ادارۂ فروغ اردو ہند کا ترجمان

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

ماہنامہ فروغ اُردو لکھنؤ

(۱-۲)

شمارہ (۱و۲) مئی و اپریل ۱۹۷۶ء جلد (۲۴)

جلد ۲۴ شمارہ ۱ (۱و۲)

رجسٹرڈ نمبر ایل، ڈبلیو / این - پی ۹۳

دفتر فون : ۲۶۱۳۵

خوش نمائش گاہ - ۲۶۶۵۶

۱۶۶

ایڈیٹر :- محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

مجلس ادارت :-

۱- عبدالقوی دریابادی بی اے

۲- سعادت علی صدیقی

مرتب امیر خسرو نمبر

ڈاکٹر انوار الحسن

صدر شعبہ علوم مشرقیہ لکھنؤ یونیورسٹی

زر سالانہ اعزازی :	دس روپیہ
عوام سے	آٹھ روپیہ
فی پرچہ	۷۰ پیسے
امیر خسرو نمبر :-	Rs. 3/-

پتہ

ادارۂ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

سید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا

فہرست مضامین

RAJ BHAVAN
LUCKNOW
۲۴ مارچ ۱۹۷۶ء

گورنر اترپردیش کا خراج عقیدت طوطئ ہند حضرت امیر خسروؒ کی بارگاہ میں

جناب مولانا صاحب

آپ کا خط مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۷۶ء موصول ہوا۔

یہ جان کر مسرت ہوئی کہ آپ ادارۂ فروغ اردو ہند کی طرف سے خسرو نمبر شائع کرنے جا رہے ہیں۔

حضرت امیر خسروؔ گوناگوں شخصیت کے مالک تھے وہ فن سپہ گری کے ماہر، شعر و ادب کی دنیا میں ممتاز، موسیقی کے تاجدار، فقیروں اور عارفوں کے دلدادہ گویا بذات خود ایک باغ و بہار تھے۔ سات سو سال ان کے انتقال کے ہو چکے ہیں مگر اب بھی وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں۔ حضرت امیر خسروؔ کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو ان کی حب الوطنی ہے۔ وہ ہندوستان کی آب و ہوا، پھول میوے، باغات، لباس اور باشندوں کی تعریف میں ہر وقت مست نظر آتے ہیں۔ وہ ایک جگہ پر فرماتے ہیں ؎

گر شنود قصۂ ایں بوستان
مکہ شود طائف ہندوستان

ہندی، سنسکرت اور فارسی کے جید عالم تھے۔ ان کے چٹکلے اور پہیلیاں آج بھی زبان زد ہیں۔

ہمیں بھارت کے اس عظیم سپوت کو نہ بھول جانا چاہیئے کیونکہ اس نے سب سے پہلے قومی یک جہتی کے راستے پر محبت اور پریم کا چراغ جلایا تھا۔

میری دعا ہے کہ آپ کا خصوصی نمبر کامیاب ہو۔

نیک خواہشات کے ساتھ

مخلص
یم چنا ریڈی
(ایم۔ چنا۔ ریڈی)
(گورنر اترپردیش)

بخدمت
جناب محمد حسین شمس علوی صاحب،
ادارۂ فروغ اردو، ہند
۳۷ حسن آباد پارک، لکھنؤ۔

ڈاکٹر انوار الحسن صدر شعبۂ علوم شرقیہ لکھنؤ یونیورسٹی

اپنی باتیں

لیجئے! آپ کے فروغ اردو کا "امیر خسرو نمبر" پیش خدمت ہے جس کے لئے آپ کو انتظار کے تکلیف دہ لمحات گزارنے پڑے۔ ادارہ نے اپنی انتہائی کوشش کی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ مفید معلومات افزا اور معیاری بنا کر پیش کیا جائے۔ ہمیں اس کوشش میں کس حد تک کامیابی ہوئی اس کا اندازہ تو قارئین ہی کر سکیں گے۔

امیر خسرو کی شخصیت بڑی رنگا رنگ، جاذب نظر اور دلکش ہی نہیں بڑی ہمہ گیر تھی۔ مختلف زبانوں کے ادبیات پر قادر، مختلف فنون میں ممتاز، مختلف علوم میں متبحر، مذہب کے سچے پیرو، تصوف کے دلدادہ، وطن پرست، مورخ، ادیب، انشا پرداز، طنز نگار، شاعر، انسانیت دوست، تہذیبی ہم آہنگی کی علامت، سیاست داں، مدبر، سپاہی، درباری —— ان کی شخصیت کی قوس و قزح میں اتنے رنگ ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔

ایک غیر اہل زبان ہوتے ہوئے بھی انھوں نے فارسی زبان میں اپنی شعری و نثری تخلیقات کے ذریعہ ایران کے اہل زبان سے اپنی شیریں سخنی کا لوہا منوالیا۔ ہندوی میں ان کے کلام کے جتنے نمونے ملتے ہیں وہ بلاشبہ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ وہ بھگتی کال کے شاعر اوّلیں تھے اُردو زبان کے بانیوں اور اس کے شعراء میں ان کی اوّلیت سے تو انکار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ عربی، ترکی سنسکرت اور بہت سی مقامی زبانوں سے ان کی واقفیت ان کے کلام ہی سے ثابت ہے۔ ان کا لسانیاتی شعور ان کی تصانیف میں ہر جگہ نمایاں ہے۔

خسرو کی گوناگوں خصوصیات اور ہمہ گیر امتیازات کے باعث اگر انھیں (GENIUS) عبقری انسان کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا اور ایسے انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ خسرو کو غالب کی طرح یہ کہنے کی ضرورت نہیں پیش آئی کہ ع شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن بلکہ وہ ان خوش قسمت شعراء میں سے تھے جن کو اپنی زندگی ہی میں درباروں سے کوچہ و بازار تک

اور ہندوستان سے ایران، افغانستان اور ترکستان تک قبول عام حاصل ہوا۔ زمین و آسمان ان کے نغموں سے گونج اٹھے۔ ان کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ اور ہر طرف ان کی عظمت کے جھنڈے بلند ہوگئے۔ سعدی شیرازی جیسے پیغمبر سخن ان کے مرتبہ شناس تھے۔ حافظ جامی اور عرفی جیسے بلند مرتبہ شعرا ان کی عظمت کے معترف نظر آتے ہیں۔

خسرو کی ہمہ گیر شہرت اور قبول عام کا سبب ان کی شاعری تھی جس میں طرز ادا اور اسلوب بیان کے ساتھ ساتھ مضامین اور معانی نیز مختلف اصناف سخن میں شاعرانہ فن کاری ہی نہیں صناعی اور سحر کاری کے نمونے نظر آتے ہیں۔ ان کی حمد و نعت، منقبت، صوفیانہ کلام، قصیدہ نگاری، مثنوی گوئی، غزل سرائی اور وصف نگاری، صنائع و بدائع کا استعمال اور اس میں نئی اختراعات موسیقی سے دلچسپی اور اس میں ایجاد و اصلاح کا انداز، پہیلی، کہہ مکرنی، امثل، دو سخنے، طنز و مزاح، مؤرخانہ حقیقت بیانی، انشاء پردازی ——————
کون سا پہلو ایسا ہے جس میں ان کی انفرادیت نمایاں نہ ہو۔ وہ سراپا محبت اور عشق کے مجسمہ تھے اور اسی خصوصیت نے ان کے ہر رنگ کو شوخ سے شوخ تر اور حد درجہ جاذب نظر بنا دیا تھا۔ ان کی انسانیت دوستی اور وطن پرستی میں بھی یہی جذبہ سب سے زیادہ تابناک نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے انھیں ہندوستان کی تہذیبی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ خسرو جن اخلاقی قدروں کے حامل اور جن تہذیبی روایات کے امین تھے انھیں سیاسی مصالح کی بناء پر، تعصب اور تنگ نظری کی وجہ سے، کج فہمی اور حقیقت سے اعراض و اغماض کے سبب نظر انداز کر دینا تو ممکن ہے لیکن ان کی اہمیت آفاقی اور مسلّم ہے جس سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا اور اسی کے پیش نظر ہماری قومی حکومت نے ان کی سات سو سالہ یادگاری تقریبات منانے کا فیصلہ کیا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں ان کی حیات و خدمات پر سیمینار منعقد کئے گئے۔ مؤقر جرائد نے خصوصی نمبر شائع کئے اور پیش نظر نمبر بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔

فروغ اردو کے "خسرو نمبر" کی ترتیب و تشکیل میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ خسرو کی گوناگوں شخصیت کے زیادہ سے زیادہ پہلوؤں پر تحقیقی مضامین شامل کئے جائیں تاکہ مستقبل میں "خسرو" کا مطالعہ کرنے والے اس سے مستفید ہو سکیں۔ اس خصوصی نمبر کی ترتیب کی خدمات ابتداء میں ڈاکٹر سید رغیب حسین صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

کے سپرد کیں اور انھوں نے اس سلسلہ کا کام بھی شروع کردیا تھا لیکن ۲۶ ستمبر ۱۹۷۴ء کو ان کی حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے مجھے یہ ذمہ داری سنبھالنا پڑی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی وفات نے ادارہ کو ایک بڑے سرپرست کی شفقتوں اور رہنمائی سے محروم کردیا جس کی کمی شدّت سے محسوس کی جاتی رہے گی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے حوصلہ مندانہ اور مفید مشورے ہمیشہ ادارے کے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں معاون رہے۔ اسی لئے ہمیں آج ان سے محرومی کا شدید احساس ہے۔ ان کی ذات خود ایک ادارہ تھی اور فروغ اُردو کی جدوجہد میں ان کی رفاقت ان کے تعاون اور ان کی رہنمائی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایک اچھے ساتھی مخلص، رفیقِ کار اور سچے دوست کی یاد میں فروغ اُردو کا "خسرو نمبر" انھیں کے نام سے معنون کیا جاتا ہے، جنھوں نے اس خصوصی نمبر کی ترتیب کا کام شروع کیا تھا۔

پیشِ نظر "خسرو نمبر" میں بعض معلوماتی مضامین رسالہ "قومی راج" کے خسرو نمبر سے لئے گئے ہیں جن کی اشاعت کے لئے ادارہ ان کا شکر گزار ہے۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی مرحوم کا مضمون فروغ اُردو کے لئے ان کی زندگی میں آیا تھا۔ بزرگ صحافی مولانا عبدالماجد دریابادی کا ریڈیو نشریہ اور استادِ محترم ڈاکٹر محمد وحید مرزا کے تحقیقی مقالہ سے ماخوذ ایک مضمون ہم تبرکاً شائع کررہے ہیں۔ ادارہ اپنے ان تمام مضمون نگاروں اور شاعروں کا شکرگزار ہے جن کی تخلیقات اس نمبر کی زینت ہیں۔ یقیناً ان کے اس قلمی اشتراک و تعاون کے بغیر اتنا شاندار نمبر شائع کرنا ممکن نہ تھا۔ اس خصوصی نمبر کی اشاعت فروغ اُردو کے سابقہ خصوصی نمبروں کے سلسلہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اور ہمیں امید ہے کہ ادارہ کی یہ علمی و ادبی خدمت بھی علمی دنیا سے خراجِ تحسین کی مستحق گردانی جائے گی۔ ناسپاسی ہوگی اگر ہم مولانا محمد حسین شمس علوی صدر ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ کا شکریہ نہ ادا کریں کیونکہ انھیں کی تگ و دو اور خصوصی توجہ سے یہ عظیم ترین امیر خسرو نمبر منظرِ عام پر آکر قارئین فروغ اُردو سے دادِ تحسین حاصل کرنے کے قابل ہو سکا۔



حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ

ولادت شوال ۶۵۱ھ مطابق ۱۲۵۳ء

وفات ذیقعدہ ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۵ء

خسروِ شیریں زباں طوطیِ ہندوستاں

عمر انصاری

شاہراہِ شوق میں ہے کون خسروؔ کے سوا		شمع بن کر روشنی دے جس کا ایک اک نقشِ پا
صاحبِ دل، شخصِ حق آگاہ و، مردِ با خدا		شاعرِ شیریں مقال و مطربِ رنگیں نوا

چھو لیا جا کر فلک کو، جب ذرا پرواز کی
سرحدیں لاکر ملا دیں، ساز اور آواز کی

نغمگی، گونجی ہوئی ہر سو یہ خسروؔ ہی کی ہے		ذہن اور دل میں بسی خوشبو یہ خسروؔ ہی کی ہے
قوس کی صورت، تنی ابرو یہ خسروؔ ہی کی ہے		گود میں پالی ہوئی اُردو یہ خسروؔ ہی کی ہے

خود بھی ویسا ہی تھا وہ، جیسا کہ اُس کا ساز تھا
ساری آوازوں میں خسروؔ اک نئی آواز تھا

زندگی کا لہلہاتا تھا چمن اُس کے لئے　　گوش بر آواز رہتا تھا سخن اُس کے لئے
تھی چمن کی خاک بھی، سرو سمن اُس کے لئے　　وہ وطن کے واسطے تھا اور وطن اُس کے لئے

موتیوں سے منھ ہر اک اہلِ وطن کا بھر گیا
ہند کی گوری کا اونچا فخر سے سر، کر گیا

چھو لیا جس شے کو دونی اُس کی قیمت ہو گئی　　بات جو کہہ دی وہی بڑھ کر "کہاوت" ہو گئی
جس "مکرنی" پر نظر کی خوبصورت ہو گئی　　چند حرفوں کی بنی صورت قیامت ہو گئی

لفظ کچھ آکر جہاں، بے جوڑ اور "انمل" ملے
یہ ہوا محسوس بس، روٹھے ہوئے دو دل ملے

پیار کا دریا چڑھا ایسا کہ پانی پا گئے　　لفظ فیضِ خسروانہ سے معانی پا گئے
وہ، جو بوڑھے ہو چکے تھے پھر جوانی پا گئے　　چھو گئے اُس کے قلم سے جو، روانی پا گئے

رکھ دیے گیتوں میں بھر بھر کر چھلکتے جام سے
سر بسر حضرت نظام الدینؒ کے پیغام سے

سر سے پا تک "ہندوی" رفتار سے گفتار سے　　آب ہے موتی کی قائم "خسروی" کردار سے
تارِ ہندی کو سجایا فارسی کے تار سے　　جل اُٹھے لاکھوں دیے دیکھا جدھر بھی پیار سے

ایک سے ہے اک سوا، انداز میں اعجاز میں
ہند میں خسرو اِدھر، سعدی اُدھر شیراز میں

جان اپنی، زندگی نادان تھی کھوتی رہی　　بات منظورِ خدا جو تھی، وہی ہوتی رہی
بے بسی، بے بس تھی، کیا کرتی کھڑی روتی رہی　　سیج پر سوئی ہوئی "گوری" پڑی سوتی رہی

ہوتے ہوتے ختم یوں سارا فسانہ ہو گیا
دور کی آواز اک، اُس کا "ترانہ" ہو گیا

ڈاکٹر محمد وحید مرزا :

امیر خسروؔ : مؤرّخ اور نثر نگار

پیشِ نظر مضمون خسروؔ کے مشہور سوانح نگار و محقق ڈاکٹر محمد وحید مرزا صاحب سابق پروفیسر و صدر شعبہ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کے تحقیقی مقالے سے ماخوذ ہے۔

ادارہ

اعجازِ خسروی یا رسائل الاعجاز[1]

خسروؔ کی یہ ضخیم تصنیف ۷۱۹ھ میں مکمل ہوئی۔ اُس وقت خسروؔ کی عمر تقریباً ستر سال کی تھی۔ دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے چار حصے جنھیں "رسالے" کہا گیا ہے ۶۸۲ھ تک لکھے جا چکے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد خسروؔ نے ایک پانچواں رسالہ اور مرتب کر کے کتاب میں بڑھا دیا (۱) اس پانچویں رسالے میں زیادہ تر وہ خط ہیں، جو انھوں نے ابتدائی عمر میں تحریر کئے تھے۔

اس کتاب کی تالیف کا بڑا مقصد یہ تھا کہ مرصع اور مزین نثر کے نمونے پیش کئے جائیں۔ اور مختلف قسم کے صنائع اور بدائع کے استعمال کو واضح کیا جائے اور اس طرح اگر ایک طرف یہ کتاب خسروؔ کا سکہ، اقلیم نثر میں بھی اسی طرح رواں ہونا ثابت کرتی ہے جس طرح مملکتِ نظم میں، تو دوسری طرف اس زمانے کے شوقین طبع کاتبوں اور نثر نویسوں کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ اور معیار بھی مہیا کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج بھی چھ سو سال کے بعد شاید بہت کم لوگوں میں اتنی ہمت اور اس قدر استقلال ہوگا کہ وہ اس کتاب کی بغور ورق گردانی بھی کر سکیں۔ اس کے نکات اور مطالب کو سمجھنا یا اُن سے مستفید ہونا تو بڑی بات ہے۔ زمانہ بدل گیا۔ مذاق تبدیل ہو گئے۔ جو چیز اس وقت مقبول تھی وہ اب مردود ہے اور جو بات اس زمانہ میں رائج تھی اب اس کی کساد بازاری ہے۔ اس زمانے کا کوئی تنقید نویس اگر خسروؔ کی اس تصنیف کو پڑھے گا تو پہلا خیال اس کے دل میں یہی آئے گا کہ خسروؔ نے ناحق اس قدر کاوش کی اور بیکار ایک طومار لکھ مارا۔ لیکن اگر وہ صبر اور ہمدردی سے کام لیکر اعجازِ خسروی کی خوبیوں اور اس کی قدر و قیمت کو سمجھنے اور

[1] اعجازِ خسروی رسالہ ۴ ص ۲۴۲، ۳ رسالہ ۵ ص ۱۶۷

پڑھنے کی کوشش کرے گا تو یقین ہے کہ اس کو خسرو کی یہ تصنیف فضول اور ان کی یہ مشقت ادبی بیکار نہ معلوم ہوگی۔ اس لئے کہ قطع نظر اس کے کہ اس کتاب میں اس زمانے کے بہترین اسالیب، نثر کے نمونے مل سکتے ہیں جو خصوصاً ہندوستان میں فارسی نثر کے ارتقا کے مطالعے میں بہت مفید ہو سکتے ہیں۔ اعجاز خسروی میں لغوی، نحوی، ادبی، تاریخی اور معاشرتی نقطہ نظر سے بے شمار معلومات مل سکتی ہیں جو کتاب کے صفحات میں جگہ جگہ پراگندہ ہیں اور اس زمانے کے کوائف اور حالات پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔

خسرو کا دعویٰ ہے کہ نثر کا جو اسلوب اعجاز خسروی میں پیش کیا گیا ہے وہ ان کی اپنی ایجاد ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی پہلے رسالے کے شروع میں وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں فارسی نثر کی ایک نئی طرز تکمیل کو پہونچ رہی تھی جس میں صنائع اور بدائع اس طرح شامل تھے جیسے پانی میں گلاب اور جس کے ذوق سے ماوراء النہر اور خراسان کے "سخن شکن" بالکل بے بہرہ تھے اور اسی طرز کے بہترین نمونے وہ اس تصنیف میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خسرو اپنے زمانے کے مذاق سے بالکل بے نیاز نہ ہو سکتے تھے اور ان کی نثر میں وہ رنگ ضرور جھلکتا ہوگا جو ان کے ہم عصر ادیبوں اور کاتبوں کی تحریر میں موجود تھا، لیکن خسرو کی جدت یہ ہے کہ انھوں نے لفظی صنائع کو حتی المقدور ترک کر کے زیادہ تر معنوی صنعتوں خصوصاً خیال اور ایہام سے کام لیا ہے اور یہ التزام رکھا ہے کہ عبارت کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ہر ایک ٹکڑے میں ایک خاص "نسبت" یعنی مناسبت سے الفاظ استعمال کئے جائیں، مثلاً اگر آگ کا لفظ ہے تو باقی عبارت میں آگ کے متعلقات اور مناسبات ہی مذکور ہوں اگر پانی کا استعارہ ہے تو پانی کے لوازمات ہی اس ٹکڑے میں آئیں، اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی تحریر میں تکلف پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس التزام کو نباہنا آسان نہیں اور خسرو کا سا قادر الکلام ادیب ہی اس کو کامیابی سے کام میں لا سکتا تھا، اس کے علاوہ خسرو نے نئی تشبیہیں، نئے استعارے، اور کئی طرح کی نئی صنعتیں بھی اس کتاب میں استعمال کی ہیں جو بقول انکے سب ان کی ایجاد ہیں۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ کتاب میں عربی اور فارسی کے جتنے بھی اشعار استعمال ہوئے ہیں، وہ سب خسرو کی اپنی تصنیف ہیں۔

اس مختصر سی کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ اعجاز خسروی کے مطالب کو پورے طور پر واضح کیا جا سکے اس لئے میں حسب ذیل مختصر سے تجزیے پر کفائت کرتا ہوں۔ امید ہے کہ اس سے کچھ اندازہ کتاب کی نوعیت اور موضوع کا ہو سکے گا۔

دیباچہ میں حمد، نعت، منقبت حضرت نظام الدین اولیاء۔ مدح سلطان علاء الدین وغیرہ کے بعد خسرو نے فارسی نثر کے ان ۹ اسلوبوں کا ذکر کیا ہے جو اُن کے زمانے میں رائج تھے یعنی :۔

۱۔ صوفیہ و اولیاء کا اسلوب جو دو قسم کا ہے، ایک تو اہل تمکین و مقامات کا جس کا نمونہ کشف المحجوب، سلوک المسافرین وغیرہ میں مل سکتا ہے اور دوسرے اہل حال کا جس کی مثال الغزالی اور عین القضاۃ الہمدانی کی تصانیف میں موجود ہے۔

۲۔ علمی محقق کا مثلاً الغزالی کی فارسی تصانیف اور

احیاء العلوم کا فارسی ترجمہ۔

۳۔ کاتبوں اور انشا نویسوں کا، جسمیں عربی اور فارسی الفاظ اور فقروں کو خوبی سے ترکیب دی جاتی ہے اور جس کی بہترین مثال کلیلہ دمنہ کا فارسی ترجمہ ہے جو بہائی بغدادی نے کیا ہے۔

۴۔ علما و فضلا کا جسمیں ہر فن اور علم کی مناسبت سے اصطلاحی الفاظ اور عبارتیں استعمال کی جاتی ہیں۔

۵۔ خطیبوں اور واعظوں کا، جو سیدھا سادھا بھی ہو سکتا ہے اور رنگین بھی۔

۶۔ مشائخ یا مدرسین کا، جو ایک ایسے چکنے پتھر کی طرح ہے جسے کسی بدسلیقہ مزدور نے راستے کے عین بیچ میں رکھدیا ہو اور جس سے عقلمند تو بچ کر نکل جائیں، لیکن بہت سے بیوقوف پھسل جائیں۔ اس اسلوب کے دلدادہ اکثر اپنی ہٹ کے پکے اور عقلمندوں کی تنقید پر کان نہ دھرنے والے ہوتے ہیں۔

۷۔ عام آدمیوں کا اسلوب جو سادہ، سلیس اور مفید مطلب ہوتا ہے۔

۸۔ مزدوروں اور کاریگروں کا، جو انکے پیشوں سے مناسبت رکھتا ہے اس میں کسی قسم کی بناوٹ یا رنگینی نہیں ہوتی اور

۹۔ ظریفوں، مسخروں اور بھانڈوں وغیرہ کا جو خاص طور پر خوش کرنے اور ہنسانے کے لئے موزوں ہوتا ہے

اس کے بعد خسرو خود اپنے اسلوب کا ذکر کرتے ہیں جو بقول انکے سب کاتبوں کی قدرت سے باہر ہے اور جو تحریریں اس اسلوب میں لکھی گئی ہیں وہ وحی خفی کی حیثیت رکھتی ہیں

پھر کتاب کی ترتیب میں بیان کرتے ہیں کہ اسمیں کل پانچ رسالے یعنی بڑے حصے ہیں۔ ہر ایک رسالہ میں کئی "خط" یا باب ہیں اور ہر ایک خط میں متعدد "حرف" یا مضامین ہیں۔

پہلے رسالہ میں وہ غرض تصنیف یہ بتاتے ہیں کہ پرانی وضع کی انشا میں کوئی خاص لطف اور چاشنی نہ تھی بلکہ خانہ بدوش ترکوں یا ہندوستانی ماہی گیروں کے کھانے کی طرح بدمزہ تھی۔ اسلئے انھیں ایک نئی طرز کی ایجاد کا خیال پیدا ہوا جس میں زیادہ تر معنوی صنعتوں خصوصاً ایہام اور خیال سے کام لیا گیا ہے، اس کے بعد خسرو مناسبت الفاظ اور جملوں اور فقروں کی موزوں ترتیب و ترکیب کی اہمیت بیان کرتے ہیں اور ہدایتیں لکھتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات قابل غور ہے کہ ان کے خیال میں عربی الفاظ کا استعمال جس قدر بھی کم ہو اچھا ہے۔

دوسرے رسالہ میں متفرق قسم کے خط ہیں اور بعض شاہی فرمان بھی ہیں۔ ایک پورا خط عربی میں مولانا شہاب الدین کے نام ہے اور ایک خالص فارسی میں ہے۔ کچھ نئی عربی اور فارسی امثال ہیں۔ یہ خسرو کی تصنیف ہیں اور انہیں سے بعض واقعی دلچسپ ہیں۔ ایک "خط" میں ہندوستانی موسیقی اور موسیقی دانوں کا ذکر ہے، آلات موسیقی کے نام بھی دیے ہیں جن میں ٹھیکان، عجیب رود، چہرہ، دھل، جنگ، رباب، دف نلی، طنبور، دیکھ، دستان، شہنائی، بابک، دم سرنی، اور بیترہ شامل ہیں۔ ارباب موسیقی میں تومری خاتون، محمد شاہ، کنجشک، خلیفہ حسینی اور اخلاق وغیرہ کا ذکر کیا ہے بعض خطوں میں مختلف علوم مثلاً نجوم، طبیعیات، طب، فقہ، اور بعض کھیلوں مثلاً شطرنج وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔

تیسرے رسالہ میں لفظی صنائع کی مثالیں دی گئی ہیں جن میں سے بعض خسرو کی ایجاد ہیں۔

چوتھے رسالہ میں پانچ "خط" ہیں، تمہید کے طور پر خسرو نے اس رسالہ میں بھی انشاء کے مختلف اسلوبوں پر بحث کی ہے اور ایہام اور خیال سے جو خوبی پیدا ہوتی ہے اسے واضح کیا ہے، اس کے صنائع معنوی کا ذکر ہے اور متفرق خطوط ہیں جن میں مختلف علوم و فنون پر بحث کی گئی ہے۔ خاص طور پر قابل ذکر ایک تو علاؤ الدین کا وہ فرمان ہے جو اس نے تخت نشینی کے بعد لکھوایا تھا اور ایک خط بدر حاجب کا خضر خاں کے نام ہے جس کے اسلوب کی خسرو نے بے انتہا تعریف کی ہے ان میں سے بعض خط یقیناً فرضی اور موسوم اشخاص کے نام ہیں لیکن بعض ایسے ہی ہیں جو خسرو نے اپنے دوستوں اور ہم عصروں کو لکھے تھے۔ یہ رسالہ بہت دلچسپ ہے اور کارآمد بھی، کیونکہ اس سے خسرو کے زمانے کے ذہنی ارتقاء اور علمی مشاغل کے متعلق مفید باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ ضمناً بعض ان درسی کتابوں کے نام بھی معلوم ہو جاتے ہیں، جو اس عہد میں مقبول اور رائج تھیں، مثلاً پنج گنج، کنز فقہ، اخبار ناجین، اخبار نیرین (؟) وغیرہ۔

پانچویں رسالہ میں وہ خط وغیرہ ہیں جو خسرو نے اوائل عمر میں لکھے تھے اور اسلئے یہ اسلوب کا نمونہ نہیں کہے جا سکتے جو انھوں نے بعد میں مکمل کیا، لیکن پھر بھی ان میں سے بعض خط بہت دلچسپ ہیں اور بہت اچھے پیرایے میں لکھے گئے ہیں، خصوصاً وہ خط جو انھوں نے اپنے دوستوں نجم الدین حسن، تاج الدین زاہد وغیرہ کو لکھے ہیں اور جن میں سے بعض کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ چار خطوں میں ایک کنجوس خواجہ کی ہنسی اڑائی ہے۔ یہ خط خسرو کی ظرافت طبع کا اچھا نمونہ ہیں۔ اگرچہ یہ ظرافت ایک قسم کی عریانی سے خالی نہیں ہے جو قدما کی اس قسم کی تحریروں میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔

پانچویں رسالے کے بعد ایک خاصہ طولانی تتمہ یا خاتمہ کتاب ہے۔ جس میں حسب معمول خسرو اپنی محنت و مشقت کا جو انھیں کتاب کی تالیف میں اٹھانا پڑی ذکر کرتے ہوئے سہو و خطا سے چشم پوشی کی درخواست کرتے ہیں اور اپنے بعض دوستوں خصوصاً شہاب الدین کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے انھیں اس کی ترتیب میں مدد دی۔

خسرو کی خوش طبعی اور ظرافت کے چند نمونے اس کتاب سے پیش کرتا ہوں۔

دعاؤں اور بد دعاؤں کی مثالیں :۔

اس کا طائر روح خدا کے ہاتھ پر بیٹھے۔ خدا اسے دوزخ کے کتوں سے بچائے۔ کوے اس کی چولی میں انڈے دیں وہ بھیڑیوں کے ناخنوں سے باندھا جائے، وہ قبر میں سو رہے (گوزالدین نامی کسی شخص کے لئے) نہ دخل الخشب فی استہ، (معشوق کی طرف سے عاشق کے لئے) :۔ اس کی روح ہمارے گھوڑے کے پسینے سے مدہوش رہے، جب تک ہمارا گھوڑا اس کی قبر پر خرام ناز کرتا رہے (ایک شطرنج باز کے لئے): وہ فیل کے نیچے مرے۔

ایک نیک سیرت شیخ کی تعریف یوں کرتے ہیں:
وہ ایک ایسا پرند ہیں کہ اگر ان کے نیچے شیطان کا انڈا سینے کو رکھا جائے تو اس میں سے جبرئیل نکل آئیں۔

بعض طنزیہ فقرے :۔
کفن دزد سے زیادہ نرم دل۔ گورکن سے زیادہ

مبارک قدم، نادانشت سے زیادہ باحیا، نوبہار سے زیادہ مہربان، عامل سے زیادہ نیک مزاج، سودخواروں سے زیادہ پُردردہ حال۔ چغلخور سے زیادہ بھروسے کے قابل چیل کے چیل سے زیادہ دوربین۔ سوتے ہوئے خرگوش سے زیادہ بیدار۔

رسائل الاعجاز نولکشور پریس میں دو مرتبہ چھپ چکے ہیں۔ قلمی نسخے بکثرت موجود ہیں۔

۲۔ خزائن الفتوح یا تاریخ علائی

علاء الدین خلجی کے عہد کی یہ مختصر سی تاریخ خسرو نے ۷۱۱ھ میں پوری کی اور اس میں اس بادشاہ سے متعلق وہ واقعات درج ہیں جو ۶۹۵ھ سے لیکر ۷۱۱ھ تک ظہور میں آئے۔ کتاب کی وجہ تصنیف خسرو دیباچے میں یوں بیان کرتے ہیں :۔

" اس بندۂ مسکین خسرو کی قسمت میں۔ اگرچہ اس کی قلم اپنی قدرت اور ہمہ گیری کے باوجود اس عظیم الشان بادشاہ کے اوصاف کا ایک شمہ بھی پوری طرح بیان کرنے سے عاجز ہے۔ یہ لکھا تھا کہ وہ اس کے عہد کی عظمت و شوکت کی ثنا خوانی کرے۔ اور اس لئے خدائے تعالےٰ نے اپنے جود و کرم سے آسمان اور زمین کے سب خزانوں کے دروازے اس کے لئے کھول دیے اور اسے ایسے جواہر بے بہا عطا کئے جو بحر تی اور اور تمام جیسے شاعروں کو بھی نصیب نہیں ہوئے تھے۔ پھر بھی یہ گراں بہا موتی اس لائق نہ تھے کہ اس کے آستان فلک پایہ پر نچھاور کئے جا سکیں، لیکن چونکہ بازار فطرت میں ان سے بہتر متاع دستیاب نہیں ہو سکتا تھا اس لئے مجبوراً مجھے ان موتیوں ہی کو پرو کر بادشاہ کے لئے تحفہ تیار کرنا پڑا۔ اور اس امید میں اس کے آگے پیش کرتا رہا کہ وہ چونکہ لطف و کرم کا دریا ہے ان کو قبول کرلے گا۔ اور جب میں نے دیکھا کہ اس بندے کے ہیچ میچ الفاظ کو بادشاہ کی درگاہ میں قبول حاصل ہوا تو مجھے نظم کی طرح نثر میں بھی طبع آزمائی کا خیال آیا کہ شائد بادشاہ میرے کلام پر ایک نظر ڈالے جس طرح سورج، سنگ قابل پر نظر ڈالتا ہے۔ اگرچہ میری قلم ہمیشہ نظم کے لئے وقف رہی ہے اور کبھی محاسن نثر کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ میں اس عروس کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بڑے آدمیوں کی آنکھ برائیوں کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ اگر مجھے عمر جاوداں مل سکتی تو اس کا بہترین مصرف یہی ہوتا کہ اسے بادشاہ کی مدح و ثنا میں گزار دوں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ زندگی مختصر ہے اور اس لئے اس کے اوصاف کے بے پایاں سمندر سے میں ایک چلّو بھر پانی لینے ہی پر اکتفا کرتا ہوں "۔

خسرو کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نثر کے میدان میں یہ ان کا پہلا اقدام تھا[1]۔ اور اگرچہ وہ اپنے دیوانوں کے دیباچوں میں کچھ نہ کچھ نثر نگاری اس سے پہلے ضرور کر چکے تھے۔ اب تک انھیں کسی مستقل نثری تصنیف کا خیال پیدا نہ ہوا تھا۔ لیکن تاریخ علائی کے مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہو گا کہ اس کتاب کو لکھنے سے پہلے خسرو نثر میں ایک نیا اسلوب قائم کر چکے تھے اور یہ اسلوب

---

[1] اعجاز خسروی کے پہلے چار رسالے اس سے پہلے مرتب ہو چکے تھے لیکن ۷۱۹ھ سے پہلے کتاب کی شکل میں شائع نہ ہوئے تھے۔

وہی تھا جس کا ذکر انھوں نے اعجاز خسروی میں کیا ہے یعنی ایہام خیال کا استعمال اور عبارت کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کرکے ہر ایک ٹکڑے میں ایک علحدہ "نسبت" کو کام میں لانا یعنی ایک خاص چیز کی مناسبت سے الفاظ اور جملے استعمال کرنا۔ اس طرز تحریر میں تکلف اور پیچیدگی کا پیدا ہوجانا ناگزیر ہے۔ اور اسی لئے خزائن الفتوح کو ٹھیک سے سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ تو بھی خسرو کی قابلیت اور شگفتگیٔ طبیعت کی داد دینا پاتی ہے۔ کہ انھوں نے اس مشکل اور پہنئے اسلوب کو نہ صرف کامیابی کے ساتھ اول سے آخر تک نباہا ہے بلکہ اس میں ایک خاص لطافت اور ایک عجیب طرح کی ظرافت بھی پیدا کردی ہے کسی تاریخی کتاب کے لئے یہ طرز تحریر موزوں تھا یا نہیں؟ یہ دوسرا سوال ہے۔ خسرو نے باوجود اس کے کہ بادشاہ کی مدح وثنا میں بہت مبالغہ برتا ہے۔ اس کا التزام رکھا ہے کہ تاریخی واقعات کی صحت اور ترتیب میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ انھیں واقعات کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان کردیتے تو پڑھنے والوں کو زیادہ آسانی رہتی مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ خسرو مورخ نہ تھے۔ بلکہ ادیب تھے اور ادیب بھی ایسے کہ جن کی طبیعت کی جولانگاہ زیادہ تر نظم کا میدان رہا تھا۔ اس لئے ان کے لئے سیدھی سادھی تحریر میں کیا دلکشی ہوسکتی تھی اور بغیر اس تکلف اور رنگینی کے خزائن الفتوح کی ادبی قدر و قیمت کیا رہ جاتی؟

خزائن الفتوح میں جو تاریخی واقعات مذکور ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

۱۔ علاء الدین کی مہم دیوگیر۔ جب وہ کڑہ مانک پور کا حاکم تھا۔ (ربیع الثانی ۶۹۵ھ)

۲۔ اسی سال اس کی دہلی پر چڑھائی اور تخت نشینی۔

۳۔ سلطنت میں امن امان اور خوش حالی پیدا کرنے کے لئے اور ہر قسم کے الحاد اور بد اخلاقی کی روک تھام کی تدابیر جو اس بادشاہ نے اختیار کیں۔

۴۔ علاء الدین کی بنا کردہ عمارتیں یعنی جامع مسجد، علائی مینار، شہر دہلی کی فصیل۔ اور حوض شمسی کی تعمیر اور مرمت یا اضافہ وغیرہ

۵۔ مغلوں کے خلاف اس کی کامیاب جنگ اور ان کی گوشمالی۔

۶۔ گجرات اور رنتھنبور کی فتح (۶۹۸ھ اور ۷۰۰ھ)

۷۔ مالوے کی تسخیر (۷۰۵ھ)

۸۔ چتوڑ کی مہم (۷۰۳ھ)
ملک کافور کی سرکردگی میں دیوگیر کی مہم (۷۰۶ھ) اور بادشاہ کے ہاتھوں سیوانہ کی تسخیر (۷۰۸ھ)

۹۔ ملک کافور کا تلنگ یا تلنگانے کو فتح کرنا (۷۰۹ھ)

۱۰۔ ملک کافور کا معبر کو فتح کرنا (۷۱۰ھ) اور اس کی فتح مند فوجوں کی دہلی میں واپسی (۷۱۱ھ)

ان تمام باتوں کو خسرو نے حسب معمول بہت صحت اور تحقیق کے ساتھ لکھا ہے اور بعض ایسی تفصیلات دی ہیں جو اور تواریخ میں نہیں مل سکتیں۔ اس لئے جب اس امر کو بھی ملحوظ رکھا جائے کہ علاء الدین کے عہد کی یہی ایک ایسی تاریخ ہے جو اسی زمانے میں لکھی گئی تو خزائن الفتوح کی تاریخی اہمیت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے اور اس بات کی ضرورت واضح ہوجاتی ہے کہ اس کتاب کا تحقیق اور غور

کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔ بدقسمتی سے اس کتاب کے قلمی نسخے غالباً دو چار سے زیادہ نہیں ہیں، جن میں سے ایک برٹش میوزیم لندن میں ہے اور دوسرا کنگز کالج کیمبرج کی لائبریری میں۔ علی گڑھ سے خزائن الفتوح کا متن شائع ہو چکا ہے جو برٹش میوزیم کے نسخے پر مبنی ہے لیکن اس میں صحت کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا۔ پروفیسر محمد حبیب نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا تھا لیکن چونکہ اصل متن ہی صحیح نہ تھا، اسلئے ظاہر ہے کہ ترجمہ میں صحت پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کتاب کا متن تحقیق اور تدقیق کے بعد تیار کیا جائے اور اس کا قابل اعتماد انگریزی یا اُردو ترجمہ بھی کیا جائے تاکہ اس بیش قیمت تصنیف سے ہمارے تاریخ بین اور تاریخ نویس احباب مستفید ہو سکیں۔

کتاب کے اسلوب کے متعلق میں اوپر لکھ چکا ہوں ایک دو خصوصیتوں کا ذکر اور کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں سے ایک تو یہ ہے کہ خسرو نے کاتبوں کی نادانستہ ستم ظریفی سے بچنے کے لئے جو تاریخوں کو اکثر مسخ کر دیتے ہیں تاریخ بیان کرنے کا ایک بالکل نیا طریقہ اختیار کیا ہے یعنی ہر ایک واقعے کی تاریخ کو ایک معمے کی شکل میں بیان کیا ہے مثلاً علی بیگ اور نورتاق مغل سرداروں کی گرفتاری کی تاریخ یوں لکھی ہے :-

"و در تاریخ سال معلوم شد کہ پای علی بیگ در سلسلہ افتد و سر و پای نورتاق نیز ہمانجا گرفتار آید"

گویا تاریخ معلوم کرنے کے لئے ان حرفوں کے عدد جوڑنا چاہئیں : علی بیگ کا پاؤں یعنی آخری حرف (گاف ۲۰) "سلسلہ" کے حروف (س ل س ل ہ ۱۸۵) نورتاق کا سر یعنی پہلا حرف (ت ، ۴۰۰) اور پاؤں یعنی آخری حرف (ق ، ۱۰۰) ۔ کل مجموعہ ۷۰۵ ہوتا ہے اور یہی ان سرداروں کی گرفتاری کا ہجری سن ہے۔

ایک اور خصوصیت جو رسائل الاعجاز میں بھی خاصی نمایاں ہے۔ یہ ہے کہ خسرو نے اس کتاب میں عربی کے مفرد بیت جو ان کی اپنی تصنیف ہیں بکثرت استعمال کئے ہیں مثلاً ہاتھیوں کے متعلق کہتے ہیں :-

وسار الفیل والنظار قالوا

اقیم البحر سیرت الجبال

عبارت کے اسلوب کے نمونے کے طور پر دو ایک ٹکڑے یہاں پیش کئے جاتے ہیں :-

"بازنسبت ز آب و ماہی بین، چندانکہ در آن خرابہ آباد کند و نیز بزخم بیک پلی کشتی شگاف طوفان خون رانند نشان آن ماہی یافتہ نشد زیرا کہ در آب ماہی را پی بیرون نتوان کشید مع ہذا جویندگان بہر رگہای آب و رود ہای زمین براندن تیزی می بریدند گمان بردند کہ مگر سوی جال کونہ کہ شہر قدیم آبادی بیراست رفتہ باشد، با خود تصور نمودند کہ نباید کہ آن ماہی بزرگ از آن جال کونہ نیز بجہد، آنجا رویم و شست بگشائیم باشد بدست افتد، بدین اتفاق پیش از انکہ آبی خورند دیا بآبداری مشغول شوند تند تر از آبی کہ از بالا فرود آید روان شدند، از آیندگان با خبر صحت اخبار کماہی معلوم گشت کہ بیرداران بیرانہ گرد نگشتہ است و از دریا نیز دست شستہ بدان سبب کہ دریا با چندان ایستاد زین در ہلی روان کرانہ خواہد کرد۔ مصرع۔ ونی تحت اثری خوفا بغور"

"اینک این نسبت زیباست و نگام رجاعت

مسلمانان کہ بیاردم گسستہ ہندو علاقہ داشتند واز " لکام لاتتخذوا الکافرین اولیاء من دون المومنین " سر برون بردہ چوں دید ندکہ رای را دوال حزم بگسستی ایشان را غاشیۂ قیامت برسرآمد جہان بر ایشاں ہم چو حلقۂ زیں تنگ شد و موج خون از پشت زیں بگذشت، بیش جلی مندزیں خشک کردن نماند، عنان از موافقت گفتار برتافتند و در زینہار اہل اسلام پناہ جستند و بفتراک دولت، " فان حزب اللہ ہم الغالبون " از زینت و تشریف ملک شاد شدند و از قود کش اسیری تراد "۔

۳۔ افضل الفوائد

امیر خسرو کو غالباً شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے آغاز جوانی ہی سے عقیدت رہی تھی، لیکن ۷۱۳ھ سے پہلے وہ باقاعدہ طریقہ پر آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل نہ ہوئے تھے۔ مرید ہونے کے بعد ۷۱۹ھ میں خسرو نے افضل الفوائد کا ایک حصہ حضرت نظام الدینؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے اُسے بہت پسند کیا اور خسرو کی ہمت افزائی کی چنانچہ خسرو نے اس کے بعد دوسرا حصہ بھی لکھنا شروع کیا مگر یہ نا تمام رہا۔ افضل الفوائد کو لکھنے کا خیال خسرو کو یقیناً خواجہ حسن کی تقلید میں پیدا ہوا۔ چونکہ دونوں دوست اپنے پیر طریقت کی تعظیم و تکریم میں ساعی اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ اسلئے خسرو نے یہ پسند نہ کیا کہ حضرت نظام الدین کے حالات اور ملفوظات کو جمع اور مرتب کرنے میں وہ خواجہ حسن سے پیچھے رہ جائیں۔ مگر خواجہ حسن اس معاملے میں خسرو سے بازی لے گئے جس کی وجہ غالباً ایک تو یہ تھی کہ انھیں خسرو کی نسبت زیادہ فراغت اور فرصت کتاب کی تصنیف کے لئے ملی اور دوسری یہ کہ اس قسم کی کتاب کے لئے جس طرز تحریر کی ضرورت تھی اس سے خسرو مانوس نہ تھے۔ دونوں کتابوں کی زبان بہت ہی سادہ اور سلیس ہے اور اس فارسی نثر کا نمونہ ہے جو اس زمانہ میں عام طور پر بولی جاتی تھی اور میرے خیال میں ادبی نقطۂ نظر سے یہی ایک پہلو ہے جس کے لحاظ سے یہ دونوں کتابیں قابل قدر ہیں۔ خواجہ حسن کی تصنیف نہ صرف زیادہ ضخیم ہے بلکہ جو قبول عام اسے حاصل ہوا وہ خسرو کی کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔

افضل الفوائد میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا زیادہ تر حضرت نظام الدین کے اقوال ہیں۔ لیکن ضمناً انکی خانقاہ کے کچھ حالات اور ان لوگوں کا بھی تذکرہ موجود ہے جو اکثر آپ کے گرد و پیش رہتے تھے اور جن میں خواجہ حسن، مولانا وجیہ الدین پایلی، مولانا شہاب الدین میرٹھی۔ مولانا برہان الدین غریب اور عثمان سیاح کا نام اکثر آتا ہے۔ کتاب کے بعض حصے دلچسپ ہیں، خصوصاً وہ جن میں حضرت نظام الدین کی رائے بعض متنازعہ فیہ مسائل کے متعلق لکھی گئی ہے۔ مثلاً سماع میں ہو ہا کرنے کے متعلق خسرو لکھتے ہیں :۔

" پھر اس کا ذکر ہوا کہ بعض درویش سماع کی محفل میں چیخنے لگتے ہیں اور نامناسب آوازیں نکالتے ہیں۔ اس پر خواجہ نظام الدین فرمانے لگے کہ وہ بہت بُرا کرتے ہیں اس لئے کہ اہل سماع نے کبھی ایسا نہیں کیا اور یہ کاملوں کا طریقہ نہیں ہے۔ اس قسم کے طرز عمل کی انہی لوگوں سے توقع ہو سکتی ہے جو گمراہ اور مذہب طریقت سے ناآشنا ہیں۔ اسلئے کہ حسن بصری کا قول ہے کہ اگر کوئی سماع کے وقت چیخنے لگے تو سمجھو کہ وہ شیطان ہے اور شیطان کا پیرو ہے۔ جس شخص کو کامل روحانیت

حاصل ہے وہ (سماع کے وقت) عالم ملکوت میں پہونچ جاتا ہے۔ اسے حرکت کرتے یا رقص کی ممانعت نہیں ہے کیونکہ اس وقت وہ بحر معرفت میں غوطہ زن ہوتا ہے اور اٹھارہ ہزار عالموں کے وجود سے بے خبر ہوتا ہے۔ جس طرح سونا کٹھالی میں پگھلتا ہے وہی حال اہل سماع کا عالم حیرانگی میں ہوتا ہے :۔

ایک اور مرتبہ سماع میں مزامیر کے استعمال کا ذکر ہوا۔ اسے خسرو نے یوں لکھا ہے :۔

"جمعرات ہفتم شوال کو مجھے شیخ کی پابوسی کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت جو لوگ جمع تھے وہ سماع کا ذکر کر رہے تھے۔ اور ان لوگوں کا بھی جو اس کے دلدادہ ہیں، عین اسی وقت ایک شخص آیا اور اس نے بیان کیا کہ ایک مقام پر شیخ کے کچھ مرید جمع تھے اور ان کے پاس مزامیر (آلات موسیقی) بھی تھے۔ اس پر خواجہ فرمانے لگے کہ میں نے اکثر اس قسم کے آلات اور دیگر خلاف شرع باتوں کو منع کیا ہے۔ انھوں نے جو کچھ کیا۔ اچھا نہیں کیا، آپ نے اس بات کی بہت تاکید فرمائی، بلکہ یہاں تک کہا کہ ایک ہاتھ کی ہتیلی دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر نہ مارنا چاہیئے اور نہ ایک ہاتھ کی پشت دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر، جس سے آپ کا یہ مطلب تھا کہ دستک (تالی) بالکل ممنوع ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ مزامیر کا استعمال نہ کرنا بہتر ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ سب بڑے بڑے مشائخ سماع سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔ اور جو لوگ اس کی اصل قدر و قیمت جانتے ہیں۔ اور ذوق اور جذبہ رکھتے ہیں وہ کسی قوال سے ایک بیت سن کر ہی ممتاز ہو جاتے ہیں۔ خواہ کوئی ساز ہو یا نہ ہو۔ برخلاف اس کے اگر کسی میں ذوق سلیم کی کمی ہے تو اسے اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا کہ اسکے سامنے کئی قوال مختلف سازوں کے ساتھ گائیں۔"

ان دونوں عبارتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دستک اور مزامیر کے استعمال کو حضرت نظام الدین ؒ معیوب اور ناشائستہ سمجھتے تھے اور اسی طرح وجد میں چیخنے چلانے کو، لیکن رقص یا ہاتھ پاؤں ہلانا اُن کے نزدیک معیوب نہ تھا۔ غالباً اُن کے زمانہ میں مشائخ کا یہی مسلک تھا۔ لیکن بعد میں مزامیر اور دستک قوالی کا ایک ایسا اہم جزو بن گئے کہ ان کے بغیر مجلس سماع میں کوئی لطف باقی نہیں رہا۔

افضل الفوائد دہلی میں ۱۳۰۲ھ میں چھپ چکی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی:-

امیر خسرو[له]

بزرگ و درویش کی حیثیت سے

خالق باری کا نام بھی آج کے لڑکوں نے نہ سنا ہوگا۔ کل کے بوڑھوں کے دل سے کوئی پوچھے! کتاب کی کتاب ازبر تھی۔ زیادہ نہیں، پشت ہی دو پشت اُدھر کی بات ہے۔ کہ کتاب تھی مکتبوں میں چلی ہوئی۔ گھروں میں پھیلی ہوئی، زبانوں پر چڑھی ہوئی۔ گویا اپنے زمانۂ تصنیف سے صدیوں تک مقبول و زندہ، مشہور و تابندہ! —— دست قدرت نے جس کی زبان میں یہ موہنی رکھدی تھی۔ جس کے کلام کو یہ حسنِ قبول کی دولت دے دی تھی۔ اُسی کا نام تھا امیر خسرو۔ امیروں میں امیر، فقیروں میں فقیر، عارفوں کے سردار، شاعروں کا تاجدار۔ شعر و ادب کے دیوان، اُس کی عظمت کے گواہ۔ خانقاہیں اور سجّادے اُسکے مرتبے سے آگاہ۔ سیرِ مشاعرہ آجائیے تو میرِ محفل اُسے پائیے۔ خاندانِ چشت اہلِ بہشت کے کوچہ میں آ نکلئے تو حلقۂ ذکر و فکر میں سیرِ مسندِ جلوہ اُس کا دیکھیے۔ اچھے اچھے شیخ دم اُس کا بھر رہے ہیں۔ معرفت و طریقت کے خرقہ پوش کلمہ اُس کے نام کا پڑھ رہے ہیں۔

والدین نے نام ابو الحسن رکھا۔ شہرتِ عام کے نقیبوں نے امیر خسرو کہہ کر پکارا۔ سال ولادت ہجری کا چھ سو اکیاون اور عیسوی کا بارہ سو ترپن۔ ترکستان کے علاقۂ بلخ میں کوئی بستی ہزارہ کہلاتی ہے۔ یہ گوہر اُسی کان سے نکلا۔ ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے نام سے موسوم تھا۔ یہ جوہر اُسی خاندان سے چمکا۔ والد بزرگوار کا نام تھا امیر شمس الدین محمود شمسی۔ چنگیز خاں کے زمانہ میں ترک وطن کر، ہندوستان پہونچے۔ یہاں ایک مقام پٹیالی عرف مومن آباد تھا، وہاں آ بسے۔ پرانے تذکرہ نویسوں نے دھندلی سی نشان دہی کی ہے کہ شہر کہیں نواح سنبھل یا مضافات دہلی میں تھا۔ نئے جغرافیہ نے نقشہ پر انگلی رکھ کر دکھا دیا کہ ضلع ایٹہ میں ایک قصبہ ہے۔ شادی یہیں ہوئی، بستی کے

له لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن - ۱۸ نومبر ۱۹۳۶ء کی شام کو۔
وقت ۱۰ منٹ

[illegible] منش رئیس اور ضلع کے منصب دار نواب عماد الملک کی صاحبزادی کے ساتھ۔ یہیں امیر کی پیدائش بھی ہوئی۔

تاریخ خوش اعتقادی کی زبان سے روایت یہ بیان کرتی ہے کہ پڑوس میں کوئی مجذوب رہتے تھے، صاحب کشف۔ لوگ خرقہ میں لپیٹ کر بچہ کو اُن کی خدمت میں لائے۔ دیکھتے ہی بولے، یہ کس کو لے کر آئے، یہ تو خاقانی سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر رہے گا ــــ مجذوب صاحب کی نگاہ کشفی شاعری کی حد تک ہی۔ بچہ نے بڑے ہو کر فقر و درویشی میں وہ مقام حاصل کیا کہ شاعری منہ دیکھتی رہ گئی۔

تعلق عمر بھر کہنا چاہیے کہ سرکار و دربار سے رہا۔ کبھی براہ راست شاہی دربار سے کبھی اُمرائے نامدار سے۔ اور سرکاریں بھی ایک دو نہیں، خلجی اور تغلق ملا کر سات سات بادشاہوں کی دیکھ ڈالیں۔ پھر شخصی سلطنتوں کی نیرنگیاں۔ انقلابات کے طوفان قیامت خیز۔ دیس میں بھی رہے، پردیس بھی گئے۔ بنگال بھی گھومے، اودھ کی بھی سیر کی۔ لیکن دل جہاں اٹکا تھا، وہیں اٹکا رہا۔ نظر جس رُخ پر ایک بار پڑی تھی، اُسی پر جمی رہی۔ ابھی آٹھ ہی برس کے تھے کہ عقیدتمند باپ نے لا کر سلطان الاولیا، خواجہ نظام الدینؒ کے قدموں پر ڈال دیا۔ سن رشد کو پہونچے تو بیعت کی تجدید کی۔ بیعت رسمی نہ تھی۔ ایک نسبت عشقی تھی کہ دونوں طرف سے قائم ہو گئی تھی۔ خواجہ کا مرتبہ دیارِ محبت و معرفت میں اُسی سے ظاہر ہے کہ اولیا اکرام نے مقبولین انام نے بقائے دوام کے دربار میں محبوب الٰہی کہہ کر پکارا۔ امیر کو دولت ملی محبت کی تھی سارا ساز و سامان کھڑے کھڑے لٹا دیا ــــ جو نقد دل نثار کر چکا ہو، اُسے زر و مال لٹا دیتے دیر ہی کیا لگ سکتی ہے۔

کہتے ہیں کہ آج سے پہلے، بہت پہلے، کوئی چھ سات سو برس پہلے، باہر سے آئے ہوئے ایک امیر کبیر مسافر، دلی کی سرا میں آکر اُترے۔ کنیز، خدام، زر و جواہر، بیش قیمت مال و اسباب سب ہی کچھ ساتھ۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں ایک دوسرا مسافر، مفلس و مفلوک الحال، دہلی سے واپس ہوتے ہوئے۔ اسی سرا میں ٹھہرا۔ رئیس کو بوئے اُنس محسوس ہوئی۔ بڑھ کر پوچھا، کدھر سے آنا ہوا؟ جواب ملا دہلی سے۔ پوچھنے والے کا اشتیاق دہلی کا نام سن کر تیز ہوا۔ پوچھا اُس شہر میں ایک درویش خواجہ نظام الدین ہیں۔ وہاں بھی حاضری کا اتفاق ہوا تھا۔ مفلس بولا، "اتفاق کیسا، اُنھیں کے پاس تو گیا تھا۔ حاجت مند ہوں چاہتا تھا کہ کچھ مل جائے۔ میری قسمت کہ وہاں کچھ موجود ہی نہ تھا۔ پیر کی پہنی ہوئی جوتیاں پڑی تھیں، وہی میرے حوالے کر دیں، اُنھیں کو لئے چلا آ رہا ہوں"۔ سننے والا اب شوق و اشتیاق سے بیخود تھا، بولا "خدا کے لئے وہ جوتیاں میرے حوالے کر دو، اور یہ میرا ساز و سامان سب تمھاری نذر ہے"۔ سائل دنگ و حیران کہ جوتیوں کے عوض یہ لاکھوں کی دولت؟ رئیس صاحب کہیں مجھ بے نوا سے دل لگی تو نہیں کر رہے ہیں۔ ادھر رئیس صاحب اپنے ہوش میں تھے کب۔ اور ہنسی دل لگی کی سکت ہی اُن میں کہاں تھی؟ راوی کہتے ہیں کہ یہ سودا چار یا پانچ لاکھ میں پڑا، اور رئیس صاحب نے وہ پیر کی اُتری جوتیاں آنکھوں سے لگا، سر پر رکھ، پگڑی کے اندر لپیٹ لیں۔ اور ایک وجد کے عالم میں دہلی چل کھڑے ہوئے! ــــ جوتیاں جس محبوب کی تھیں، وہ تو وہی ہیں جنھیں زبانِ خلق محبوب الٰہیؒ کے نام سے پکارتی ہے، اور امیر وہی امیر خسروؒ تھے جن کا

یہ فارسی شعر اُس وقت تک سے ابتک خدا معلوم کتنے دلوں کی، حال و قال کی محفلوں کو گرما چکا ہے ؎

متاعِ وصلِ جاناں بس گران ست
گر این سودا بجاں بودے چہ بودے

یہ رقم تو خیر لاکھوں ہی کی تھی، کہنے والا تو یہ کہہ رہا ہے کہ محبوب تک رسائی اگر نقدِ جاں کے معاوضہ میں ہو جائے تو بھی یہ سودا نہایت ارزاں ہے!۔

آگے چلیے! دنیائی عمر چند سال اور کھسکی خلجی و تغلق کی بہار رخصت ہوئی دہلی کے تخت پر اب آل تیمور کا اقبال چمک رہا ہے۔ سخن سنج و سخن گستر بادشاہ کے حضور میں محفلِ سماع گرم ہے۔ جب مطرب اس شعر پر پہونچا۔

تو شبانہ می نمائی، بہ مہرکہ بودی امشب
کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد

بادشاہ کا ذہن قدرتاً شعر کے ظاہری مفہوم کی طرف گیا، اور قریب تھا کہ شاعر کی بیحیائی کا خمیازہ قوال غریب کو عتابِ سلطانی کی شکل میں اُٹھانا پڑے کہ ایک مزاج دان و ادب شناس ندیم نے جھٹ ہاتھ باندھ عرض کی کہ "پیر و مرشد! غزل خسروؒ کی ہے، تصویر کھینچ رہے ہیں، اپنے تہجد گزار، شب بیدار، محبوب، محبوب الٰہی کی، کہ ساری رات کن کن اذکار، کن کن اشغال میں گزاری، کون کون سے احوال و مقامات طے کیے، کہ جاگنے کا اثر اس وقت تک دن میں باقی ہے!" معاً عتاب لطف میں، اور ناگواری واہ میں تبدیل ہوگئی۔

وقت کی محدود گنجائش کے باعث صرف ایک شعر نمونہ کے طور پر پیش کر دیا گیا، ورنہ غزلوں کی غزلیں انہیں دیوان کے دیوان لبریز ہیں۔ انھیں مواجید و احوال کی تلمیح سے، رموز و اسرار عارفین کی توضیح سے۔ ہندی کے دوہے اور ٹھمریاں، ایک دو کی تعداد میں نہیں پچاسوں اور سیکڑوں، سب میں یہی نقشہ جما ہوا، یہی رنگ بھرا ہوا۔ یہی رنگ بھرا ہوا، حد یہ ہے کہ مرشد خود فرمایا کرتے تھے کہ خدا قیامت میں پوچھے گا، کیا لائے ہو؟ جواب میں عرض کروں گا کہ خسروؒ کو۔ گریہ و مناجات میں ہوتے تو عرض کرتے کہ الٰہی میری مغفرت اسی ترک کے سوزِ دل کے طفیل کر دے! —— بڑوں کا اور مرشد کا وسیلہ پکڑتے ہوئے سب نے دیکھا ہے، چھوٹوں کے اور مریدوں کے وسیلہ بننے کی مثال حضرت امیر خسروؒ کے نصیب میں آئی۔

سوزِ دل اور ذوقِ عبادت کا عالم یہ تھا کہ پچھلی رات نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو سات سات پارے قرآن مجید کے پڑھ جاتے۔ جب تک دل ایسا ہی درد و خشیت سے چور چور نہ ہو۔ اتنا بڑا مجاہدہ کس کے بس کی بات ہے؟ اودھ میں ایک بڑے رئیس کے دربار میں تھے، ماں نے دلّی میں یاد کیا۔ معقول مشاہرہ پر لات مار ماں کے پاس پہونچے۔ ماں کی وفات پر پُر درد مرثیہ لکھا۔ بقول مولانا شبلی۔ اڑتالیس سال کی عمر میں ماں کی یاد میں اسطرح آنسو بہاتے ہیں کہ گویا کوئی کمسن بچہ بلک بلک کر رو رہا ہے۔ یہ سب پرتو ہے اسی سوز و گداز کا، جس کا واسطہ دلا دلا کر خود مرشد علیہ الرحمہ اپنی نجات کے طالب رہتے تھے۔!

۷۲۵ھ کا ماہ ربیع الثانی تھا کہ حضرت محبوب الٰہی

(باقی مضمون صفحہ ۳۳ پر دیکھیے)

ضیا احمد بدایونی :-

امیر خسرو

تیرھویں صدی عیسوی کا زمانہ ایشیائی ملکوں کے لئے نہایت پُر آشوب زمانہ تھا۔ تاتار سے ایک دلیر حوصلہ مند شخص چنگیز خاں اٹھا اور دیکھتے دیکھتے آندھی کی طرح ایک بڑے رقبہ پر چھا گیا۔ اُس کے گروہ کے لوگ خونخوار۔ وحشی۔ مضبوط اور اپنے لیڈر کے مطیع تھے۔ یہ لوگ کسی خاص مذہب کے پیرو نہ تھے۔ شکلیں بھیانک عادتیں وحشیانہ۔ رحم سے نا آشنا اور درگزر سے بیگانہ۔ خود دربار[1] کے مورخوں کا اعتراف ہے کہ تاتاری (یعنی منگول) جدھر رخ کرتے تھے، قتل، غارت۔ آگ اور تباہی ان کی جلو میں چلتی تھی۔ جس علاقہ پر قبضہ کرتے تھے اس میں بوڑھے ناکارہ آدمیوں یا کتے بلیوں کے سوا کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا۔ خدا کی مہربانی تھی کہ سلاطین دہلی کی بیدار مغزی کی بدولت ان کو ہندوستان کے تاخت و تاراج کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یوں تو ان کی زبردست فوجیں بارہا ہند کی سرحد سے ٹکرائیں۔ ملتان اور لاہور پر حملہ آور ہوئیں بلکہ ایک مرتبہ تو دہلی پر بھی چڑھائی کر دی لیکن ہر بار انھوں نے شکست فاش کھائی۔ اور کثیر مال غنیمت چھوڑ کر بھاگے۔ اکثر تاتاری میدانِ جنگ میں لقمۂ اجل ہوئے۔ بہت سے قید ہو کر آئے۔ اور ان کے سر کاٹ کر مینار بنا دیے گئے۔

ان حملوں کے اثر سے ایشیا کے اکثر اسلامی ممالک زیر وزبر ہو گئے۔ اور ان کی تہذیب و تمدن۔ علوم و فنون خاک میں مل گئے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہانِ دہلی کے درباروں میں بیس سے زیادہ تاجدار اپنے ملکوں سے بھاگ کر پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔

خاندان اور پیدائش :- یہی زمانہ[1] امیر سیف الدین محمود (خسرو کے والد) کے ورودِ ہند کا ہے۔ اور انھیں اسباب کے تحت وہ اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان آئے اور پٹیالی میں اقامت اختیار کی۔ وہ نسلاً ترک لاچین تھے اور ترکستان کے شہر کش میں

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ جہاں کشا از جوینی

[1] امیر خسرو از ڈاکٹر وحید مرزا

اپنے قبیلے کے سردار کی حیثیت سے رہتے تھے۔ یہ سلطان شمس الدین التتمش کا عہد حکومت تھا جو ایک دیندار لائق، عادل اور مردم شناس بادشاہ تھے۔ امیر سیف الدین نہایت دلیر اور جنگجو سردار تھے اور جلد سلطان کے دست راست بن گئے۔ انھوں نے کئی معرکوں میں داد شجاعت دی اور اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔ اسی زمانے میں دہلی میں ایک فیاض اور بارسوخ امیر عماد الملک نامی تھے جو اپنی اولوالعزمی، فیاضی اور تدبر کے باعث بادشاہوں کے مقرب، فوج میں ہر دلعزیز اور عوام میں محبوب تھے۔ اور تمام دہلی میں ان کا ڈنکا بجتا تھا۔ سیف الدین کا عقد انھیں عماد الدین کی بیٹی سے ہوا جن کے بطن سے ہمارے ہیرو (ابوالحسن خسرو) پیدا ہوئے۔ خسرو کے ایک بڑے بھائی اعز الدین علی شاہ اور چھوٹے بھائی حسام الدین کا ذکر بھی تاریخوں میں ملتا ہے۔ مگر ان کو کوئی خاص شہرت میسر نہیں ہوئی۔ خسرو کا مولد پٹیالی اور سال پیدائش ۱۲۵۳ء ہے۔

خدا کی شان دیکھئے ایٹہ یو۔پی کا ایک معمولی چھوٹا سا شہر ہے جس میں چند روز ہوئے ریلوے لائن تک نہیں تھی۔ لیکن اس کے ایک قصبے پٹیالی کو خسرو کے مولد اور دوسرے قصبے سوروں کو تلسی داس کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے۔

اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا ہوگا کہ خسرو کی ددھیال اور ننھیال دونوں آسودہ حال اور باوقار تھیں مگر ابھی انھوں نے باپ کے سایۂ عاطفت میں سات سال ہی بسر کئے تھے کہ امیر سیف الدین کسی جنگ میں کام آ گئے۔ جس کے متعلق خسرو[1] نے کہا ہے:۔

سیف[2] از سرم گذشت و دل من دو نیم ماند
دریائے من رواں شد و دُرِّ یتیم ماند

امیر سیف الدین مرد سپاہی تھے مگر بیٹے کی تعلیم پر انھوں نے پوری توجہ کی۔

باپ[3] کے مرنے کے بعد ان کی تربیت کی ذمہ داری تمام تر ان کے نانا عماد الملک پر عائد ہوئی۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص جس کے دریائے فیض سے تمام خاص و عام سیراب ہوتے تھے وہ اپنے عزیز نواسے کے لئے کیا کچھ نہ کرتا ہوگا۔ اور اس کی دلجوئی اور دلداری میں کیا دقیقہ اٹھا رکھتا ہوگا۔ خسرو کو اپنی ماں سے بے حد محبت تھی۔ جب کافی عمر ہوگئی تو بھی ماں کی جدائی میں بچوں کی طرح روتے تھے۔

تعلیم:۔ خسرو قدرت کی طرف سے غیر معمولی ذہن اور حافظہ لے کر آئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کتابی علوم کی بجائے زیادہ تر صحیفۂ فطرت سے سبق لیا تھا تاہم ان کے ابتدائی[4] اساتذہ میں ہمیں ایک بزرگ سعد الدین (یا اسد الدین) خطاط کا نام ملتا ہے جن[5] سے وہ شائد خوش خطی سیکھتے تھے۔ مگر ان کے حالات زیادہ دستیاب نہیں ہوتے۔ ایک استاد کا ذکر خود خسرو نے کیا ہے۔ یعنی شہاب الدین مہمرہ بدایونی۔ ان کے بارہ میں

---

[1] اتنی چھوٹی عمر میں ایسا عمدہ شعر کہنا جبکہ اس وقت تک خسرو شاعری میں کسی کے شاگرد بھی نہیں ہوئے تھے ان کی بے نظیر طبّاعی کا ثبوت ہے۔ [2] سیف (تلوار) میرے سر سے گزر گئی اور میرا دل دو ٹکڑے ہوگیا۔ میرا دریا (باپ) تو چل دیا اور دُرِّ یتیم (خسرو) رہ گیا۔ [3] امیر خسرو از وحید مرزا
[4] شعر العجم حصہ دوم

پہنچا سکیں گے۔ اس قدر مسلّم ہے کہ وہ مذہب۔ تاریخ۔ فقہ۔ ہیئت پر کافی عبور رکھتے تھے۔

شاعری:۔ امیر کو بہت تھوڑی عمر سے شاعری کا ذوق تھا۔ خود فرماتے ہیں :۔

درآں صغر سن کہ دنداں می افتاد سخن می گفتم
وگوہر از دہانم می ریخت۔

یعنی بچپن میں جب میرے دودھ کے دانت گر رہے تھے میں شعر کہتا تھا اور میرے منہ سے موتی جھڑتے تھے۔ یہی شغل ان کو مدۃ العمر رہا یہاں تک کہ دنیا نے انکی استادی کو تسلیم کر لیا۔ وہ بے شبہہ born poet تھے۔ اور ان کی ابتدائے عمر کا فارسی کلام بھی ان کی ذہانت اور طبّاعی کا گواہ ہے۔ مگر ان کی سلامت رَوی اس سے ثابت ہے کہ وہ پختہ عمر کو پہونچ کر بھی اپنے شعر کو استاد کی نظر اصلاح سے بے نیاز نہیں سمجھتے تھے۔ مثنوی ہشت بہشت خمسہ کی سب سے اخیر مثنوی ہے جو ۷۰۱ھ (۱۳۰۱ء) میں اتمام کو پہونچی۔ اس میں شاعر کا کمال فن اور اس کا استادانہ اسلوب شباب کو پہونچا ہوا ہے۔ اس کے باوجود خسرو نے اس میں اپنے استاد شعر شہاب الدین کی اصلاح کا پوری حق شناسی کے ساتھ اقرار کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ صاف کہا ہے کہ میری پانچوں مثنویاں شہاب کی نظر فیض اثر سے گذر چکی ہیں۔ یہ شہاب کون تھے۔ اپنے عہد کے ایک ممتاز عالم اور کہنہ مشق استاد جو مہرہ (خوزستان) سے ترک وطن کرکے بدایوں میں متوطن ہو گئے اور آج بھی اسی خاک میں آسودہ ہیں۔ انکے کلام کا نمونہ مُلّا عبد القادر بدایونی نے اپنی منتخب التواریخ میں دیا ہے۔

۱ شعر العجم حصہ دوم ۲ منتخب التواریخ

واقعی بدایوں کی خوش قسمتی تھی کہ خسرو جیسے genuinus کے استاد (شہاب الدین) اور پیر (حضرت نظام الدین) دونوں اسی خاک پاک سے نسبت رکھتے تھے۔ دکنی بہ مخزا ڈاکٹر وحید مرزا نے عمروں کے تفاوت کی بنا پر خسرو کے شاگرد شہاب ہونے سے انکار کیا ہے مگر ہمارے نزدیک یہ شبہہ بے بنیاد ہے۔ جب خسرو نے ۵۰ برس کی عمر میں (۱۳۰۱ء میں) یہ مثنوی ختم کی ہے تو یہ امر ہرگز بعید نہیں کہ شہاب جو اس وقت تقریباً ۹۰ برس کے ہوں گے خسرو کی مثنوی پر نظر اصلاح ڈالیں۔ اس موقع پر خسرو کے چند شعر ملاحظہ کیجئے :۔

من بدو عرضہ کردہ نامۂ خویش
او بہ اصلاح رانده خامۂ خویش
شمع من یافتہ ضیا از وے
مسِ من گشتہ کیمیا از وے
یارب او چوں بہ پنج نامۂ من
بردبیروں خطائے خامۂ من
نامۂ او کہ حرز جانش باد
در قیامت خط امانش باد

یعنی میں نے شہاب کو اپنی مثنوی دکھائی اور انھوں نے اصلاح فرمائی۔ میری شمع میں جو روشنی ہے وہ انھیں کے فیض سے اور میرے تانبہ میں جو کیمیا کی خاصیت پیدا ہو گئی ہے وہ انھیں کی بدولت۔ الٰہی جس طرح انھوں نے میری خمسے (۵ مثنویاں) کی غلطیاں دور کیں ان کا نامۂ اعمال قیامت میں ان کے لئے پروانۂ آزادی ہو جائے۔ ان

۳ دیباچہ غرۃ الکمال ۴ مثنوی ہشت بہشت [illegible]
۵ شعر العجم حصہ دوم۔ ماخوذ از دیباچہ غرۃ الکمال

حالات میں ڈاکٹر موصوف کا یہ کہنا کہ یہ اصلاح لینا محض حصولِ برکت کے مقصد سے ہوگا دعوائے بے دلیل سے زیادہ نہیں۔ یہاں بے محل نہ ہوگا اگر شاعری، خصوصاً اپنی شاعری کی نسبت جو نقطۂ نظر خود خسرو نے اپنی تصانیف میں پیش کیا ہے ہم حسبِ ضرورت نقل کردیں۔ وہ لکھتے ہیں[1]۔

شاعر کی تین قسمیں ہیں۔ استادِ تام جو کسی طرزِ خاص کا موجد ہو۔ استادِ نیم تام جو خود کسی طرزِ خاص کا موجد نہیں۔ لیکن کسی خاص طرز کا پیرو ہے اور اُس میں کمال بہم پہونچایا ہے۔ سارق جو اوروں کے مضامین چراتا ہے۔ ... استادی کی چار شرطیں ہیں۔ طرزِ خاص کا موجد ہو۔ اُس کا کلام شعرا کے انداز پر ہو۔ صوفیوں اور واعظوں کے طریقے پر نہ ہو۔ غلطیاں اور لغزشیں نہ کرتا ہو ...... میں درحقیقت استاد نہیں اس لئے کہ چار شرطوں میں سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی میں سرقہ (چوری) نہیں کرتا اور میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر نہیں۔ لیکن دو شرطیں مجھ میں موجود نہیں۔ اول تو میں کسی طرزِ خاص کا موجد نہیں۔ دوسرے میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ وہ غزل میں سعدی کے، مثنوی میں نظامی کے سوا عظ و حِکَم (اخلاقی مضامین) میں سنائی و خاقانی کے اور قصائد میں رضی الدین نیشاپوری و کمال اسمٰعیل کے پیرو ہیں۔

اس جگہ ہم اگر اپنی ناچیز رائے شامل کردیں تو شاید گستاخی میں داخل نہ ہو۔ امیر کا فارسی کلام بہت سے قصائد، دس مثنویوں اور غزلیات کی بڑی تعداد پر مشتمل ہے۔ اُنھوں نے خود قصائد اور مثنویات کو بہت اہمیت دی ہے۔ ہمارے نزدیک ان کے قصائد استادانہ ضرور ہیں مگر بلند پایہ نہیں ہیں۔ شاید شیخ سے بیعت ہونے کے بعد وہ قصیدہ گوئی کو (مذہبی اور اخلاقی قصائد کو چھوڑ کر) دل سے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

رہیں ان کی دس مثنویاں جن میں پانچ تاریخی[1] حیثیت رکھتی ہیں اور پانچ خمسۂ نظامی کے جواب میں ہیں اور علاء الدین خلجی کو dedicate کی گئی ہیں ان کا شمار ہندوستان اور ایران کے اعلیٰ شعری لٹریچر میں ہے۔ تاریخی مثنویاں شاعرانہ حسن کے علاوہ صحت جزئیات کے اعتبار سے بھی لاجواب ہیں۔ اور ان سے اُس عہد کی جو معلومات حاصل ہوتی ہے وہ دوسری کتابوں میں نہیں ملتی۔

نظامی کے خمسہ (پنج گنج) کے جواب میں جو خمسۂ خسرو ہے اُس کی نسبت مولانا جامی نے بجا طور پر کہا ہے کہ وہ نظامی کی سب سے کامیاب تقلید (پیروی) ہے۔ خود خسرو نے کسی طرزِ خاص کے موجد ہونے کا دعویٰ ہی کب کیا تھا۔ البتہ یہ کیا کم ہے کہ ایران اور ہندوستان میں جن اساتذہ نے خمسۂ نظامی کا جواب لکھا اُن میں خسرو سب سے بازی لے گئے ہیں۔

اب غزلیات کی کیفیت سنئے۔ جو صاحبِ ذوق ان کی غزلوں کو پڑھے گا وہ یقیناً اس نتیجے پر پہونچے گا کہ وہ غزل میں سعدی کے قریب پہونچ گئے ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو کہیں کہیں سعدی کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ خسرو خود معترف تھے کہ میری شراب میں خم خانۂ سعدی کی مستی ہے۔ ملبن[2] کے

---

[1] شعر العجم۔ حصہ دوم۔ ماخوذ از دیباچہ غرۃ الکمال

[1] ہشت بہشت۔ [2] شعر العجم حصہ دوم

لائق فرزند سلطان محمد شہید نے کئی بار زادِ راہ کے ساتھ شیخ سعدیؔ کی خدمت میں دعوت نامہ بھیجا مگر انھوں نے پیرانہ سالی کا عذر کرتے ہوئے یہ جواب دیا کہ "وہاں خسروؔ جوہر قابل ہے۔ اس کی تربیت کیجائے"۔

عجیب ہوتا ہے کہ جس طرح مرزا غالبؔ اپنے اردو کلام کو اپنے لئے "ننگ" سمجھتے تھے حالانکہ وہی کلام ان کے تاجِ شہرت کا سب سے آبدار موتی ہے۔ اسی طرح خسروؔ بھی اپنی غزل کو چنداں اہمیت نہ دیتے تھے۔ لیکن آج طویل مثنویاں اور خوشامد آمیز قصائد کون پڑھتا ہے۔ ہاں غزلیات بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ نہ صرف قوالی کی محفلوں میں بلکہ اہل ذوق کی صحبتوں میں لوگ ان کو سنتے اور سر دُھنتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نشانہ صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ تیر انداز ذرا فاصلہ پر ہو۔ ورنہ خسروؔ ایسی رائے کیوں دیتے۔ گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش۔ (یعنی کبھی کبھی غیبی آواز سے بھی دھوکا ہو جاتا ہے)

بقول مولانا شبلیؔ خسروؒ کی غزلیات سوز و گداز۔ معاملاتِ عشق کے بیان۔ اسلوب کی جدت۔ عجز و نیاز۔ زبان کی نرمی اور شیرینی۔ خیالات کی سادگی۔ بحروں کے ترنم کی وجہ سے اس قدر دلپسند اور مقبول ہیں۔ چند مثالوں سے شائد کچھ اندازہ ہو سکے ؂

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ ای
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

تونے کہا ہے کہ میری قیمت دونوں جہان ہیں یعنی اگر کوئی مجھے چاہے تو دونوں جہان سے ہاتھ اٹھائے مگر میں سمجھتا ہوں کہ تو اب بھی سستا ہے۔ اپنا نرخ اور زیادہ کرے۔

مائیم و تحیر و خموشی — و آفاق ہمہ بہ گفت گو ئیت

دنیا تیرے چرچے سے گونج رہی ہے ایک ہم ہیں جن کو حیرت کی وجہ سے چپ۔ لگ گئی ہے۔

خسرو بہ کمند تو اسیر است
بیچارہ کجا رود ز کویت

خسروؔ تیری محبت کی کمند میں قید ہے۔ آخر بیچارہ تیری گلی چھوڑ کر کہاں جائے۔

امروز صبا از جگرم بوئے گرفتست
زنہار کہ آں سوش وزیدن نگذارند

آج صبا میں میرے جلے ہوئے جگر کی بو بسی ہوئی ہے۔ خبردار۔ اس کو محبوب کی گلی کی طرف جانے نہ دینا۔

یک خرقہ غمت درست نگذاشت
در صومعۂ کبود پوشاں

تیرے غمِ عشق نے صوفیوں کی خانقاہ میں کسی کی گدڑی (پارسائی) سلامت نہ رکھی۔

از پردہ دمے چو گل بروں آ
ناز ہمہ نیکواں فروشاں

گھڑی بھر کو پھول کی طرح پردے سے باہر آ۔ اور تمام حسینوں کا غرور خاک میں ملا دے۔

خوش وقت تو کآگہی نداری
از آتش سینہ ہائے جوشاں

تیرا کلیجہ ٹھنڈا رہے۔ تجھے عاشقوں کے سینوں کی بھڑکتی ہوئی آگ کی کیا خبر۔

از تو سخنے بہ ہر ولایت
خسرو بہ ولایت خموشاں

خسروؔ شہرِ خموشاں میں جا سویا۔ مگر تیرے حسن کی ہی

چرچے ہر شہر و ولایت میں رہیں گے۔ کہتے ہیں[۱] کہ ایک مرتبہ جہانگیر کے دربار میں قوال نے خسرو کا یہ شعر پڑھا۔

تو شبانہ می نمائی بہ بر کہ بودہ ای شب
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

یعنی تیرا منہ باسی سا معلوم ہوتا ہے۔ نہ جانے رات تو کس کے آغوش میں رہا کہ ابھی تک تیری مست آنکھوں میں خمار کا اثر باقی ہے۔

شعر کا سننا تھا کہ بادشاہ کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا۔ گانے والوں کو فوراً نکال دیا اور حکم دیا کہ گانا موقوف۔ جلسہ برخاست۔ کس کی مجال تھی کہ بادشاہ سے خفگی کا سبب پوچھتا۔ آخر ایک مقرب امیر نے دریافت کیا پیر و مرشد۔ مزاج عالی کیوں برہم ہے۔ جواب دیا۔ کون غیرت مند اپنی محبوبہ سے یہ کہہ سکتا ہے کہ تو شبانہ می نمائی الخ اس امیر نے عرض کی سرکار یہ خسرو کا شعر ہے۔ اور خسرو ہندی الاصل تھے۔ ہندوستان میں عورت مرد سے خطاب کرتی اور کہتی ہے کہ "تمھاری آنکھوں کا خمار صاف بتا رہا ہے کہ تم نے رات سوکن کے آغوش میں گذاری ہے" یہ سن کر جہانگیر کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

رخ جملہ را نمود و مرا گفت تو مبیں
زیں ذوق مست و بے خبرم کیں سخن چہ بود

یعنی اس نے سب کو اپنا روئے زیبا دکھایا مگر مجھ سے کہہ دیا کہ تو نہ دیکھ۔ میں اس ذوق سے مست ہو گیا کہ آخر اس بات میں کیا بھید تھا۔ بات یہ ہے کہ خسرو کا دل چوٹ کھایا ہوا تھا۔ ان کے دل کی آگ کا خود ان کے پیر کو بھی علم تھا۔ چنانچہ وہ اکثر دعا کرتے تھے۔ الٰہی مرا بسوز سینۂ این ترک بہ بخش۔ خداوندا مجھے اِس ترک کے سینے کی گرمی کے طفیل میں بخش دے۔

ممکن ہے کہ خسرو کو کبھی عشق مجازی سے بھی سروکار رہا ہو۔ لیکن ان کے کلام کا بڑا حصہ ایسا ہے جس میں شیخ کی محبت۔ یا معشوق حقیقی کے عشق کی بجلیاں چمکتی ہیں ان کی غزل سے جس طرح ایک دنیادار محظوظ ہوتا ہے ایک صوفی بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہ بھی ان کی مقبولیت کا بڑا راز ہے۔ اس کے علاوہ خسرو موسیقی کے ماہر بلکہ بعض راگوں کے موجد تھے۔ اس لئے ان کی بحریں بڑی مترنم اور دلآویز ہیں۔ چھوٹی بحروں میں وہ جو کچھ لکھ گئے ہیں نشتر سے کم نہیں۔

فارسی اور اردو غزلوں پر بعض لوگ بے ربطی کا الزام لگاتے ہیں لیکن بقول شبلی انھوں نے متعدد مسلسل غزلیں لکھ کر اس الزام کو دور کر دیا۔

امیر خسرو ہندی شاعری سے بخوبی واقف تھے اور ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ممکن ہے کہ ان کی غزل کی لگاوٹ اور دلکشی میں ہندی کا بھی اثر ہو۔

بیعت :۔ اوپر آپ نے پڑھا کہ خسرو کی شاعری میں جذبات کی گرمی اور سوز جو محسوس ہوتا ہے وہ اس آتش عشق کا نتیجہ ہے جو ان کو اپنے شیخ (پیر) کی بدولت نصیب ہوئی۔ یوں تو حصول برکت کی نیت سے ان کے والد نے ان کو اس وقت حضرت نظام الدینؒ کے قدموں میں ڈال دیا تھا جب وہ (خسرو) صرف سات یا آٹھ سال کے تھے۔ لیکن ۶۷۱ھ (۱۲۷۲ء) میں بیس سال کی عمر میں انھوں نے تجدید بیعت کی۔ رفتہ رفتہ خسرو کی ارادت

---

[۱] شعر العجم حصہ دوم

حضرت سے اور حضرت کی شفقت خسرو پر ضرب المثل ہو گئی

یہ حضرت نظام الدین کون بزرگ تھے۔ آپ[1] کے دادا خواجہ علی اور نانا خواجہ عرب اپنے وطن بخارا سے ہجرت کر کے دہلی آئے اور وہاں چند روز ٹھہر کر بدایوں (یو۔ پی) میں سکونت اختیار کی۔ یہ غالباً شمس الدین التمش کا عہد سلطنت تھا۔ بعد کو خواجہ علی کے فرزند حضرت سید احمد کا نکاح خواجہ عرب کی صاحبزادی بی بی زلیخا سے ہوا جس سے حضرت نظام الدین کی ولادت بدایوں میں واقع ہوئی۔ آپ کی ولادت کا سال ۶۳۶ھ (۱۲۳۸ء) ہے۔ اور آپ ساداتِ عظام کے خاندان سے ہیں۔ والد (حضرت سید احمد) اپنے زمانے کے ایک کامل و شاغل بزرگ تھے۔ اور والدہ بھی بڑی صالحہ اور عابدہ تھیں۔ اس لئے تعجب نہیں کہ حضرت نظام الدین شروع سے نہایت دیندار اور پرہیزگار رہے۔ ابھی کم عمر ہی تھے کہ باپ نے انتقال فرمایا۔ جن کا مزار آج بھی بدایوں میں مرجع خاص و عام ہے۔ اب ماں کی زندگی بڑی ناداری میں بسر ہو رہی تھی۔ تاہم انھوں نے بیٹے کی تعلیم و تربیت میں حد سے زیادہ کوشش اور توجہ کی۔ چنانچہ[2] آپ بدایوں کے بڑے عالم سید علاء الدین اصولی سے اونچی کتابیں پڑھتے رہے۔ اور دستار فضیلت کے مستحق قرار پائے لیکن ابھی علم کی پیاس باقی تھی۔ اس لئے والدہ اور ہمشیرہ کو لے کر دہلی روانہ ہوئے۔ اور وہاں کے فضلا سے فیض حاصل کیا۔ انہیں مولانا کمال الدین زاہد اور شمس الملک خوارزمی مشہور ہیں۔ اسی دوران میں اجودھن (پاک پٹن) کے حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کا نام سنا اور ان کی زیارت کا اشتیاق ہوا۔ چنانچہ وہاں جا کر بابا صاحب سے بیعت کی اور ان کی ہدایات و ارشادات سے مستفید ہوئے۔ شیخ نے حکم دیا کہ دہلی جا کر رہو۔ خلق خدا کو آرام پہنچاؤ اور لوگوں کی جفاؤں پہ صبر کرو۔ حضرت نے تعمیل کی اور آپ کی زندگی سے دہلی اور بیرونجات کی ہزارہا مخلوق کو ہر طرح کی دینی اور دنیاوی برکات حاصل ہوئیں۔ حضرت کی وفات ۷۲۵ھ (یعنی ۱۳۲۴ء) میں ہوئی اور آپ دہلی ہی میں دفن ہوئے۔ یہ مقام اب بستی نظام الدین کہلاتا ہے۔

حضرت نظام الدینؒ کی زندگی اعلیٰ اسلامی تعلیم کا سچا نمونہ تھی۔ علم۔ عمل۔ عشق الٰہی۔ خدمتِ خلق۔ صبر و ضبط۔ عفو و درگذر۔ سلاطین سے وحشت۔ غریبوں سے محبت۔ عمر بھر آپ کا شعار رہی۔ آج بھی ہزاروں بندگان خدا بغیر لحاظ مذہب و ملت آپ کے مزار پر صبح و شام آتے اور خاک آستان کو آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

خسرو حضرت سے مرید ہونے کے بعد اپنے فرائض منصبی سے فارغ ہو کر زیادہ وقت عبادت و تلاوت میں صرف کرتے تھے۔ حضرت سے انتہائے محبت کا یہ حال تھا کہ گویا "آپ کا جمال دیکھ کر جیتے تھے۔" بیعت ہوتے ہی اپنا تمام مال و اسباب راہِ خدا میں لٹا دیا۔ حضرت بھی کمال شفقت فرماتے اور خسرو کو تُرک اللہ (خدا کا تُرک) کہہ کر بلاتے۔ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ الٰہی اس ترک کے سینے میں جو سوز ہے اُس کے طفیل میں مجھ کو بخش دے۔

درباری تعلقات :

دولت مند اور چاہنے والے نانا کے انتقال کے بعد

---

[1] فوائد الفواد اور دوسری کتابیں۔
[2] تذکرۃ الواصلین از مولوی رضی الدین بدایونی

خسرو کو معاش کی فکر ہوئی۔ اب ان کی عمر ۲۰ سال کی ہو چکی تھی۔ اس زمانے کے بادشاہ اور امیر (دو ایک کو چھوڑ کر) نہایت خوش مذاق۔ علم دوست اور فیاض ہوتے تھے کسی عالم۔ شاعر یا اہل حاجت کو ایک وقت میں گاؤں یا ہاتھی گھوڑے یا دس دس یا بیس بیس ہزار روپے دے ڈالنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چنانچہ خود عماد الملک۔ ملک چھجو (بلبن کا بھتیجا)۔ بغرا خاں (بلبن کا چھوٹا بیٹا)۔ سلطان محمد (بلبن کا بڑا بیٹا)۔ امیر علی۔ خان جہاں۔ اپنے وقت کے حاتم تھے عماد الملک کے علاوہ ان میں سے یکے بعد دیگرے وہ ہر ایک کے دربار میں شاعر اور مصاحب کی حیثیت سے مامور رہے اور انعام واکرام پاتے رہے۔ جب امرا کی سخاوت کا یہ حال تھا تو سلاطین کی قدردانی کا کیا پوچھنا۔ پہلا بادشاہ جس نے ان کو اپنے دربار میں طلب کیا اور مثنوی قران السعدین لکھنے کی خدمت سپرد کی۔ غلام خاندان کا آخری فرمانروا کیقباد تھا۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں:

زشاہاں[1] کسے کا دلم کرد یاد
معز الدنیا بود شہ کیقباد

اب[2] خلجیوں کا دور آیا۔ جلال الدین خلجی خود صاحب مذاق اور شاعر تھا۔ خسرو کو امیر کا خطاب۔ معقول تنخواہ اور مصحف داری۔ قرآن شریف کی حفاظت) کی خدمت۔ اسی بادشاہ کی دین ہے۔ علاؤالدین خلجی شعر و ادب سے کوئی علاقہ نہ رکھتا تھا۔ لیکن ہمارے شاعر کی قدردانی میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ خمسۂ خسرو (یعنی وہ پانچ مثنویاں جو خسرو نے نظامی کی مثنویوں کے جواب میں لکھی ہیں)،

۱؎ نہ سپہر۔ ۲؎ شعر العجم

انھوں نے علاء الدین ہی کے نام معنون dedicate کیا ہے۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ قطب الدین مبارک نہایت عیش پرست اور احمق تھا۔ مگر جب خسرو نے مثنوی نہ سپہر لکھ کر پیش کی تو ہاتھی کے برابر تول کر روپیہ دیا۔ خسرو کا اعتراف ملاحظہ ہو۔

چنیں[1] بخششے کز تو جسم یافتم
در ایام بیشینہ کم یافتم

تجھ جیسے جمشید مرتبہ سلطان نے مجھ پر جیسی بخشش کی ایسی پہلے کسی نے نہ کی تھی۔ جب عنان حکومت تغلق سلاطین کے ہاتھ میں آئی تب بھی خسرو کا اعزاز بدستور رہا۔ وہ غیاث الدین تغلق کے ہم رکاب بنگال گئے ہوئے تھے۔ بادشاہ تو دہلی روانہ ہوا۔ اور دہلی کے قریب ایک اتفاقی حادثہ کا شکار ہو گیا۔ خسرو وہیں رہ گئے تھے کہ اپنے پیر کی وفات کی غم ناک خبر سنی۔ فوراً دہلی پہونچے۔ اپنا تمام مال وزر لٹا کر ماتمی لباس پہنا اور پیر کے مزار پر جا پڑے مزار کو دیکھ کر انھوں نے یہ دوہا پڑھا اور بیہوش ہو کر گر پڑے ؎

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چو نہ دیس

آخر سات مہینے کے بعد انھوں نے بھی سفر آخرت کیا۔

جامعیت:

مولانا شبلی نے سچ کہا ہے کہ خسرو ایسے جامع کمالات تھے کہ ایسے باکمال بزرگ نہ صرف یہاں بلکہ ایران و روم میں بھی دو چار ہی پیدا ہوئے ہونگے۔ ترکی ان کی قومی زبان تھی۔ فارسی میں وہ اہل زبان کے ہمسر تھے۔ عربی ایران کو

۱؎ نہ سپہر

کا حق قدرت تھی۔ اردو کے وہ موجد سمجھے جاتے ہیں۔ درحقیقت اس میں تو شک نہیں کہ وہ اردو اہل قلم کے اولین دور سے تعلق رکھتے تھے۔ ہندوستان کی زبانوں میں وہ ہندی کے ماہر اور سنسکرت سے بخوبی واقف تھے۔ ان کو اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا۔ کہتے ہیں

ہست مرا مولد و ماوا و وطن

یعنی ہندوستان میری جائے پیدائش۔ جائے پناہ اور وطن ہے۔

انھوں نے اپنی مثنویوں میں ہندوستان کے "باشندوں کی ذہانت۔ استعداد علمی۔ زبانوں۔ رسم و رواج۔ مذہبی عقائد" کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ یہاں کی عمارتوں، باغوں۔ ہاتھیوں۔ گانے والیوں۔ باجوں۔ کھانوں اور پانوں کا مفصل بیان کیا ہے۔ خسرو کا فارسی کلام کئی لاکھ اشعار پر مشتمل تھا۔ کہتے ہیں کہ ہندی کلام اس سے بھی زیادہ تھا۔ غرض انھوں نے ایک جگہ خود کہا ہے کہ میں ہندی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اور سنسکرت کی بھی ایک حد تک تحصیل کی ہے۔ "من قدرے بر سرِ آں کار شدم (میں نے اس زبان کو کسی قدر سیکھا ہے) غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ بیک وقت شاعر۔ ادیب۔ مصنف۔ ماہر موسیقی[1] درباری مصاحب اور صوفی صوفی تھے۔ حیرت اس پر ہے کہ اس کثرت تصانیف کے باوجود وہ سرکاری خدمات اور حاضریٔ دربار کے فرائض کیونکر انجام دیتے تھے۔ اس پر مستزاد۔ عبادات و اوراد کا شغل اور پیر کی خدمت میں روزانہ شام کی حاضری۔ اس وصف کو حیرت انگیز نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔

اخلاق و عادات:

خسرو ایک مہذب اور پابند مذہب امیرزادے تھے جو امارت کی آغوش میں پلے۔ امرا و سلاطین کے مقرب بن کر رہے اور آخر میں فقر و تصوف کے قدموں میں آپڑے وہ اپنے افراد خاندان سے بیحد محبت کرتے تھے۔ باپ کی یاد۔ نانا کے احسانات کا اعتراف۔ ماں سے غیر معمولی محبت بھائیوں اور اولاد سے شغف۔ وطن سے دلی لگاؤ۔ اس کے آئینہ کمال کے جوہر ہیں۔ درباری تعلق ضرور رہا۔ بلکہ بعض مواقع پر ایسے ظالم حکمرانوں سے بھی تعاون ملتا ہے جو بدا عمال تھے یا حضرت نظام الدینؒ کے مخالف۔ مگر مجبوراً نباہ کیا۔ گو وہ دل سے اس تعلق کو ناپسند کرتے تھے۔ آخر مثنوی لیلیٰ مجنوں میں دل کی بات زبان پر آہی گئی۔ کہتے ہیں۔

"میں غریب اپنے حواس میں نہیں اور ہر وقت دیگ کی طرح جلتا اور ابلتا رہتا ہوں۔ شام سے لے کر صبح تک اور صبح سے لیکر شام تک مجھے چین نہیں۔ نفسِ بد کی خاطر اپنے ہی جیسے انسان کے سامنے مجھے گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا ہے جب تک سر سے پاؤں تک خون نہ بہے۔ ممکن نہیں کہ کسی کے گھر کے پانی سے اپنے ہاتھ تر کر لوں"۔

اس کے ساتھ اور اس سے بڑھ کر وہ عشق صادق ہے جو ان کو اپنے پیر حضرت نظام الدینؒ سے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پیر حد سے زیادہ ان کا مان کرتے اور فرماتے تھے کہ بعض اوقات میں سب سے۔ حتیٰ کہ اپنے آپ سے تنگ آجاتا ہوں۔ مگر خسرو سے تنگ نہیں آتا۔ خسرو بھی پیر کی مرضی

---

[1] تذکرہ نگاروں نے بتایا ہے کہ خسرو نے کئی راگ اختیار کئے ستار کے موجد تھے اور نایک کے لقب سے شہرت پائی۔ مگر افسوس کہ ہم اس فن سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اس پر تبصرہ کرنے سے معذور ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھو حیاتِ امیر خسرو از نقی محمد خاں۔

کے سامنے جابر سلاطین کے حکم کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ان کی انصاف پسندی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شیخ کے (Saymngs) آپ کے دو مخلص مریدوں یعنی حسن[1] سنجری اور خسرو نے مرتب کئے۔ جن کے نام علی الترتیب فوائد الفواد اور افضل الفوائد ہیں۔ خدا کا کرنا کہ قبول عام کا امتیاز اول الذکر کو ملا۔ چنانچہ خسرو کہا کرتے تھے کہ کاش حسن میرا تمام مجموعۂ کلام لے لیتا۔ اور فوائد الفواد مجھے دیدیتا۔ (سیر العارفین از مولانا جمالی)۔

تصانیف :-

امیر کے کثیر التصانیف ہونے میں شبہ نہیں۔ مولانا[2] جامی تصانیف کی تعداد ۹۹۔ اور امین احمد رازی ایک سو سے زیادہ بتاتے ہیں۔ اشعار ۴ یا ۵ لاکھ کی بقدر ہیں۔ نثری تصانیف (اعجاز خسروی اور خزائن الفتوح۔ اور افضل الفوائد) ان کے علاوہ۔ کہا جاتا ہے کہ ہندی کلام اس کی برابر یا اس سے زیادہ تھا جس کا بڑا حصہ تلف ہو گیا۔ کچھ گیت اور پہیلیاں وغیرہ جو بیشتر مشکوک ہیں زبان زد خاص وعام ہیں ان کے استادانہ کمال کی مقبولیت کا یہ کھلا ثبوت ہے کہ آج تک وجد وحال کی محفلوں میں قوال انکی غزلیات سے ارباب ذوق ان کے قصائد اور مثنویات سے۔ بچے ان کی پہیلیوں سے اور لڑکیاں ان کے گیتوں سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ بعض مواقع پر ضابطہ اور سنجیدہ اصحاب بھی ان کا کلام سنکر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ قبول عام خدا کی دین ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں ان کے ہندی یا اردو نما[3] کلام کی چند مثالیں پیش کریں۔ جو ایک طرف عام پسند اور دلچسپ ہیں اور دوسری طرف گھلاوٹ اور اثر سے لبریز۔

پہیلی[4] (انسان)

بدھنا نے اک پرش بنایا — تریا دی اور نیہ لگایا
جوگ بھی کچھ دا ایسی — دیس چھوڑ بھیو پردیسی

ایضاً (آری)

آنا جانا اس کا بھائے — جس گھر جائے لکڑی کھائے

ایضاً (آئینہ)

فارسی بولی آئی نہ — ترکی ڈھونڈی پائی نہ
ہندی بولوں آرسی آئے — منہ دیکھوں جو تاؤں بتائے

ایضاً (دیا)

بالا تھا جب سب کو بھایا — بڑا ہوا تو کام نہ آیا
خسرو کہدیا اس کا ناؤں — ارتھ کہو، نہیں چھاڑو گاؤں

کہہ مکرنی (دیا)

ساری رین موئے سنگ جاگا — بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
وا کے بچھڑت پھاٹے ہیا — اے سکھی ساجن؟ نا سکھی دیا

---

[1] پورا نام امیر حسن بن علا سنجری ہے عموماً دہلوی کہلاتے ہیں مگر حال کی تحقیق سے ان کا بدایونی ہونا ثابت ہو گیا ہے۔ بڑے فاضل اور شاعر تھے۔ اور سعدیٔ ہند کے لقب سے مشہور۔

[2] یہ اعداد کسی قدر مبالغہ آمیز ہیں۔ علاوہ بریں خالق باری کے متعلق محققین کہتے ہیں کہ یہ امیر خسرو کی نہیں۔ بلکہ شیخ سعدی ہندی (دکنی) کی تصنیف ہے۔

[3] امیر کے مخلوط اردو کلام کے ثبوت میں اس قبیل کے اشعار بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں۔

خوار شدم خوار شدم لوٹ گئی — در غم ہجر تو کمر ٹوٹتا ہے
روئے تو روشن تر ز آفتاب — سرو بہ پیش قد تو بوٹا ہے

[4] آب حیات وغیرہ



ایضاً (چاند)

اونچی اٹاری پلنگ بچھایو میں سوئی میرے سر پر آیو
کھل گئیں انکھیاں بھئی آنند اے سکھی ساجن ، نا سکھی چند

ساون کا گیت

اماں میرے باوا کو بھیجو ری کہ ساون آیا
بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری 〃 〃
اماں میرے بھیا کو بھیجو ری 〃 〃
بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری 〃 〃
اماں میرے ماموں کو بھیجو ری 〃 〃
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری 〃 〃

رخصتی کا گیت

کاہے کو بیاہی بدیس رے سن بابل میرے

اس میں کئی بول ہیں۔ مگر اس قدر درد انگیز اور پُر اثر کہ سنکر ضبط کرنا غیر ممکن ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایسے مخلوط اشعار[2] بھی کہے ہیں کہ آسان اُردو یا فارسی کے ساتھ ہندی کا میل بہت لطف دیتا ہے۔

خسرو کے حالات اور اشعار سے ایسا قیاس ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن میں ایک گنگا جمنی تہذیب کو رواج دینا چاہتے تھے جس کی زمین ہند کی ہو اور بالائی ڈھانچہ ایران کا۔ ہر ایک شخص اپنے عقائد و افکار میں آزاد ہو۔ لیکن وطن کی بہبود کے لئے سب کے سب متحد ہو کر کمر بستہ ہو جائیں۔ ان کے بعد بھی بعض اصحاب نے اس کا بیڑا اٹھایا اور کام کو ایک حد تک آگے بڑھایا۔ لیکن جب تک

---

[1] آب حیات۔ [2] مثال اوپر گذری

تمام افراد تنگ دلی اور کوتاہ نظری سے بالاتر ہو کر سچائی کی حمایت میں سیسے کی دیوار نہ بن جائیں یہ خواب کیونکر شرمندۂ تعبیر ہو۔ علامہ اقبال مرحوم نے سچ کہا تھا ؎

کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پابہ گل ہیں
تو غنچے کہنے لگے ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا

بقیہ مضمون صفحہ ۱۸

بقیہ مضمون صفحہ ۱۸

جنّت کو سدھارے۔ امیر اس وقت بنگال میں تھے۔ خبر وحشت اثر سنی تو بھاگا بھاگ دلی پہونچے۔ مزار پر حاضر ہوئے تو اہل ارادت کی روایت ہے کہ ہندی کا یہ شعر اسی وقت پڑھا ؎

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چودیس

ماتمی لباس پہن لیا۔ سب کچھ لٹا دیا۔ خالی ہاتھ ہو بیٹھے غم کی آگ میں جلتے، ہجر کی بھٹی میں تپتے، خود اپنے وقت کا انتظار کرنے لگے۔ ادھر چھ مہینے کی مدت پوری ہوئی کہ ادھر ۱۸ شوال ۷۲۵ھ (مطابق ۱۳۲۵ء) کو خود بھی اپنے محبوب سے جا ملے —— حضرت فاطمہ زہراؓ بھی مرشدِ کائنات کا غم اس سے زیادہ کب برداشت کر سکی تھیں —— تجویز پیش ہوئی کہ دفن مرشد ہی تربت میں کئے جائیں۔ احترام شریعت غالب آیا۔ پائینتی کی جانب چند گز ہٹ کر قبر بنی۔ اہل دل اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ آستانۂ سلطان المشائخ سے پہلے اگر اس کشتۂ عشق و محبت اور مجسمۂ سوز و گداز کے مرقد پر فاتحہ خوانی کرلی جائے تو دل کی انگیٹھی کی چنگاریاں اور تیز و روشن ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی :

امیر خسرو

بحیثیت ایک غزل گو شاعر

غزل عربی کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں "سوت کاتنا" لیکن یہ لفظ اگر عورتوں کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنی بدل جاتے ہیں اور اس کا مطلب ہوتا ہے عورتوں سے پیار و محبت کی باتیں کرنا، ان کی خوبصورتی اور حسن کو سراہنا ان کے ساتھ کھیلنا کودنا اور انھیں بہلانا پھسلانا وغیرہ۔

اس طرح غزل عربی اصطلاح ضرور ہے، لیکن ایک مستقل صنف شاعری کی حیثیت سے عربی ادب میں اس کا وجود نہیں ہے۔ عربی شاعری میں پیار و محبت کی باتیں ضرور ملتی ہیں لیکن غزل کے نام سے نہیں بلکہ تشبیب یا نسیب کے نام سے، جو دراصل قصیدہ کا ہی ایک حصہ ہوتی ہے اور تشبیب یا نسیب کے معنی بھی تقریباً وہی ہیں جو غزل کے ہیں یعنی جوانی اور شباب کی باتیں۔

غزل گو عربی شاعری کا حصہ نہ بن سکی مگر عربی ادیبوں اور شاعروں کے ذہن میں اس کا ایک واضح تصور ضرور تھا۔ چنانچہ ابن قدامہ اور ابن رشیق نے عاشقانہ شاعری کو پیش نظر رکھ کر غزل کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، ان میں بعض یہ ہیں :-

(۱) غزل کو عشق و محبت، بے خودی، وارفتگی، رنج و غم اور سوز و گداز جیسے دلی جذبات کا مجموعہ ہونا چاہیئے۔

(۲) اس میں ایسے خیالات ہونے چاہئیں جو عام طور پر سبھی عاشقوں کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

(۳) اس میں محبوب کی جسمانی تعریف کی بجائے اُس کی اُن خوبیوں کا ذکر ہونا چاہیئے جو دل کو موہ لیتی ہیں اور دماغ کو متاثر کرتی ہیں۔

(۴) اس کی زبان نرم اور میٹھی ہونی چاہیئے اور اس کا روپ طرب انگیز اور مستانہ۔

غزل کا رواج ایک مستقل صنفِ شاعری کے طور پر سب سے پہلے فارسی زبان میں ہوا، کیونکہ غزل جیسی نرم و نازک اور لطیف چیز کو پنپنے کے لئے ایک ایسی سرزمین درکار

تھی۔ حسن و جمال، لطافت و نزاکت اور ناز و نعم کا گہوارہ جو صفات تھیں صرف ایران کی سرزمین میں پائی جاتی تھیں؛ اس کا تمدن ہزاروں سال پرانا تھا۔ اس کی معاشرت، لطافت و نزاکت سے بھرپور تھی۔ اس کا چپہ چپہ حسن و جمال، رنگینی و دل فریبی اور عشق و محبت کا بے مثال نمونہ تھا۔

● اس طرح غزل گو ایران میں شروع تو ہوئی لیکن عرب ناقدین کی تعریف کے مطابق ابتدا ابتدا میں اس کا دائرہ عاشقانہ مضامین تک محدود رہا، شاعر عاشق کا روپ دھار کر پیار و محبت کے گیت گاتے، محبوب کے حسن و جمال کے قصے سناتے اور حسن و عشق کی کشمکش سے پیدا ہونے والے دلی تاثرات کی داستان بیان کرتے تھے۔ ساری غزل گوئی پیار و محبت کی باتوں تک محدود رہی

● حسن و محبت کی باتوں میں گرمی پیدا کرنے اور اس سے پیدا ہونے والے جذبات کو ابھارنے کے لئے ایرانی تہذیب نے ہمیشہ جس چیز کا سہارا لیا وہ تھی شراب، نتیجہ یہ کہ جب فارسی شاعروں نے حسن کی شمع جلائی اور محبت کا راگ چھیڑا تو شراب کی یاد بھی خود ہی تازہ ہو گئی اور غزل میں کھلے بندوں بادہ و مئے، ساغر و مینا اور جام و صراحی کا ذکر ہونے لگا۔ ساقی اور پیر مغاں مرکزی کردار بن گئے اور زاہد، واعظ، شیخ اور محتسب کا مذاق اُڑایا جانے لگا۔

● عشق و محبت کی گرمی اور شراب کی مستی اکثر اوقات آدمی کو غلط راستے پر ڈال دیتی ہے۔ چنانچہ جب ان کے اثرات سے شاعر بہکنے لگے اور ان کا قدم محبت کی پاکیزگیوں سے نکل کر ہوس پرستی و عیاشی کی حدوں کو چھونے لگا تو پھر غزل کو ان مضر اثرات سے بچانے کے لئے ایک نیا موڑ دینے کی ضرورت پیش آئی۔ اور یہ نیا موڑ تصوف کی صورت میں سامنے آیا۔ اب پیار و محبت، رندی و سرمستی کا رخ عورت کی ذات سے ہٹ کر خدا کی طرف ہو گیا اب بھی فارسی غزل میں حسن کی تعریف ہوتی، عشق کی بے چینیوں کا ذکر ہوتا، ساقی و شراب کے قصیدے پڑھے جاتے تھے لیکن اب ان سے مراد عورت کی محبت یا دنیوی سرمستی نہ ہوتی بلکہ خدا کی پہچان اور اس کی معرفت کا نشہ ہوتا تھا۔ عشق مجازی، عشق حقیقی میں بدل گیا اور شاعری کی باتوں میں ایک بے پناہ گرمی اور تاثیر پیدا ہو گئی۔

● اس خوشگوار تبدیلی کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ غزل کے دروازے اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین کے لئے بھی کھل گئے۔ کیونکہ تصوف کا فلسفہ اور اخلاق سے بھی بڑا گہرا تعلق ہے، اب غزلوں میں اخلاقی و فلسفیانہ مضامین بھی باندھے جانے لگے۔ زندگی اور موت، سچ اور جھوٹ، اچھائی اور برائی اور اس قسم کے بیسیوں دوسرے مسائل پر بھی اظہارِ خیال ہونے لگا۔

● غزل کی اس معنوی وسعت کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی نکھرنے سنورنے لگی۔ طرزِ ادا میں بانکپن آنے لگا۔ نرم و نازک الفاظ استعمال کئے جاتے، محاورہ اور روزمرہ کا خیال رکھا جاتا۔ اور پھر اس لسانی خوبی کو اپنانے کی کوشش ہوتی جو غزل کے ظاہری حسن کو دوبالا کر دے۔ زمین کے انتخاب میں بھی بڑی احتیاط برتی جاتی تھی۔

● غزل کے معاملہ میں زبان اور زمین کا یہ اہتمام اس کے ترنم، اور موسیقی پر جا کر ختم ہوا۔ سماع اور دوسری سماجی و ثقافتی محفلوں میں اس کو ایک خاص اہمیت حاصل

ہو گئی۔ قوال غزلیں گاتے اور سننے والے ان غزلوں کو سن کر تڑپ اُٹھتے تھے۔

مختصر یہ کہ جو صنف حسن و عشق کے معاملات، چند لطیف اور نازک جذبات کو ظاہر کرنے کے لئے اپنائی گئی تھی وہ معنوی و صوری دونوں اعتبار سے اتنا بنی سنوری، پھولی پھلی اور مقبول ہو گئی کہ آج پورے فارسی ادب میں اس کے مقابلے کی کوئی صنف نہیں ہے۔ وہ ایک آفاقی چیز ہے اس کا کسی مذہب، قوم اور ملک سے کوئی تعلق نہیں اور وہ انسان کے درد بھرے دل کی ایک ایسی آواز ہے جو روز ازل سے لے کر آج تک کسی نہ کسی شکل میں فضاؤں میں گونجتی رہی ہے اور جس کی لے میں آج بھی ہم اپنے دل کی دھڑکنوں کو سن سکتے ہیں۔

غزل کو اس بلند مقام تک پہونچنے میں تین سو سال سے زیادہ کا عرصہ بیت گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک زمانے تک ایران اور فارسی زبان کے دوسرے علاقوں میں قصیدہ گوئی کو شاعری کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ فارسی شاعروں کی شاعری کوشش یہ ہوتی تھی کہ اپنے آقا کی شان میں اچھے سے اچھا قصیدہ لکھ کر جلد از جلد اپنے آپ کو ان کے انعام و اکرام کا مستحق بنایا جائے۔ سلاطین و امراء کے وقت بھی ان شاعروں کی زبان سے اپنے عدل و انصاف، داد و دہش اور بہادری و کامرانی کی تعریف سن کر بے حد خوش ہوتے اور انھیں ہر قسم کے انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔

یہاں تک کہ جب تاتاری حملوں نے ہر طرف تباہی مچانا شروع کر دی، علم و ادب کی سرپرستی کرنے والی اکثر چھوٹی بڑی حکومتیں ایک ایک کرکے ختم ہو گئیں۔ وہ سلاطین وہ امراء نہ رہے جو ان قصیدہ گو شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے تو پھر ان قصیدوں کا زور گھٹنے لگا اور غیور و دل شکستہ شاعر اپنے دردناک جذبات کے اظہار کے لئے غزل کو ایک بہترین وسیلہ سمجھ کر اس کی طرف مائل ہو گئے اور غزل دن دونی ترقی کرنے لگی۔

غزل کو اس مقام تک پہونچنے میں چاہے جتنی دیر لگی ہو لیکن اس کو ترقی دینے اور اسے ایک معمولی درجے سے اٹھا کر موجودہ بلندیوں تک پہونچانے میں تقریباً سبھی فارسی شاعروں نے اپنے اپنے طور پر تھوڑا بہت حصہ ضرور لیا ہے اور ہر شاعر نے چاہے قصیدہ گوئی اس کی پسندیدہ صنف رہی ہو یا مثنوی نگاری، دردناک لمحات میں اپنے ٹوٹے ہوئے دل کی ڈھارس بندھانے کے لئے غزل کا ہی سہارا لیا ہے چنانچہ فارسی شاعری کے باوا آدم رودکی سے لے کر غزل کے اولین باقاعدہ علمبردار سعدی شیرازی تک، تقریباً سبھی شاعروں کے ہاں ہمیں غزلیں ملتی ہیں کسی کے ہاں وہ ابتدائی منزل میں ہے تو کسی کے ہاں درمیانی اور کسی کے ہاں اس سے بھی آگے البتہ سعدی کے ہاں ہمیں یہ مکمل صورت میں ملتی ہے اور پہلی بار فارسی شاعری کی دنیا میں پورے حسن و جمال کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

رودکی :-

اے جان من از آرزوی تو پژمان
بنما ز یکی روی بہ بخشای بر این جان

میرے محبوب، میرا دل تیری چاہت میں بہت دکھی ہے
اس پر رحم کر صرف ایک بار اپنی جھلک دکھا جا

دقیقی :- گوینده صبر کن که ترا صبر بر دهد — لوگ کہتے ہیں: صبر سے کام لو، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے
آری دهد ولیک به عمر دگر دهد — ہاں ہوتا ہوگا لیکن اس دنیا میں نہیں دوسری دنیا میں

اوحدی :- خلق نشان دوست طلب می کنند باز — لوگ محبوب کا پتہ پوچھتے ہیں، اور اتنی ساری نشانیوں
از دوست غافل اند بچندین نشان که هست — کے باوجود اس تک پہونچ نہیں پا رہے ہیں۔

نظامی :- منّتم مکن که تو شیفته تر زمن شوی — محض اس بات پر مجھے سزا مت دو کہ میں تمھارا عاشق ہوں اگر
گر بنگری در آئینه روی چو ماه خویش را — تم خود بھی اپنا چاند سا مکھڑا آئینہ میں دیکھوگے تو عاشق ہو جاؤگے

کمال :- از چشم نیم خواب تو امروز روشن است — آج تمھاری ان نیم خوابیدہ آنکھوں سے وہ آہیں
آن ناله ها که در غم تو دوش کرده ایم — جھلک رہی ہیں جو کل ہم نے تمھاری یاد میں بھری تھیں

سعدی :- حدیث عشق چه داند کسی که در همه عمر — پیار و محبت کا مزہ وہ کیا جانے جس کو زندگی میں کبھی
به سر نکوفته باشد در سرای را — محبوب کے آستانے سے سر ٹکرانے کا موقع نہ ملا ہو

یہ گو چند شعر سہی لیکن یہ بتانے کے لئے کافی ہیں کہ غزل کی ترقی میں ہر شاعر نے کس طرح حصّہ لیا ہے۔ اور کس طرح یہ دھیرے دھیرے پروان چڑھی۔

اس طرح خسرو نے جب غزل گوئی کے میدان میں قدم رکھا تو اس وقت تک وہ ایک بہترین صنف شاعری کا درجہ حاصل کر چکی تھی اور ان کے سامنے سعدی جیسے ایک با کمال غزل گو کا پورا دفتر کھلا تھا اب انھیں غزل کہنے میں کسی دشواری کسی دقت کا سامنا نہ تھا وہ غزل کہہ سکتے تھے اور پوری شان سے کہہ سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے جہاں اور اصناف سخن، مثنوی اور قصائد وغیرہ میں کمال دکھایا وہاں غزل کی طرف بھی توجہ کی اور اس کی انتہائے کمال تک پہونچایا، گویا جو کام سعدی سے بھی پورا نہ ہو سکا تھا انھوں نے پورا کر دیا۔ شبلی کی زبان میں " امیر خسرو کی غزل گوئی دراصل خمخانۂ سعدی ہی کی شراب ہے جو دوبارہ کھینچ کر تیز تر ہو گئی ہے "۔ یہی وجہ ہے کہ خسرو کی غزلوں میں وہ تمام معنوی و صوری خوبیاں جمع ہیں جو غزل کی تاثیر کو دوبالا کرتی ہیں اور غزل کو اور اصناف سخن کے مقابلہ میں زیادہ محبوب صنف بناتی ہیں۔

خسرو نے ایک امیر گھرانے میں جنم لیا تھا، گو بچپن میں ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اس سے انکے عیش و آرام میں فرق نہ آیا، کیونکہ باپ کے انتقال کے فوراً بعد ہی ان کے نانا عماد الملک نے انھیں اپنی نگرانی میں لے لیا تھا۔ عماد الملک سلطان التمش کے عہد میں اور بعد بھی عرض ممالک کے عہدے پر فائز تھے، زندگی بڑے ہی شان و شوکت سے گذرتی تھی۔ سیکڑوں خادم اور غلام ان کی خدمت کے لئے موجود تھے۔ اور ہر وہ سہولت موجود تھی جو دلوں کو گدگدا کر محبت اور پیار کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ ان حالات میں یہ ناممکن ہے کہ خسرو نے پیار و محبت کا صحیح مزا نہ چکھا ہو۔ لیکن بعض سماجی پابندیوں کی وجہ سے اس عہد میں غیر عورت سے باتیں کرنا اور اس سے علانیہ محبت جتانا ناممکن تھا اسلئے ہمیں ان کی زندگی میں حسین عورتوں سے دل لگانے کا کوئی واقعہ، کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ ایک خوبرو نوجوان حسن دہلوی سے انھیں

جو بے پناہ محبت تھی وہ افسانہ بن چکی ہے۔

کہتے ہیں کہ حسن بیحد حسین وجمیل تھے۔ ان کی نان کی دکان تھی۔ جوانی کے دنوں میں ایک بار جب خسرو کا حسن کی دکان پر سے گذر ہوا تو وہ ان کو دیکھ کر مسحور سے ہوگئے، نان خریدنے کے بہانے تھوڑی دیر ان سے بات چیت کی اور گھائل ہو کر اپنے گھر چلے آئے۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے حسن کے دل میں بھی خسرو کا نقش بن گیا۔ پھر تو آہستہ آہستہ یہ دونوں ایکدوسرے سے اسقدر قریب ہوگئے کہ انکے عشق و محبت کی کہانی نے لوگوں کے دلوں سے محمود و ایاز کی یاد کو بھی مٹا دیا۔

جن دنوں یہ دونوں ملتان کے حاکم خان شہید کے ملازم تھے۔ خان شہید نے بہتیری کوشش کی کہ انھیں بدنامی سے بچایا جائے۔ ملنے سے منع کیا، تنبیہ کی، کوڑے لگوائے لیکن بے سود، وہ دو دل الگ ہونے کے لئے نہ ملے تھے۔ اس موقع پر خسرو نے ایک غزل بھی کہی تھی جس کے چند شعر ہیں ؎

ہر شبم جان برلب آید نالۂ زار آورد	ہر رات جان ہونٹوں پر آتی ہے اور دل سے آہیں نکلنے لگتی ہیں۔
تا کُرا این باد بوئی زان جفا کار آورد	یہ ہوائیں کب تک اس ظلم کی خوشبو مجھ تک پہونچاتی رہیں گی۔
رفت آن شوخ و دل خون گشتہ را باخود ببرد	وہ چنچل چلا گیا اور اپنے ساتھ میرا لہو لہان دل بھی لے گیا
عاقبت روزی ہمان خوش گرفتار آورد	ایک دن آئیگا جب یہی لہو اُس کو میرے پاس پکڑ کر لانے لگا
دوستان من نی ہوس دارم بنالیدن ولی	دوستو! مجھے رونے دھونے کا کوئی شوق نہیں ہے لیکن کیا کروں
درد چون در سینہ باشد نالۂ زار آورد	جب جگر میں درد ہوتا ہے تو ایک آہ سی دل میں نکل ہی جاتی ہے
زین دل خود کام کار من بہ رسوائی کشید	اس مطلبی دل نے میرے معاملہ کو رسوائی تک پہونچا دیا۔
خسرو! فرمان دل بردن ہمیں بار آورد	اے خسرو! دل کی بات ماننے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے

اس سے صاف ظاہر ہے کہ خسرو محبت کی سچی محبت سے مالا مال تھے۔ انکے پہلو میں ایک درد بھرا دل تھا۔ وہ رنج و غم، سوز و گداز، بے چینی اور تڑپ، غرض ہر اس جذبہ اور احساس سے عملاً واقف تھے جو ایک محبت کرنے والے انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی محبت روایتی نہیں بلکہ سچی ہے، اور اُن کی غزلوں میں جو بلا کی تڑپ ہے وہ ایک سچے عاشق کے دل کی پکار ہے۔

سعید نفیسی کے مرتب کردہ "دیوان کامل امیر خسرو دہلوی" کے مطابق خسرو کی غزلوں کی مجموعی تعداد ۱۷۲۶ ہے اور ہر غزل میں انکے محبت بھرے دل کی بلیسیوں دھڑکنیں چھپی ہوئی ہیں۔ اسی صورت میں یہ ناممکن ہے کہ ہم ان کی غزلوں کے ایک ایک شعر کو لے کر اس پر بحث کریں اور اس کی خوبیاں گنائیں۔ بطور نمونہ صرف دو عشقیہ غزلوں کے کچھ شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں ؎

صبا آمد ولی دل باز نامد	صبا آئی لیکن دل واپس نہیں آیا
غریب ما بہ منزل باز نامد	دیار محبوب کا مسافر اپنی منزل پر نہ پہونچا

بدریا غرق شد رخت صبوری	صبر کا سارا ساز و سامان دریا کی نذر ہو گیا
کہ کشتی سوی ساحل باز نامد	لیکن ناؤ کنارے نہ لگی
دل ما رفت با محمل نشینی،	میرا دل ایک محمل نشیں کے ساتھ ہو گیا
رود جان ہم کہ محمل باز نامد	اب شاید جان بھی جائے کیونکہ محمل واپس نہیں آیا
بعشقم مست بگذارید یاران	مجھے پیار و محبت کے نشہ میں مست رہنے دو
کس از میخانہ عاقل باز نامد	تمکو معلوم ہے کہ آجتک شراب خانہ سے کوئی شخص صحیح سلامت نکل سکا
بوادی غمش گم گشت خسرو	خسرو محبت کی وادی میں کھو چکا ہے
کہ کس از راہ مشکل باز نامد	یہ وہ کٹھن جگہ ہے جہاں سے کوئی واپس نہ آیا
ز شفقت بے قرارم با کہ گویم	درد محبت نے مجھے بیچین کر رکھا ہے کس سے کہوں
ز ہجرت خوار و زارم با کہ گویم	تیری جدائی میں مر رہا ہوں میں کس سے کہوں
نمی پرسی ز احوالم کہ چونی	کبھی تم مجھ سے پوچھتے تک نہیں کہ تم کیسے ہو
پریشاں روزگارم با کہ گویم	رات دن پریشان ہوں کس سے کہوں
ہمی خواہم کہ بفرستم سلامی	دل چاہتا ہے کہ تمھیں سلام بھیجوں
چوں یک محرم ندارم با کہ گویم	لیکن میرا کوئی ہمراز نہیں، کس سے کہوں
دلم بردی غم کارم نخوردی	دل لے گئے اور میرا خیال تک نہ کیا
خرابست روزگارم با کہ گویم	میری دنیا ویران ہے، کس سے کہوں
ندارد جز تمنائے تو خسرو	تمھارے علاوہ خسرو کو اور کسی کی تمنا نہیں ہے
جمالت دوستدارم با کہ گویم	تمھارے حسن کا پرستار ہوں، کس سے کہوں

اوپر کی دو غزلوں پر یا ان کے ترجمے پر ایک سرسری نظر ڈال کر بھی ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ ان میں خسرو نے محبوب سے اپنے لگاؤ اور اس لگاؤ سے پیدا ہونے والے جذبات کا کس خوبی سے اظہار کیا ہے۔ ان میں درد بھی ہے، غم بھی ہے، بیچینی و بیقراری بھی ہے اور ہر وہ کیفیت موجود ہے جو ایک عاشق کے دل میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتی ہے۔ خسرو کے درد بھرے دل کی یہ آواز ہم ان کی سبھی غزلوں میں سن سکتے ہیں۔

خسرو سلطان بلبن کے زمانے سے لیکر سلطان غیاث الدین تغلق بلکہ محمد بن تغلق کے زمانے تک دربار سے متعلق رہے۔ اس کے علاوہ بہتیرے امیروں اور شہزادوں کے ساتھ بھی انھوں نے اپنی زندگی کے اہم دن بتائے ان میں معزالدین کیقباد اور قطب الدین مبارک خلجی کے علاوہ اور سب سلاطین و امرا مذہب پسند تھے۔ اُن کے کھلے عام شراب پینے پلانے کی کوئی مثال نہیں ملتی، بلکہ علاؤالدین خلجی ہندوستان کا پہلا حکمران تھا کہ جس نے مے نوشی و مے فروشی کو سرکاری طور پر ممنوع قرار

دیدیا تھا، ایسی صورت میں یہ باور کرنا مشکل ہے کہ خسروؔ نے کبھی شراب کا مزہ چکھا بھی ہوگا۔ لیکن وہ صلاح کی جس بلند سطح پر وہ رہتے تھے۔ اور جس قسم کی محفلوں میں ان کا صبح شام بیٹھنا اٹھنا ہوتا تھا، وہاں کھلے عام نہ سہی چوری چھپے تو ضرور جام چھلکتے ہونگے، شراب چھلکتی ہوگی، اِسلئے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خسروؔ نے اپنی زندگی کے کسی دور میں انگور کی بیٹی سے منہ نہیں لگایا تب بھی ظاہر ہے کہ وہ اس کی مستی و بدمستی سے واقف تھے۔ اور اس سے پیدا ہونے والی کیفیتوں کو سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں پیار و محبت کی باتوں کے بعد جس محبوب چیز کا ذکر بار بار آتا ہے وہ یہی مئے ہے، جام ہے، سبو ہے، رندی و سرمستی ہے، اور بے خودی و بے تابی ہے۔ خسروؔ جب بھی ان چیزوں کا ذکر کرتے ہیں ان کے اشعار میں ایک جان سی ایک مستی سی آجاتی ہے۔ اور پڑھنے والا بھی جھوم اُٹھتا ہے۔ صرف دو غزلیں ملاحظہ ہوں ؎

- خیز تا بادہ در پیالہ کنیم

گل درون قدح چو لالہ کنیم
ساقی جا نفزا و نغمۂ چنگ
تا بکی خون خوریم و لالہ کنیم
با گل و لالہ ہمچو بلبل مست
وصف آں عنبریں کلالہ کنیم
وز بخار شراب آتش فام
ورق چہرہ پر ژالہ کنیم
ہمچو خسرو بنام می خواراں
ملک دیواں بخوں قبالہ کنیم

- لبا لب کن قدح ساقی کہ مستم

بمئے دہ جملگی اسباب ہستم
مرا کن سرخرو از جرعۂ خویش
چہ می رانی کہ پیش خاک پستم
اگر اصحاب عشرت می پرستند
بیا ساقی کہ من ساقی پرستم
مرا گویند در مستی چہ دیدی
کہ می گوئی دل اندر بادہ بستم

آؤ پیالے میں شراب انڈیلیں
اور اس کو لالہ کی طرح سرخ بنا دیں
ساقی کی دل نوازیاں ہیں اور ساز کے نغمے
ایسے میں ہم کب تک خون جگر پئیں اور آہیں بھریں۔
مست بلبل کی طرح پھولوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر
ہم مہکتی زلفوں کے گیت گائیں
اور آگ کی طرح دہکنے والی شراب کی گرمی سے
گالوں کے دامن کو شبنم کے موتیوں سے بھر دیں
اور خسروؔ کی طرح میخواروں کے نام پر
دیوان کو خون کے عوض گرو رکھ دیں
اے ساقی! جام چھلکا آج میں مست ہوں
میری زندگی کے تمام وسائل اس میں ڈبو دے
اپنے ہاتھ سے جام دے اور مجھے عزت بخش
مجھے ہانک کر تجھے کیا ملے گا، میں ویسے بھی رُسوا ہوں
میرے دوست محض عشرت کے پجاری ہیں
اے ساقی تو میرے پاس آ میں تیرا سچا پرستار ہوں
دوست پوچھتے ہیں کہ آخر نشہ میں کیا رکھا ہے
جو تم کہتے ہو کہ میں نے شراب سے دل لگا لیا ہے

تعالیٰ اللہ ازیں بہتر چہ باشد	قسم خدا کی شراب سے بہتر دنیا میں اور کیا چیز ہو سکتی ہے
کہ از ننگ وجود خود برستم	اس نے مجھے زندگی کی ذلتوں سے نجات دلا دی ہے
مرا گوئی کہ از کے یاز مستی	پوچھتے ہو یہ نشہ کی عادت کب سے پڑی
ازاں روزی کہ با خسرو نشستم	یہ نشہ کی عادت اسوقت سے پڑی ہے جب سے میں خسرو کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا۔

جس نے زندگی میں کبھی شراب نہیں چکھی اس کی نظر میں شراب اور ساقی کی یہ تعریفیں بے معنی ہیں لیکن جو زندگی کی تلخیوں سے دُور بھاگنا چاہتا ہے۔ اپنے وجود کو بھول کر کائنات کی اِن بے پناہ وسعتوں میں کھو جانا چاہتا ہے۔ اس کی نظر میں شراب اور شراب کی بخشی ہوئی چند گھڑیوں کی بے خودی بھی بہت کچھ ہے۔ یہ گھڑیاں، یہ لمحے اس کی زندگی کا حاصل ہیں۔ خسرو نے ان غزلوں میں ایک رندِ قدح خوار کی طرح بڑی خوبی سے یہ بات واضح کی ہے۔

خسرو نے ایک امیر گھرانے میں ضرور آنکھیں کھولی تھیں، لیکن ان کا پورا خاندان نہ صرف یہ کہ مذہبی احکام کا پابند تھا بلکہ صوفیوں سے بھی اُسے خاص نسبت تھی۔ اِس خاندان کے سارے افراد شیخ نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے۔ خود خسرو بھی ابھی چھوٹے ہی تھے کہ انھیں شیخ کے حلقۂ ارادت میں شامل کر دیا گیا۔ اور جیسے جیسے ان کا شعور پختہ ہوتا گیا، ویسے ویسے وہ شیخ سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ جب بھی وہ دہلی میں ہوتے ان کا زیادہ تر وقت شیخ کی صحبت میں گذرتا تھا، ہر رات وہ عشار کی نماز کے بعد شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ انھیں دہلی کے تازہ حالات سے باخبر کرتے، دوستوں اور ضرورتمندوں کی درخواستیں ان کی خدمت میں گذارتے، ان کے جواب لکھتے، اور ان کی زبان سے جو بھی اچھی بات نکلتی اسکو نوٹ کرتے اور دیر گئے تک ان کے پاس رہتے تھے۔

شیخ بھی خسرو کو بہت چاہتے تھے انھوں نے خسرو کو 'ترک اللہ' کا خطاب دے رکھا تھا، اکثر کہا کرتے کہ میں سب سے اکتا جاتا ہوں یہاں تک کہ اپنے آپ سے اکتا جاتا ہوں لیکن خسرو سے کبھی نہیں اکتاتا، وہ یہ بھی کہتے کہ اگر ایک قبر میں دو آدمیوں کو دفن کرنے کی اجازت ہوتی تو میں وصیت کرتا کہ خسرو کو میرے پہلو میں دفن کیا جائے۔

جب شیخ کا انتقال ہوا تو خسرو دہلی میں نہیں تھے، شاہی لشکر کے ساتھ ایک مہم پر گئے ہوئے تھے۔ جب وہ واپس ہوئے اور انھیں پتہ چلا کہ شیخ کا انتقال ہو گیا ہے تو پھر اپنے ہوش کھو بیٹھے، کپڑے پھاڑے، سیاہ لباس پہنا اور روتے دھوتے ان کے مزار پر پہونچے، ان کی زبان پر یہ دوہا تھا ؎

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس ٭ چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چو [illegible]

جو شخص کہ شیخ کا نہ صرف مرید بلکہ ان کا محبوب اور خلیفہ ہو، جس کی پوری زندگی درباروں میں رہنے کے باوجود عبادت و ریاضت میں گذری ہو، جس کا زیادہ تر وقت درباروں کے بجائے خانقاہوں میں گذرتا ہو، اس کے متعلق یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ تصوف اور دنیائے معرفت کی باریکیوں سے ناواقف ہوگا۔ اپنی غزلوں میں انھوں نے نہ صرف پیار و محبت اور رندی و سرمستی کی باتیں کی ہیں بلکہ معرفت کے راز بھی بہت کھولے ہیں۔ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ صرف

دو غزلیں پیش کی جاتی ہیں ۔

• دل ز تن بردی و در جانی ہنوز	جسم سے جان نکال لی اور جان ہی میں چھپے ہوئے ہو
دردہا دادی و درمانی ہنوز	تم نے بہت درد دیے لیکن ان کی دوا بھی تم ہی ہو
آشکارا سینہ ام بشگافتی	تم نے کھلے عام میرا سینہ چاک کیا
ہمچناں در سینہ پنہانی ہنوز	پھر اسی سینہ میں اپنی جگہ بھی بنائی ہے
ہر دو عالم قیمت خود گفتہ ای	تم نے کہا تھا، دونوں جہاں دے دو اور مجھے لے لو
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز	اپنا نرخ بڑھاؤ، سستے معلوم ہوتے ہیں
ما ز گریہ چوں نمک بگداختیم	ہم رو رو کر نمک کی طرح گھل گئے
تو بخندہ شکرستانی ہنوز	اور تم ہنس ہنس کر مصری کی ڈلی بنے جا رہے ہو
پیری و شاہد پرستی ناخوش است	یہ بڑھاپا اور عشق بازی، کوئی اچھی چیز نہیں
خسروا تا کی پریشانی ہنوز	اے خسرو! کب تک تم ان الجھنوں میں پڑے رہو گے
• ما کہ در راہ غم قدم زدہ ایم	ہم نے محبت کی راہ میں قدم رکھنے کے بعد
بر خط عافیت قلم زدہ ایم	آرام و آسائش کو تیاگ دیا ہے
ما بہ طوفان عشق غرقہ شدیم	اور عشق کے سیلاب میں ڈوب کر
بر سر نہ فلک قدم زدہ ایم	نویں آسمان کے سرے پر جا پہونچے ہیں
قدمی کو براہ عشق شتافت	جو قدم عشق کی راہ میں بڑھ چکا ہے
دیدہ بر راہ آں قدم زدہ ایم	ہم اس کے راستے میں آنکھیں بچھاتے ہیں
چونکہ اندر وجود نیست ثبات	چونکہ وجود کو ثبات حاصل نہیں ہے
دست در نامۂ عدم زدہ ایم	ہم نے "عدم" کا دامن تھام لیا ہے
از سر نیستی چو سلطانی	اس کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے ہی سے تم سلطان ہو
ہستی ہر دو کون کم زدہ ایم	اسی لئے ہم نے کبھی تمھارے سامنے اس کائنات کو اہمیت ہی نہ دی۔

ان غزلوں میں خسرو نے ایک صوفی صافی کی طرح "خدا کی پہچان" "ہمہ اوست" کی اصلیت، دنیا کی بے ثباتی، سالک کا مقام، بقا و فنا کا مسئلہ، کون و مکاں کی حقیقت، اور "اللہ بس باقی ہوس" جیسی معرفت کی باتوں کو لے کر اپنے خاص انداز میں ان کا تجزیہ کیا ہے۔ اور ان کی باریکیاں بتائی ہیں، ان کو گو ہم سمجھ نہیں سکتے لیکن محسوس ضرور کر سکتے ہیں۔

خسرو کی اخلاقی بلندی بے مثال تھی، عام اخلاقی باتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ اس زمانہ کا ایک عام آدمی بھی

ان کا پابند تھا لیکن ان کے ہاں اخلاقی عظمت کی جو مثالیں ملتی ہیں وہ اچھے اچھوں میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ صبح شام سلاطین و امرا کے ساتھ رہنے کے باوجود کبھی انھوں نے کسی کی خوشامد نہیں کی، ان میں خوبیاں دیکھیں تو ان کی تعریف کردی، غلط باتیں پائیں تو نرمی سے ان کی طرف متوجہ کردیا۔ طاقتور کے مقابلے میں کمزور کا ساتھ دیا۔ ہمیشہ جو بات کہی، سلاطین کی ناراضی انھیں منظور تھی لیکن حق بات کو چھپانا انھیں منظور نہیں تھا۔ ایک واقعہ لیجئے ۔

شیخ نظام الدین اولیاء۔ امرا و سلاطین کے سایوں سے ہمیشہ دور رہے کبھی کسی نے عقیدت مندی دکھائی اور حاضرِ خدمت ہونے کی خواہش بھی کی تو اس کو خوبصورتی کے ساتھ ٹال دیا۔ جلال الدین خلجی کو شیخ کی اِس عادت کا علم تھا۔ اس نے طے کیا کہ ایک دن اطلاع دیے بغیر ہی شیخ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیئے۔ خسرو کو اپنے پیر کی پریشانی منظور نہ تھی، انھوں نے سلطان کے اس ارادے سے شیخ کو آگاہ کردیا۔ اور شیخ اِس ملاقات سے بچنے کی خاطر غیاث پور چھوڑ اجودھن روانہ ہوگئے۔ سلطان کو جب اِس کا علم ہوا تو وہ خسرو پر خفا ہوا اور کہا "تم نے میرا بھید کھول کر مجھے شیخ کی قدمبوسی سے محروم کردیا"۔ خسرو نے فوراً جواب دیا" سلطان کے خفا ہونے سے صرف جان جانے کا ڈر تھا، لیکن شیخ کی رنجش سے ایمان جانے کا ڈر تھا"

جو شخص اس قدر بلند اخلاق کا مالک ہو اس کی شاعری میں اس کی چھاپ کا نہ ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ خسرو کی غزلوں میں ہمیں پند و نصیحت اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی عکاسی بھی قدم قدم پر ملتی ہے۔ صرف دو غزلیں حاضر ہیں -

● یاراں کہ بودہ اند ندانم کجا شدند	پتہ نہیں اتنے سارے دوست کہاں گئے
یارب کہ روز بود کہ از ما جدا شدند	اے خدا! وہ کونسا دن تھا کہ جس دن یہ سب ہم سے جدا ہوگئے۔
ای گل چو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند	پھولو! تم زمین سے آئے ہو، تم ہی بتاؤ کہ
آں رو یہا کہ در تہ گرد فنا شدند	وہ ساری مورتیں جو مٹی میں مل گئیں، کیسی ہیں۔
آں سروراں کہ تاج سر خلق بودہ اند	وہ سارے سردار جو کل تک عوام کے سر کا تاج بنے ہوئے تھے
اکنوں نظارہ کن کہ ہمہ خاک پا شدند	آج دیکھو کس طرح پاؤں کی دھول بنے ہوئے ہیں
خورشید بودہ اند کہ رفتند زیر خاک	کیا ہوئے وہ ذرّے، جو کل فضا میں بلند ہوئے تھے
آں ذرہا کہ ہر ہمہ اندر ہوا شدند	سورج بنے یا مٹی میں مل گئے
بازیچہ ایست طفل فریب ایں متاع دہر	یہ دنیوی مال و اسباب بچوں کو خوش کرنے والا ایک کھیل ہے۔
بے عقل مرداں کہ بدیں مبتلا شدند	ناسمجھ ہیں وہ لوگ جو اس کھیل سے دھوکا کھاتے ہیں
خسرو گریز کن کہ وفا رفت ایں زماں	خسرو! ان دنیا والوں سے بھاگو، آج وفاداری نہیں رہی
زاہل جہاں کہ ہمچو جہاں بے وفا شدند	یہ لوگ بھی دنیا ہی کی طرح بے وفا ہو چکے ہیں ۔

وقت آنست کہ بار د بخرابات نہیم — وقت آگیا ہے کہ ہم ویرانوں کی طرف چل دیں
چند بر زرق وریا نام مناجات نہیم — عبادت کے نام پر جھوٹ اور مکاری کب تک
گر فروشیم مصلیٰ زپے می بر از انک — ہم شراب کے بدلے مصلے بیچ ڈالیں تو اس سے اچھا ہے
رفت تزویر بہ بازار مکافات نہیم — کہ مکر و فریب کا سامان لیکر میدان حشر میں جائیں
مست گر بپای بلغزد چو دراں ثابت پاست — اگر کسی شرابی سے لغزش ہو اور وہ اس پر ثابت قدم رہے
دیدہ بر پاش بصد عذر و مراعات نہیم — تو ہم پوری عزت کے ساتھ اسکی راہ میں آنکھیں بچھانے کو تیار ہیں
دل خسرو کہ ہمہ شیشۂ می می سنجد — خسرو کا دل جو ہمیشہ شراب کی بوتل پر نظر لگائے رہتا ہے۔
سنگ قلب است کہ در پلۂ طاعات نہیم — ایک ایسا باٹ ہے جو عبادت کے پلڑے میں رکھا جا سکتا ہے۔

ان غزلوں میں خسرو نے زندگی اور موت کی حقیقت، دنیا سے دل لگانے کا انجام، دوستوں کی بیوفائیاں، مذہب کے نام لیواؤں کی مکاریاں، دنیوی جاہ و جلال کی بے ثباتی، اچھائی اور برائی کا معیار، اس قسم کے اور بہت سے اخلاقی مسائل کو بڑی خوبی سے قلمبند کیا ہے۔ وہ مکار نمازی کے مقابلے میں صاف گو شرابی کو ترجیح دیتے ہیں۔ انکی نظروں میں صرف وہ آدمی عزت کے قابل ہے، جو اپنے کردار کا پکا ہو۔

وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

گلاب کی ایک ایک پنکھڑی کو لے کر اس کے رنگ روپ کی تعریف کرنے سے وہ بات پیدا نہیں ہوسکتی جو گلاب کو مجموعی طور پر دیکھ کر اس کے حسن، اس کی نرمی، اس کی نزاکت اور اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہونے میں ہے۔ اسی لئے ہم نے خسرو کی غزلوں کی معنوی خوبیاں بیان کرتے وقت عام رواج کے مطابق ایک ایک شعر کو لے کر اس پر بحث نہیں کی ہے بلکہ ایک مضمون کی پوری پوری غزلوں کو نقل کر دیا ہے۔ اس سے ہمارا ایک مقصد تو یہی تھا کہ قاری کی توجہ کو بٹنے سے بچا کر اس کے دل میں ایک کیفیت اور ایک تاثر پیدا کیا جائے، دوسرا ہم یہ بھی چاہتے تھے کہ اگر قاری کے سامنے خسرو کی چند غزلیں اپنے بھرپور روپ میں آجائیں گی تو پھر ہمیں ان کی ظاہری خوبیاں گنانے میں دشواری نہ ہوگی۔ اور ہم آسانی کے ساتھ بتا سکیں گے کہ خسرو نے جو زبان استعمال کی ہے وہ کس قدر خوبصورت اور حسین ہے۔ چنانچہ اگر اس مضمون کے پڑھنے والے فارسی زبان سے واقف ہوں تو وہ انہی چند غزلوں کی مدد سے خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ خسرو کی زبان میں جو مٹھاس جو گھلاوٹ ہے، ان کے ہاں الفاظ کا جو رچاؤ ہے۔ ترکیبوں کی جو چستی ہے اور محاوروں کی جو بندش ہے، اس نے ان غزلوں کے حسن، اثر اور آہنگ کو کس قدر بلند کر دیا ہے۔ ان غزلوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ایک چندن ہار ہو، اور اس میں رنگ برنگی نگینے بڑے سلیقے سے جڑے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی خسرو نے ان غزلوں کے لئے جو زمینیں چنی ہیں، ان کی وجہ سے ان میں ایک ترنم اور موسیقی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے جس کو ہم بھی دو ایک شعر گنگنا کر محسوس کر سکتے ہیں۔

خسرو کی غزلوں کی یہی وہ معنوی اور ظاہری خوبیاں تھیں جنھوں نے ان کی غزلوں کو دربار تو دربار عوام تک میں مقبول کر دیا تھا اور دہلی کے گلی کوچوں میں وہ گائی جانے لگیں۔ خود شیخ نظام الدین اولیاؒ کے ہاں محفل سماع منعقد ہوتی تو شیخ کی ہدایت پر قوال زیادہ تر اس مقصد کے لئے خسرو ہی کی غزلوں کا انتخاب کرتے تھے، محفل جمتی، ایک طرف شیخ [illegible]، دوسری طرف خسرو اور پھر شیخ کے مرید اور ارادت مند، قوالی شروع ہوتی اور خسرو کا کلام پڑھا جاتا، جیسے جیسے قوال وہ دھیمی اور پُرسوز آواز کے دوش پر بیٹھ کر، تاثیر کی بلندیوں کو چھوتے ویسے ویسے شیخ اور دوسرے سننے والوں پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی، قوال جھومتا، شیخ جھومتے، خسرو جھومتے، محفل جھومتی۔ زمین آسمان جھومتے، ساری کائنات جھومتی تھی۔

وہ دن اور آج کا دن، خسرو خدا کو پیارے ہو گئے، لیکن انکی غزلوں کی کسک آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہے۔ اور آج بھی جب کسی نشرگاہ سے انکی کوئی غزل فضا کی خاموشی کو چیرتی ہوئی ہم تک پہونچتی ہے، تو ہم بھی مست ہو کر جھوم اُٹھتے ہیں۔

ہماری اس پوری بحث سے یہ صاف ظاہر ہے کہ دانشوروں نے ایک اچھی غزل کی جو خوبیاں بتائی ہیں۔ یا زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں جس قسم کی خوبیوں کی اضافہ ہوتا گیا وہ ساری کی ساری ہمیں خسرو کی غزلوں میں ایک ساتھ ملتی ہیں۔ اور مکمل صورت میں موجود ہیں۔ اِس اعتبار سے انکی غزلوں کو اِس صنف کی بہترین نمائندہ سمجھنا چاہیئے۔

لیکن اتنا کہدینے سے بات پوری نہیں ہو جاتی۔ فارسی غزل گوئی میں ان کا مقام متعین کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان کی غزلوں کا اور شاعروں کی غزلوں سے مقابلہ کریں اور دیکھیں کہ کون اسمیں زیادہ کامیاب ہے یا غزل کو کس کی دین یاد ہے۔

ہم نے ابتدا ہی میں لکھدیا ہے کہ سعدی تک گو اکثر شاعروں نے غزلیں بھی لکھی ہیں، لیکن غزل کو بھرپور روپ دینے کا اصل سہرا سعدی کے سر ہے۔ خسرو سعدی ہی کے خوشہ چیں تھے۔

خسرو کے بعد غزل کے میدان میں حافظ نے قدم رکھا اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر اس کو انتہائے کمال تک پہونچا دیا۔ حافظ کو غزل سے اور غزل کو حافظ سے زندگی ملی۔

حافظ کے بعد ڈیڑھ سو سال تک غزلیہ شاعری کی دنیا میں ایک سناٹا سا رہا۔ سیاسی نشیب و فراز نے شاعروں کے دل سے زندہ رہنے کی قوت ہی چھین لی۔ پھر صفوی دورِ حکومت میں امن و امان کا دور دورہ ہوا تو شاعری کی دنیا میں پھر بہار آئی۔ اور اکثر شاعروں نے دیگر اصناف کے ساتھ غزلیں بھی موزوں کرنا شروع کر دیں۔ لیکن ان کا رنگ بعض مخصوص معتقدات کی وجہ سے پچھلے عام رنگ سے الگ تھا۔

اِس طرح ہمیں غزل کی اِس پوری تاریخ میں صرف تین نام ایسے ملتے ہیں کہ جن کا رشتہ غزل گوئی کے ساتھ مضبوطی سے بندھا ہوا تھا اور جن کی غزلیں ادب کی دنیا میں امر ہو چکی ہیں۔ یہ تین غزل گو شاعر ہیں۔ سعدی۔ خسرو اور حافظ۔ حافظ بہرحال سعدی اور خسرو کے خوشہ چیں تھے۔ ان کی غزلوں میں جو زندگی، جو تاثیر، اور جو جادو ہے وہ ان کی اپنی خداداد صلاحیت کے علاوہ سعدی و خسرو کا بھی رہین منت ہے۔ اِسلئے غزل گوئی میں خسرو کا مقام متعین کرتے وقت خسرو اور حافظ

کا مقابلہ درست نہ ہوگا۔ اب صرف سعدی اور خسرو رہ جاتے ہیں۔ جن کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ دونوں مزاجاً صوفی تھے دونوں کی اصل جولانگاہ غزل نہیں بلکہ نظم و نثر کے دوسرے میدان تھے۔ دونوں کے ہاں غزل کو ثانوی حیثیت حاصل تھی دونوں کو سیاسی و سماجی اتار چڑھاؤ کا بے حد تجربہ تھا۔

لیکن عملاً مقابلے کی یہ کوشش ہمیں کسی خاص نتیجے تک نہیں پہونچا سکتی۔ اسلئے کہ سعدی اور خسرو دو مختلف جگہوں کی پیداوار تھے۔ دو مختلف حالتوں کا انھیں سامنا تھا، ایک نے ایسی سرزمین میں بیٹھ کر شاعری کی جہاں کی زبان جہاں کا ماحول، اور جہاں کی سماجی روایتیں فارسی غزل کے مزاج کے مطابق تھیں۔ اس کا ہر نقش حقیقی اور فطری تھا، لیکن دوسرے نے اس زبان کے اصلی مرکز سے دور، بہت دور بیٹھ کر اس راگ کو چھیڑا۔ گو یہاں بھی یہ زبان رائج تھی، یہاں بھی ایک خاص طبقے نے ایرانی تہذیب اور ایرانی روایات کو اپنا رکھا تھا۔ لیکن بہرحال یہ زبان، یہ تہذیب ان کی اپنی اصلی نہیں تھی، اپنائی ہوئی تھی، اس لئے دونوں کو ایک کسوٹی پر جانچنے کی کوشش کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ البتہ دونوں کا اپنا الگ الگ رنگ معلوم کرنے کے لئے ہم یہاں ان کی صرف دو دو غزلیں نقل کرتے ہیں ؎

سعدی

خوب رویانِ جفا پیشہ وفا نیز کنند
بکساں درد فروشند دوا نیز کنند
پادشاہانِ ملاحت چو بہ نخچیر روند
صید را پای ببندند و رہا نیز کنند
نظری کن بمنِ خستہ کہ ارباب کرم
بضعیفاں نظر از بہر خدا نیز کنند
عاشقاں را ز بر خویش مراں تا بر تو
سر وزا ہر دو فشانند و دعا نیز کنند
بوسہای زاں دہن تنگ بدہ یا بفروش
کایں متاعیست کہ بخشند و بہا نیز کنند
سعدیا گر نہ کند یاد تو آں ماہ مرنج
ما کہ باشیم کہ اندیشۂ ما نیز کنند

خسرو

دلبراں مہر نمایند و وفا نیز کنند
دل بر آں مہر نہ بندی کہ جفا نیز کنند
چند گویند کہ گہ گہ بدلش می گذری
ایں حدیثی است کہ بہر دل ما نیز کنند
عالمی را بکش از غمزہ کہ ترکاں بخدنگ
گرچہ بکشند سہی صید رہا نیز کنند
عاشقاں گرچہ ترا بہر جفا بد گویند
از پی چشم بد خلق دعا نیز کنند
منعماں گرچہ برانند گدا را از در
گہ گہی حاجت درویش روا نیز کنند
سوی خسرو نگہی کن بہ طفیل دگراں
کاھل دولت نگہی سوی گدا نیز کنند

[یہ حسن والے صرف ظلم نہیں کرتے وفا بھی کرتے ہیں
وہ جن لوگوں کو درد بیچتے ہیں انھیں دوا بھی دیتے ہیں

[یہ دل لینے والے محبت اور وفا بھی کرتے ہیں
لیکن تم ان سے دل نہ لگانا کیونکہ وہ ظلم بھی ڈھاتے ہیں

حسن کے یہ بادشاہ جب اپنے نخچیر کے ساتھ چلتے ہیں
تو کبھی شکار کے پیر باندھتے ہیں اور کبھی چھوڑ دیتے ہیں
مجھ غریب کیطرف بھی محبت کی ایک نظر کرو، کیونکہ اچھے لوگ
کبھی خدا کے لئے بھی کمزوروں کے ساتھ مہربانی سے پیش آتے ہیں
اپنے چاہنے والوں کو تم محفل سے مت نکالو
یہ لوگ تم پر نہ صرف جان و مال قربان کرتے ہیں بلکہ دعا بھی دیتے ہیں
اصفہان نازک ہونٹوں کا بوسہ دو یا بھینچو
کیونکہ یہ چیز ہی ایسی ہے جو یا محبت سے دیجا سکتی ہے یا قیمت لیکر
اے سعدی اگر وہ ماہرو تمہاری طرف نہیں دیکھتا تو تم غنیمت کرو
ہم ہیں ہی کون جو اپنی فکر کریں]

دوستوں کا کہنا ہے کہ کبھی ان کے دلمیں ہماری یاد بھی آتی ہے۔
اور یہ ایک ایسی بات ہے جو میرے دل کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔
تم اپنی اداؤں سے لوگوں کو جا ہو تو مارو، ترک تیروں سے
شکار کو مارتے بھی ہیں اور چھوڑ بھی دیتے ہیں
تمھارے پرستار تمھارے ظلموں کیوجہ سے تمھیں برا ضرور کہتے ہیں۔
ساتھ ہی وہ تمھارے حق میں نظر بد سے بچنے کی دعا بھی کرتے ہیں۔
بڑے لوگ غریبوں کو اپنے دروازے سے بھگا ضرور دیتے ہیں
لیکن کبھی انکی ضرورت پوری بھی کر دیتے ہیں
دوسروں کے طفیل ہی سہی، کبھی خسرو کو محبت بھری نظر سے دیکھ لیا کرو۔
کیونکہ دولتمند کبھی غریب کیطرف ہمدردی سے بھی دیکھ لیا کرتے ہیں]

سعدی

آخر نگہی بسوی ما کن
دردی بہ تفقدی دوا کن
بسیار خلاف وعدہ کردی
آخر بہ غلط یکی وفا کن
مارا تو بخاطری ہمہ روز
یک روز تو نیز یاد ما کن
ایں قاعدۂ خلاف بگذار
ویں خوی معاندت رہا کن
آں را کہ ہلاک می پسندی
روزی دو بخدمت آشنا کن
سعدی چو حریف ناگزیر است
تن در دہ و چشم در قضا کن
زیبا نبود شکایت از دوست
زیبا ہمہ روز گو جفا کن

[کبھی تو اک نظر ہماری طرف کرو
تم نے درد دیا ہے کبھی بھولے سے دوا بھی کردو
تم نے وعدہ خلافی بہت کی ہے

خسرو

آخر نگاہی در حال ما کن
درد دلم را روزی دوا کن
از دست ہجراں من در بلایم
یارب بفضلت آن را دوا کن
گفتی بوصلت روزی نوازم
وقت است جانا وعدہ وفا کن
من در فراقت شوریدہ حالم
باز آ و رحمی بر حال ما کن
صد رہ نویدم دادی بوصلت
امید ما را باری وفا کن
از خوبرویان زشتی نیاید
ایں زشت روئی آخر رہا کن
در عشق خسرو دل را چہ قیمت
جان در رواں را پیشش فدا کن

[کبھی اک نظر ہمارے حال پر بھی کرو
اور ایکدن ہمارے دردِ دل کی دوا بھی کرو
جدائی کے ہاتھوں میں مصیبت میں پڑ گیا ہوں

کبھی غلطی سے وعدہ وفائی بھی کرو
ہم تو روز ہی تم کو یاد کرتے ہیں
تم بھی ایک آدھ دن ہمیں یاد کرکے دیکھو
یہ غلط اُصول چھوڑو
اس غلط عادت سے باز آؤ
جس کو تم ہلاک کرنا چاہتے ہو
دو ایک دن اسکو اپنی خدمت میں رکھ کر بھی دیکھو
سعدی! جب حریف سے چھٹکارا نہیں
تو پھر اسکو برداشت کرہی لو اور فیصلہ قسمت پر چھوڑ دو
دوست کی شکایت اچھی نہیں
بلکہ اچھا یہ ہے کہ کہو" ہاں اور ستم ڈھاؤ"]

یارب! اپنے فضل سے تو ہی اس سے بچا
تم نے کہا تھا کہ ایک دن میں تمھیں نوازوں گا
اے محبوب! وقت آگیا ہے اب تم اپنا وعدہ پورا کرو
تمھاری جدائی میں میں پریشان حال ہوں
لوٹ آؤ اور میرے حال پر رحم کرو
تم نے سو بار ملنے کی خوشخبری دی ہے
ایک بار تو ہماری آس پوری کرو
حسینوں کو یہ ترش روئی زیب نہیں دیتی
اچھا ہوگا اگر اس سے باز آؤ
اے خسرو! محبت کے بازار میں دل کی کوئی قیمت نہیں ہے۔
بہتر ہوگا اگر تم اسکے آگے اپنی جان ہی قربان کردو]

اس طرح سعدی اور خسرو کے ذخیرۂ غزل کا ایک ساتھ مطالعہ کرنے پر جو تاثر دل میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خسرو نے کہیں بھی چاہے وہ اظہار جذبات کے معاملے میں ہو یا طرز ادا کے معاملے میں ہو، سعدی کا رنگ اڑانے کی ہرگز کوشش نہیں کی ہے ان کا اپنا رنگ جدا ہے اور اسلوب جدا، یہاں تک کہ بحروں کے معاملے میں بھی خسرو نے بڑی احتیاط برتی ہے، اور اس بات کی شعوری طور پر کوشش کی ہے کہ بحروں اور ردیف قافیوں کے معاملے میں بھی وہ اپنے آپکو سعدی سے الگ ہی رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہمنے سعدی اور خسرو کی ایک جیسی غزلوں کو ڈھونڈھنے کی کوشش کی تو سوائے مذکورہ دو غزلوں اور ایک آدھ اور غزل کے اور کوئی غزل ایک زمین اور ایک ردیف قافیہ میں نہیں ملی اور انمیں بھی دونوں کی اپنی انفرادیت قدم قدم پر ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ آواز ایک ہے لیکن انداز الگ ہیں۔

مختصر یہ کہ فارسی شاعری نے تین ہی باکمال غزلگو پیدا کئے ہیں۔ سعدی۔ خسرو اور حافظ، خسرو کا مقام ہماری نظروں میں اسلئے بھی بلند ہے کہ دو سوفی صد سرزمین ہند کی پیداوار تھے۔ اور اسپر انھیں بجا طور پر ناز بھی تھا۔

خسرو از خاک کف پای بتاں گشت چہ باک
ہر کہ در کوی بتاں خاک شود ہمت اوست

حوالے:- (۱) شبلی نعمانی : شعرالعجم اول تا پنجم ، دارالمصنفین ، اعظم گڑھ
(۲) عبدالسلام ندوی : شعرالہند اول و دوم دارالمصنفین اعظم گڑھ
(۳) خلیق احمد نظامی : سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ، ندوۃ المصنفین دہلی
(۴) محمد وحید مرزا : امیر خسرو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد
(۵) سعید نفیسی (مرتب) دیوان کامل امیر خسرو دہلوی تہران
(۶) مہدی سہیلی (مرتب) شاہکارہای سعدی تہران

ضمیر نیازی :-

خسرو کا صوتِ سرمدی

آج سے سات صدیوں قبل ایک ایسے سپاہی زادہ نے جنم لیا جس کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے میں قلم، تلوار مغرور سلاطین کے دربار سے وابستہ ہو گئی۔ اور قلم نے ایک گوشہ نشین قلندر کے مسکن میں پناہ لی۔

دربار کا طمطراق و پرشکوہ ماحول اور تختِ شاہی کی عظمت و جبروت و رعونت دلوں میں ہیبت پیدا کر دیتی تھی تو دوسری طرف بوریا نشیں فقیر کی کٹیا میں محبت، رواداری اور انسان دوستی کی مشعل فروزاں تھی جس نے ترک اللہ کے سوزِ سینہ کو دو آتشہ میں تبدیل کر دیا۔ آج دنیا اسی سلطانِ سخن گویاں کی والہ و شیدا ہے اور صاحب السیف کو فراموش کر چکی ہے۔ اس اہلِ قلم کا نام یمین الدین ابو الحسن خسرو ابن امیر سیف الدین محمود تھا۔

ہندوستان کی ہزار سالہ فارسی شاعری کی تاریخ میں پانچ ایسے شاعر — خسرو۔ فیضی۔ بیدل۔ غالب اور اقبال — پیدا ہوئے جنھیں ایران کے مسلم الثبوت اساتذہ کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ بقول نیاز فتحپوری: "برصغیر کا سب سے پہلا شاعر جس کا جواب جامعیت کے لحاظ سے ایران کی سرزمین بھی پیش نہ کر سکی، خسرو تھا" ان کی شاعرانہ عظمت اور زباندانی کا یہ عالم تھا کہ حافظ۔ جامی۔ اور عرفی کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
ایں قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ می رود — حافظ

بہ روحِ خسرو ایں پارسی شکر دارم
کہ کامِ طوطیِ ہندوستاں شود شیریں — عرفی

"امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمہ در ..... قصیدہ و غزل و مثنوی و غیرہ ہمہ را بکمال رسانیدہ" — جامی

اگر ان تمام علوم و فنون کو سامنے رکھا جائے جن کے خسرو ماہر تھے اور ساتھ ہی ان کے حجم و مقدار کو ملحوظ رکھا جائے تو ایران کے تمام شاعر مل کر بھی ان کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔ قادر الکلامی کا یہ حال کہ ہر صنفِ سخن کے جامع غزل میں سعدی، مثنوی میں نظامی۔ تصوف، فلسفہ میں سنائی اور قصائد میں کمال اسمٰعیل اور رضی نیشاپوری کے قدم بہ

قدم چلے۔

خسروؔ نے شاعری کی ابتدا عمر کے اُس حصہ میں کی جبکہ سخن گوئی اور سخن فہمی تو کجا انسان میں صحیح شعر پڑھنے کی بھی صلاحیت نہیں ہوا کرتی۔ ان کے لڑکپن کے ذوقِ شعری کے بارے میں خود انہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں :-

"بندہ خسرو نکتہ پرداز ہے کہ عنایتِ ایزدی سے میں نے ۱۰، ۱۱ برس کی عمر میں بیت و رباعی کہنی شروع کی اس عہد کے عالم و فاضل اُسے سن کر تعجب کرتے اور ان کے تعجب سے میرا شوق ابھرتا۔ وہ بزرگ میری قابلیت دیکھ کر مجھے ترغیب دیتے میرا یہ عالم کہ کثرتِ شوق کے اثر سے شام سے صبح تک مثلِ قلم سرنگوں رہتا اور رات کو مطالعہ میں مصروف رہتا۔ یہاں تک کہ دقتِ نظر پیدا ہوئی اور کلام کی باریکیاں خیال میں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ابنائے جنس میری طبیعت کا امتحان لیتے۔ اس امتحان سے میرا دل گرماتا تھا اور دل کی گرمی زبان میں روانی پیدا کرتی تھی ..... اس صغر سنی میں جبکہ میرے دودھ کے دانت ٹوٹے تھے۔ میرا کلام نمونۂ زر افشانی تھا۔"

یہ گرمیٔ دل اس وقت سوزشِ دل میں تبدیل ہوگئی۔ "جب یہ بندۂ ضعیف و نحیف خسرو لاچین نے ملک المشائخ فی الارضین ..... کی دولتِ پائے بوس حاصل کی ..... اور شرفِ بیعت سے مشرف فرمایا" جس کا اعتراف خسروؔ نے ان الفاظ میں کیا ہے ؎

غلیانِ خسرو است از سوزشِ دل
بنالد دیگ چوں آتش کند جوش

خسروؔ کے خود اپنے بیان کے بموجب دودھ کے دانت نکلے تھے کہ شاعری شروع کر دی تھی لیکن جس چیز نے اس شراب کو دو آتشہ بنا دیا وہ حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کے سلسلۂ عالیہ میں ان کی شمولیت تھی جس نے خسروؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو ایسا اجاگر کیا کہ کلام میں شیرینی کے ساتھ ساتھ صدق و صفا۔ مکمل سپردگی، بے خودی اور والہانہ پن کے وہ اعلیٰ جوہر پیدا کر دیے جو تصوّف کی دین ہے۔ اس قربت نے ان میں وسعتِ نظر، تنوّعِ فکر، ندرتِ خیال اور نفاست کی وہ دولت عطا کی کہ آج سات صدیاں بیت جانے کے باوجود خسروؔ کے چھیڑے ہوئے صوت سرمدی کی رنگینی، تابنائی اور تازگی ماند نہ پڑ سکی۔ دیکھا جائے تو شاعر خسروؔ اور صوفی خسروؔ کی شخصیت کوئی جدا جدا نہیں ہے۔ امیر کی شاعری کا معتد بہ حصہ پیر و مرشد کے نظریات و تعلیمات کی تفسیر و تعبیر ہی ہے، ان کی شاعرانہ عظمت و شہرت نے جہاں اس عہد کے دوسرے شعراء کی خوبیوں اور صلاحیتوں کو گہنا دیا۔ وہیں میدانِ تصوّف میں ان کی اہمیت کو نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ خسروؔ ساری عمر حکمرانوں اور امیروں کے دربار سے وابستہ رہے۔ اس عالمِ امارت کے باوجود اپنے پیر و مرشد کے یارِ وفادار اور محرمِ اسرار رہے۔ اس تضادِ زندگی کا خود انہیں بھی احساس تھا۔ فرماتے ہیں ؎

مردِ اہلِ طریقت لباسِ ظاہر نیست
کمر بخدمت ببند و صوفی باش

یہ تصوف بذاتِ خود بے عملی، فرار اور ترکِ دنیا کا فلسفہ نہیں بلکہ احترامِ آدمیت۔ انسان دوستی، رواداری اخوت اور بھائی چارہ کے اعلیٰ آدرشوں کی تعلیم کے ساتھ خودداری، خود اعتمادی اور عزتِ نفس کا اعلیٰ درس دیتا ہے۔ دیباچہ غرۃ الکمال میں احترامِ آدمیت کے سلسلے میں لکھتے ہیں:-

"اگرچہ آدمی بے حساب است ولیکن در دیوانِ آدمیت ہمہ را در حسابِ آدمیت نتوان شمرد" (اگرچہ آدمی بے شمار ہیں لیکن زمرۂ انسانیت میں سب شامل نہیں ہیں)۔

یہ عزتِ نفس، خودداری اور احترامِ آدمیت خسرو کو عارضی مصلحتوں کے سامنے سرنگوں ہونے نہیں دیتی۔ کہتے ہیں ؎

مرد گردِ ہر درکہ نانت دہند
در کعبہ زن تا امانت دہند

(روزی کی تلاش میں مارا مارا نہ پھرا کر، بلکہ خانۂ خدا کی جانب متوجہ ہو جا تاکہ تجھے امان مل جائے) کیونکہ ؎

ضامنِ روزیٔ تو روزی رساں
دیدۂ کورِ تو بسوئے جہاں

(تیری روزی کا ضامن تو خدا ہے، لیکن تو اپنی بے بصری کے سبب دنیا کی جانب دیکھ رہا ہے)۔

جب انسان اپنے ہی جیسے انسانوں سے بے نیاز ہو کر بارگاہِ رب العزت میں سربسجود ہوتا ہے۔ تو یہ ایک سجدہ اسے ہزاروں سجدوں کی لعنت سے آزادی عطا کرتا ہے۔ یہ آزادی اس میں طبعِ بلند، رفعتِ طالع، تخیلِ اعلیٰ، خود اعتمادی اور سچی انابت کے جوہر نمایاں کر دیتی ہے خود اعتمادی کی تلقین اس طرح کرتے ہیں ؎

تکیہ چرا عاری بہ عصائے کسے
زندہ نہ [illegible] کس بہ لقائے کسے

سچی ا[illegible]ت کے بارے میں انتہائی مؤثر انداز میں فرماتے ہیں۔

تا دلت از ترس نہ لرزد چو بید
مغفرتِ امید مدار از امید

آغازِ تصوف سے ہی صوفیائے کرام دو واضح مکاتیبِ فکر میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ خوفِ الٰہی پر زور دیتا تھا اور دوسرا محبتِ الٰہی پر۔ مؤخر الذکر مکتبۂ فکر نے تصوف میں محبت کو ایک مستقل اور محکم مسلک کی صورت میں پیش کیا۔ ان صوفیائے کرام کی نظروں میں کائنات اور اس کا ہر ذرہ۔ اور ہر ذرہ کی حرکتِ عشق ہی کی مرہونِ منت ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا، اس دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے محبوب مرید و خلیفہ بھی اپنے پیر و مرشد کی طرح ادب شناسِ محبت اور رمز گاہِ حقیقت تھے یہ محبت ہی ہے جو دل میں سوز و گداز، جذبات میں تہذیب و ترتیب، نفاست، شائستگی، قلب و نظر میں بلندی، خیالات میں پاکیزگی، گہرائی اور گیرائی پیدا کرتی ہے۔ محبت انسان کی سب سے بڑی قوت، خوبی اور فضیلت ہے۔ خسرو جب نغمۂ محبت الاپتے ہیں تو اس سے خود بھی محظوظ و مسرور ہوتے ہیں اور جب گریہ کناں ہوتے ہیں تو انسان تو انسان بے جان اشیا کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہتے جب محبوب کی جدائی کی گھڑی آن پہونچتی ہے تو نہ صرف وہ اور ان کا محبوب بلکہ ابرِ باراں بھی ان کے ساتھ اشک باری میں مصروف ہو جاتے ہیں ؎

ابرِ باراں و من و یار ستادہ بہ وداع
من جدا گریہ کناں، ابر جدا، یار جدا

اور جب محفلِ نشاط میں کھو جاتے ہیں تو یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں ؎

ما ئیم و شبے، و یار در پیش
جامِ مئے خوشگوار در پیش
گل آمدہ و خزاں گذشتہ
دی رفتہ و نو بہار در پیش

(بہار کے جانفزا موسم نے ہر طرف رنگینیاں بکھیر دی ہیں ہم ہیں، رات ہے، جام ہے اور یارِ دلنواز)۔

عجب یہ سہانا سماں ہو تو کون ایسا کافر ہے جو محبوب کے غمزوں کا شکار نہ ہوگا اور اس کا دل زخموں سے چور نہ ہوگا ؎

کدام دل کہ تو غمزہ زدی نگار نہ شد
کدام کس کہ ترا دید و بے قرار نہ شد

اس بیقراری میں اتنی دلفریبی اور لطافت ہے کہ خسرو اس آنچ کو اور بھی شدید کرنے کے خواہشمند ہیں ؎

دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا
تنم از بے دلی بے چارہ شد بے چارہ تر بادا

(میرا دل عاشقی میں آوارہ ہو گیا ہے، خدا کرے اور آوارہ ہو جائے۔ میرا جسم محبت میں بے چارہ ہو گیا ہے۔ اچھا ہے اس کی بے چارگی میں اضافہ ہو جائے)۔

اس کوچۂ عشق میں اتنی لذت و کشش ہے جو ایکبار یہاں قدم رکھدے تو پھر رہائی ناممکن ہے ؎

ہر کس کہ در قیدِ عشق شد مجنوں
تا قیامت ز بند او نہ رہید

(جو شخص قیدِ عشق میں ایک بار مجنوں ہو گیا تو قیامت میں اسے رہائی نصیب نہیں ہو سکتی)۔

عشق کے اسرار و رموز کو امیر نے مثنوی شیریں خسرو میں فرہاد کی ایک گفتگو میں اسطرح بیان کیا ہے ؎

بگفتش، کیستی، در چہ سازی
بگفتا عاشقم، در جاں گدازی

(پوچھا تم کون ہو اور کیا کرتے ہو، جواب دیا کہ میں عاشق و جاں نثار ہوں)۔ ؎

بگفتش عشق بازاں را نشاں چیست
بگفتا آں کہ با بد در بلا زیست

(پوچھا عاشق کی پہچان کیا ہے۔ جواب دیا کہ ان کی جان ہمیشہ آفت میں رہتی ہے)۔ ؎

بگفتش، عاشقاں زیں رہ چہ پویند
بگفتا، دل دہند و درد جویند

(پوچھا عاشق کس چیز کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ جواب دیا۔ دل دیتے ہیں اور درد لیتے ہیں)۔

یہ دردِ دل اور محبوب کی قیدِ بے زنجیر انسان اس لئے بسر و چشم قبول کر لیتا ہے، کیونکہ ہزاروں سال اس جمالِ دلفروز کے نظارے کے باوجود آرزوئے شوق سرد نہیں ہوتی ؎

شوم فدائے جمالے کہ گر ہزاراں سال
کنم نظارہ، ہنوز آرزو بجا باشد

یہ آرزوئے نظارہ ویسی ہے جو سینہ چھلنی اور دل پارہ پارہ کر دیتی ہے ع

صد چاک شدہ سینہ و صد پارہ شدہ دل

یہ چاک سینہ اور پارہ شدہ دل ہی تو محبت کی معراج ہے۔ اسی نے امیر کی روح و دل میں ایسی سوزش پیدا کر دی کہ وہ ساری عمر عشق و حسن کے ایسے پُر درد نغمے الاپتے رہے جن سے "سوزِ جگر" کی بو آتی ہے۔ بقول خسرو یہ بادۂ لطیف و خوشگوار ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہوتی۔ خونِ دل پینے کے بعد چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے ؎

(باقی مضمون صفحہ ۳۶ پر دیکھئے)

ڈاکٹر انوار الحسن
صدر شعبۂ علوم مشرقیہ عربی و فارسی۔ لکھنؤ یونیورسٹی

امیر خسرو
تہذیبی ہم آہنگی کی علامت

ہندوستان زمانۂ قدیم سے اپنی رنگ برنگی تہذیب کے لئے ایشیا کے ملکوں میں ایک امتیازی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ غیر ملکی اقوام کی آمد سے یہاں کے تہذیبی سرمایہ میں نئے دھارے شامل ہوتے رہے اور ان کے اثرات ہمیشہ رونما ہوتے رہے۔ قدرت نے بھی اس ملک کو جغرافیائی اعتبار سے متنوع آب و ہوا دی ہے جس کے نقوش کشمیر سے راس کماری تک آج بھی نمایاں ہیں۔ آب و ہوا اور پیداوار کے تنوع کے ساتھ ساتھ یہ ملک بہت سی زبانوں اور تہذیبوں کا بھی سنگم رہا ہے۔ مختلف تہذیبوں کے امتزاج سے اس ملک میں ایک حسین گنگا جمنی تہذیب نے جنم لیا جسے "ہندوستانی تہذیب" کہا جاتا ہے۔ اس حسین تہذیبی گلدستہ کے اجزائے ترکیبی میں بدھ مذہب، ہندو مذہب۔ اسلام۔ فلسفہ۔ ویدانت۔ اور تصوف کے رنگ سب سے زیادہ شوخ دلکش اور جاذب نظر ہیں۔

تصوف بقول علامہ شبلی نعمانی "وہ باطنی حسن ہے جو محبت کی بنیادوں پر مشق و ریاضت سے پیدا ہوتی ہے اور جس کے ذریعہ انسان اشیاء کی حقیقت کو روحانی رنگوں میں دیکھتا ہے۔ روحانیت کی ارتقاء انسانیت کی معراج کمال ہے اور تصوف کا بنیادی مقصد ارتقائے روحانیت ہے[۱]۔" تصوف کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ محبت الٰہی اور معیت ذاتی۔ صوفیائے کرام کا دعوےٰ ہے کہ محبت الٰہی کی دعوت خود قرآن کریم میں دی گئی ہے[۲]۔ اور اسی سے معیت و قرب ذاتی کا دعویٰ بطور نتیجہ نکلتا ہے[۳]۔ محبت الٰہی کا عملی راستہ یہ ہے کہ انسان خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے کیونکہ قرآن اسی کی تعلیم دیتا ہے اور احادیث نبوی میں بھی اسی پر زور دیا گیا ہے۔ رسول اکرمؐ اور انکے مقدس صحابہؓ کا طرزِ عمل بھی اسی دعوے کی شہادت دیتا ہے۔

---

۱ شبلی : شعر العجم جلد پنجم صفحہ ۱۲۰
مطبوعہ انوار بک ڈپو لکھنؤ

۲ قرآن کریم پارہ ۲ آیت ۱۶۰ و پارہ ۳۵ آیت ۲۹
و پارہ ۲۰ رکوع ۱ و ۱۴

۳ مکتوبات مجدد الف ثانی جلد اول مکتوب ۲۵
(مطبوعہ لاہور)

صوفیائے کرام نے محبت کے اسی عملی راستہ کو اختیار کیا تھا اور خدمتِ خلق کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں۔ وہ دن رات انسانی دلوں کو ایک رشتۂ الفت میں پرونے کے لئے بے چین رہتے تھے۔ انھوں نے نفرت، دشمنی اور بربریت کے اندھیرے میں محبت کے چراغ جلا کر لوگوں کو روشنی دکھلائی۔ انھوں نے انسانی اخلاق کو سدھارنے کا وہ مہتم بالشان کام کیا جس سے معاشرہ کی اصلاح ہوئی اور بنی نوعِ انسان میں باہمی اخوت اور بھائی چارہ کو فروغ ہوا۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی سے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے اور محبت و یگانگت کی فضا پیدا کرنے پر سب سے زیادہ توجہ صرف کی۔ کیونکہ محبت ہی تمام بلاؤں اور مصیبتوں میں ڈھال کا کام کرتی ہے۔ جو شخص سرتاپا محبت ہو، اسے کسی چیز کا خوف نہیں ہو سکتا اور نہ وہ کسی سے نفرت کر سکتا ہے۔ انبیا اور اولیاء وحشی جانوروں کو رام کر لیتے تھے اور چرند و پرند ان کی پناہ میں رہتے تھے اس کی وجہ غالباً یہی ہوگی کہ ان کی ذات نفرت، عزیت اور خبیث سے پاک اور نورِ وحدانیت کی تجلی گاہ ہوتی تھی۔

صوفیائے کرام اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ اپنے دشمنوں، آزار پہونچانے والوں اور مخالفوں سے محبت کرنا اور ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا محبت کا بزرگ ترین مقام ہے اور اسی سے انسان کو خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے اسی لئے انھوں نے اس راہ کو اپنایا۔

جرمنی کے مشہور فلسفی نیٹشے نے کہا ہے کہ "[1] دوست کو دوست سمجھنے کے بجائے دوست کو دشمن سمجھنا انسان کا بڑا ہنر ہے"۔ دراصل یہ مقولہ ان انسان نما حیوانوں پر صادق آتا ہے جس کی مادّی اور حیوانی صفات ان کی روحانی اور انسانی صفات پر غالب ہیں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام اور صوفیائے کرام کا عمل یہ رہا ہے کہ انھوں نے دشمنوں سے بھی محبت کی ہے۔ مہاتما گوتم بدھ کی تعلیم بھی یہی ہے کہ "دشمنی[2] کو دشمنی سے نہیں دبایا جا سکتا ہے بلکہ دشمنی کو صرف محبت سے زیر کرنا ممکن ہے اس لئے غصّہ کو نرمی سے اور دشمنی کو محبت سے زیر کرنا چاہیئے"۔

کرشن جی کہتے ہیں کہ "جو لوگ[3] تمھیں تکلیف پہونچاتے ہیں اور تم سے نفرت کرتے ہیں انھیں مقدس سمجھو اور ان کا احترام کرو"۔ عیسیٰ علیہ السلام اور سرورِ کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دشمنوں اور مخالفوں کے ساتھ بھی محبت اور شفقت کا جو سلوک کیا وہ دنیا پر روشن ہے۔ صوفیائے کرام انھیں کے نقشِ قدم پر چل کر مخالفوں کو موافق اور دشمنوں کو دوست بنانے کی کامیاب جد و جہد کرتے رہے۔ مشہور فلسفی گوئٹے کہتا ہے "روئے[4] زمین پر تین چیزوں کی حکمرانی ہے۔ عقل، خیال اور طاقت۔ لیکن عشق سو وہ حکمرانی نہیں کرتا ہے بلکہ وصل کا کام کرتا ہے جو سب سے زیادہ اہم ہے" اور صوفیوں نے وصل ہی کا کام انجام دیا ہے۔ اسلام کے سیاسی اور سماجی نظام میں عدل و مساوات انسان دوستی اور عالمی اخوت کو سب سے اہم درجہ حاصل رہا ہے۔ جب تک اسلام کے پیروان اصولوں پر کاربند رہے انھیں دنیا میں سربلندی حاصل رہی۔ اموی دَور میں جب مسلمان حکمرانوں نے اس سے کنارہ کشی شروع کی تو اسی وقت سے ان کا انحطاط بھی شروع ہو گیا۔ اسی لئے انھیں کے عہد میں بصرہ و کوفہ تحریکِ تصوف کے اولین مراکز بنے۔ صوفیائے کرام نے اسلامی تعلیمات ہی کو اپنا

---

[1]، [2]، [3]، [4] رہبرِ نثر از گفتارِ معظم از حسین کاظم زادہ مطبوعہ برلن

شعار بنایا اور معاشرہ کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ محبت و اخوت کے یہ مبلغ جہاں جہاں بھی پہونچے۔ اپنی عملی زندگی سے لوگوں کو متاثر کرتے رہے۔ انھوں نے تہذیبی ہم آہنگی پیدا کرکے اپنے پیغام محبت کی اشاعت کے لئے فضا ہموار کی اور اپنے مقدس مشن کو کامیاب بنانے کے لئے ماحول کو سازگار بنایا مشہور مؤرخ ڈاکٹر تارا چند رقمطراز ہیں :۔ ”صوفیائے کرام کے عقیدوں نے ہندوستان کی تہذیب کی ثروت میں قابل قدر اضافہ کیا۔ مذہبی اور سماجی زندگی کی ترقی میں قابل تعریف کردار انجام دیا۔ توحید باری پر واضح اور شدید ایمان رکھنے کی ترغیب دی اور عشق کی پر زور تاکید کی۔ کیونکہ عبادت کی روح اور عمل صالح کی وہی اصل ہے انسانوں کی برادری کا اعلان، انفرادیت کی عظمت کا اعتراف اور نظام عالم کو اُلوہیت کا قوس نزول و عروج تسلیم کرنا۔ یہ سب تعلیمات ایسی تھیں جنھوں نے ذہنوں میں ہلچل ڈالدی اگرچہ ارباب علم مثلاً پنڈتوں میں کہنے ان نئے خیالات سے استفادہ کیا مگر وسط طبقہ کے ان لوگوں نے جو سنجیدگی کے ساتھ حق و صداقت کے جویا تھے۔ ان خیالات کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔“[1]

تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان میں بھی غازیوں اور مجاہدوں کی تلواروں نے وہ کام انجام نہیں دیا جو پاک باطن صوفیائے کرام کی عملی زندگی کے ذریعہ پورا ہوا۔ امیر خسرو دہلوی صوفیائے کرام کے چشتیہ سلسلہ سے وابستہ تھے، یہ سلسلہ اپنے وسیع اخلاق اور انسانیت دوستی کی بنا پر رسول خدا کے ارشاد ”وکونوا عباد اللہ اخوانا“ پرکاربند تھا اور اسی لئے اس گروہ کے بزرگوں کا خیال تھا کہ ہندوؤں کے ساتھ خوشگوار اور دوستانہ تعلقات رکھے جائیں[1] اور اس ملک کی تہذیبی زندگی میں اپنا مقام بنایا جائے ۔ ”نافع السالکین“ میں خواجہ محمد سلیمان تونسوی کے ملفوظات کے ذیل میں لکھا ہے :۔

”حضرت قبلۂ من قدس سرہٗ فرمودند کہ در طریق ما ہست کہ با مسلمان و ہندو صلح باید داشت و ایں بیت شاہد آوردند ؎

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام[2]

صوفیائے کرام نے عام طور پر اور چشتی مشائخ نے خصوصیت کے ساتھ ہندو مذہب کے بارے میں وسیع النظری اور انتہائی رواداری سے کام لیا۔ انھیں اگر ہندوؤں کی کوئی بات پسند آتی تو اس کی تعریف میں بخل سے کام نہ لیتے۔ ہندوؤں کے تیوہاروں میں ہولی، دیوالی، بسنت اور دوسرے رسم و رواج سے ان کی دلچسپی کسی سے پوشیدہ نہیں خواجہ معین الدین چشتیؒ بابا فرید گنج شکرؒ، اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے عقیدتمند اور ارادت کیشوں میں مسلمانوں کے دوش بدوش ہزاروں ہندو تھے[3]۔ ہندوؤں کے ساتھ ان کی رواداری کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ صبح کے وقت شیخ نظام الدین اولیاء اپنی خانقاہ کی چھت پر سے ہندوؤں کی عبادت اور

---

[1] ہندوستانی کلچر کا ارتقا (تاریخ کے آئینہ میں) از ڈاکٹر تارا چند صفحہ ۴۵ مطبوعہ دہلی

---

[1] نافع السالکین صفحہ ۱۷۶ از مولانا امام الدین مطبوعہ لاہور ۱۲۸۵ھ ہجری

[2] اخبار الاخیار صفحہ ۲۲ مطبوعہ دہلی ۱۳۰۹ھ

و فوائد الفواد صفحہ ۸۵ و ۴۵ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ

ؔشنان کا نظارہ کر رہے تھے۔ امیر خسرو بھی ساتھ تھے۔ حضرت شیخ نے فرمایا ؏

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے[1]

شیخ کے سر پر اس وقت ٹوپی ترچھی لگی ہوئی تھی خسرو نے اسی مناسبت سے فوراً ہی دوسرا مصرع لگا دیا ؏

من قبلہ راست کردم برطرف کج کلاہے

امیر خسرو کی مذہبی رواداری، بے تعصبی اور وسیع النظری کا ثبوت تو خود ان کا یہ شعر ہے ؎

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری

ہم زوے آموز پرستش گری

خسرو خاندانی روایات کے بموجب شاہی دربار سے وابستہ ضرور رہے لیکن وہ صوفی منش اور درویش صفت انسان تھے۔ ان کی نگاہ بلند اور دل وسیع تھا۔ تصوف کی تعلیمات نے انھیں عالمی اخوت اور محبت کا علمبردار بنا دیا تھا۔ ان کے والد ترکی النسل اور ماں ہندوستانی تھیں۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور بوڑھے نانا عماد الملک راوت کے آغوش تربیت میں پروان چڑھے۔ بقول ڈاکٹر تارا چند: "انکی ذات قرآن السعدین تھی جس میں دو تمدنوں کا سنگم نظر آتا ہے۔"[2]

وہ بڑے مرنجان مرنج بامروت خوش اخلاق دوست نواز، منکسر المزاج اور وفا شعار تھے۔ علم موسیقی میں یگانۂ روزگار اور ایسے ذو فنون تھے کہ اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث شخصی حکمرانی اور آمریت کے دور میں بھی مختلف

لہ تزک جہانگیری۔ مطبوعہ علی گڑھ ص ۸۱

ٹہ امیر خسرو اور ہندوستان صفحہ ۱۱ مطبوعہ دہلی

بادشاہوں کے درباروں میں معزز عہدوں پر فائز رہے۔ اگر ان کی شخصیت تہذیبی ہم آہنگی کا نمونہ نہ ہوتی تو شاید ان کے بعد دیگرے پانچ پانچ بادشاہوں کے زمانوں میں حکومت سے عوام تک یکساں مقبولیت اور ہر دلعزیزی نہ حاصل ہو سکتی۔ وہ فارسی کے بلند مرتبہ شاعر تھے اور "سعدی ہند" کہلائے۔ اپنی شاعرانہ عظمت کے لئے انھوں نے اپنی زندگی ہی میں ایران اور خراسان سے خراج تحسین حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ حاکم ملتان سلطان شہید کی دعوت پر شیخ سعدیؒ نے ضعف پیری کے سبب ہندوستان نہ آسکنے کی معذرت کرتے ہوئے اسے مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان میں خسرو جیسا جوہر قابل موجود ہے۔ اسی کی سرپرستی کرنا چاہیئے۔ مجموعۂ تذکار میں لکھا ہے:۔

"آوردہ اند کہ قاآن ملک عادلاً و عاجلاً التماس قدوم شیخ سعدیؒ از شیراز نمودہ و سید حسین شرقی و عموش را باتحف گرامی و خرج کانی نزد شیخ در شیراز فرستاد اما آں حضرت عذر ضعف پیری درمیان نہادہ و سفائن غزل را ہر دو مرتبہ بہ خط مبارک نبشتہ بہ رسولاں سپرد و فرمود کہ در ہند خسرو بس است[1]"

اسی واقعہ کے بارے میں ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:۔

"و شیخ بہ عذر پیری نیامد، اما بہ تربیت امیر خسرو سلطان را وصیت فرمود و سفارش او فوق الحد نوشتہ[2]"

خسرو کے ہمعصر مورخ ضیاء الدین برنی ان کے علمی

لہ دی مغل پرشین ان انڈیا از عبدالغنی صفحہ ۳۹۴ بحوالہ مجموعہ تذکار قلمی مسودہ صفحہ ۳۹)

ٹہ منتخب التواریخ جلد اول صفحہ ۱۳۰ مطبوعہ کلکتہ ٹائپ ڈیشن

کمالات و شاعرانہ عظمت کے بارے میں رقمطراز ہیں :۔

"در عصر علائی شعرائے بودند کہ بعد از ایشاں بلکہ پیش از ایشاں چشم روزگار مثل ایشاں نہ دیدہ است۔ خصوصاً امیر خسرو کہ خسرو شاعران سلف و خلف بودہ است در اختراع معانی و کثرت تصنیفات و کشفِ رموز غریب نظیر ندا شت۔ ما گر استادان نظم و نثر در یک دو فن بے ہمتا بودند امیر خسرو در جمیع فنون ممتاز و مستغنی بود۔ ہم چناں ذو فنونے کہ در جمیع فن ہائے شاعری سر آمدہ و استاد باشد در سلف نہ بود۔ و در خلف تا قیامت پیدا آید یا نیاید۔ امیر خسرو در نظم و نثر فارسی کتاب خانائے تصنیف کردہ است و داد سخنوری دادہ است[1]"

برنی ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں :۔

" اگر ہمچو امیر خسرو در عہد محمودی و سنجری پیدا آمدے ظاہر و غالب آنست کہ آں پادشاہان ولایتے و اقطاعے بدو انعام دادندے[2]۔"

خود امیر خسرو اپنی زباندانی کے بارے میں کہتے ہیں :؎

من بہ زبانہائے کساں بیشترے
کردہ ام از طبع شناسا گذرے
خواندم و دریافتہ و گفتہ ہم
جستہ وُر دُرِّ دشن شدہ زاں بیش و کم[3]

خسرو کے دعوے کے مطابق انھیں اس زمانے کی بیشتر ہندوستانی زبانوں سے واقفیت تھی اور ان میں فکر سخن بھی کرتے تھے۔ بعد کے بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ وہ ترکی۔ عربی۔ فارسی۔ سنسکرت کے علاوہ برج بھاشا سے بھی نہ صرف واقف تھے بلکہ برج بھاشا میں شعر گوئی پر بھی قادر تھے۔ خود خسرو دیوان غرۃ الکمال کے دیباچے میں اپنی ہندی دانی کے بارے میں کہتے ہیں ؎

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم چو آب
شکر مصری نہ دارم کز عرب گویم سخن
چو من طوطی ہندم ار راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم[4]

انھیں اُردو زبان کا پہلا شاعر بھی کہا گیا ہے[6]۔

بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انکی زباندانی ایک مسلم حقیقت تھی۔ اور وہ لسانی تعصب سے آزاد تھے۔ انھوں نے کھلے دل سے سنسکرت کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اسے عربی کے ہم پلہ اور فارسی سے برتر قرار دیا ہے۔ اور ہندی بھی ان کے نزدیک فارسی سے کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ دنیا کی بہت سی زبانوں سے برتر ہے[5]۔

مثنوی دول رانی خضر خاں میں ہندوستان کی زبانوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی لسانی اہمیت اور برتری پر روشنی ڈالتے ہیں اور سنسکرت عربی و فارسی نیز ہندی کے بارے میں اپنی رائے اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

غلط کردم گر از دانش زنی دم
نہ لفظ ہندی است از پارسی کم

---

۱ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۹ مطبوعہ کلکتہ
۲ " " ص ۳۶۶ "
۳ مثنوی قرآن السعدین
۴ شعر العجم جلد دوم ص ۱۳۳
۵ دیباچہ دیوان غرۃ الکمال
۶ تاریخ ادب اُردو حصہ نظم از رام بابو سکسینہ
۷ تفصیل کے لئے دیکھئے مثنوی نہ سپہر صفحہ ۱۸۰، ۱۸۱ مطبوعہ علی گڑھ

بہ جز تازی کہ میر ہر زبان است
کہ بر جملہ زبانہا کامران است

دگر غالب زبانہا در رسے دروم
کم از ہندی است شد از اندیشۂ علوم

زبان ہند ہم تازی مثال است
کہ آمیزش درآنجا کم مثال است

گر آئین عرب نحو است دگر صرف
از آن آئیں درین کم نیست یک حرف

کسے کیں ہر سہ دوکاں راست صراف
شناسد کیں نہ تخلیط است وے لاف

دگر پرسی بیانش از معانی
درآن نیز از دگرہا کم نہ دانی

اگر از صدق و انصاف دہم شرح
حد ہندی کنی گفتار من جشرح ۱؎

خسرو ایک سچے وطن پرست شاعر تھے۔ انھیں ہندوستان کے ذرّہ ذرہ سے محبت تھی۔ وہ گنگا اور جمنا کو دجلہ فرات اور نیل سے برتر تصور کرتے تھے ۲؎۔ انھوں نے ہندوستان کی تہذیب، حکمت و دانش اور علوم و فنون کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ مثنوی ”نہ سپہر“ میں کہتے ہیں :–

دان کہ دریں عرصہ پوشیدہ درون
دانش و معنی است ز اندازہ برون

گرچہ بہ حکمت سخن از روم شدہ
فلسفہ زانجا ہمہ معلوم شدہ

لیک نہ ہند است ازاں خالی ازاں
هست درو یک یک ز اندیشہ بہی

منطق و تنجیم و کلام است درو
ہرچہ کہ جز فقہ تمام است درو

برہمنی ہست کہ در علم و خرد
دفتر قانون ارسطو بدرد ۱؎

خسرو نے اسی مثنوی میں ہندوستانیوں کی زباندانی کی بھی تعریف کی ہے کہ وہ نہ صرف مقامی زبانوں سے واقفیت رکھتے ہیں بلکہ غیر ملکی زبانوں کے سیکھنے میں بھی انھیں بڑی مہارت ہے جبکہ غیر ملکی اقوام کو ہماری زبانوں کا علم نہیں اور وہ ہمارے ملک میں حکمت و دانش کے حصول کے لئے آتی ہیں۔ علم ریاضی میں صفر کی ایجاد، شطرنج جیسے دماغی امتحان کے کھیل کی ایجاد اور کلیلہ دمنہ جیسی معرکۃ الآرا کتاب کی تصنیف ہندوستان کی برتری کا بین ثبوت ہیں۔ ہندوستانی موسیقی اپنے سحر و اعجاز سے انسانوں ہی کو نہیں جانوروں کو بھی مبہوت کر دیتی ہے۔ اور آخر میں شاعرانہ شوخی سے کہتے ہیں کہ اس ملک کا سب سے بڑا شاہکار خود

۱؎ دول رانی خضر خاں ص ۴۱-۴۲ مطبوعہ علی گڑھ
۲؎ ″ ″ ص ۴۳ ″

۱؎ مثنوی نہ سپہر ص ۱۶۱-۱۶۳ مطبوعہ علی گڑھ

میں شکست ہے کیونکہ میرا جیسا شاعری سے جادو جگانے والا روئے زمین پر کوئی دوسرا نہیں۔[1]

انھوں نے ہندو مذہب کی تعریف و توصیف میں ہی مبالغے سے کام نہیں لیا، بلکہ وہ اس مذہب کی اچھائیوں کو کھلے دل سے بیان کرتے ہیں اور ہندوؤں کو "موحد" قرار دیتے ہیں ؎

معترف وحدت ہستی و قدم
قدرت ایجاد ہمہ بعد عدم
رازق ہر پُرہنر و بے ہنرے
عمر بر و جاں دہ ہر جانورے
خالق افعال بہ نیکی و بدی
حکمت و دانش ازلی و ابدی
فاعل مختار و مجازی بعمل
عالم ہر کلی و جزوی ز ازل[2]

اسی مثنوی میں آگے چل کر خسرو بتاتے ہیں کہ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں، زردشتیوں کے نزدیک خدا دو ہیں۔ کوئی خدا کا مادی جسم تصور کرتا ہے اور کوئی اسے ممکنات سے تشبیہ دیتا ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک سبعۂ سیارہ ہی کو مرتبۂ الوہیت حاصل ہے۔ لیکن ان سب کے برعکس ہندو توحید کے قائل ہیں۔ اگر وہ درخت، پہاڑ، دریا، سورج یا بتوں کی پرستش کرتے ہیں تو اس لئے کہ انھیں مظاہر ذات سمجھتے ہیں۔ اور یہ بھی آبا و اجداد کی موروثی روایت کی بنا پر ہے جس سے بغاوت کی جرأت نہیں کر پاتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

وانچہ کہ معبود برہمن است بہ فرق
معترف است او کہ نہ مثلے است ز حق
سنگ و ستور و خر و خورشید و گیا
ہرچہ پرستند نہ اخلاص و ریا
معتقد انند بہ تقلید دراں
کانچہ رسیدہ است بہ ما از پدراں
ما نتوانیم از و دور شدن
خود نتواند سیہی نور شدن[3]

خسرو "مذہب عشق" کے پیرو اور شراب معرفت کے متوالے تھے خود اپنے بارے میں کہتے ہیں ؎

ترک ہر مذہب گرفتم زانکہ نزد پیر دیر
ذکر مذہب لاابالی زاختلاف مذہب است[4]

ایک دوسرے شعر میں اپنے مسلک کی مزید وضاحت اس طرح کی ہے ؎

ما دُعشق یار را اگر در قبلہ وُ در بت کدہ
عاشقان دوست را با کفر و ایمان کار نیست[5]

ایک رباعی میں لوگوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے اپنے مسلک کی ترجمانی اس طرح کی ہے ؎

کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست
خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم، با خلق عالم کار نیست[6]

---

[1] مثنوی نہ سپہر صفحہ ۱۶۶ - ۱۶۲ مطبوعہ علی گڑھ
[2] " " " " ۱۶۳
[3] مثنوی نہ سپہر صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۶ مطبوعہ علی گڑھ
[4] دیوان خسرو ردیف "ت" مطبوعہ نولکشور اکیڈیمی
[5] " " " " " " "
[6] " " " " " " "

مثنوی "مطلع الانوار" میں ایک حکایت نظم کی
ہے کہ ایک حاجی جوتے پہن کر حج کرنے جاتا ہے اور اسکے مقابلہ
میں ایک برہمن بتکدہ کی طرف سینہ کے بل چل کر راہ قطع کرتا
ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ ہندوؤں کی بت پرستی پر طعنہ دینے والو
عبادت کرنا انھیں سے سیکھو ؎

کعبہ روے دید ز صدق و ثبات
برہمنے را بہ رہ سومنات
جاں ز دم شوق مساحت کناں
خاک رہ از سینہ مساحت کناں
خستگیٔ سینہ بہ راہِ دراز
از سر دل پوست ہمی کرد باز
گفت بدو عارفِ خوف و رجا
"کیں سفر آخر ز کجا تا کجا؟"
برہمنش گفت کہ "سالیست بیش
کیں رہ ازیں گونہ گرفتم بہ پیش"
گفت نیوشندہ کہ "چوں پائے ہست
سینہ چرا داری ازیں گونہ پست"
گفت "چو دل در رہِ بت باختم
پا بہ رہش نیز ز دل ساختم"
اے کہ ز بت طعنہ بہ ہندو بری
ہم ز وے آموز پرستش گری[1]

پرانے زمانے میں ہندوؤں میں "ستی" کی قبیح رسم
جاری تھی جسے بعد کے مصلحین نے ختم کروایا لیکن خسرو کے
نزدیک یہ بھی بڑی سبق آموز رسم تھی۔ محبت اور پرستاری

۱؎ ۔ مطلع الانوار مطبوعہ نول کشور صفحہ ۴۷

کی اس سے بڑھ کر مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ کہتے ہیں ؎

مردن از دوستیٔ دوست ز ہندو آموز
زندہ در آتش سوزاں شدن آساں بود[1]

اور کبھی اسی خود سوزی کی جراَت مندانہ صفت کی بنا پر
بہتیرے مردانِ خدا کو ہندو عورت سے کمتر قرار دیتے ہیں ؎

اندراں مجلس کہ خود را زندہ سوزد اہلِ عشق
اے بسا مردِ خدا، کو کمتر از ہندو زنے است[2]
جاں فدائے دوست کن، کم زانِ ہندو زن ای
کہ وفا ی شوی در آتش بسوزد خویش را

اور کبھی شوخی کا انداز بیان اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

عاشقاں در روشِ عشق مسلماں نہ شوند
کہ نہ در سوختن خویش چو ہندو باشند[3]

امیر خسرو نے آج سے سات سو سال قبل قومی یکجہتی اور
تہذیبی ہم آہنگی کی ضرورت کو محسوس کیا جس کی اہمیت اور
افادیت سے آج کے ہندوستان میں بھی انکار نہیں کیا
جا سکتا بلکہ آج کے بدلے ہوئے حالات میں اسکی ضرورت
اور بھی زیادہ شدید ہو گئی ہے۔ تہذیبی ہم آہنگی اور
قومی یکجہتی کا صالح تصور اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا
جبتک کہ وطن پرستی کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ پیغمبر اسلام
صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بموجب "وطن سے محبت
کرنا ایمان کا جزو ہے"۔ پھر خسرو اس ارشاد کی تعمیل میں کیسی

۱؎ دیوان خسرو ردیف "د" مطبوعہ نولکشور اکیڈمی
۲؎ " " " "ت" "
۳؎ " " " الف "
۴؎ " " " د "

سے بچھ کیسے رہ سکتے تھے۔ اسی لئے ہندوستان کے رنگ برنگے پھول، قسم قسم کے میوے اور پھل، طرح طرح کے خوبصورت پرندے اور دوسرے حیوانات سبھی خسرو جیسے وطن پرست شاعر کے لئے وجہ کشش رکھتے ہیں۔ وہ ان میں سے ایک ایک شے کا ذکر والہانہ انداز سے کرتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ ہندوستانی پھولوں میں کیوڑہ، بیلا، جوہی، رائے چمپا، مولسری، دونا، کرنا اور سیوتی کا ذکر کیسے ذوق و شوق سے کرتے ہیں اور آخر میں انکے مقابلہ پر غیر ملکی پھولوں میں ارغوان اور لالہ کے لئے کہتے ہیں کہ ان میں رنگ ضرور ہے لیکن خوشبو قابل ذکر نہیں ؂

ز گلہائے تر ہندوستان ہم
شدہ سرگشتہ باد و بوستان ہم
از یں سو بیل پیشانی کشادہ
بیک گل ہفت گل بر ہم نہادہ
وزاں سو دل ربائے عاشقاں جائے
ہمہ تن بہر دلہا راشدہ جائے۔
بہ خوبی کیوڑہ جا در تحافش
سناں نقرہ وز مینا غلافش
ز بویش حقہ خوباں معطر
دو سالہ خشک و بویش ہم چناں تر
دگر آں رائے چمپا شاہ گلہا
کہ بویش مشکبار آمد چو ملہا
چو معشوق سمن بر ناز پرورد
ولے رنگش چو روئے عاشقاں زرد
بہ روغن پرورندش بہر سرہا
کہ سر از مشک تر گیرد اثرہا
دگر مولسری کش طرفہ نامے
برنگ طرفہ مروارید فامے
بہ سویش بسکہ دلہا گشتہ مائل
شدہ در گردن خوباں حمائل
دگر دونا کہ آں ریحان ہنداست
ز تری بویش درخور دلپسنداست
دگر کرنا کہ چوں ز و جست بوئے
معطر گردد از یک خانہ کوئے
بسودہ مشک و بویش نام کردہ
ز بو از بہر دلہا دام کردہ
چو پیکان بلبلہ سیوتی خسرد
کہ جانہا بہر آں پیکاں ہوس برد
ز عشق بوئے او جاں دادہ زنبور
نہ گشتہ بعد مردن نیز ازو دور
چہ بینی ارغوان و لالہ خنداں؟
کہ رنگے ہست و بوئے نیست چنداں[۱]

پرندوں میں گوریا، مینا، طوطی، شارک اور مور کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ شارک ایسا پرندہ ہے کہ جس کی نظیر عرب و عجم میں نہیں ملتی اور مور تو نادرۂ روزگار ہے[۲] حیوانوں میں سے ہندوستانی گھوڑے کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ موسیقی کے آہنگ پر چلتا ہے۔ بکری لکڑی کے ایک ٹکڑے پر چاروں سموں سے کھڑی ہو سکتی ہے۔ بندر اپنی ذہانت کے سبب نوادرات میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ اور ہاتھی کہنے کو تو جانور ہے لیکن درحقیقت بہت سی انسانی

---

[۱] مثنوی دول رانی و خضر خاں صفحہ ۱۲۹–۱۳۰ مطبوعہ علیگڑھ
[۲] مثنوی نہ سپہر صفحہ ۱۸۱

صفات کا حامل ہے[1]۔ پان کے لئے بتاتے ہیں کہ اہل خراسان تو پان کو خس و خاشاک سمجھتے ہیں لیکن صاحب ذوق اس کے قدرشناس ہیں[2]۔ پان تو لیچوں کرتا ہے، دانتوں کو مضبوط کرتا ہے اور ہندوستان کی ایسی انمول نعمت ہے جس سے امیر و غریب سب ہی لطف اندوز ہوتے ہیں[3]۔ خسرو کے نزدیک ہندوستان کا آم دنیا کے تمام پھلوں پر فوقیت رکھتا ہے[4]۔ آم اور کیلا یہاں کے بہترین پھل ہیں[5]۔ موسم اور آب و ہوا کے لحاظ سے بھی یہ ملک قابل تعریف ہے[6]۔ غرضکہ خسرو کے نزدیک ہندوستان ہی بہشت ارضی ہے اور اسی لئے یہاں مور و ہما اور سانپوں کی کثرت ہے[7]۔

صنعتی حیثیت سے بھی ہندوستانی کاریگر دنیا میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ خاص طور پر کپڑا بننے کی صنعت میں تو ہندوستان کا جواب نہیں۔ یہاں کا "دیو گیری" کپڑا اپنی لطافت و نفاست میں "کتاں" سے بیش قیمت ہوتا ہے ؎

نکو دانند خوبان پری کیش
کہ لطف "دیو گیری" از "کتاں" بیش
زلطف آں جامہ گوئی آفتا بیست
و یا خود سایہ لے یا ماہتا بیست[8]

یہاں کا ایک کپڑا تو ایسا باریک ہوتا ہے کہ اگر اسے لپیٹ دیا جائے تو ناخن میں سما سکتا ہے۔ اور کھول دیا جائے تو دنیا کو ڈھانپ لے[1]۔ (شاید یہ ڈھاکہ کی ململ کا ذکر ہے) ہندوستانی تلوار تو ساری دنیا سے اپنا لوہا منوا چکی ہے[2]۔ تمام صفات حسن میں ہندوستان کے حسینوں کو خوبان عالم پر فوقیت حاصل ہے۔ اور مصر۔ روم۔ قندھار۔ سمرقند۔ خطا۔ ختن۔ یغما۔ اور خلخ کے حسینوں میں سے کوئی بھی ہندوستانی مہ لقاؤں کا مقابلہ نہیں کرسکتا[3]۔

ہندوستان کی ان گنت خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے خسرو کی زبان نہیں تھکتی۔ یہاں کے رقص و موسیقی۔ شعبدہ گری۔ نظر بندی۔ آتش بازی غرضکہ کوئی فن ایسا نہیں ہے جسے خسرو نے نہ سراہا ہو[4]۔

خسرو نے بہت سے ہندوستانی رسم و رواج بھی نظم کئے ہیں۔ اور ہندوستانی تہذیب کے ہر ہر خد و خال کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ چند نمونے دیکھئے۔ پرانے زمانے میں برتنوں کے ہوتے ہوئے بھی ہندو عام طور پر چلو سے پانی پیتے تھے اس کا ذکر خسرو نے یوں کیا ہے ؎

ز بس ابلہی ہندوان کلال
بدست آب نوشند با صد سفال[5]

---

[1] مثنوی نہ سپہر صفحہ ۱۸۱-۱۹۱ مطبوعہ علی گڑھ
[2] مثنوی۔ دول رانی خضر خاں صفحہ ۱۰۵ 〃
[3] مثنوی قران السعدین صفحہ ۱۸۵-۱۸۶
[4] 〃 〃 〃 ۱۸۵-۱۸۶
[5] 〃 نہ سپہر 〃 ۱۰۸-۱۹۱
[6] 〃 〃 〃 ۱۰۸-۱۹۱
[7] 〃 〃 〃 ۱۴۸-۱۵۸
و مثنوی دول رانی 〃 ۴۳
[8] 〃 〃 〃 ۴۳

[1] مثنوی قران السعدین صفحہ ۱۳۲
[2] 〃 〃 〃 ۱۳۲
[3] مثنوی دول رانی و خضر خاں صفحہ ۱۳۳-۱۳۴
[4] 〃 〃 〃 〃 ۱۵۵-۱۵۶
[5] آئینہ سکندری صفحہ ۵۳ مطبوعہ علی گڑھ
[6] 〃 〃 〃 ۵۳

ہندوستان میں عاشق کی پیشانی پر عام طور سے
سیندور لگایا جاتا ہے، اسے خسروؔ نے کیسی خوبصورتی سے
تشبیہ کی صورت میں پیش کیا ہے ؎

سیندور از رنگ سرخی سر کو ہسار
چو پیشانی پیل شنگرف دارد[1]

ہندوستانی عورتیں عام طور پر منہ پر آنچل ڈال لیتی تھیں
اور کسی سے بات کرتے وقت ایک طرف سے آنچل سرکا لیتی
تھیں، خسروؔ کی زبان سے سنئے ؎

چو یک سو کنم مقنع از طرف گوش
کلاہ از سر اندازم و سر زدوش[2]

ہندوؤں میں مُردے کو جلانے کا رواج ہے اسے تشبیہ کے طور پر
کیسی خوبی سے بیان کیا ہے ؎

ہندوے شب مرد و خورشید آتشے
از برائے سوز آں ہندو نمود[3]

ہندوؤں میں بعض درختوں کی پرستش کی جاتی ہے اس کا
بیان بھی دیکھئے ؎

چو ہندواں کہ بسوئے درخت سجدہ برند
نماز من بسوئے قامت بلند تو باد[4]

نیلگایوں کا رنگ بالعموم سیاہ ہوتا ہے اور محبوب کی زلفیں
بھی سیاہ ہیں اس لئے خسروؔ زلفوں کو "ہندوستان" قرار
دیتے ہیں ؎

دلم را در سر زلفت رہ افتاد
غریباں را بہ ہندوستاں رہ افتد[5]

مرغ دل آشیانہ بہ زلف توی کند
چوں طوطیے کہ میل بہ ہندوستاں کند

اور کبھی محبوب کے لبہائے شیریں کو "ہندوستان" کا نام
دینا بھی خسروؔ ہی کا حق ہے ؎

سر زلف کاید ہمی بر لبش
نمک سوئے ہندوستاں می برد[6]

ہندوستان کے بت کدوں میں "سومنات" کو تاریخی شہرت
حاصل ہے اور امیر خسروؔ اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

بت پرستاں گر ز تو آگہ شوند
یاد نارند از بتان سومنات[7]

ہندوؤں میں سورج کی بھی پرستش ہوتی ہے اس کا ذکر
شاعرانہ لطافتوں کے ساتھ یوں کیا ہے ؎

سیاہ روئے شدم زیں سفید رخساراں
چو ہندوے کہ پرستار آفتاب شود[8]

شطرنج ہندوستان کا اہم ترین کھیل ہے جسے آفاقی شہرت
حاصل ہو چکی ہے۔ اس کی اصطلاحات کے ذکر سے خسروؔ کی
معنی آفرینی دیکھئے ؎

شطرنج عشق باز کہ ما بہر نرد تو
خود را بہ مات گاہ رسانیم و شہ کنیم[9]

---

[1] آئینہ سکندری صفحہ ۵۳
[2] " " " ۱۳۴
[3] دیوان امیر خسرو صفحہ ۹۳۰ مطبوعہ نولکشور اکیڈمی
[4] " " ردیف د " "

[5] دیوان امیر خسرو بردیف د مطبوعہ نولکشور اکیڈمی
[6] " " " " "
[7] " " " " "
[8] " " " ت " "
[9] " " " د " "
[10] " " " م " "

خالص ہندوستانی تشبیہات و استعارات کے علاوہ وہ اکثر ہندی الفاظ بھی نظم کرتے ہیں جیسے ؎

خان کرڑہ جھجھوے کشور کشا
کز لب شاہاں کرڑہ دارد بپا[1]

دوسرے مصرعہ میں کرڑہ وہی زیور ہے جسے ہندوستانی عورتیں پاؤں میں پہنتی ہیں۔ مثنوی دول رانی خضر خاں میں "سکھ آسن" کا استعمال دیکھیے ؎

رسید و سر بہ سکھ آسن درون کرد
بگریہ پائے جاناں غرق خوں کرد[2]

قرآن السعدین میں پگڑی اور چیرہ کا ذکر اسطرح کیا ہے ؎

اے دہلی و اے بتان سادہ
پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ[3]

خسرو سے بڑھ کر دہلی کے بارے میں تو شائد ہی کسی شاعر نے اتنی تفصیل سے لکھا ہوگا۔ انھوں نے دہلی کو بہشت عدن اور باغِ ارم ہی نہیں اتنا مقدس بتایا ہے کہ اگر مکہ اس کی صفات سے واقف ہو جائے تو اس کا طواف کرنے آئے۔ دہلی کے باغات، عمارات۔ قلعے۔ مساجد۔ آب و ہوا۔ پیداوار۔ قطب مینار۔ محلات۔ آبادی۔ جمنا۔ غرضکہ سب ہی کا ذکر بڑی محبت عقیدت اور شیفتگی کے ساتھ کیا ہے[4]

خسرو بڑے جامع کمالات بزرگ تھے۔ شاعری کے علاوہ موسیقی، انشاپردازی اور اپنی ایجاد پسند طبیعت کے لئے بھی ان کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ ایک طرف حکمرانوں کے درباروں سے وابستگی دوسری طرف تصوف سے دلچسپی اور پیر طریقت شیخ نظام الدین اولیاؒ کا فیض صحبت غرضکہ خسرو کی شخصیت بھی ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی طرح بڑی رنگا رنگ، پہلو دار اور متنوع تھی۔ انھیں ہندوستان کی تہذیبی ہم آہنگی کا مکمل ترین نمونہ

بہ سلسلہ مضمون صفحہ ۵۲

خونِ دل خوردم و بہ سوختہ آرے
ہر کس آں بادۂ خوشگوار نیابد

خونِ دل کی اسی کشید اور سوزشِ دل نے آخر یہ حالت کردی کہ ع

کہ متاعِ عقل و جان و دل ہمہ سوخت

اس متاعِ عقل و جان و دل کے جل کر راکھ ہونے کی کہانی بھی خاصی دلفریب و دل آویز ہے۔

۱۸ ربیع الاول ۷۲۵ھ کو حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اس وقت امیر خسرو دہلی سے دور اودھ میں مقیم تھے۔ جب پیر و مرشد کے انتقال کی خبر سنی تو دیوانہ وار دہلی دوڑ آئے۔ ان کی قبر کو دیکھ کر فرمایا ؎

"سبحان اللہ۔ آفتاب تو زیر زمین ہے۔ اور خسرو زندہ ہے" اور بے حال ہو کر یہ دوہا پڑھا ؎

گوری سوئے سیج پر، مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر آپنے، رین بھئی سب دیس

چھ ماہ بعد یعنی ۱۸ شوال ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء کو رحلت فرمائی اور پیر کی پائنتی سپرد خاک ہوئے ؎

شد عدیم المثل یک تاریخ او
دیگرے شد، طوطیٔ شکر مقال

---

[1] ہشت بہشت ص ۱۳۹ مطبوعہ علی گڑھ
[2] مثنوی دول رانی خضر خاں ص ۱۴۴ " "
[3] مثنوی قرآن السعدین مطبوعہ کلکتہ
[4] تفصیل کے لئے دیکھئے مثنوی قرآن السعدین صفحہ ۲۸-۸۴ مطبوعہ کلکتہ

ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل :-

شیخ سعدی اور امیر خسرو

ساتویں صدی ہجری کی یہ دونوں صاحب عرفان و واجب الاحترام، جہاں دیدہ و آفاق گردیدہ، مقتدر و ممتاز، برگزیدہ و خدارسیدہ ہستیاں اپنے مزاج افتادِ طبیعت، ادبی وقار اور تاریخی اہمیت کے لحاظ سے اتنی بے مثال اور غیر معمولی قدر و منزلت کی حامل ہیں کہ ان کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں کے شاہکار عالمگیر شہرت اور مقبولیت رکھتے ہیں اور ان کی افادیت مسلّم ہے۔ دونوں کی زندہ جاوید شخصیتیں سات سو برس سے خواص و عوام کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہیں اور آج بھی ان کی تصانیف ہمارے قدیم اور صحت مند تہذیبی و ثقافتی ورثہ کی آئینہ دار ہیں۔

شیخ سعدی کو ہندوستان اور ہندوستانیوں سے اس قدر محبت تھی کہ انھوں نے اپنے سیر و سیاحت کے پروگرام میں ہندوستان کو شامل کیا۔ اور 'بوستان' میں ہندوستان سے متعلق ایک قصہ بھی لکھا۔ لیکن امیر خسرو بذات خود سراپا ہندوستان کی محبت میں گرفتار ہیں اور اپنی تصانیف میں ایسی ملی جلی تہذیب و معاشرت کے نقشے پیش کرتے ہیں کہ جو قومی یک جہتی اور سماجی یگانگت کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ دو ممتاز تمدنوں اور تہذیبوں کو امتزاج دیکر "من تو شدم، تو من شدی" کی جیتی جاگتی تصویر دکھا دیتے ہیں اور خود گنگا جمنا کا سنگم نظر آتے ہیں۔ سعدی و خسرو دونوں ہمارے ادبیات عالیہ کے خالق ہیں۔ اخلاقیات کے معلم خصوصی ہونے کے علاوہ دارین کی فلاح و بہبود کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں مسرت بھی ہے اور بصیرت بھی۔ سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی۔ روشنی بھی ہے اور حرارت بھی۔ دانائی بھی ہے اور شوریدہ سری بھی۔ دنیا کتنے ہی رنگ بدلے لیکن ان کی عظمت و رفعت پر کبھی کوئی حرف نہیں آ سکتا اور وہ بھلائے نہیں جا سکتے۔ شیخ سعدی نے ایک موقع پر کہا تھا ؎

ہفت کشور نمی کنند امروز   بے مقالات سعدی انجمنے

ممکن ہے یہ بات ان کے زمانے میں سخن گسترانہ سمجھی گئی ہو۔ لیکن آج یہ حقیقت ہے کہ ان کے مقالات اور نظریات ہماری زندگی اور عملی کارکردگی کے لئے

شمعِ ہدایت اور ان کے مشورے اور تنقیدی اشارے ہمارے مقاصد کی کامیابی کے لئے ضمانت و سعادت ہیں۔ یہی حال حضرت امیر خسرو کے اقوال و طریقِ حیات کا ہے۔ انھوں نے جس طرح علم و ادب کی خدمت کی جذبہ وطن پرستی کو عام کیا، خواص و عوام کا رابطہ مضبوط بنیادوں پر قائم کیا، درباروں اور خانقاہوں کی رونق بڑھائی، شاعری، موسیقی کے فنون لطیفہ کی عملی سرپرستی کی شاہی لشکر اور بزمِ صوفیہ میں وقار و امتیاز حاصل کیا۔ آج اس بات کو امرِ مسلّم بنا دیتا ہے کہ وہ فی الحقیقت اس شہرتِ عام و بقائے دوام کے مستحق تھے کہ جوان کو ملی اور مل رہی ہے اور جس کی بدولت انھوں نے عالم گیر مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل کر لی ہے۔ صرف ہندوستان اور پاکستان، ایران و روس ہی نہیں ان کی ہفت صد سالہ تقریبات منا رہے ہیں، بلکہ اُس طوطیٔ شیریں مقال کے نغمے سارے عالم میں گونج رہے ہیں اور ہر مذہب و مسلک کے لوگ ان کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

سعدی و خسرو ایسے دور کی یادگار ہیں کہ جس میں ہر دہائی یا چند سال کے بعد سیاسی انقلابات برپا ہوتے رہے اور انھوں نے کبھی ان انقلابات میں تھوڑا بہت حصہ لے کر اور کبھی ان سے دامن بچا کر اپنی انفرادیت اور عظمت کو برقرار رکھا اور دنیا کو ان انسانی اور روحانی قدروں سے روشناس کرتے رہے کہ جو ان کو جان و دل سے زیادہ عزیز تھیں۔

شیخ سعدی کے سن پیدائش کے متعلق کافی اختلاف ہے۔ کچھ لوگ ان کی پیدائش ۵۸۰ھ اور ۶۱۶ھ کے درمیان بتاتے ہیں اور صحیح سن پیدائش کا تعین ناممکن قرار دیتے ہیں۔ لیکن مختلف بیانات اور خود شیخ سعدی کی تصانیف میں پائی جانے والی داخلی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ سعدی ۵۸۵ھ (۱۱۸۹ء) میں بمقام شیراز تولد ہوئے تھے انھوں نے کافی وقت سیر و سیاحت اور تحصیلِ علم میں گزارا اور ۶۵۴ھ میں وطن شیراز واپس آگئے۔ ۶۵۵ھ میں انھوں نے 'بوستان' تصنیف کی اور اس کے ایک سال بعد 'گلستان'۔ ان کی وفات شیراز میں ۶۹۱ھ (۱۲۹۲ء) میں واقع ہوئی اور لفظ 'خاص' سے ان کی تاریخ رحلت نکالی گئی۔

حضرت امیر خسرو کی پیدائش ۶۵۱ھ (۱۲۵۳ء) میں بمقام مومن پور (پٹیالی) ضلع ایٹہ (خسرو نگر یو۔پی) ہوئی۔ وہ ابھی تقریباً نو سال کے تھے کہ ان کے والد امیر سیف الدین محمود جو شمس الدین التمش کی سرکار میں ملازم تھے، ایک جنگ میں کام آگئے۔ ان کی والدہ امیر عماد الملک کی صاحبزادی تھیں چنانچہ مستقل طور پر وہ خسرو کو لیکر دہلی چلی گئیں اور ان کی پرورش، تعلیم و تربیت سب ان کے نانا کے زیرِ سایہ ہوئی۔ ان کے علم و فضل اور ادبی کارناموں کی بنیاد پر ۶۶۳ھ میں غیاث الدین بلبن نے خسرو کو 'طوطیٔ ہند' کا لقب دیا اور ان کی خدمات شاہانِ دہلی کے درباروں میں روز بروز مقبول سے مقبول ہوتی گئیں۔ وہ ابھی بیس سال کے تھے کہ ان کے نانا عماد الملک کا انتقال ہو گیا اور اپنی والدہ کے سایۂ عاطفت سے بھی وہ ۶۹۸ھ میں محروم ہو گئے۔ ان کے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ کا ۷۲۵ھ میں انتقال ہوا اور خسرو اس حادثۂ جانکاہ کی خبر سنتے ہی تغلق شاہ سے، جن کے ساتھ اس زمانہ میں وہ بنگالہ اور اودھ کی مہم پر گئے ہوئے تھے، اجازت لے کر افتاں و خیزاں دہلی واپس

آئے اور یہیں اپنے پیرو مرشد کے انتقال کے چھ ماہ بعد واصل بحق ہو کر ان کے پائیں دفن ہوئے۔

تاریخہائے پیدائش کو پیش نظر رکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ سعدی امیر خسرو سے ۶۴ سال پہلے عالم وجود میں آئے تھے اور امیر خسرو کی وفات شیخ سعدی کے انتقال کے ۳۴ سال بعد ہوئی۔ امیر خسرو نے تو شیخ سعدی کے کارناموں اور تصانیف سے استفادہ کیا ہی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امیر خسرو کے علم و فضل کی شہرت بھی شیراز تک پہونچ چکی تھی اور شیخ سعدی اس نابغہ روزگار کی ادبی اہمیت اور روحانی عظمت سے باخبر تھے۔

مشہور واقعہ ہے کہ شیخ سعدی کو ہندوستان کے شہزادے سلطان محمد قاآن (سلطان شہید) نے دوبار ہندوستان بلایا۔ اور بہت کچھ تحائف اور زاد راہ بھیج کر ان سے التجا کی کہ وہ ملتان آکر اس کے مجوزہ مدرستہ العلوم کی زیب و زینت بڑھائیں اور اس کے ادبی وقار کو چار چاند لگائیں۔ لیکن دونوں مرتبہ شیخ سعدی نے بڑھاپے کا عذر پیش کر کے ہندوستان آنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ اس زمانہ میں جب کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے ولیعہد شہزادہ محمد قاآن نے جو ملتان کا گورنر تھا شیخ سعدی کو ملتان آنے کی دعوت دی تھی شیخ سعدی کی عمر ۹۰ سے سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان شہید نے امیر خسرو کا کلام بھی شیخ سعدی کو بھیجا تھا اور بڑے اصرار سے ان کو ملتان بلایا تھا۔ شیخ سعدی نے اس کے جواب میں دوسری مرتبہ کی دعوت پر اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تصانیف 'بوستان' و 'گلستان' بطور تحفہ سلطان شہید کو بھیجی تھیں۔ امیر خسرو کے کلام کی تحسین و تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ "یہ جوہر قدر دانی کے قابل ہے۔ اور "در ہند خسرو بس است"

شیخ سعدی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کی سیر و سیاحت کے دوران دہلی یا ملتان میں حضرت امیر خسرو سے ملاقات کی تھی۔ یہ بات حقیقت ہو یا نہ ہو لیکن اتنا قابل یقین ہے کہ شیخ سعدی اور امیر خسرو اپنے نظریہ حیات، وحدت فکری و معنوی، شوق اصلاح خلق اور ذوق علم و ادب میں ایک دوسرے سے بے حد قریب تھے۔

امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین محمود اگرچہ قبیلہ ہزارہ کے ایک 'ترک' تھے لیکن ان کی ماں ہندوستانی تھیں اور ایک ہندوستانی کی بیٹی۔ ان کے نانا عماد الملک عارض راوت، یا راوت عارض کے عہدہ پر ممتاز تھے، بقول ڈاکٹر وحید مرزا 'راوت'، گجراتی زبان میں 'سوار' کو کہتے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے 'عارض راوت' کے فرائض یہ تھے کہ وہ شاہی سواروں کی دیکھ بھال اور نگرانی کریں۔ تاکہ لڑائی کے وقت کسی قسم کی دقت نہ ہو عماد الملک نہ صرف ہندوستانی تھے بلکہ گورے رنگ کے بھی نہ تھے، وہ پان کے بیحد شوقین تھے اور ہر لحاظ سے مکمل طور پر ہندوستانی تھے۔ امیر خسرو کے آبا و اجداد کی زبان فارسی تھی لیکن ہندی ان کو اپنی والدہ سے ورثہ میں ملی تھی۔ اپنے دیوان سوم غرۃ الکمال کے دیباچہ میں وہ خود کہتے ہیں:-

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

امیر خسرو کی 'ہندوی' زبان میں سندھی، لاہوری، تلنگی، گجری، کشمیری، بنگالی، اودھی، اور دہلوی وغیرہ وغیرہ۔ سب زبانیں شامل تھیں۔ وہ پٹیالی ضلع ایٹہ میں جو گنگا کے کنارے واقع ہے، پیدا ہوئے تھے۔ اور انھوں نے

زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں جو جمنا کے کنارے واقع ہے گذارا۔ گویا گنگا جمنی فطرت کے مالک تھے اور گنگا اور جمنا دونوں دریاؤں سے مستفیض تھے۔ ہندوستان کی عظمت، سطوت اور دولت کے دل وجان سے قدر شناس تھے اور یہاں کے رسم وراہ اور فنون لطیفہ کے شیدائی۔ وہ ہندوستان کی آب و ہوا کو دوسرے ممالک کی آب وہوا سے بہتر سمجھتے تھے۔ یہاں کے پھولوں اور پھلوں کی دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔ پان، آم اور کیلا ان کی نظر میں ہندوستان کے نادر تحفے تھے، اور ہندوستانیوں کی ہر ادا ان کو بیحد پسند تھی۔ خسرو کی شاعری ہندوستان ہی میں پروان چڑھی اور یہاں ہی کی فضا نے انکے انداز سخن کو، سبک ہندی، کی ان سب لطافتوں سے مالا مال کردیا کہ جن کا حوالہ مولانا شبلی نے شعر العجم میں دیا ہے۔

'جام وسنداں باختن' کوئی آسان کھیل نہیں ہے لیکن شیخ سعدی اور امیر خسرو نے اس مشغلہ کا ایسا فنکارانہ مظاہرہ کیا ہے کہ جس کی اتنی اچھی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں مشکل ہی سے ملے گی۔ ان دونوں اہل علم وفن کے ہاتھوں میں ایک طرف 'جام شریعت' ہے اور دوسری طرف 'سندان عشق'۔ وہ شریعت وطریقت کے بھی دلدادہ ہیں اور عشق ومحبت کے شیدائی بھی۔ دین سے بھی تعلق رکھنا چاہتے ہیں اور دنیا سے بھی۔ وہ 'تماش و نقرہ و فرزند وزن' سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں اور خدا سے غافل ہونا بھی پسند نہیں کرتے وہ دنیادار بھی ہیں، اور صاحب باطن بھی۔ شیخ سعدی نے اگرچہ اپنے عہد کے سیاسی معاملات میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا لیکن بادشاہان وقت سے تعلقات بھی منقطع نہیں کئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سیر وسیاحت اور مشاہدۂ عالم میں گزار دیا اور آخری زندگی میں اپنے سارے تجربات کو اپنی تصانیف میں محفوظ کرکے 'ہدایت نامہ خلق' کی صورت میں چھوڑ گئے۔ برخلاف اس کے امیر خسرو کا طرز فکر و انداز حیات اس سے کسی قدر مختلف تھا۔ ان کو ملکی سیاست میں بھی دخل تھا، اور گاؤں سدھار میں بھی۔ پنہاریوں کے لئے بھی وہ 'انمل بجوڑ' کہہ سکتے تھے اور شاہی درباروں کے لئے بھی وہ قصائد اور تاریخی مثنویاں لکھ سکتے تھے۔ وہ صوفیائے کرام کی آنکھوں کی روشنی اور دل کی ٹھنڈک بھی تھے اور فوج کے سپہ سالار بھی۔ ان کی ہزار شیوہ و دل نواز شخصیت قوس قزح سے بھی زیادہ حسین ورنگین تھی۔ اوران کی روحانیت بزم صوفیا اور حلقہ اصفیا میں مشاہدۂ حق سے زیادہ دلکش وجان آفریں۔ سعدی نے تصوف کی تعلیم شیخ شہاب الدین سہروردی (المتوفی سنہ ۶۳۲ھ) سے حاصل کی تھی اور خسرو نے حضرت نظام الدین اولیاؒ (المتوفی سنہ ۷۲۵ھ) سے۔ دونوں نے کاملین وقت سے فیض پایا تھا۔ اوران کے مسلک کو پوری طرح طبیعت ثانیہ بنا لیا تھا۔

شیخ سعدی نے جس طرح گلستاں و بوستان، بالخصوص گلستان، میں خواص وعوام کے لئے عملی زندگی کا لائحہ کار اور طریق حیات حکایات کی صورت میں جمع کردیا۔ امیر خسرو نے بھی اپنی مثنویات میں بادشاہوں سے لیکر عوام تک سب کے لئے زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے اور کامیاب زندگی گذارنے کا سامان فراہم کردیا۔ وہ بے تکلف شاہان وقت یعنی علاء الدین خلجی کو 'ہشت بہشت' میں دین داری وعدل گستری، دادرسی اور غربا پروری کے متعلق نصیحتیں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بالعموم لوگ عیش وتنعم میں پڑکر 'انسانیت' کی خوبیوں کو بھول جاتے ہیں۔ صرف مخلوق کی نگہبانی ہی بادشاہ کے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ بلکہ اپنی نگہبانی اور اپنے اعمال

کا احتساب بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ شجاعت و جواں مردی اچھی چیز ہے لیکن اہم امور سلطنت میں تجربہ کاروں سے مشورہ بھی ضروری ہے۔

چون خدایت سر بہ شاہی داد　　مملکت از ماہ تا بہ ماہی داد
گوش کن آسودہ داری باز شاہی　　عالمے را ز ماہ تا ماہی
بر ستم کش نہ عدل کم نہ کنی　　بر ستم کار جز ستم نہ کنی

چوں بہ خاصاں دہی نوالہ و جام
کام شاں خوش کنی بہ نعمت و کام
یاد کن زاں گروہے بے توشہ
کہ شب افتد گرسنہ در گوشہ
تا توانی بدیں و داد گرائے
کہ بود ملک زیں دو پایہ بجائے
ورچہ کس نیست دشمن تن تو
غفلت تو بس است دشمن تو
در صف رزم با جواناں پوئے
لیک تدبیر آں ز پیراں بوئے

خسرو کے یہاں 'عدل و انصاف' پر بیحد زور ہے۔ وہ اس صنعت کو استحکام مملکت کیلئے بنیادی چیز قرار دیتے ہیں ؎

تخت را مملکت برپائے خواہی　　بنا بر عدل دارد بادشاہی
تا جوراں را بہ راہ اندیشہ　　نیست بہ از دادگری پیشہ

شیخ سعدی اور امیر خسرو دونوں ایسی شخصیتیں ہیں کہ جو اہل دول اور اصحاب اقتدار سے کبھی مرعوب نہیں ہوئیں۔ اور انھوں نے اپنی آزادی رائے کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ سعدی نے شیراز کے گورنر انکیانو کی مدح میں متعدد قصیدے لکھے لیکن بقول مولانا شبلی نعمانی ہر قصیدہ میں نہایت دلیری سے اس کو نصیحت کی اور صاف کہہ دیا کہ جس کو دربار کی طمع نہیں وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا ؎

سعدیا چندانکہ می دانی بگو　　حق نباید گفتن الا آشکار
ہر کرا خوف و طمع در بار نیست　　از خطا باکش نباشد و ز تتار

ایک اور قصیدہ میں کہتے ہیں ؎

جزا مش باد ملک بادشاہی　　کہ پیشیں مدح گویند از قفا ذم
جہاں سالار عادل انکیانو　　سپہدار عراق و ترک و دیلم
چنیں پند از پدر نشنیدہ باشی　　الا اگر ہوشیاری بشنو از عم
نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ　　سخن ملکیست سعدی را مسلم

'بوستان' میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

دلیر آمدی سعدیا در سخن　　چو تیغت بدست است فتحے بکن
گر آنچہ دانی کہ حق گفتہ بہ　　نہ رشوت ستانی و نہ رشوہ دہ
طمع بند و دفتر ز حکمت بشوئے　　طمع بگسل و ہر چہ خواہی بگوئے

یہی حال و مزاج امیر خسرو کا ہے انھیں سلاطین وقت کو نصیحت کرنے میں کبھی کوئی تکلف نہیں ہوتا اور دل کی بات بے ساختہ زبان پر آجاتی ہے۔

اسی طرح وہ اپنی دختر نیک اختر کو نصیحت کرتے ہوئے تعلیم و تربیت، ہنر و سلیقہ، مشاغل خانہ داری کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ عفت و عصمت کی اہمیت جتاتے ہیں۔ اطاعت و عبادت پروردگار کی طرف راغب کرتے ہیں اور شرم و حیا اور حجاب نظر کا تذکرہ کرتے ہوئے خانہ داری و کفایت شعاری کے اصول بتاتے ہیں۔ سینے پرونے خاص طور پر گھریلو صنعتوں میں چرخہ کاتنے پر غیر معمولی زور دیتے ہیں۔ امیر خسرو ہندوستان اور اہل ہند کے مزاج داں تھے۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ہمارے ملک میں چرخہ کاتنے اور تن ڈھانکنے کا سامان خود اپنے گھروں میں تیار کرنے کی کیا اہمیت ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے چھوٹی صنعتوں کو گھروں میں رائج کرنے کی تلقین کی اور صنعت و حرفت کی طرف افراد ملک و قوم کو متوجہ کیا۔ مثنوی 'ہشت بہشت' میں "نصیحت بدختر نیک اختر" کے سلسلہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

از منت آں کہ او لیں پند است
جہد بر طاعت خداوند است

پاک تن باش ہمچو آب سپہر　　بلکہ پاکیزہ تر ز چشمۂ مہر
گوشہ گیراں ستودہ نام بوند　　کوچہ گرداں فراخ گام بوند
مرد اگر یک فراخنہ کار کند　　زن بکد بانوی ہزار کند

گرچہ زر باشدش فراخ نہ تنگ
تا ندارى ز دو دیگ و سوزن تنگ
دو دیگ و سوزن گذاشتن نہ فن است
کالت پردہ پوشی بدن است

شیخ سعدی اور امیر خسرو دونوں نے معلم اخلاق کے فرائض بڑی ذمہ داری کے ساتھ انجام دیے ہیں اور اس طرح تلخ وتند باتوں کو لطیف و شیریں الفاظ و انداز میں اور حکایات ونصائح کا روپ دے کر بیان کیا ہے کہ بچوں کے دلوں میں بھی اُتر جاتی ہیں اور بڑے بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ خود ان کے ضمیر کی آواز یہی ہے۔

شیخ سعدی کو غزل کا پیغمبر" کہا گیا ہے اور خواجہ حافظ نے بھی ان کو 'استاد غزل' مانا ہے۔ شیخ سعدی نے سب سے پہلے عشق کی واردات اور معاملات کو غزل میں بیان کیا اور امیر خسرو نے ان ہی مسائل و جذبات کو ہر لحاظ سے ترقی دے کر عروج کمال تک پہنچایا۔ مولانا شبلی نعمانی نے شعر العجم میں شیخ سعدی اور امیر خسرو کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "غزل قدما کے زمانہ تک کوئی مستقل چیز نہ تھی۔ سعدی نے غزل کو غزل بنادیا۔ اور امیر خسرو کی غزل گوئی پر تقریظ کرنی ہو تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہی خمخانۂ سعدی کی شراب ہے جو دوبارہ کھینچ کر تیز ہو گئی ہے۔"

خود امیر خسرو کو اعتراف ہے کہ:-

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

مولانا شبلی نے جو خصوصیات سعدی اور خسرو کی غزلیات میں مشترک بتائی ہیں ان میں درد، سوز و گداز، جذبات محبت معاملات عشق، عجز و نیاز، سادگی و لطافت زبان، قریب الفہم انداز بیان۔ لب ولہجہ کی نرمی بحروں کی روانی وغیرہ وغیرہ شامل ہیں بعد ازاں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو نے صنف غزل میں "کمال شاعری کی بہت سی چیزیں اضافہ کیں اور ایجادات و اختراعات کے چمن کھلا دیے"۔

پروفیسر وزیر الحسن عابدی نے بڑی محنت، کاوش اور کوشش سے شیخ سعدی اور امیر خسرو کے دواوین کی چھان بین کرکے ان کی ہم طرح غزلیں یکجا "پیکجز لمیٹڈ۔ لاہور" سے شائع کردی ہیں۔ انھوں نے جو غزلیں انتخاب کی ہیں انہیں شیخ سعدی کی 'طیبات' سے ۲۶ غزلیں لی ہیں اور 'بدائع' سے ۱۴ غزلیں۔ ان کی 'غزلیات قدیم' سے ۴ غزلیں منتخب کی ہیں اور 'خواتیم' سے ۳ غزلیں۔ اسی طرح امیر خسرو کے دیوان 'نہایت الکمال' سے جو ان کا دیوان پنجم ہے اور ۷۲۵ھ میں مرتب کیا گیا ہے ۳۶ غزلیں انتخاب کی ہیں، اور 'تحفۃ الصغر' سے جو ان کا دیوان اول ہے۔ اور ۶۷۱ھ میں ترتیب دیا گیا ہے۔ ۷ غزلیں۔ 'بقیۂ نقیہ' دیوان چہارم مرتبہ ۷۱۶ھ اور 'غرۃ الکمال' دیوان سوم، مرتبہ ۶۹۳ھ سے دو، دو غزلیں لی ہیں اور 'وسط الحیوٰۃ' دیوان دوم مرتبہ ۶۸۳ھ سے بھی دو غزلیں۔

"طیبات" اور 'بدایع' میں شیخ سعدی کی وہ غزلیں شامل ہیں کہ جو ان کے کمال شعر گوئی و معراج سخن سنجی کا بہترین نمونہ ہیں۔ امیر خسرو کی منتخب غزلیں بھی جو ہم طرح اور تقریباً اسی زمین اور ردیف و قوافی میں ہیں، بالعموم امیر خسرو کی پیرانہ سالی، بس کہولت، اور پختہ مشقی کی یادگار ہیں اور اس قول کی تصدیق کرتی ہیں کہ "جلد سخن دارد و شیرازۂ شیرازی"۔ کلام سعدی و خسرو کے بالمقابل مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی..

چونکہ آخر عمر میں امیر خسرو کی عقیدت و ارادت شیخ سعدی اور ان کے انداز بیان سے غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی اور علمی و ادبی دنیا میں طرز فکر و انداز نظر میں وہ شیخ سعدی سے بہت مماثلت رکھتے تھے صنف غزل میں سعدی کی 'پیمبری' کو انھوں نے تسلیم کیا تھا اور اسباب حسن یار پر کچھ اضافے کرنے اور حسن تغزل و ترنم کو لطیف و دلکش تر بنانے کے لئے اسلوب بیان میں کچھ تبدیلیاں اور جدتیں بھی کی تھیں۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ سعدی کا ایک شعر ہے ؎

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

امیر خسرو نے جدت اسلوب سے کام لے کر اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

جراحت جگر خستگان چہ می پرسی
زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

سعدی کے یہاں تو صرف 'دل دینے' اور اس مجبوری کا ذکر تھا کہ جس کی بدولت یہ واقعہ پیش آیا۔ اور دوستوں کے طعن و تشنیع کا عاشق مجبور کو نشانہ بننا پڑا۔ لیکن خسرو نے ان زخموں کی گہرائیوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ جن کی وجہ سے محبوب کے دست و بازو کو نظر لگنے کا اندیشہ ہے اور اس کی نظر کی برچھیاں دل و جگر کے لئے سامان صد جراحت ہیں۔ سعدی اور خسرو کی ہم خیالی، ہم آہنگی، ہم مشربی، یگانگت اور طبعی مطابقت کے کچھ اور نمونے ملاحظہ ہوں:

عشق و رسوائی کچھ لازم و ملزوم سی چیزیں ہیں اور عاشقان صادق کا قول ہے کہ جو شخص بدنام ہونے یا مرنے سے ڈرتا ہو اس کو اس مسلک پر قدم رکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے ؎

گریز دار صف ما ہر کہ مرد غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

شیخ سعدی اس سلسلہ میں کہتے ہیں:

خبر از عشق نبود ست و نہ باشد ہمہ عمر
ہر کہ او را خبر از شنعت و رسوائی ہست

خانۂ عشق در خرابات است
نیک نامی در و چہ کار کند

امیر خسرو بھی عشق کے منازل میں نیک نامی و عافیت خواہی کو قابل نفرت و لائق استہزا قرار دیتے ہیں۔ اور ایسے شخص کو عاشق صادق ماننے سے انکار کر دیتے ہیں کہ جو لوگوں کے طعن و تشنیع سے ڈر جائے اور رسوائی و بدنامی سے جان چرائے۔

بدنامی است عشق تیاں، دور بہ ز ما
آں عاشقے کہ در رہ ما نیک نام شد

چشم یار کی تیر اندازی، اور سحر کاری کے مقابلہ میں اہل زہد و تقوے کی بے بسی اور سپر اندازی کا منظر شیخ سعدی کے ایک شعر میں ملاحظہ ہو ؎

گفتم بہ تیر مردی چشم از نظر بدوزم
با تیر چشم مژگان تقوی سپر نباشد

اسی کیفیت کو امیر خسرو کے یہاں محسوس کیجئے اور دیکھئے کہ دل بیتاب کی بے قراری اور زہد و تقوی کی شکستہ پائی کو وہ کس طرح بیان کرتے ہیں ؎

زیں ساں کہ دل در عاشقی بگسست تقوی را رسن
نتواں لگام از شرم کرد ایں توسن بے رام را

شکن زلف یار کی فتنہ سامانیاں اور خم ابروئے دوست کی کارفرمائیاں شیخ سعدی اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ولولہ در شہر نیست جز شکن زلف یار
فتنہ در آفاق نیست جز خم ابروئے دوست

امیر خسرو جدت ادا سے کام لیتے ہوئے دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں، کی تشریح سیارگان فلک کی آہ و فریاد کا حوالہ دیکر اس طرح پیش کرتے ہیں :

می گذشتی شب و از ماہ برآمد فریاد
کاین چہ فتنہ است کہ بر روئے زمیں می گذرد

راہِ وفا میں فدا کاروں کے ثبات قدم اور خاک عشاق کی وفا کیشی کا منظر شیخ سعدی کے یہاں ملاحظہ ہو:۔

گر متفرق شود خاک من اندر جہاں
باد نیارد ربود گرد من از کوئے دوست

امیر خسرو اسی، وفاداری و استواری کو اپنے انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں :۔

گر ہمہ عالم شوند منکر ما گو شوید
دور نخواہیم شد ما ز سر کوئے دوست

ما را ز کوئے جاناں عزم سفر نہ باشد
بے عمر زندگانی کس را بسر نباشد

بوئے یار کی مشام نوازی اور دنیا بھر کی خوشبو دار چیزوں سے افضلیت و لطافت شیخ سعدی اس طرح محسوس کرتے ہیں :۔

در مشک و عود و عنبر و امثال طیبات
خوشتر ز بوئے دوست دگر ہیچ طیب نیست

اسی بوئے دوست کی جاں نوازی اور عشاق کے دلوں کا سراپا اشتیاق و مرہون سوز و گداز ہونا کچھ بدلے ہوئے انداز میں امیر خسرو کے یہاں ملاحظہ

جاں بفشانم ز شوق در رہ باد صبا
گر برساند بما صبح دمے بوئے دوست

دل را بسوختی و ہنوز از برائے تو
سوگند می خورد کہ بہ آتش درون شود

تسلیم و رضا ایسے مسائل ہیں کہ جن سے اہل عرفان کو ہر قدم پر واسطہ پڑتا ہے۔ شیخ سعدی کا انداز فکر اس مسئلہ میں اپنا مخصوص انداز فکر رکھتا ہے:۔

گر تاج می دہی غرض ما قبول تو
ور تیغ می زنی طلب ما رضائے تو

گر بندہ می نوازی دگر بندہ می کشی
زجر و نواخت ہر چہ کنی رائے رائے تست

امیر خسرو کی اس مسئلہ میں سپردگی و رضا جوئی کا انداز حسب ذیل ہے :۔

ما جان فدائے خنجر تسلیم کردہ ایم
خواہی بخش و خواہ بکش رائے رائے تست

غم عشق کی جنوں نوازی، عقل گدازی اور فرماں روائی کا ذکر شیخ سعدی اس طرح کرتے ہیں :۔

بہ خرابات چہ حاجت کہ یکے مست شود
کہ بہ دیدار تو عقل از سر ہشیار برفت

دیوانہ می کند دل صاحب تمیز را
ہر گہ کہ التفات پری دار می کند

دنیا و دین و صبر و عقل از من برفت اندر غمش
جائے کہ سلطان خیمہ زد غوغا نماند عام را

اسی غم عشق کی کارفرمائی اور چشم مخمور کی صید اندازی کو امیر خسرو کے یہاں ملاحظہ کیجئے۔

ہر چہ از عقل بزدون خدہمہ عمرم جو جو
اندریں غارت غم جملہ بیک بار برفت

چو عقل عاقلاں نہ کند صید چشم تو
مست است وقصد مردم ہشیاری کند

صنفِ غزل میں "قافیہ" کا حرف بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ سعدی اور خسرو کے چند اشعار ملاحظہ ہوں کہ جن میں ہر دو اساتذہ نے وسعت فکر و نظر کی شان دکھائی ہے اور ایک ہی قافیہ ور دیف میں حسن تغزل کے نمونے پیش کئے ہیں :۔

سعدی 'بدائع' میں کہتے ہیں ؎

بارے بہ چشم احساں در حال ما نظر کن
کز خوان پادشاہاں راحت بود گدارا

خسرو 'تحفۃ الصغر' میں کہتے ہیں :۔

از آں گہے کہ تو سلطان بہ ملک دل بنشستی
نشاط خواب بہ شبہا حرام گشت گدا را

'قضا'، کا قافیہ ملاحظہ ہو :۔

سعدی (بدائع)

سعدی قلم بہ سختی رفت است و نیک بختی
پس ہر چہ پیشت آید گردن بنہ قضا را

خسرو (تحفۃ الصغر)

نہ من اسیر بتانم بہ اختیار و لیکن
گسست می نتوانم کسے کمند قضا را

'آتش و آب'، اور 'ابر و آفتاب'، کی دلکش تشبیہیں ان دونوں فن کاروں کی ہم طرح غزلوں میں ملاحظہ ہوں :۔

سعدی (طیبات)

از درون سوزناک و چشم تر
نیمۂ در آتشم نیمے در آب

خسرو (غرۃ الکمال)

باخیالِ زلف ورویت چشم من
نیمۂ ابر ست و نیمے آفتاب

ایک اور غزل کے چند اشعار سنئے جو سعدی (بدائع) اور خسرو (تحفۃ الصغر) کے کلام سے ماخوذ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خسرو نے سعدی کی غزل سامنے رکھ کر یہ غزل کہی ہے اور نئے نئے قافیوں میں زور طبع صرف کیا ہے :۔

سعدی

چو فتنہ بود کہ حسن تو در جہاں انداخت
کہ یک دم از تو نظر بر نمی توان انداخت

بلائے غمزۂ نامہربان خونخوارت
چہ خون کہ در دل یاران مہربان انداخت

زعقل و عافیت آن روز بر کران ماندم
کہ روزگار حدیث تو در میان انداخت

خسرو

چہ تیر بود کہ چشم تو ناگہاں انداخت
کہ برنشانۂ دلہاے عاشقاں انداخت

شمایل قدر عنا و طبع موزونت
ہزار فتنہ و آشوب درجہاں انداخت

چہ کرد پیش رخت گل کہ گلفروش او را
بدست خود بہ گلو بستہ ریسماں انداخت

نه باغ ماند و نه بستان که سرو قامت تو
برست و ولوله در باغ و بوستان انداخت
چنین حکایت روزی به دوستان برسد
که سعدی از پی جانان برفت و جان انداخت

کمال حسن تو جائی رسید در عالم
که خلق را بدو خورشید در گمان انداخت
به هر نفس غم عشقت هزار تیر بلا
بر نزد خسرو مسکین ناتوان انداخت

شیخ سعدی اور امیر خسرو کی چند مزید ہم طرح غزلیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ دونوں فنکاروں کے خیالات کی ہم آہنگی و مماثلت اور حسن بیان و فضل و کمال کی عظمت و رفعت کا بالمقابل اندازہ کیا جا سکے۔

مزید تفصیل کے لئے ہر دو اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ ضروری ہے :-

سعدی (طیبات)

امشب سبک تر می زنند این طبل بی هنگام را
یا وقت بیداری غلط بود است مرغ بام را
یک لحظه بود این یا شبی کز عمر ما تاراج شد
ما همچنان لب بر لبی نابرگرفته کام را
هم تازه رویم هم خجل هم شادمان هم تنگ دل
کز عهده بیرون آمدن نتوانم این انعام را
گر پای بر فرقم نهی تشریف قربت می دهی
جز سر نمی دانم نهادن عذر این اقدام را
چون بخت نیک انجام را با ما بکلی صلح شد
بگذار تا جان می دهد بدگوی بدفرجام را
سعدی علم شد در جهان صوفی و عامی گو بدان
ما بت پرستی می کنیم آنگه چنین اصنام را

خسرو (بقیہ نقیہ)

بهر تو خلقی می کشد آخر من بدنام را
بس می نیایم چون کنم وه این دل خود کام را
یک شب به بوسه دیدمت آنگه بیاد پای تو
رنگین بساطی می کنم از خون دل آن بام را
خواهم که خون خود چو می در گردن جامت کنم
دانی چه دولت می دهی هر ساعت از لب جام را
تا چند هر دم از صبا در جنبش آید زلف تو
آخر دمی آرام ده دل های بی آرام را
گر آب چشمی نیستت باری کم از نظاره‌ای
این دم که آتش در زدم بازار ننگ و نام را
بگرفت در تو سوز من اکنون که خواهم چاره‌ای
دوزخ مگر پخته کند این شعله های خام را
من عاشقم ای پندگو بهبود گو اما نه کر تو
از عافیت شربت دهی جان بلا آشام را
گر کشته شد خسرو ز غم تهمت چه بر خوبان نهم
چون چرخ خنجر می دهد در کشتنم بهرام را

سعدی

درویشی و [illegible] خوشتر است — یک درویشی ز هستی خوشتر است
[illegible] — عارفان گویند مستی خوشتر است
خود پرستی خیره دارد [illegible] — نیستی و حق پرستی خوشتر است
چون گروه [illegible] سختی می روند — هم سبک باری و چستی خوشتر است
سعدیا [illegible] — می نماند تنگدستی خوشتر است

سعدی

برمن که صبوحی زده ام خرقه حرام ست
اے مجلسیان راه خرابات کدام ست
هر کس بجهان خرمی پیش گرفتند
مارا غمت اے ماه پری چہره تمام ست
برخیز که در سایۂ سروے بنشینیم
کانجا که تو بنشینی بر سرو قیام ست
دام دل صاحب نظرانت خم گیسو ست
وان خال بناگوش مگر دانۂ دام ست
با چون تو حریفے بچنیں جائے درین وقت
گر باده خورم خمر بهشتی نه حرام ست
دردا که بپختیم درین سوز نهانی
وآن را خبر از آتش ما نیست که خام ست
سعدی خبر اندیشه که در کام نهنگان
چون در نظر دوست نشینی همه کام ست

خسرو

مفلسی از پادشاهی خوشتر است — مفلسی از پارسائی خوشتر است (رندی)
پادشاهی راست در درسرے — چون بگه کردم گدائی خوشتر است
پادشاہان چون بخود ندہند راه — با فقیران بے نوائی خوشتر است
آدمی چون کبر در سری کند — با سگ کو آشنائی خوشتر است
دل که از سودائے خوبان بشکند — آن شکسته مومیائی خوشتر است
آشکارا عشق بازی با بتان — از پسِ پرده ریائی خوشتر است
نیست لذت عشق را بے دار و وصال — عشق بازان را جدائی خوشتر است
عشق دونان خسروا از سر بنه — عشق با سر فدائی خوشتر است

خسرو

مارا چه غم امروز که معشوقه بکام است
عالم بمراد دل و اقبال غلام است
صیدے که دل خلق جهان بود بدامش
المنة لله که امروز بدام است
از طاق دو ابروے توأے کعبۂ مقصود
خلقے بگماں اند که تا کعبه کدام است
چشم تو اگر خون دلم ریخت عجب نیست
او را چه توان گفت که او مست مدام است
خسرو که سلامت نکند عیب مگیرش
عاشق که ترا دید چه پروائے سلام است

سعدی

آن سرو که گویند به بالای تو ماند
هرگز قدم پیش تو رفتن نتواند
دنبال تو بودن گنه از جانب ما نیست
با غمزه بگو تا دل مردم نستاند
زنهار که چون می‌گذری بر سر مجروح
وز وی خبرت نیست که چون می‌گذراند
بخت آن نکند با من سرگشته که یک روز
همخانهٔ من باشی و همسایه نداند
هر کس سر پیوند تو دارد به حقیقت
دست از همه چیز و همه کس درگسلاند
امروز چه دانی تو که در آتش داغم
چون خاک شوم باد به گوشت برساند
آنان که ندانند پریشانی مشتاق
گویند که نالیدن بلبل به چه ماند
هر ساعتی این فتنهٔ نوخاسته از جای
برخیزد و خلقی متحیر بنشاند
در حسرت آنم که سر و مال به یک بار
در دامنش افشانم و دامن نفشاند
سعدی تو در این بند بمیری و ندانند
فریاد مکن یا بکشد یا برهاند

سعدی

من اگر نظر حرام است بسی گناه دارم
چه کنم نمی‌توانم که نظر نگاه دارم
ستم از کسی است بر من که ضرورت است بردن
نه قرار زخم خوردن نه مجال آه دارم

خسرو

من سرو ندیدم که به بالای تو ماند
بالای تو سروی است که گل می‌شکفاند
بگذار که این عاشق دل سوخته بی تو
یک لحظه نماند که به یک جای نماند
ترسم که به کام دل دشمن بنشینم
با آنکه فلک با تو به کامم بنشاند
فریاد که از تشنگی‌ام جان به لب آمد
کس نیست که آبی به لب تشنه رساند
فریاد که بیداد ز حد بردی و از تو
فریادرسی نیست که دادم بستاند
دیوانهٔ در سلسله گر بوی تو یابد
دیوانه شود سلسله در هم گسلاند
وقت است که بیدار شود دیدهٔ بختم
وز چنگ غم و درد و عذابم برهاند
آسان شود این مشکل در دانش تو امشب
کاحوال جهان جمله به یک حال نماند
ما بندهٔ خسرو که به سختی بنهد دل
هم عاقبتش بخت به مقصود رساند

خسرو

نکنم ز عشق توبه که بسی گناه دارم
چه کنم نمی‌توانم دل خود نگاه دارم
چو نیائی و نیاید ز رهی جز آنکه پیشت
جگری به خاک ریزم نظری به راه دارم

نه فراغت نشستن نه شکیب رخت بستن
نه مقام ایستادن نه گریزگاه دارم
نه اگر همی نشینم نظری کند به رحمت
نه اگر همی گریزم دگری پناه دارم
بهم از قبول عامی و صلاح نیک نامی
چه بترک سر بگفتم، چه غم از کلام دارم
سر من فدای عاجت سر بنده و آستانت
چه مراد از گدائی، چه تو پادشاه دارم
چه شب است یا رب امشب که ستاره‌ٔ برآمد
که دگر نه عشق خورشید و نه مهر ماه دارم
مکنید دردمندان گله از شب جدائی
که من این صباح روشن ز شب سیاه دارم
چو در روئے خوب دیدن گناه است یعنی سعدی
تو گمان نیک کردی که خود این گناه دارم
ز فراق شهر بندم بکدام سو گریزم
که بگرد قلعهٔ جان ز بلا سپاه دارم
شبکی ز سوز سینه کنمت چو شمع روشن
همه تیرگی که در دل ز شب سیاه دارم
چه کنم که آب حسرت نکنم روان ز مژگان
که بسینه ز آتش دل همه دود آه دارم
چو فرو شدم بطوفان، چه کنم جفائے دیده
چو گذشت آبم از سر، چه غم کلاه دارم
بکشش از نامهٔ جان رقم وفا نوشتم
نه من سیاه نامه جز این گناه دارم

سعدی (طیبات)

بری زند ز مشرق شمع فلک زبانه
اے ساقی صبوحی در ده مے شبانه
عقلم بدزد لختے، چند اختیار و دانش
هوشم ببر زمانے تا کے غم زمانه
گر سنگ فتنه بارد، فرق منش سپر کن
ور تیر طعنه آید، جان منش نشانه
گرمے بجان دهندت، بستان که پیش دانا
ز آب حیات بهتر خاک شراب خانه
آن کوزه بر کفم نه کآب حیات دارد
هم طعم نار دارد، هم رنگ ناردانه
صوفی چگونه گردد گرد شراب صافی
گنجشک را نگنجد عنقا در آشیانه،

خسرو (تحفة الصغر)

شمع فلک برآید با آتشین زبانه
ساقی نامسلمان در ده مے مغانه
کشتی مے روان کن ما تا کرانه یابیم
دریائے غم ندارد چون هیچ جا کرانه
مے نیم خورد خود ده وز پارهٔ برنجی
دل بر لب تو دارم بے خواستن بهانه
نے نے که از رخ خود بیهوش کن که بارے
یکدم خلاص یابم از محنت زمانه
رد تا ردیم بیرون دستم بگردن تو
تو بیخود صبوحی من بیهش زمانه
اے مه غلام حسنت چون در خمار باشی
نے روئے خواب شسته نه موئے کرده شانه

دیوانگان نہ ترسند از صولت قیامت
بشکید اسب چوبیں از سیلی و تازیانہ
صوفی د کنج خلوت، سعدی و طرف صحرا
صاحب ہنر نگیرد بہ بے ہنر بہانہ

مطرب برود خود زن دستے بہ ابر باران
ویں زہد خشک مارا ترکن بیک ترانہ
خسرو خراب مطرب، تو مست ناز و سرخوش
ہاں در چنیں نشاطے یک رقص عاشقانہ

اب تک شیخ سعدی اور امیر خسرو کی مشترک خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا۔ اب امیر خسرو کی چند انفرادی خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ امیر خسرو کا تعلق سلسلہ نظامیہ چشتیہ سے تھا۔ جس میں شاہان وقت اور امرائے عہد سے تعلق رکھنا ممنوع نہ تھا۔ اور بزم موسیقی و محفل سماع میں شرکت بھی جائز تھی۔ امیر خسرو نے دہلی میں گیارہ بادشاہوں کا عروج وزوال دیکھا اور سات درباروں سے متعلق بھی رہے۔ ان کے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ نے دربار شاہی سے روابط استوار رکھنے کی ان کو اجازت دے رکھی تھی اور ایسے بادشاہان وقت سے تعلقات قائم رکھنے کو بھی روا رکھا تھا کہ جن کو حضرت نظام الدین اولیاؒ سے سخت مخالفت و عناد تھا۔ امیر خسرو خانقاہوں اور درباروں کے موسیقاروں کے لئے تازہ بتازہ غزلیں لکھ کر دیتے تھے اور موسیقی کی خاص الخاص تالیفات کے لئے بھی اشعار کہتے تھے۔ ان کی غزلیں مختلف آلات موسیقی پر محافل سماع میں گائی جاتی تھی اور اہل ذوق عالم وجد و حال میں ان پر سر دھنتے اور رقص کرتے تھے۔

امیر خسرو کے کلام کی تاثیر اور روحانی کیف و سرمستی کے سلسلہ میں اس واقعہ کا حوالہ کافی ہے کہ جس کا تذکرہ شہنشاہ جہانگیر نے 'تزک جہانگیری' میں لکھا ہے ؎

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

اس شعر کا پہلا مصرع حضرت نظام الدین اولیاؒ کا ہے جو انھوں نے دریائے جمنا کے کنارے اہل وطن کو طلوع آفتاب کے وقت عبادت و پرستش میں مصروف دیکھ کر بیساختہ کہہ دیا تھا۔ امیر خسرو نے جو اس وقت ان کے ہمراہ تھے۔ اظہار عقیدت کرتے ہوئے برجستہ مصرع ثانی موزوں کر کے شعر مکمل کر دیا تھا۔

ایک محفل سماع میں جو دربار شاہی میں منعقد ہوئی تھی۔ اسی شعر پر ملا علی احمد چشتی نے جان دیدی تھی اور اس امر کو ثابت کر دیا تھا کہ موسیقی ایک روحانی غذا ہونے کے علاوہ محبوب تک پہونچانے، حرکت قلب روک دینے اور واصل بحق کرنے کا ایک وسیلہ بھی ہے۔

امیر خسرو کو موسیقی میں جو دسترس حاصل تھی اس کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس فن میں غیر معمولی مہارت اور دلچسپی رکھتے تھے۔ اور عوام و خواص کی قلبی گہرائیوں تک پہونچنے نیز دلی احساسات کے اظہار کے لئے اس کو نہایت مؤثر و کارآمد سمجھتے تھے۔ رشید ملک صاحب جنھوں نے حال ہی میں ایک طویل و مدلل مضمون بعنوان "حضرت امیر خسرو کا علم موسیقی" لکھا ہے اور چند دیگر مضامین کے ساتھ کتابی شکل میں لاہور سے شائع کیا ہے، یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ستار، مردنگ، ڈھول اور طبلہ وغیرہ یا قوالی، ترانہ، نیز دیگر راگوں کی ایجاد امیر خسرو کی اختراعات

[illegible] ہے کہ امیر خسرو کی موسیقی دانی میں کسی کو کلام نہیں ہے لیکن فن موسیقی کے اعتبار سے ان کی [illegible] امیر خسرو کی وہ اہمیت نہیں ہے کہ جو عام طور پر [illegible] ہے۔ داخلی شہادتوں کی بنیاد پر ان کا کہنا ہے کہ خسرو کی نظر میں موسیقی بحیثیت ایک علم کے شاعری کے [illegible] ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ خود امیر خسرو کے ایک قطعہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مطربے می گفت خسرو را کہ اے گنج سخن
علم موسیقی ز فن نظم نیکو تر بود
زانکہ این علمی است کز دقت نیاید در قلم
وان نہ دشوار است کاندر کاغذ و دفتر بود
پاسخش گفتم کہ من در ہر دو معنی کاملم
ہر دو را سنجیدہ بر وزنے کہ آن بہتر بود
نظم را کردم سہ دفتر در بہ تحریر آمدے
علم موسیقی سہ دیگر بودار باور بود
فرق می گویم میان ہر دو معقول و درست
تا دہد انصاف آن کز ہر دو دانشور بود
نظم را [illegible] تصور کن بنفس خود تمام
کو نہ محتاج سماع و صوت و خنیاگر بود
گر کسے بے زیر و بم نظمے فرو خواند رواست
نے بمعنی ہیچ نقصان نے بلفظ اندر بود
در کند مطرب بسے ہاں ہاں ہوں ہوں در سرود
چون سخن نبود ہمہ بے معنی و ابتر بود
[illegible] زن را ببین کہ صوتے دارد و گفتار نے
لاجرم محتاج در قول کسے دیگر بود
پس درین صورت مزدت صاحب صوت و سماع
از برائے شعر محتاج سخن پرور بود

نظم را حاصل عروسے دان و نغمہ زیورش
نیست عیبے گر عروسے خوب بے زیور بود

امیر خسرو نے نظم کی افضلیت مختلف دلائل سے ثابت کرنیکی کوشش کی ہے اور ایک حد تک صوت و سماع اور نغمہ و خنیاگری کو نظم کا محتاج یا منحصر علیہ قرار دیا ہے۔ لیکن رشید ملک ان کے ان دلائل کو قطعی اور ناقابل تردید نہیں سمجھتے۔ ان کی نظر میں موسیقی بذات خود ایک علم ہے۔ اور اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں کسی دوسرے علم و فن کا محتاج نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فن موسیقی شاعری سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اس کی اپنی ایک دنیا ہے اور اس کے رموز و نکات نہایت دقیق و لا محدود ہیں۔ امیر خسرو کو ستار، ترانہ، قوالی وغیرہ کا موجد نہ مانتے ہوئے ان کے دلائل کا انداز یہ ہے کہ "موسیقی میں نہ راگ کشف کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی مزامیر کرامات کے ذریعہ ظہور میں آتے ہیں۔ یہ صدیوں کے تجربات کی بنا پر ارتقائی منزلیں طے کر کے ہم تک پہونچتے ہیں۔ اور شاید یہ ان کی آخری منزل بھی نہ ہو۔ اگر یہ آخری منزل ثابت ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس شعبۂ حیات میں فکری جمود کا شکار ہو گئے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ موت ہوگا۔"
(صفحہ ۹)

آگے چل کر رشید ملک لکھتے ہیں کہ "ہر ایجاد کے پیچھے ایک 'تصور' ہوتا ہے، جو ارتقائی منزلوں سے گزر کر مختلف صورتیں اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ کوئی ایجاد ایک دم ظہور میں نہیں آجاتی۔ بلکہ وہ صدیوں کے مشاہدات و تجربات اور غور و فکر کا نتیجہ ہوتی ہے ...... یہ کہنا کہ 'ستار' ایک فرد واحد کی ایجاد ہے۔ وسعت نظر کے فقدان کی

دلیل ہے۔" (صفحہ ۱۷۰)

مضمون کے آخر میں اپنے دلائل کی تلخیص کرتے ہوئے رشید ملک کہتے ہیں کہ "دراصل فن کی جڑیں عوام میں ہوتی ہیں۔ اور یہ کسی علاقہ یا قبیلہ کی زندگی کا عکس ہوتا ہے اس کی تاریخ اس قبیلہ یا علاقہ کے جمہور کی تاریخ ہوتی ہے اس پر کسی فرد کا اجارہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ موسیقی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔ موسیقی کی تاریخ زبان کی تاریخ کی طرح جمہور کی تاریخ ہے۔ زبان کی طرح موسیقی کا ارتقاء اور اس کی نشو و نما بھی داخلی اور خارجی عوامل کی مرہون منت ہے۔ جس طرح ہم کسی فرد واحد کو زبان کا موجد یا زبان کے کسی شعبہ کا موجد قرار نہیں دے سکتے اسی طرح موسیقی یا دوسرے فنون میں بھی کسی ایک شخص کو اس کا یا اس کے کسی شعبہ کا موجد قرار دینا غلط ہے۔"
(صفحہ ۳۰۶)

رشید ملک کے دلائل میں کتنا ہی وزن ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ امیر خسروؒ کے معاصرین سے لے کر آج تک ہر صاحب فن ان کے کمال موسیقی کا قائل ہے اور مہارت و رموز شناسی کی بدولت ان کو استاد فن تسلیم کرتا ہے۔ خود رشید ملک کو اعتراف ہے کہ:

"حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے دامن سے وابستگی، ان کی درباروں سے وابستگی، ان کا علم و فضل اور ان کی عظیم شاعری، ان سب عوامل نے ان کی ذات اور شخصیت کے اردگرد تقدس و عظمت کا ایک ہالہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ ان کی ذات گرامی سے منسوب کسی روایت کو ہم چیلنج کرنے کے موقف میں نہیں ہیں۔" (صفحہ ۳۰۵)

امیر خسرو صرف ایرانی لحن اور موسیقی ہی کے ماہر نہیں تھے بلکہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ہندوستانی راگ راگنیوں کو گوپال نائک سے حاصل کیا تھا، اور آلات موسیقی کے استعمال میں انھوں نے مشق کمال بہم پہونچائی تھی۔ ان کی غزلوں کا ترنم و نغمگی اس کا بین ثبوت ہے اور بڑے بڑے موسیقار ان کی اختراعات و ایجادات کے قائل ہیں۔ امیر خسرو نے ایک عظیم ماہر موسیقی ہونے کی حیثیت سے عمیق نظر و فکر سے کام لے کر نئے نئے راگ اور مزامیر ایجاد کئے اور مروجہ راگ و مزامیر میں نئے نئے تجربے کرکے فن موسیقی کے مستقبل کو جاندار و شاندار تر بنا دیا۔ فی الحقیقت بقول ڈاکٹر اقبال۔

ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

قصہ مختصر خواہ اردو زبان کے ارتقاء کا مسئلہ ہو خواہ اصول لسانیات کی تحقیق کا، شعر و سخن پر تبصرہ ہو خواہ فن موسیقی پر، وطن پرستی کا تذکرہ ہو، خواہ تاریخ نگاری کا۔ عوام کی نفسیات کا مطالعہ ہو خواہ فطرت انسانی کے تقاضوں کا، ادبی تخلیقات کا جائزہ ہو خواہ اخلاقی و روحانی تعلیمات کا، روحانیت کا ذکر ہو خواہ تزکیہ نفس کا، آفاقی قدروں کا بیان ہو خواہ علامت نگاری و رمز و ایما کا۔ امیر خسروؒ کا کلام ہمیشہ ہماری رہنمائی کرتا رہے گا اور ہمارے عزیز از جان قدیم ورثہ کو زندہ و تابندہ رکھے گا۔

نذرِ عقیدت

بحضور طوطیِ ہند، موجدِ اردو زبان حضرت امیر خسرو

ضیاؔ ہاشمی

بانیِ اردو زباں ، اے شاعرِ ہندوستان
ہادیِ تہذیبِ ادب ، پیغمبرِ اہلِ زباں
موجدِ اردو غزل ، اے خسروِ شیریں سخن
امتیازِ انجمن ، روحِ روانِ انجمن
کلکِ سحر پرور ، ہر بیاں سحر آفریں
معجزِ جدت ادا ، جدت بیاں جدت طراز
معجز بیانِ نکتۂ حق و مجاز
ہر ادا ہر طرز ہر انداز ہر ندرت حسیں
ساقیِ بزمِ سخن ، ساغر بکف مینا بدوش
نکتہ رس شیریں دہن شیریں زباں شیریں کلام
ہر تفکر ہر نفس وابستۂ شعر و ادب
ہر سخن ہر لعلِ یمن ہر حرف دُرِّ شاہوار
ہر لطافت ہر بلاغت موجبِ صد افتخار
تیرے نغمے تیری غزلیں تیرے دوہے شاہکار

نغمہ سنج و ماہرِ فن ، سب سے بہتر ہمہ داں
نکتہ رس ، بہتر معانی ، مخترع ، اہلِ فن
فیضِ رمز و معانی ، مخترعِ نثر و وضع
واقفِ [illegible] ، اے نوربار ، [illegible] نازنیں
افتخارِ جلوہ ریز و [illegible] سوز و گداز
سازِ [illegible] آہنگ [illegible] سوز و نیاز
[illegible] مطربِ [illegible] راز و نشیں
[illegible] نوا و واقفِ تخیلِ دل
[illegible] محبت ، [illegible] عقل و ہوش
نغمہ سرا [illegible] گل افشاں ساغرِ جام
محرمِ رازِ [illegible] بادہ بدست
سخن [illegible] میکدہ [illegible] شعر و ادب
حرف آفریں [illegible] شعر و قطار
کیفِ [illegible] آبرو [illegible] اندر [illegible]
شانِ [illegible] گلدستۂ [illegible] قطار اندر بہار
عنبر و تخیل صف در صف گل افشانی بہار اندر بہار
جدتِ الفاظ [illegible]
شوکت [illegible] نمایاں تیری فطرت کا نکھار
فصاحت نقطے نقطے سے نمایاں تیری فطرت کا نکھار

کشورِ شعر و ادب کا تاجدارِ محتشم
زندہ و پائندہ باد اے شہر یارِ محتشم

از ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی
صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی.

امیر خسرو اور انسان دوستی

آج جس موضوع پر دعوت فکر دی گئی ہے وہ "امیر خسرو اور انسان دوستی" کا موضوع ہے دیکھنا یہ ہے کہ حضرت امیر خسرو نے زندگی کی اس رنگارنگی کو کس نظر سے دیکھا ہے اور اس کو کس طرح برتا ہے انسان دوستی کا وہ کون سا نصب العین ہے جو امیر خسرو کے سلسلہ سے مل کر تمام ہندوستان بلکہ عالم کا مطمح نظر بن گیا ہے لیکن اجازت دیجئے کہ اس موضوع پر آنے سے پہلے چند کلمات خود "انسان دوستی" یا "انسانیت" کے بارے میں عرض کر دوں۔ تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ انسان دوستی کا وہ کونسا تصور تھا جس کو امیر خسرو نے اپنایا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ انسان دوستی کی منزل تک پہونچنے کے لئے فلسفیوں کے یہاں مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جو مذہب کا منکر ہے مگر انسان دوستی کا حامی۔ اس کا خیال ہے کہ مذہب سے الگ ہٹ کر بھی انسان دوستی کی تبلیغ کی جا سکتی ہے بلکہ ان میں جو زیادہ متشدد ہیں ان کا خیال ہے کہ مذہب انسان دوستی کے منافی ہے۔ ان کے نزدیک مذہب کی حیثیت فرد کے عمل کی ہے کسی مسلک کے مزاج کی نہیں ہے دوسرا طبقہ وہ ہے جس کا بیان ہے کہ مذہب انسانیت کا احترام سکھاتا ہے اور مذہب کی حیثیت اقدار کی ہے جن کے بغیر تکمیل انسانیت ممکن نہیں ہے اور یہ راستہ ہے جس کے ڈانڈے صوفیانہ افکار سے مل جاتے ہیں۔ مگر یہ دونوں طبقے اپنے نظریاتی اختلافات کے باوجود سیدین صاحب کے اس قول کی تائید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

"ہر انسان اس مشترک انسانیت کے رشتہ کا احترام کرے جو اسے دوسروں سے ملتا ہے۔ اور خارجی یا نسلی فرق کی وجہ سے خود کو دوسروں سے برتر اور اعلیٰ نہ سمجھے"۔ پیغمبر اسلام کا ارشاد گرامی ہے کہ قیامت کے دن اللہ اپنے بندوں سے پوچھے گا کہ میں بھوکا تھا تم نے کھانا نہیں کھلایا۔ میں برہنہ تھا تم نے مجھے کپڑا نہیں دیا۔ وہ عرض کریں گے کہ خدایا تیری ذات بے نیاز ہے تجھے کھلانے اور کپڑے کی کیا حاجت۔ ارشاد ہو گا کہ میرے بندے بھوکے اور

بیاسے اور برہنہ تھا پیے دروازے پر آئے ان کا دینا میرا ہی
دینا تھا۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے انھیں جذبات کو
نظم کے پیرایہ میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے ؎

غم انسان کو دیکر وہ کہتے ہیں مجھ سے
یہ قسمت ہے ہمارا اسے کھو نہ دینا
اگر جذبۂ شوق بے چین کر دے
کسی ٹوٹے دل میں ہمیں ڈھونڈ لینا
ہم آئیں گے اس طرح سے بھیس بدلے
تمھاری نظر کو خبر بھی نہ ہوگی
نہ پہچان پائے تو اتنا سمجھ لو
شب ہجر کی پھر سحر بھی نہ ہوگی

تمہید ذرا طویل ہوگئی۔ مگر اس کے بغیر خسرو کے مزاج کی وضاحت ممکن نہ تھی خسرو کا تعلق اس طبقہ سے ہے جس نے مذہب کو انسانیت کا مرکز سمجھا اس کا عقیدہ تھا کہ مذہب انسان کو منافرت اور نفاق نہیں سکھاتا جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں ان کے سوچنے کا انداز محدود ہے اور یہی جذبہ فکر ہے جو خسرو کو تصوف کی طرف لے جاتا ہے۔ گویا ایک مثلث بن جاتا ہے جو کائنات کی اصل ہے خسرو کی شخصیت بڑی عجیب و غریب ہے اگر یہ کہا جائے کہ ان کی ذات ملکی یکجہتی۔ ہندو مسلم اتحاد اور انسانی اخوت کا پیکر تھی تو اس میں قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔

وہ ایک ترک باپ اور ہندوستانی ماں کے فرزند تھے یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ ضلع ایٹہ کے دو قصبوں کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہاں دو مبلغین انسانیت پیدا ہوئے۔ سوروں میں تلسی داس اور پٹیالی میں خسرو اور یہ بھی دلچسپ اتفاق ہے کہ ان کو مرشد ایسا ملا جس کا دامن فیض ہندوستان کے ہر مذہب اور ہر گروہ کے لئے کشادہ تھا۔ میری مراد حضرت نظام الدین محبوب الٰہی بدایونی سے ہے آپ ہی کا فیضان تھا کہ خسرو ہمیشہ امن اور شانتی کے ترانے گاتے رہے تھے۔ خسرو نہ صرف شاعر بلکہ صوفی بھی تھے جن کا کام لوگوں سے نفرت نہیں بلکہ محبت سے ان کے دلوں کو کھینچنا تھا ان کے یہ خیالات ان کے کلام میں بکھرے پڑے ہیں۔

حضرت امیر خسرو اپنے شیخ کے اس قول کو اکثر دہرایا کرتے تھے کہ معاملات خلق تین قسم کے ہوتے ہیں
اول قسم یہ کہ ایک شخص کو دوسرے سے فائدہ ہو نہ نقصان۔
دوسری قسم یہ ہے کہ ایک شخص کو دوسرے سے صرف نفع پہونچے
تیسری قسم ان دونوں سے بہتر ہے کہ ایک شخص سے دوسروں کو فائدہ پہونچے اور کوئی نقصان پہونچائے تو برداشت کرے۔ اور بدلہ لینے کی کوشش نہ کرے اور یہ مرتبہ صدیقین کا ہے۔ ؎

بر نیفتد آخر از عالم نشان مردمی
شرم دار از مردمان و مردم آزاری مکن

میں نے عرض کیا کہ رواداری اور قومی یکجہتی کا نقش اول امیر خسرو کے یہاں ملتا ہے جس میزان قدر میں انھوں نے زندگی کے مسائل کو تولا وہ آیندہ کے لئے اخلاق کا معیار بن گئے ان کی پوری زندگی شرافت انسانی کا ایسا مرقع تھی جس نے شائستگی اور تہذیب کا پیمانہ متعین کر دیا۔ جس ضابطہ اخلاق کی انھوں نے نشان دہی کی وہ زندگی کی شاہراہوں کے لئے سنگ میل بن گئی۔ اور اس کے لئے جو نفسیاتی پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے وہ بے پناہ ہے ۔۔ مثال ملاحظہ ہو ؎

چرخ کہ از گوہر احسانت ساخت
آئینۂ صورت رحمانت ساخت
آئینہ زیں گونہ کہ داری بہ جنگ
آہ ہزار آہ کہ داری بہ زنگ

انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلاتا ہے کہ انسان تو وہ ہے جس کو دیکھ کر خدا نظر آجائے۔ انسان کی حیثیت ایک آئینہ کی ہے جس میں رحمان کی صورت نظر آتی ہے۔ اگر اس آئینہ پر غفلتوں کا زنگ چڑھ جائے تو اس سے زیادہ اور کیا بدبختی ہو سکتی ہے اسی کے ساتھ اس کو احساس بھی دلاتے ہیں کہ ؎

گنج خدا را تو کلید آمدی
نے پئے بازیچہ بدید آمدی

خسرو نے حسن کو اپنی زندگی اور شاعری کا مسلک قرار دیا وہ ان کا ناصحانہ پہلو ہے جس میں تلخی یا ناگواری کا احساس تک پیدا نہیں ہوتا۔ تواضع اور خاکساری۔ کاہلی سے نفرت، ہنر کی اہمیت، ہمت کی بلندی۔ حرص کی پستی۔ رضائے الٰہی اور فیاضی کے سلسلے میں وہ روایت مشہور ہے کہ کسی بادشاہ نے اتنا انعام و اکرام سے نوازا کہ سونا چاندی گاڑیوں میں اس طرح بھر کر لا رہے تھے جیسے کوئی سامان لاد کر لاتا ہے۔ مگر وطن پہونچتے پہونچتے تمام گاڑیاں تقسیم کر چکے تھے۔ بیوی جو لڑکی کی شادی کے لئے اس امید پر بیٹھی تھیں کہ خسرو انعام اکرام لاتے ہوں گے ان کو خالی ہاتھ آتے دیکھ کر غم سے بیقرار ہو گئیں مگر خسرو توکل کا پیکر اپنے اس عمل پر نازاں تھا اس اثنا میں ایک ہندو ساہوکار آیا اور روپیوں کی گاڑی پیش کر دی۔ اور کہا کہ خسرو کی اس سخاوت سے مجھے خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ

مگر خالی ہاتھ پہونچیں گے اس لئے میں بھی سوالی بن کر ان کے پاس آیا تھا ورنہ ان کی دعا سے میرے پاس کوئی روپے کی کمی نہیں ہے۔ سر دست اس سے بحث نہیں کہ اس قصے میں صداقت کہاں تک ہے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس قصے کے پیچھے جو خاکہ مرتب ہوتا ہے وہ خسرو کی سیرت سے کس قدر قریب ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خسرو معلم اخلاق تھے تو غلط نہ ہوگا۔ جب وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسان کو اپنے فرائض سے غافل نہیں رہنا چاہیئے خواہ وہ بے شمار دولت ہی کا کیوں نہ مالک ہو تو کہتے ہیں ؎

سرمایۂ مردمی کن گم   کز مردمی است تو مردم
گر زرت از عدد بود بیش   درویش نواز باش و درویش

اعمال صالح خواہ کم ہوں مگر بہتر ہیں اس مال و دولت سے جو نہ کوئی فائدہ پہونچا سکے ؎

یک شاخ کہ میوۂ دہد تر   بہتر ز ہزار باغ بے بر

انسان کو راضی برضا رہنا چاہیئے ؎

انچہ مقدر شد است چوں بنود بیش و کم
گر برسد خرم ورنہ رسد باک نیست

مستقل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کرنا چاہیئے ؎

مرد نہ ترسد ز فقر شیر نہ ترسد ز زخم
مذہب عیاریست بیم عسس داشتن

ان کے نظریات کی وضاحت ذیل کے اشعار کے ترجمہ سے ہوتی ہے۔

۱۔ اگر انسان جنت میں بھی رہتا تو اس کو وہ مسرت حاصل نہ ہوتی اگر آدم نہ ہوتے تو آدمی کا وجود بھی نہ ہوتا۔
۲۔ لوگوں کی دلجوئی کر کہ کہیں انجام کار دنیا سے انسانیت کا نام و نشان ہی نہ ختم ہو جائے

(باقی مضمون صفحہ ۱۲۴ پر دیکھئے)

از ڈاکٹر امیر حسن عابدی - پروفیسر و صدر شعبۂ عربی و فارسی دہلی یونیورسٹی
و
ڈاکٹر سید مقبول احمد - شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی

حیاتی گیلانی اور ضمیمہ تغلق نامہ امیر خسرو

مولانا کمال الدین حیاتی گیلان کے شہر رشت میں پیدا ہوئے اور سن رشد کو پہونچ کر بہ حیثیت تاجر کاشان اور گیلان کے درمیان آیا جایا کرتے تھے، نیز عراق اور خراسان کی سیر کی تھی۔ مندرجہ ذیل شعر سے ان کے سوقیانہ مذاق کا پتہ چلتا ہے ؎

تا تو ہم گاھی توانی وصل یافت
ای حیاتی یار بازاری خوش است

مؤلف ماثر رحیمی نے بھی ان کی آلودگیوں کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے :- "با وجود آلودگیہای نامناسب در کمال پاکیزگی روزگار می گذرانید[1]"۔

ایک مرتبہ میلی نامی شاعر نے نشہ کے عالم میں تلوار سے ان کا داہنا ہاتھ زخمی کر دیا، مگر وہ اتنے صاحب مروت تھے کہ قدرت کے باوجود بھی انتقام نہ لیا اور اسکو معاف کر دیا، خاص کر اس لئے کہ نشہ کے عالم میں یہ فعل سرزد ہوا تھا۔ البتہ اس واقعہ کے بعد وہ کاشان چلے گئے اور وہاں سے ہندوستان آگئے۔

ہندوستان آکر حیاتی نے ایران اور ایرانیوں کی توصیف اور یاد میں یہ رواں قصیدہ لکھا جس میں امام رضا کی مدح اور گیلان اور گیلانیوں کی مذمت کی گئی ہے، نیز اس میں جذبات کی فراوانی ہے ؎

روم تا با ایرانیان جان فرستم
بآن بوم و بر راح و ریحان فرستم
چہ راح و چہ ریحان کہ آن بوم و بر را
ہمہ مشک سوزم ہمہ بان فرستم -
ہمہ دشت ایران گل است و زیاحین
چہ سازم فغان گردم الحان فرستم
کشایم پر و بال طبع و پس آنگہ
کہن بلبلی در گلستان فرستم

---

[1] ج ۳، ص ۳۴۷

من و دامن پر زخوناب حسرت
چه دارم نوا نم بایران فرستم
ملکت نیمه جانی و جسم عظیمی
باین تنگدستی چه تا وان فرستم
ز ایران بیاد آرم و از دل تنگ
حزانی بگلگشت بستان فرستم
چه ایران که هرگه بوهمش بسنجم
تب لرزه در مغز توران فرستم

ازین پس بغم در شوم زار گریم
گهربارم و در بعمان فرستم
شب هجر شان بس که سیلاب ریزم
شفق را همه خون بداما ن فرستم
کشم آه و قفل بغم بستگان را
زبر در مفاتیح حرمان فرستم
کنم گریه و تنگدستان غم را
بداما ن همه لعل و مرجان فرستم
شمارا و مارا کفاف است باری
هر آن بهره کز شکر یزدان فرستم
اگر کان اگر بحر خود دست یابم
بهم برزنم هر دو یکسان فرستم
بد نیسان که خونابه از چشم ریزم
ازین قیمتیها فراوان فرستم
ازین این فرستم از آن آن فرستم
مراد اینکه جان را بجانان فرستم
جبیں سازم از ماه و خورشید وانگه
سجودی بخاک خراسان فرستم

شرف از که افزود آن خاک و آبی
بگویم پیامی بکیوان فرستم
علی رضا آنکه از لطف نامش
دو صد خلد و جنت برضوان فرستم
هر آن خاک کار دنسیم از دیارش
همه هدیه بر پیر کنعان فرستم
قدر سروران را سر خسروان را
بجولان گهش گوی چوگان فرستم
من و اشک چشم حیاتی که با او
همه زادهٔ ابر نیسان فرستم
زگیلان و گیلانیان یاد نارم
هر آنگه که بر دوستان فرستم
بآن کافریها که آن قوم کردند
اگر قبله باشد کی ایمان فرستم

گیلان سے غالباً وہ کبیدہ خاطر ہوکر آئے تھے جس کی تصدیق شائد اس شعر سے بھی ہوسکے گی ؎

حیاتی مخوانم که شرمنده گردم
که تنگ وجودم ازین زندگانی

بعد میں انھیں افسوس ہوا کہ وہ کیوں ایرانی دوستوں کو چھوڑ کر یہاں چلے آئے ؎

عفتہ سر در جگرم کرده و خون میخوردم
که چرا ترک زمین بوسی ایران کردم

زیادہ تر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ حیاتی شہنشاہ اکبر[1] کے زمانہ میں ہندوستان آئے، نیز کہا ہے کہ انکی نشو و نما ہندوستان میں ہوئی جس کا شائد مطلب یہ ہے کہ ان کو

---

[1] ۹۶۳ - ۱۰۱۴ ہجری - ۱۵۵۶ - ۱۶۰۵ ہجری

عروج یہاں نصیب ہوا۔ یہاں وہ حکیم ابوالفتح گیلانی[1] کے ذریعے اکبر کے ملازم اور صاحب ثروت و منصب ہوئے۔

مؤلف مآثر رحیمی اکبر تک رسائی اور دربار میں ان کی حیثیت یوں ذکر کرتے ہیں۔

"حکیم ابوالفتح گیلانی ..... از را ہ اعزاز و احترام با مولانا در آمدہ بدستوری کہ شیوہ و رسم آن غریب پرور بود اورا بنظر بادشاہ بردو در سلک ملازمان و منصب داران آن سرکار در آورد و بعلوفہ و جاگیر لائقہ سرفراز ساخت و چندان قرب و منزلت اورا در ملازمت آن بادشاہ بہم رسید کہ مزید برآن متصور نبود[2]۔"

بادشاہ کے علاوہ دوسرے شاہزادوں سے بھی ان کے تعلقات تھے، نیز وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

"اکبر کی وفات کے بعد حیاتی جہانگیر بادشاہ[3] کے مداحوں میں ہو گئے، نیز جہانگیر انھیں اتنا مانتا تھا کہ وہ سفر و حضر میں ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے۔

حیاتی عبدالرحیم خان خاناں[4] سے بھی متوسل ہوئے۔ نیز انھوں نے کافی دولت جمع کر لی۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ خان خانان انھیں اپنے خزانہ میں لے گیا اور کہا کہ جتنی اشرفیاں لے جا سکتے ہو اٹھا لے جاؤ۔ اسطرح وہ دولت کثیر اپنے گھر لے گئے۔

---

[1] متوفی بسال ۹۹۹ ہجری۔ ۹۱ - ۱۵۹۰ عیسوی
[2] ج ۳ ص ۴۰ - ۳۹ء
[3] ۱۰۱۴ - ۱۰۳۷ ہجری ۱۶۰۵ - ۱۶۲۷ عیسوی
[4] ۹۶۴ - ۱۰۳۶ ہجری ۱۵۵۶ - ۱۶۲۷ "

جب دکن کی فتح عبدالرحیم خان خانان کے سپرد ہوئی تو مدد کے لئے حیاتی بھی ان کے ساتھ ہوئے۔ نیز اگرچہ پہلے سے دونوں میں ملاقاتیں تھیں، مگر اس سفر میں صحیح طریقہ سے خانخانان کو ان کے کمالات کا اندازہ ہوا، اور اب پوری طرح سے یہ ان کے مداحوں میں ہو گئے اور دونوں کے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ اب حیاتی غزلوں اور قصیدوں میں لگاتار ان کی مدح کرنے لگے۔ خانخاناں نے پرگنہ باران میں ایک موضع انعام کے طور پر ان کو دیا جس سے ہر سال کافی آمدنی ہونے لگی اور تمام عمر وہ شراب پیتے رہے۔ رسمی قلندر نے ایک قصیدہ میں خانخاناں کی تربیت اور مربی ہونے کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے :۔

"زنعمت تو حیاتی حیات دیگر یافت[5]"

دولت آباد کے اطراف میں خانخاناں راجو دکھنی اور ملک عنبر میں جنگ چل رہی تھی[6]۔ خانخاناں کے بیٹے شاہنواز خاں راجو کی فکر میں ادھر اُدھر سرگردان تھے اور وہ جنگلوں میں مارا مارا چھپا پھر رہا تھا۔ ایک مرتبہ گھات لگا کر اُس نے خانخاناں پر اس وقت حملہ کیا جبکہ ان کی فوج کوچ کر چکی تھی اور اس وقت ڈیڑھ دو سو آدمی سے زیادہ انکے پاس نہ تھے جبکہ راجو کے پاس پانچ ہزار آدمی تھے۔ جب لشکر کو خبر ملی تو سب سے پہلے حیاتی اپنے پچاس آدمیوں سمیت خانخاناں کے پاس پہونچ گئے۔

جس زمانہ میں حیاتی خان خانان کے پاس تھے،

---

[5] مآثر رحیمی، ج ۳، ص ۴۰،
[6] خانخاناں ۱۶۰۵ء - ۱۶۱۰ء تک شہنشاہ اکبر کیطرف سے دکن میں راجو دکھنی اور ملک عنبر سے جنگ میں مصروف رہے۔

اس زمانہ میں اکثر و بیشتر خود خانخاناں ان سے روزانہ ملنے جایا کرتے تھے اور جس روز وہ انکے یہاں نہیں پہونچ سکتے تھے۔ حیاتی ان کے سلام کے لئے خود آجاتے تھے۔

صوبہ دکن سے نکل کر حیاتی جہانگیر کے دربار میں پہنچے مگر اس وقت بھی وہ انکی مدح سرائی کرتے رہے۔

حیاتی کے سال وفات میں اختلاف ہے۔ زیادہ تر تذکرہ نویسوں نے ۱۰۱۵ ہجری (۷-۱۶۰۶ ہجری) بتلایا ہے مؤلف باغ معانی نے ۱۰۱۸ ہجری (۱۰-۱۶۰۹ ہجری) لکھا ہے مگر سعید گیلانی کے اس قطعہ سے۔ مؤلف مآثر رحیمی نے ان کا سال وفات ۱۰۲۸ ہجری (۱۹-۱۶۱۸ عیسوی) لکھا ہے نیز لکھا ہے کہ خود اس مؤلف نے "حیات باقی یافتہ"[۱] سے سال تاریخ نکالی تھی۔

انکے انتقال کے سلسلہ میں اس مؤلف نے تفصیلات دی ہیں جس سے مزید اسی کے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے لکھنے کے مطابق صفر ۱۰۲۸ ہجری (۱۶۱۹ عیسوی) میں جب حیاتی احمد آباد گجرات سے واپس ہو کر فتحپور آئے تو ان کا ارادہ تھا کہ خانخاناں کی خدمت میں رہ کر عمر کا بقیہ حصہ گذارینگے اور اس ارادہ سے وہ جہانگیر کے دربار سے رخصت لے کر چلے، مگر فتحپور سے آگرہ جانے کے لئے ابھی سوار بھی نہیں ہوئے تھے کہ انتقال کر گئے۔

ابوالفضل حیاتی گیلانی کے متعلق لکھتے ہیں :-

"از دربار معنی جوئی بہ نگاہ ادگذرد دو دستی راستی از پیشانی او پیدا است"[۲] اور صاحب مآثر رحیمی ان کو اس طرح یاد کرتے ہیں :- "فارس عرصۂ خوش ذاتی ملا حیاتی، نہال حیات برومندش چون گلدستۂ قدس دلآویز و غالیہ مجالس طرب بیز ہر لفظی از منظوماتش چون ماں صباح متضمن طلوع آفتاب معانی و ہر حرفی از منثوراتش چون دم عیسوی متکفل حیات باقی، رشحات اقلامش از صفا رشک قطرات سحاب و نظم کلامش در پاکیزگی غیرت گوہر سیراب جامع فنون کمالات و حیثیات کسبی و وہبی است و آداب نیکو ذاتی و خوش صحبتی و شگفتہ روی و قاعدہ دانی دستور العمل ارباب این فن است۔ وجود شریفش در ہر مکان و زمان باعث تفریح است بوسیلۂ او بسیاری از مستعدان و غریبان ہر صنف در ممالک ہندوستان بمطلب و مدعای خود رسیدہ اند۔ و در این قسم امور بر خود منت دارد نہ بر یاران منت میگذارد و بقدر وسیع وامکان در این وادی میکوشد۔ و دایم الاوقات بصحبت مردم داہل فصحا و بلغا بسر میبرد و صلای عیش و عشرت درداده طبع باقی نیز در زمانہ می گذارد و در مضمار فصاحت و بلاغت از مشاہیر فرقۂ سخنوران است"[۳]۔

مؤلف ہفت اقلیم کہتے ہیں :-

"بلطف طبع و شگفتگی خاطر و وسعت مشرب و گرمی ہنگام موصوف بود"[۴]

نصرآبادی لکھتے ہیں :-

"طبعش لطیف است"[۵] اور صاحب ہمیشہ بہار لکھتے ہیں۔

"حیاتی گیلانی سرزمرۂ رہروان طریقت و حقیقت بود براندک و بیش قانع، بمروت و سرور زندگانی کردی"[۶]

مؤلف باغ معانی کہتے ہیں :- "دیوا قیام

---

۱ ج ۳، ص ۳۴۴، ۲ آئین اکبری ص ۱۹۸

۳ ج ۲ ص ۳۹۰، ۴ ج ۳ ص ۱۴۹
۵ ص ۳۱۳ ۶ ص ۶۱

سخن [illegible] رنگین و طبع متین داشت و بسیار خوش طبع بذلہ سنج [illegible] بوده[51]"

مؤلف [illegible] الافکار لکھتے ہیں :۔

"شاعر خوب است و کلامش مرغوب[52]"

نیز صاحب شمع انجمن لکھتے ہیں :۔

"نفس بروح پرورش محمد حیات است و نوای اهتزاز آورش مفرح ذات[53]"

سراج الدین علی خان آرزو نے حیاؔتی کو "خوش فطرت درست فکرت، نہایت ہزّال، مزاح ندیم بذلہ گو[54]" کہا ہے۔ اور صاحب مخزن الغرائب نے ان کو "شاعر شیریں زبان، خوش صحبت، فصیح البیان[55]" بتلایا ہے۔ مؤلف صحف ابراہیم ان کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"حیاؔتی گیلانی بخوش بیانی موصوف و شعر شناسی معروف بود[56]" نیز لکھا ہے کہ :۔

"حدّتِ فہم اور سرعت نظم" کی وجہ سے وہ شروع شروع میں اتنے مغرور ہوگئے تھے کہ لوگ ان کو مجنون کہنے لگے تھے لیکن بعد میں بہت ہی متواضع اور منکسر المزاج ہوگئے۔

مؤلف میخانہ حیاؔتی گیلانی سے ملے تھے۔ نیز انھوں نے ان کو "منتخب امثال و اقران[57]" بتلایا ہے، اور لکھا کہ جب حیاؔتی گیلانی نے "خسرو شیریں" کی بحر میں "سلیمان بلقیس" نام کی مثنوی کہی اور بادشاہ کے نام معنون کی تو انھیں صلہ میں سونے میں تولا گیا۔ ممکن ہے کہ تعلق نامہ کی تکمیل پر جو حیاتی کو تولا گیا تھا اسی کو صاحب میخانہ نے "سلیمان بلقیس" نام کی مثنوی کے ساتھ وابستہ کر دیا ہو۔ وہ ان کا دیوان خود نہ دیکھ سکے البتہ میخانہ کی تالیف کے وقت کسی سے سنا کہ اس میں سات ہزار شعر ہیں ——— صاحب تذکرہ نظم گزیدہ نے ایک دیوان میں صرف تین ہزار شعر بتلائے ہیں۔

حیاؔتی گیلانی کے حسب ذیل اشعار یا رباعیاں دو یا دو سے زیادہ تذکروں میں نقل کی گئی ہیں :۔

کوی عشق است این سرباز ار نیست
لب بہ بند اینجا زبان در کار نیست

درمیان کافران ہم بوده ام
یک کمر شایستہ زنار نیست

از ہوس اہلِ ہوس خصم ہم اند
دوستی را ہیچکس اغیار نیست

از بسکہ رفو زدیم شد خاک
این سینہ ہمہ بہ دوختن رفت

مریض عشق بدرد جہان گرفتار است
کہ آرزوی مداواش ہم زیان دارد

بعد مردن بتو معلوم شود رنج حیات
بہر دم آن لحظہ بنالد کہ بمنزل برسد

بہر سخن کہ کنی خویش را نگہبان باش
ز گفتنی کہ دلی بشکند پشیمان باش

---

۵۱ ص ۸۲
۵۲ ص ۱۲۳
۵۳ ص ۱۹۶
۵۴ ص ۱۹۸
۵۵ ص ۸۳
۵۶ و ۱۲۲
۵۷ و ۲۳۳
۵۸ ص ۳۲۵ھ

چہ بال مرغ کہ گر شغل روزگار نیست
ز موز نیز قدم دام کن گریزان باش

ہر قدم میروم براہ عدم
گردی از رہروان نمی بینم

ہر آن خاری کہ در راہ تو کارند
ز آب دوی خندان تازہ گردان

در کوچۂ عشق منزلی میخواہم
بال و پر شمع محفلی میخواہم
نی دین ز کسی خواہم دنی دنیائی
شائستہ دوستی دلی میخواہم

تا گفتن آرزو بود پیشۂ تو
جز پای تو میخی نزند تیشۂ تو
دشمن نکند آنچہ تو با خویش کنی
ای خون تو بر گردن اندیشۂ تو

دیوان حیاتی گیلانی کا ایک قلمی نسخہ آزاد بھون لائبریری نئی دہلی میں ہے جو خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے اور جس کا سائز ۴ ½″ × ۸″ ہے[1]۔ نیز اس میں دو سو صفحے ہیں۔ یہ نسخہ بہت باریک حروف میں لکھا ہوا ہے اور شروع کے علاوہ جگہ جگہ سے ناقص ہے۔ بہرحال سب سے پہلے اس میں غزلیں[2] ہیں جو اس شعر سے شروع ہوتی ہیں ؎

چند از خون لبطراز م مژہ گریان را
نام کم باد ز ہر نام و نشان ہجران را

اَب ان غزلوں سے کچھ اچھے اشعار یہاں نقل کئے جا رہے ہیں ؎

خرم آن کام کہ او زہر چشیدن دانست
فارغ آن دست کہ او سینہ دریدن دانست

بی محابانہ در آ گرمی صحبت باقی ست
دل ھمان دوست ہمان مہر و محبت باقی ست

عید آمد و زاہد را میخانہ بیاد آمد
تسبیح فرامش شد پیمانہ بیاد آمد

غزلوں کے بعد قصیدے[3] ہیں جو پیغمبر، شہنشاہ اکبر، شاہزادہ سلیم، حکیم ابوالفتح، خانخانان اور امام رضا کی مدح میں کہے گئے ہیں۔ انھوں نے ابوالفرج رونی کا خاص طور سے ذکر کیا ہے جن کی پیروی کرنے کی کوشش کی گئی ہے ؎

درین قصیدہ چنان داد شاعری بدہم
کہ ابوالفرج نکند بر کسی دگر تقدیم

اس کے بعد قطعوں کی باری آتی ہے جن میں حکیم ابوالفتح، شیخ ابوالفضل، ہمام الدین، تقی الدین محمد، جلال الدین حسین، خانخانان، محمد مومن کی تعریف کی گئی ہے۔ ایک قطعہ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ غالباً چھ سال پہلے وہ اپنے وطن میں تھے۔ مگر اب وہ تین مرتبہ رنج و غم میں مبتلا ہو چکے ہیں[4] ؎

شش سال بیش بود کہ من بندہ صاحبا
دوری ندیدہ بودم ۔۔۔۔۔۔۔۔ خبر نبود
امسال من سہ بار ندانم کہ یا چہ کینہ داشت
گردون چہ ہیچکس ۔۔۔۔۔۔ نبود

---

[1] نمبر ۴۴
[2] تقریباً ۱۱۷ شعر
[3] تقریباً ۶۱۶ شعر
[4] ۱۸ عدد، تقریباً ۲۰۸ شعر

ایک شب بارشد کہ بعد درد رنجہ ساخت

جانا مرا کہ تیر قضا کارگر نبود

قطعوں کے بعد ایک آٹھ بیت کی مثنوی ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے ع

ای ز تو روشن ہمہ شہر و دیار

اس کے بعد نثر میں یہ عبارت ہے جس سے ان کے نثری انداز کا پتہ چل سکتا ہے :-

"الٰہی بفروغ انوار حمایت کہ جا تنہای خردمندان روشن است و بہ پرتو آتش جلالت کردلہای سنگ کاران از آن گلشن کہ تجلّی ذات و صفات جمال و جلال خود را بر جبین عالم آرای این بادشاہ ملا آگاہ خلائق پناہ تابان داری و برگزیدۂ شاہزادہ ہای حق پرست حقیقت شناس کہ ہرگوہر شب چراغ ملک و ملکوت اند ہم در سایۂ ظل اللہ بعد کمال رسانیدہ روشن ضمیر گردانی"

اس کے بعد رباعیاں[۱] ہیں۔ ایک رباعی میں کسی مظہری نامی شخص کا ذکر ہے جن کے ساتھ وہ ۱۵ پنے کھنڈر کی طرف گئے تھے۔

با مظہری امروز بویرانۂ خویش

بودیم بفکر دل دیوانۂ خویش

ایک رباعی میں بادشاہ کے جشن وزن کا ذکر ملتا ہے۔ ع

امروز کہ روز جشن شاہنشاہ است

اس کے بعد پھر غزلوں کے ۳۸ شعر آگئے ہیں۔ اس کے بعد مثنوی ساقی نامہ ہے جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے ؎

بیا ای ساقی نوشین لب من

تمنای ہمہ روز و شب من

---

[۱] ۱۰۷ رباعیاں [۲] ۲۲ شعر

اس کے بعد غزلوں، قصیدوں، رباعیوں وغیرہ کے اشعار مخلوط ہوگئے ہیں۔ آخر میں یہ نسخہ اور بھی خراب ہوگیا ہے۔ بہرحال اس میں تقریباً ۲۳۴ شعر ہیں نیز انہیں شاہزادہ سلیم، ہمام الدین وغیرہ کی مدح ملتی ہے۔

گیارھویں صدی ہجری (سترھویں صدی عیسوی) میں حیاتی تخلص کے ایک اور شاعر گذرے ہیں جنکو حیاتی کاشی کہا جاتا ہے۔ مولانا حیاتی کاشی شروع میں سقائی کا کام کرتے تھے، اسی وجہ سے ان کا یہ تخلص ہوگیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نقطوی خیالات کی وجہ سے شاہ طہماسپ صفوی نے ان کو قید میں ڈالدیا تھا۔ جب دو سال کے بعد قید سے چھوٹے تو شیراز چلے گئے اور وہاں سے کاشان پہونچے نیز بعد میں نقطوی خیالات سے باز آئے۔ یہ واقعہ صحیح رہا ہوگا مگر یہ کہنا کہ شاہ طہماسپ نے ان کو قید کیا تھا، صحیح معلوم نہیں ہوتا، اسلئے کہ شاہ طہماسپ اوّل[۳] کا زمانہ حیاتی کاشی سے پہلے اور طہماسپ شاہ دوئم[۴] کا زمانہ ان کے بعد آتا ہے ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی اور بادشاہ رہا ہو۔

ایک صراف زادہ کے عشق میں گرفتار ہوکر حیاتی قزوین گئے اور دہاں سے ہندوستان آئے، جہاں وہ دکن میں احمد نگر میں رہنے لگے۔ تقی اوحدی نے ان کو دیکھا تھا۔ ۱۱۰۰ ہجری ۸۹-۱۶۸۸ عیسوی میں انھوں نے انتقال کیا۔

[illegible] نتائج الافکار ان کے متعلق لکھتے ہیں: "عذوبت از کلام رنگینش ظاہر و فصاحت از اشعار متینش باہر"[۵] اور

---

[۳] ۹۳۰-۹۸۳ ہجری / ۱۵۲۴-۱۵۷۶ ہجری

[۴] ۱۱۳۵-۱۱۴۴ ہجری / ۱۷۲۲-۱۷۳۱ ہجری

[۵] ص ۱۱۸

صاحب شمع انجمن کہتے ہیں :- "شاعر شیریں ابیات است
وسیراب چشمۂ آب حیات[1]"
حیاتی کاشی کے یہ اشعار دو یا دو سے زیادہ تذکروں
میں نقل کئے گئے ہیں ؎

گر بہ نا سر ویرانی عالم دارد
کشتیٔ نوح بیارید کہ طوفان اینجا ست

فغاں کہ رنجش جانان باں مقام رسید
کہ ہر کہ کرد گنہ از من انتقام کشید

خاک کوی تو زسیل مژہ بر نم کردیم
تا غباری بتو از رہگذر ما نرسد

بر صفحۂ آرزو خط نسیان کش
نی وصل طلب نہ محنت ہجران کش
خواہی کہ کس انگشت بحرفی ننہد
بنشین و چو نقطہ پای در دامان کش

تغلق نامہ

حضرت امیر خسرو[2] کی آخری تصنیف "تغلق نامہ" ہے۔ جسے انھوں نے تغلق حکومت کے بانی سلطان غیاث الدین تغلق[3] کی فرمائش پر لکھا تھا۔ اس مثنوی میں قطب الدین مبارک شاہ[4] کے قتل، خسرو خاں کی چند مہینوں کی حکومت اور غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی کا ذکر ہے۔

اکبر و جہانگیر کے زمانہ میں تغلق نامہ کے نسخے نایاب ہو گئے تھے۔ سید ہاشمی فرید آبادی صاحب نے اسکے متعلق فیضی کا ایک خط بھی نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"امیر خسرو کی بعض اور تصانیف زمانے کی اس دست برد سے محفوظ نہیں رہیں اور جیسا کہ بعض مبصرین کا اندازہ ہے ان کا آدھے سے زیادہ کلام بے نشان ہو گیا، اسمیں مثنوی تغلق نامہ کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ اکبر کے عہد میں.... یہ مثنوی بہت ہی کمیاب ہو گئی تھی[5]۔"

اس بارے میں سب سے دلچسپ اور قیمتی شہادت ملک الشعراء فیضی کے رقعے سے ہم پہونچی ہے جو اس نے راجہ علی خاں فاروقی والی خاندیس کو تحریر کیا تھا..... رقعہ کی عبارت یہ ہے:-

"بہ سلطنت وا بہت پناہ سیالا قران راجہ علیخان فاروقی والی خاندیس امید کہ نواب معلی القاب کی اوصاف موید و منصور باشید ...... بموجب ضرور استدعا می نماید کہ از کتاب تغلق نامہ از انفاس مقدسہ امیر خسرو ہست، چند ورق از اول و چندی از آخر رفتہ التفات نمودہ دو جز از اول و ہمیں قدر از آخر ہیکی از خدمت کاران امر فرمایند کہ بخطی کہ مسودہ نمودہ بجہت بندہ مصحوب حاملان عریضہ فرستند۔ امید کہ مکارم عالیہ را عذر پذیر این جرأت و تصدیع خواہند داشت ادام اللہ افضالکم۔

(العبد الاقل فیضی)

اس رقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اکبر بادشاہ کے زمانہ میں کم سے کم شمالی ہندوستان میں بہت نادر الوجود ہو گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ بظاہر کتب خانہ میں اس کا جو نسخہ موجود تھا اس کے ابتدائی

---

[2] ۶۵۱ - ۷۲۵ ہجری/ ۱۲۵۳ - ۱۳۲۵ عیسوی۔ [3] ۷۲۰ - ۷۲۵ ہجری/ ۱۳۲۰ - ۱۳۲۴ عیسوی۔ ۷۱۶ - ۷۲۰ ہجری/ ۱۳۱۶ - ۱۳۲۰ عیسوی
[4] ۷۲۰ ہجری/ ۱۳۲۰ عیسوی

اور آخری اوراق ضائع ہو گئے تھے"[۱]

بہر حال جہانگیر کے زمانے میں اس مثنوی کا صرف ایک نسخہ موجود تھا، جس کے دونوں طرف ناقص تھے۔ اس بنا پر جہانگیر نے اپنے درباری شاعروں کو حکم دیا کہ اس کو مکمل کر دیں۔ حیاتی کا مکمل کردہ تغلق نامہ بادشاہ کو اسقدر پسند آیا کہ اس کو سونے اور چاندی میں تلوا دیا۔ محمد سعید گیلانی نے اس تقریب کی تاریخ کہی ہے ؎

چوں حیاتی را بزر سنجید شاہنشاہ عصر
پادشاہ عدل گستر شاہ گردوں اقتدار
شاہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ
آفتاب ہفت کشور سایۂ پروردگار
بہر تاریخش ہر دی کعبۂ میزان چرخ
شاعر سنجیدۂ شاہی، رقم زد روزگار
۱۹ ۱۰ ھ

اس قطعہ تاریخ سے ۱۰۱۹ نکلتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حیاتی اس وقت تک زندہ تھے۔

مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد دکن نے ۱۳۵۲ ہجری/۱۹۳۳ عیسوی میں حیاتی کے تکمیل کردہ تغلق نامہ کو شائع کیا ہے۔

ابھی حال میں ہمیں دیوان حیاتی کا ایک قلمی نسخہ[۲] ملا ہے جس میں تغلق نامہ بھی ہے نیز یہ تغلق نامہ مطبوعہ نسخہ سے بہت کچھ مختلف ہے۔ خاص کر مثنوی کے آخر میں۔ علاوہ بریں مطبوعہ تغلق نامہ کے ایڈیٹر ہاشمی فریدآبادی صاحب نے تغلق نامہ کے تکملہ کو حیاتی کاشی کی طرف منسوب کیا ہے، جبکہ ہماری رائے میں یہ حیاتی گیلانی کی تصنیف ہے۔ یہ دونوں شاعر بالکل معاصر تو نہ تھے۔ البتہ ان کا زمانہ ایک دوسرے کے قریب ضرور تھا۔

حیاتی گیلانی کے متعلق یہ یقین ہے کہ وہ اکبر بادشاہ کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور مغل دربار سے متعلق ہوئے۔ نیز اکبر کے علاوہ مغل شاہزادے بھی ان کی بیحد قدر کرتے تھے جس میں جہانگیر بھی ہونگے اسلئے یہ کہنا کہ یہ مثنوی حیاتی گیلانی کی لکھی ہوئی ہے زیادہ صحیح ہے۔ بہت سے تذکرہ نویسوں نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ بعد کے بعض تذکرہ نویسوں نے بجائے حیاتی گیلانی کے اشتباہاً اسے حیاتی کاشی کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ مؤلف ید بیضا نے لکھا ہے کہ جہانگیر نے دکن سے بلا کر حیاتی کاشی کو نوازا نیز ۱۰۱۹ھ میں جب انھوں نے دوسرے درباری شعراء کی طرح ناقص تغلق نامہ کو مکمل کیا تو بادشاہ کو اسقدر پسند آیا کہ اس کو سونے چاندی میں تلوا دیا۔ نیز اس تول میں چھ خریطے صرف ہوئے اور ہر خریطہ میں ایک ہزار اشرفی اور روپے تھے۔

مؤلف ید بیضا نے اپنی دوسری تالیف خزانہ عامرہ میں بھی یونہی لکھا ہے اور ہاشمی صاحب نے خزانۂ عامرہ کے حوالے سے اور زیادہ تر اسی پر بھروسہ کرتے ہوئے، اسے حیاتی کاشی کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ مؤلف باغ معانی نے لکھا ہے کہ صاحب ید بیضا نے اس واقعہ کو حیاتی کاشی کی طرف منسوب کیا جو صحیح نہیں ہے۔ اسلئے کہ زیادہ تر مؤلفوں نے خاص کر صاحب تاریخ بدایونی کے جو دونوں کے معاصر تھے اس واقعہ کو حیاتی گیلانی کے متعلق لکھا ہے۔ مؤلف باغ معانی نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ صحیح معلوم ہوتا ہے گو یہ کہنا کہ مؤلف تاریخ بدایونی نے ایسا لکھا ہے صحیح نہیں ہے اسلئے کہ ناول تو صاحب تاریخ بدایونی نے ایسا

۱؎ مثنوی تغلق نامہ امیر خسرو دہلوی ص ۵-۶

۲؎ نمبر ۱۶۸ الہ آباد میوزیم

لکھا نہیں، دوسرے یہ کہ مؤلف تاریخ بدایونی اس واقعہ سے بہت پہلے ۱۰۰۴ ہجری ۹۶ – ۱۵۹۵ عیسوی میں مر چکے تھے۔

الہ آباد میوزیم کے دیوان حیاتی گیلانی کے پہلے صفحہ پر یہ عبارت ہے :-

اللہ اکبر ظل سبحانی

مثنوی اول این کتاب داستان چند لیست کہ بجہت اتمام یافتن کتاب تغلق نامہ ناتمام میر خسرو گفتہ شدہ کہ پارۂ از اوایل آن نداشت و بسیاری از آخرہم، چنانچہ تفصیل آن از داستان سبب نظم کتاب کہ گفتہ مفہوم میگردد۔ بندگان خلائق پناہ خلافت دستگاہ، سلیمان مکانی با فصح شعرای زمان ملا حیاتی گیلانی امر فرمودند کہ ابتدای این کتاب را تا جائی کہ افتادہ بگوید و آخر را اتمام کند، توفیق این کتاب یافتہ بروح پر فتوح میر یاوری نمودہ بروش پسندیدہ صورت اتمام یافت در بساعت نیک از نظر خورشید اثر گذاشت و گفتہا خلعت پسندیدگی یافت و قائل را بزری وزن نمودند با وج مرتبہ و قدردانی و مرتبت افزائی رسانیدند، چنانچہ گوید ؂

زان گنج طبع ریز واز آن دست درنثار

مداح کامران شد و ممدوح نامدار

اس عبارت کے علاوہ خود اس دیوان کے اندر ایک قصیدہ ہے جسمیں گیلان اور اس کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ قصیدہ حیاتی گیلانی کا ہوگا جو غالبًا وہاں کے لوگوں سے ناراض ہو کر چلے آئے تھے۔

وہ شاعر جو ۱۱۰۰ ہجری میں انتقال کرے اور زیادہ تر دکن میں رہا ہو یہ کہنا کہ اسے جہانگیر نے بلایا اور اس نے یہ تغلق نامہ کہا صحیح معلوم نہیں ہوتا اسلئے کہ جہانگیر کے زمانہ میں اس کی اتنی شہرت نہ رہی ہوگی کہ وہ مخصوص اس کام کے لئے بلایا جائے۔ علاوہ برایں حیاتی کاشی کی زندگی کے حالات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اول الذکر کا مغل دربار سے گہرا تعلق تھا جبکہ کاشی کا کوئی خاص تعلق معلوم نہیں ہوتا۔

غنی نے تذکرۃ الشعراء کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ جب جہانگیر نے حیاتی گیلانی کو سونے میں تولا تو شاہ عباس ماضی نے حیاتی کاشی کو سونے میں تولا۔ یہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا اسلئے کہ شاہ عباس ماضی نے ۱۰۳۸ ہجری میں انتقال کیا اس وقت حیاتی کاشی اتنے اہم شاعر ہو گئے تھے، مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔

قلمی نسخہ میں حسب ذیل ابیات کے پہلے یہ عنوان دیے ہوئے ہیں جو مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہیں :-

"نگارش داستان در مدح وثنای کیہان خدیو عصر آفرینش حضرت خلافت دستگاہ خلائق پناہ سلیمان مکانی ظل سبحانی ابو المظفر نورالدین جہانگیر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ ابدا ؂

حیاتی حمد را فرجام نبود چو گر آغاز ہست انجام بود

افزایش بیان در ستایش مجلس آسمان آئین و فردوس تزئین کہ بندگان حضرت سلیمان مکانی با اقبال سرمدی اکلیل فرزود بہیم آرای بودند سخن از کتاب و شعر و تاریخ میگذشت از زبان الہام بیان گوہر بار شدند کہ عجب حیفی و دریغی از ہر کتاب منظوم امیر خسرو بتغلق نامہ ریشان واخوردہ چنانچہ بالکل از حمد و مدح و آغاز داستان واکثر از حکایت و روایت و موعظہ و چگونگی تاریخ و خاتمہ درمیان نیست و چند لیست کہ بخاطر اشرف لمعان پرتو می افگند کہ بیکی از سخن سرایان پایہ سر بآسمان میسر امر شود کہ

ؔ ۹۵۸ – ۱۰۳۸ ہجری / ۱۵۵۰ – ۱۶۲۹ عیسوی

بارکت عون مقدس ما از عہدۂ این کار برآمدہ دقیقہ از ہیچ
باب سخن فرو نگذارد و از آغاز بانجام رسانند۔ آنگاہ از
زمرہ آن جمع بتقدیم بندہ فدوی کہ ہمیشہ مدحت سرا و صاحب
ثنا بودہ امر ہمایون شرف نفاذ یافت امتثالاً لامرہ
شروع در آغاز شد و بعون عنایت الٰہی و فیوضات
نامتناہی شاہنشاہ در اندک فرصتی بانجام رسید ؎

حیاتی ای سخن را مرد فرہنگ
برون آوردہ گوہر از دل سنگ

شرح گفتار در چگونگی این دو بیت امیر خسرو کہ تغلق نامہ
در وعظ بطریق تمثیل گفتہ بودند و از اول آن کتاب ہر
در سخن چہ حمد و چہ مدح و چہ آغاز داستان نبودہ چیزی دیگر
مگر این دو بیت ؎

چو بیند آسمان از دیدۂ مہر
شود غار از راز زیبائی چہر
اگر ہد ہد کہ مرغی کم ہنر شد
سلیمان چون گزیدش تاجور شد[1]

آرایشِ سخن در تمام نمودن این دو بیت مذکور
جہان برآئین موعظہ و پند مشتمل بریک مقالہ و دو حکایت
برسبیل تمثیل المقالہ ؎

بیا ای دل قبول مقبلان جو
دلی را نام از صاحبدلان جو

اد ہم باد کے قلمی نسخہ کی ایک عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ
مغل بادشاہوں کے کتبخانہ میں جو نسخہ موجود تھا اس کے
ابتدائی حصہ میں صرف یہ دو شعر تھے جو وعظ اور تمثیل
کے طریقے سے کہے گئے تھے ؎

چو بیند آسمان از دیدۂ مہر
شود غار از راز زیبائی چہر
نگر ہد ہد کہ مرغی کم ہنر شد
سلیمان چون گزیدش تاجور شد

اس کے علاوہ حمد، بادشاہ کی مدح، آغاز داستان
وغیرہ سے متعلق کوئی اور چیز نہ تھی۔ مگر مطبوعہ نسخہ کے
دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حیاتی اپنے ضمیمہ میں ان دو بیتوں
کو ٹھیک سے جگہ نہ دے سکے اور اب بھی یہ دونوں شعر
اکھڑے اکھڑے سے نظر آتے ہیں۔

مطبوعہ نسخہ میں صرف ایک جگہ لفظ حکایت آیا
ہے، جبکہ قلمی نسخہ میں اس کے علاوہ حسب ذیل بیت کے
پہلے ہی لفظ حکایت آیا ہے:۔

حکایت

کنون بشنو کہ این در از چہ سفتم
نصیحت گو نہ بہر چہ گفتم

مطبوعہ نسخہ کے تمہیدی حصہ میں یہ ابیات ہیں جو قلمی نسخہ
میں موجود نہیں ہیں ؎

بیا ای خازنِ گنج نہانی — بیاور آنچہ داری آسمانی
درخشان چتر شاہ زفرق آسمان گیر — یمانی تیغش از دستش جہانگیر
خزاین بحر بحر و کوہ کوہش — زمین تا آسمان فروشکوہش
قدم بر لالہ زر و بر سمن دار — بزیر پای ہر جا شاخ گل کار

اس کے علاوہ مشترک عنوانات اور ابیات کے
جزئیات اور ترتیب میں بھی فرق ہے جو دوبارہ ایڈٹ کرتے
وقت پیش کیا جا سکے گا۔

حسب ذیل بیت تک دونوں نسخے کم و بیش ایک ہیں اور

---

[1] مطبوعہ نسخہ میں یہ دو شعر دو مرتبہ ملتے ہیں، جبکہ قلمی نسخہ میں صرف ایک مرتبہ نقل کئے گئے ہیں۔

اوپر دیے ہوئے اختلافات اتنے اہم نہیں ؎

حیاتی نکتہ سنج داستان شان
نوا خوان عندلیب گلستان شان

مگر اسی بیت کے بعد دونوں نسخے ایک دوسرے سے کلیتہً جدا ہو جاتے ہیں۔ یہ مثنوی گیلانی کی ہو یا کاشی کی اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنا یہ امر کہ اصل مطلب دونوں مثنویوں میں مختلف ہے۔

قلمی نسخہ کی حسب ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً امیر خسرو کا ناقص تغلق نامہ آنے والی چار بیتوں پر تمام ہوا تھا۔

گزارش گفتار در تہمت نمودن سخن سازان بدگمان و دروغ آراستن تیرہ رایان و حسد پیشگان کہ برگشتن ملک تغلق از برابر غنیم و منزل چند واپس نشستن نبودہ مگر در ساختن با دشمن و یا سراسیمگی و دل بباد دادگی چنانچہ از مضمون این چہار بیت تغلق نامۂ امیر خسرو مفہوم میگردد کہ آخرین داستان ناتمام این کتاب است ؎

چو بر غازی ملک شد روشن این حال
بحیلہ رای شان را کرد پامال
بتدبیر سرہ در قلب کوشید
اگرچہ قلب لشکر زان بجوشید
دو منزل بازگشت از رفتن پیش
ہمہ کس بدخیال او نیک اندیش
گمان این شد بدلہای پریشان
کہ یا ترسید و یا شد یار ایشان

مگر مطبوعہ نسخہ میں کسی جگہ یہ اشعار نہیں ملتے، نیز مطبوعہ نسخہ میں اصل واقعہ کے بیان میں تمام عنوانات زیادہ تر نظم میں ہیں۔ جبکہ قلمی نسخہ میں عنوانات نثر میں دیے گئے ہیں۔

یہاں ہم مطبوعہ مثنوی کے تمام عنوانات کو ایک جگہ جمع کر کے ذیل میں درج کرتے ہیں جن سے واقعات پر نظر ڈالی جا سکتی ہے ؎

خطاب حضرت شاہ وازدخواہش پرستاخی
کہ از چشم رضا و مرحمت بیند درین دفتر
درشروع نظم میگوید ؎
سخن در سن عمر و خواندن شہزادگان دانگہ
حدیث دو خلف کان از خلاف آمد بتیغ خنجر
حدیث چشم زخم خاندان ملک و خاقان را
کشیدن از پلک دیدہ بر آن سان کز صدف گوہر
سخن ز آوازۂ خسرو کہ چون آلود مسند را
ہمہ پیشش نگون کردند سر جز غازی سرور
عزیمت کردن اعظم ملک فخر الحق والا
بسوی حضرت غازی ملک کافر کش صفدر

حکایت :

صفت خنجر ملک غازی ؎

ہراس و لرزۂ جان حسن از عزم فخر الحق
وز آن اندیشہ راندن بر ہمہ شہزادگان خنجر
حدیث گفتگوی ہر کس اندر مجلس خسرو
پس از صوفی سوی عادل نشستن ناخوش و ابتر

حکایت

بسوی کاررانان و امیران نامۂ غازی
کہ قطع کفر و کفران را شوندش یار و یاری گر

صفت نامۂ ملک بہرام
رفتن نامۂ ملک بہرام
قہر و قتل مغلطی ملتان
قصۂ حال میر سیوستان
جانب عین ملک نامۂ خاص
گفت دیگر بسوی عین الملک
نامہ بر یک مکھی و قصۂ او
حدیث خوابہای سرور بیدار دل وانگہ
شدہ تعبیر خواب یوسف اندر مصر یکی مضمر
خواب غازی ملک بدیدن پیر
خواب غازی ملک کہ دید سہ ماہ
خواب غازی عصر و دیدن باغ
بچنگ آوردن غازی ملک پس ملک را دادن
ہر آنچہ از مولتان بہر حسن می رفت اسپ و زر

حکایت:

صفتہای دل غازی ملک و از ہر طرف مژدہ
چو از دہلی بسویش راند لشکرہای بحر و بر
حدیث عہد و پیمان سران لشکر غازی
کہ در کام نہنگ اندر زوند و دیدۂ اژدر
مصاف اول غازی ملک با لشکر دہلی
بیاد حملۂ زیر و زبر کردن چنان لشکر
حدیث بخشش جان و نوازش از ملک غازی
مسلمانان دہلی را بہ لطف بی حد و بی مہر
پس از فتح نخستین جنبش غازی ملک از جا
ز بہر قلع گبران نی برای مسند و افسر
سخن در رای بدرایان و یاران بد خسرو
کہ آن گمراہ را بردند سوی گمرہی رہبر
خزینہ دادن و تاراج بیت المال از خسرو
بر آن گنجی کہ جمع از باختر کردند از خاور
حدیث دو یمین فتح ملک غازی دوا گفتن
ز ترتیب سپاہ و جنبش و برکوب و کر و فر
مظفر گشتن غازی ملک بر لشکر خسرو
باندک فوج و لشکر پیل و صف درہم زدن لشکر
بشارت دادن اسباب شاہی و جہانداری
دل غازی ملک را بہر مسند ز انجم و اختر

حکایت

دخول موکب غازی ملک در قصر سلطانی
چنانکہ آید بہ برج خویشتن مہر ضیا گستر
جلوس شہ غیاث الدین و دنیا تغلق غازی
فراز تخت سلطانی چو افریدون و اسکندر
حدیث مرتد مدبر کہ چون بد دش گرفتاری
وز آن پس کشتہ گشتن بعد رسوائی بشہر اندر
گرفتاری خسرو از الغ خان مخالف کش
چو مرغی شوم کش بازی کند صید از برای خور

اب ہم اس کے مقابلہ میں قلمی نسخہ سے حسب ذیل عنوانات کو نقل کرتے ہیں جس سے پتہ چل سکے گا کہ اصل واقعہ کو دونوں نسخوں میں مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔

اشارات بیان بر طبق مضمون آنچہ بر دراین سہ چہار
بیت پیش گفتہ و شرح جگونگی ملک تغلق غازی ہم ز
کار افزائی شمشیر و غا و ہم از استواری عہد و وفا بیان
در سبب بر گشتن ملک تغلق غازی از برابر غنیم و چند
منزل در پس نشستن و حملہ سردار و سپاہ و کار آگاہ

را طلبیده حرف از بسیار دانبوہی غنیم در میان آوردن و بچاره و تدبیر آن مشغول شدن۔

داستان در برآمدن ملک تغلق غازی از لشکرگاه خود با گروہی از مردان کار آزموده و رفتن بجانب صحرائی و محکم جای بهم رسانیدن و لشکر آرای آنجا طلبیده مهیای جنگ داشتن و صفت آن محکم جا۔

افزایش بیان در مغرور شدن گبران از برگشتن ملک تغلق غازی و همه جا بقتل و غارت مشغول بودن تا بچند گروہی لشکر تغلق رسیدن و بکارسازی جنگ مشغول شدن و نیز آگاہی یافتن ملک تغلق غازی از نزدیک رسیدن غنیم و ساخت ساز حرب نموده با جمعی از مردان جنگ دیده برآمدن و بجانب صحرای رفتن

شرح گفتار در دار و گیر آن دو لشکر خونخوار جرار و در آویزش و در آویختن با هم و فتح نمودن ملک تغلق غازی و شکست یافتن گبران برگشته روزگار و بدست افتادن سرداران شان غنیمتی بیحد و شمار و فرستادن ملک غازی جمله را بدرگاه علائی و سرفراز و نامدار گردیدن از الطاف و عنایات بی غایت خدائی و پادشاہی۔

بیان اندر کردار ناصواب خسرو خان غدار که چون بصاحب و ولی نعمت قدیم خود باغی گردیده جمعی از ..... با خود یار کرده و فرصت یافته در محل خاص درآمد و سلطان را بی محابا بتیغ بی دریغ ہلاک ساخت و جمله اولاد اتباع ایشان حکم قتل و غارت نمود و از آه و دود سلطانیان زمین و زمان را تیره و مظلم ساخت۔

اندیشه نمودن جمعی از نام آوران با ناموس و نام سلطان قطب الدین بعد از کشته شدن سلطان مرحوم و بیم و ہراس افتادن از قتل و کوشش و ظلم و بیباکی خسرو خان بی حفاظ و ہنگامه پرساختن و شورش انگیختن در برانداختن تخت و بخت آن سگ زاد ناپاک و از همه جهان ملک تغلق را بسالاری و سرداری برداشتن و محضر کرده بایشان فرستادن۔

عرض گفتار در رسانیدن فرستاده محضر را و خواندن ملک تغلق غازی سرپای آن را و ہمان لحظه طلبیدن قبیله و فرزندان خویش و که و مه ہرجا را و استمداد منتقم حقیقی جسته با انتقام آن کافر نمک خونخوار بیرون آمدن و باندک روزی از تخت و تاجش برآورده با اتباع و اولادش بقتل رسانیدن و جهان را پاک از آن ناپاک کردن۔

نشستن ملک تغلق غازی بپادشاہی بتخت دہلی بعد از شکست یافتن و کشته شدن خسرو خان باغی و سکه و خطبه بنام خویش کردن و تغلق شاه شدن و جهان را با من و عدل و داد آراستن و داد شہریاری و شاہی دادن۔

حسن بیان در خطاب با ساقی و نکوہش دنیا و بی ہیچی و بی ثباتی آن۔

خوشا شب جهان افروزی و زہا مجلس فردوس اساسی که گیهان خدیو عرصه آفرینش درازای چنین سرمه نقدی جهانم بزر سنجید و منزلت و پایه مرتبه دانی و قدر افزائی را برا وج علیین رسانید۔

آخر میں اتنا اور کہہ دیا جائے کہ قلمی نسخہ میں صرف وہ اشعار ہیں جو خود حیاتی نے کہے تھے۔ جبکہ مطبوعہ نسخہ میں دونوں مخلوط ہوگئے ہیں۔

★

پروفیسر نظام الدین ایس۔ گوریکر ایم۔اے، پی ایچ ڈی
(صدر شعبۂ فارسی و اردو، سینٹ زیویرس کالج بمبئی)

خسرو اور اساتذۂ فارسی

حسنِ اتفاق سے چودھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی سرزمین میں فارسی زبان و شعر کا انداز بالکل وہی تھا جو اس وقت فارس میں تھا۔ سعدی شیرازی کی ادبی شخصیت جس طرح ایران پر حاوی رہی اسی طرح امیر خسرو دہلوی کا سکہ ہندوستان میں جاری رہا۔ خسرو کا زمانۂ شباب سعدی کے عالم شیب سے ملا ہوا تھا دونوں شخصیتیں فطرت کے شعر پرور رجحانات کا شاہکار تھیں جو ہمیشہ پیدا نہیں ہوتیں بلکہ مدتوں کے بعد ایک تہذیب ایک تمدن اور ایک ثقافت کی یادگار بن کر سامنے آتی ہیں۔ دونوں کی شاعری میں آشوبِ وقت کا ردِ عمل تھا، دونوں کے کلام میں تصوف کی چاشنی تھی اور دونوں کے شعر جذبات کی تصویر کشی کا مرقع تھے اور اس پر طرہ یہ کہ ہندوستان کے خوشگوار حالات اور سازگار ماحول نے خسرو کے کلام کو بے ساختگی اور بانکپن بخشا اور اُن کے اشعار کو واقعیت اور مترنم انداز کا مجموعہ بنا دیا۔

تین سو سال کے بعد بھی عرفی شیرازی جیسے قادر الکلام بھی خسرو کے شاعرانہ محاسن کا اعتراف کرنے میں ایک گونہ فخر محسوس کرتے ہیں ؎

به روحِ خسرو از این پارسی شکر دادم
که کام طوطیٔ هندوستان شود شیرین

اور حافظ شیرازی جیسے مشہور زمانہ شاعر بھی اُن کی شیریں کلامی کا تذکرہ کرنے سے گریز نہیں کرتے ؎

شکر شکن شوند همه طوطیانِ هند
زین قند پارسی که به بنگاله می رود

خسرو بچپن ہی سے شعر موزوں کر لیتے تھے اور اُن کی طبیعت کی روانی اور شاعری کا ملکہ دیکھ کر قاضی اسد الدین خطاط انھیں اپنے ہمراہ خواجہ عز الدین کے دولت خانہ پر لے گئے اور کہا کہ یہ میرا شاگرد ہے لیکن شاعری سے شوق ہے۔ خسرو نے خواجہ صاحب کی ایما پر چند شعر خوش الحانی سے پڑھے۔ خواجہ صاحب اُن کے اندازِ بیان

سے متاثر ہو کر کہا کہ مو، بیضہ، تیر اور خربوزہ ان چار بے جوڑ چیزوں کو موزوں کر دو۔ خسرو نے برجستہ ایک رباعی میں اُن کو پیش کیا ؎

ہر موئی کہ در دو زلف آن صنم است
صد بیضۂ عنبریں برآن موی ضم است
چون تیر مدان راست دلش راز یرا
چون خربزہ دندانش میان شکم است

اس رباعی کو سن کر خواجہ صاحب نے خسرو کو گلے سے لگایا اور فرمایا کہ تمہارا تخلص "سلطانی" ہونا چاہیئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں خسرو نے سلطانی تخلص فرمایا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خسرو نے رسمی طور پر شاعری میں کسی کی شاگردی قبول نہیں کی کیونکہ انھیں یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ وہ استادی شاگردی کی زنجیر میں پابند ہو کر اپنے ذوق و رجحان پر بیجا پابندیاں عاید کریں لیکن یہ ضرور تھا کہ فن شاعری میں کمال حاصل کرنے کیلئے اساتذہ فارسی کے کلام کا مطالعہ جاری رکھا اور استفادہ حاصل کیا بقول خود :- "جو دیوان بھی مجھے مل سکا میں نے نہ صرف اس کا مطالعہ کیا بلکہ اس کی نقل بھی اپنے کلام میں ضرور کی" دوسرے لفظوں میں خسرو کسی استاد کی شاگردی قبول کرنے کی بجائے مشاہیر اساتذہ کے دواوین سامنے رکھ کر ان کا تتبع کرتے اور ایک عرصہ تک بطور خود کہتے رہے جس استاد کے کلام کا مطالعہ کرتے اسی انداز کے شعر خسرو کہتے اگرچہ آخر آخر میں انھوں نے اپنے کلام کو اساتذۂ فن کو دکھلانا اپنا شعار بنا لیا۔ ہشت بہشت کے

خاتمہ میں خسرو نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ انھوں نے "خمسہ" تین سال کی مدت میں لکھا ہے اور اس زمانہ کے جید عالم قاضی شہاب الدین نے مثنویوں مطالعہ کرکے تصحیح کی ہے۔ بقول خود ؎

یارب او چون زنج نامۂ من
برد بیرون خطائی خامۂ من
نامۂ او کہ حرز جانش باد
در قیامت خط امانش باد

ظاہر ہے کہ خسرو کا "خمسہ" شہاب کا اصلاح دادہ ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خسرو مزے مقلد نہ تھے تاہم جہاں اُن کو اصلاح کسی وجہ سے پسند نہ آتی وہاں استاد کی رائے کو تسلیم نہیں کرتے گو ادب کا پاس اب بھی ملحوظ رکھتے ؎

عیب آن برمن است نہ بروی

خسرو نے معاصر اساتذہ کے علاوہ قدیم اساتذۂ فارسی سے بھی فیض حاصل کیا ہے خسرو قدیم اساتذہ کے دواوین سے اس طرح فائدہ اٹھاتے جس طرح کوئی شاگرد زندہ استاد سے سیکھتا ہے۔ خدائے سخن نظامی گنجوی کے بارے میں خسرو لیلیٰ مجنوں میں یوں رقم طراز ہیں ؎

زندہ است بہ معنی استادم
ورنیست منش حیات دادم

اور غرۃ الکمال میں خسرو لکھتے ہیں کہ میں نظامی کا پیرو ہی نہیں بلکہ شاگرد بھی ہوں ؎

نظم نظامی بہ لطافت چو دُر
وز دُر او سربسر آفاق پر

پختہ ار و شد چو معانی تمام
خام بود پختن سودائی خام

بگذر ازیں خانہ کہ جای تو نیست
وین رہِ باریک بہ پای تو نیست

اسی طرح خسرو نے انوری کے کلام سے بھی استفادہ کیا ہے اور فرماتے ہیں ؎

خہ کہ د[illegible]ہد تو سلطان سخن
خسرو لاچین سلطانی شدہ ست

تاکشد گردون بہ چشم انوری
خاکِ من کحل صفاہانی شدہ ست

اور خاقانی کے شعروں سے متاثر ہوتے ہیں اور یوں مدعا کرتے ہیں ؎

خاقانی ارز خاک برآید بہ صد زباں
انصاف این قصیدۂ غرّہ برآورد

سعدی شیرازی کے متعلق یوں رقمطراز ہیں ؎

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

اس ضمن میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سعدی بھی خسرو کے کلام قدر داں تھے اور اُن کا احترام کرتے تھے شہزادہ محمد نے جب اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی تو سعدی نے بڑھاپے کا عذر کر کے اس کو ٹال دیا تاہم اپنے معذرت نامہ میں اُنھوں نے خسرو کے بارے میں یہ لکھا ہے:

" در ہند خسرو بس است "

اجمالاً خسرو نے آغاز جوانی میں خاقانی، انوری اور سنائی جیسے باکمال اساتذہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی گو اُنھیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی خاقانی کے ساتھ ساتھ کمال اصفہانی کے انداز کو بھی اپنانے کی کوشش کی۔ اور آخر میں تمام مشاہیر اساتذہ فن کے کلام کے مطالعہ کو اپنا محبوب مشغلہ بنایا اور استفادہ کیا

بہرکیف خسرو نے استاد شعرا کی استادی سے انکار نہیں کیا اور تمام اساتذہ کا احترام ہی نہیں کیا بلکہ ان سے فیضیاب ہوتے رہے۔ خسرو فرماتے ہیں کہ غزل میں سعدی، مثنوی میں نظامی قصیدہ میں خاقانی اور حکمت میں سنائی جیسے اساتذہ فن سے میں مستفید ہوتا رہا۔ آخر میں وہ اپنے کلام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میں سرقہ نہیں کرتا۔ ورنہ ہی میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر ہے۔ تاہم اُن کی غزلیں سوز و گداز اور والہانہ محبت کا پیکر ہیں۔ اور نازک خیالی کا مخزن ہیں اور اُنکے مرثیے درد والم اور غم و اندوہ کا البم ہیں۔ بہ الفاظ دیگر خسرو کا کلام حکمت و تدبر، تصوف و معرفت اور پند و نصائح کا انوکھا مجموعہ ہے اور آج بھی ان کا پیغام ہمارے لئے وہ مشعل ہدایت ہے جو منزل مقصود کی طرف ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی :-

امیر خسروؒ

(فیچر)

مرحبا خسروِ نوا گستر　　طوطیٔ ہند، نغمہ سنجِ بہار
اُسکی ہر بیت اک شگوفۂ زر　　اُس کا ہر شعر اک دُرِ شہوار
ہر رباعی میں زندگی کے رموز　　ہر پہیلی میں ذہن کے اسرار
غزل اُس کی لطیف تر ایسی　　جیسے پھولوں کی نرمیٔ رخسار
سرزمینِ وطن میں جذب ہوا　　ایسا رکھتا تھا خاکِ ہند سے پیار
تجھ پہ اربابِ فکر و فن کا سلام
قصرِ اردو کے اوّلیں معمار

راوی ۱ :- ۱۲۵۴ء کا زمانہ ہے۔ دہلی کے تخت پر خاندان غلامان کا ایک مشہور بادشاہ ناصرالدین محمود بیٹھا ہے کہ یہیں ہمارے یو۔پی کے ضلع ایٹہ کے قصبہ پٹیالی میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے جس کا نام ابوالحسن یمین الدین رکھا جاتا ہے۔ باپ کا نام سیف الدین محمود ہے جو اسی خاندان غلامان کے ایک بہت مشہور بادشاہ التتمش کے زمانہ میں ترکستان کے علاقہ سے ہندوستان آئے تھے۔ اور اُسی بادشاہ کے دربار سے وابستہ ہوگئے تھے اور اپنی بہادری اور قابلیت کی بدولت التتمش کی سلطنت کے ایک بڑے رکن بن گئے تھے۔ پٹیالی کے قریب اُن کو جاگیر ملی تھی اس لئے وہ یہیں بس گئے تھے۔ اُن کی شادی اُسی زمانے کے ایک بہت مشہور ہندوستانی امیر عمادالملک راوت کی بیٹی سے ہوئی جن سے تین لڑکے ہوئے اُن میں سے ابوالحسن یمین الدین دوسرے بیٹے کا نام تھا لیکن کون جانتا تھا کہ یہ اپنے نام سے نہیں اپنے خطاب اور تخلص یعنی امیر خسروؒ کے نام سے مشہور ہونگے اور شاعری اور موسیقی میں وہ نام پیدا کرینگے جو صدیوں کے بعد بھی ہندوستان ہی میں نہیں باہر کے ملکوں میں بھی عزّت و احترام کے ساتھ لیا جاتا رہے گا۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ پیدا ہوئے تو انکے والد ان کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر ایک مجذوب درویش کے پاس لے گئے۔ انھوں نے دیکھتے ہی فرمایا :-

آواز :- "یہ لڑکا عارف باللہ ہوگا اور یگانہ روزگار قیامت تک اس کا نام یادگار رہے گا اور فارسی کے مشہور شاعر خاقانی سے آگے بڑھ جائے گا"

راوی ۱ :- بچپن کے چار سال پٹیالی ہی میں گذرے اس

کے بعد ان کے باپ سیف الدین ان کو اپنے ساتھ دہلی لے گئے اور وہاں ان کی تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر انتظام کیا گیا۔ لیکن ابھی خسروؔ آٹھ برس ہی کے تھے کہ ان کے والد کسی لڑائی میں کام آ گئے۔ اور خسروؔ یتیم ہو گئے لیکن ان کے نانا عماد الملک زندہ تھے اور بڑے پایہ کے امیر اور بڑے دیندار اور نیک آدمی تھے۔ اب خسروؔ کی پرورش اور تعلیم و تربیت اُن کی نگرانی میں ہونے لگی، اور انھیں کی توجہ اور شفقت کے باعث خسروؔ نے اپنے زمانے کے تمام علوم و فنون میں جلد ہی کمال حاصل کر لیا۔

راوی ۲ ترکی تو اُن کے آباواجداد ہی کی زبان تھی، ہندی مادری زبان تھی فارسی سرکاری اور درباری زبان تھی۔ خسروؔ جلد ہی ان تینوں زبانوں پر قادر ہو گئے۔ اُس زمانہ میں فارسی کے ساتھ تھوڑی بہت عربی بھی مسلمان گھرانوں میں پڑھائی جاتی تھی چنانچہ عربی زبان سے بھی خاصی واقفیت حاصل کر لی تھی اتنی کہ ان کی چند غزلیں اور تحریریں عربی میں بھی لکھی ملتی ہیں لیکن وہ خود اس بات کے معترف تھے کہ میں تو ہندوستانی ترک ہوں ہندی جانتا ہوں عربی میں کلام نہیں کر سکتا۔ عربی کے علاوہ تھوڑی بہت سنسکرت سے بھی واقف تھے کیونکہ اپنی ایک مثنوی میں سنسکرت کی تعریف کی ہے کہ یہ زبان فارسی سے بڑھ کر ہے۔ ایرانی اور ہندوستانی موسیقی میں مہارت بھی اسی زمانے میں حاصل کی ہوگی۔ کیونکہ دربار میں اعلیٰ درجہ کے عالم بھی موجود تھے اور موسیقار بھی۔

راوی ۱:۔ فارسی میں شاعری انھوں نے اپنے لڑکپن ہی سے شروع کر دی تھی اور اپنی ذہانت اور موزونیِ طبع کے باعث بہت جلد شہرت حاصل کر لی تھی۔

شاعری میں ان کے استاد خواجہ شمس الدین خوارزمی تھے جو سلطان ناصرالدین کے دربار کے سب سے بڑے عالم اور شاعر تھے انھوں نے بڑی توجہ سے خسروؔ کے ابتدائی کلام پر اصلاحیں دیں۔ چنانچہ ۱۸-۱۹ برس کی عمر ہی میں ان کی غزلوں کا پہلا دیوان تیار ہو گیا تھا۔ ان کے اس دیوان کی ایک مشہور غزل کے چند اشعار سنئے:۔ (ترنم سے)

دلم در عاشقی آوارہ شد، آوارہ تر بادا
تنم از بے دلی بے چارہ شد، بے چارہ تر بادا
گر اے زاہد دعائے خیر می خواہی مرا ایں گو
کہ آن آوارہ کوئے بتاں آوارہ تر بادا
چو با تر دامنی خو کردہ خسرو با دو چشم تر
بہ آب چشم مژگاں دامنش ہموارہ تر بادا

آواز
یہ دل جو عشق میں آوارہ ہے تو اور بھی ہو
یہ قلب جسم میں بے چارہ ہے تو اور بھی ہو
دعا کر اے مرے زاہد یہی کہ یہ عاشق
بتوں کی گلیوں کا آوارہ ہے تو اور بھی ہو
ہمیشہ رونے کی عادت سے دامنِ خسرو
یہ آنسوؤں سے جو تر سارا ہے تو اور بھی ہو

راوی ۱:۔ خسرو کی عمر جب بائیس سال کی ہوئی تو اُن کے نانا عماد الملک کا انتقال ہو گیا۔ خسروؔ کو بڑا صدمہ ہوا کیونکہ باپ کے مرنے کے بعد وہی ان کی کفالت کر رہے تھے اور خسروؔ کو بہت چاہتے تھے۔ اُن کی وفات پر خسروؔ نے ایک بڑا پُر درد مرثیہ لکھا جس کے چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے:۔

آواز:۔ " وہ چراغ گل ہو گیا، شمع فلک بجھ گئی، افسوس

آسمان کے گنبد کا ستون گر گیا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہی محل کے بام و در رنگ سوگوار نظر آتے ہیں۔ ترکوں نے اپنی کلاہیں اُتار پھینکی ہیں اور اپنے جبے دامنوں تک چاک کر دیے ہیں، اور ہندو راجے برہمنوں کی طرح سر ننگے کیے ہوئے پریشان اور غم زدہ آنسو بہا رہے ہیں۔"

راوی ۱ :۔ نانا کے مرنے کے بعد خسروؒ کو فکر معاش دامنگیر ہوئی۔ چونکہ بحیثیت شاعر ان کی شہرت پھیل چکی تھی۔ اس لیے ہر امیر کی خواہش تھی کہ وہ اُس کے دربار کی زینت بنیں۔ چنانچہ ملازمت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور خسروؒ اپنی وفات یعنی ۱۳۲۵ء تک مختلف بادشاہوں شہزادوں اور امیروں کے درباروں سے وابستہ رہے اور اپنی شاعری، موسیقی، بذلہ سنجی، علمی قابلیت اور فنی کمالات کی بدولت ہر امیر، شاہزادہ اور بادشاہ اُن کی عزت اور قدر و منزلت کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتا رہا۔

راوی ۲ :۔ خسروؒ نے تقریباً آٹھ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا، ایک کے بعد ایک کا تختہ اُلٹتا رہا۔ اس عرصہ میں بڑے بڑے جنگ جو، مدبر اور علم دوست بادشاہ بھی پیدا ہوئے، ظالم، مغرور اور عیاش بھی، بادشاہت کی حرص میں باپ کو بیٹے نے، بھتیجے نے چچا کو اور بھائی نے اپنے تمام بھائیوں کا قتل عام کیا۔ غلام خاندان تغلق اور خلجی بادشاہوں کے زمانے میں خسروؒ یہ تمام خونیں انقلابات دیکھتے رہے لیکن انھوں نے خود کو ہمیشہ اپنے زمانے کی سیاست سے الگ رکھا۔ اسی لیے ان کی زندگی ان کی سلامت روی کے باعث آلام سے کٹی اور ہر خاص و عام ان کی ہمیشہ عزت کرتا رہا۔

راوی ۱ :۔ بادشاہوں اور امیروں کے دربار میں ان کی فارسی شاعری کے علاوہ ان کی موسیقی کی بھی بہت قدر و منزلت تھی کیونکہ خسروؒ فن موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے اپنے ایک فارسی شعر میں خود کہا ہے کہ میں شاعری اور موسیقی دونوں میں کامل ہوں۔

راوی ۲ انھوں نے ایرانی اور ہندوستانی راگوں کو ملا کر کئی سے راگ ایجاد کیے مثلاً مجیر، سازگیری، ایمن، عشاق، زیلف، زنگولہ، سَرپردہ، فردوست وغیرہ سازوں میں طبلہ اور ستار انھیں کی ایجاد بتائی جاتی ہیں۔

راوی ۲ مختلف قسم کے گانوں کے طریقے مثلاً ترانہ قول، قطبانہ، نقش اور گل کے موجد بھی خسروؒ ہی ہیں۔ ترانہ اور قول جو اب قوالی کہی جاتی ہے اب بھی مقبول ہیں قوالی اور ترانہ کی بندش ہر راگ میں کی جاتی ہے۔

(ترانہ)

راوی ۱ بادشاہوں اور امیروں کے درباروں کے علاوہ خسروؒ اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے بہت عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور انکے یہاں برابر حاضری دیا کرتے تھے۔ اور حضرت نظام الدینؒ بھی خسروؒ کو بہت چاہتے تھے۔ حضرت خواجہ کا دربار دوسری نوعیت کا تھا۔ یہاں کسی قسم کی پابندی نہ تھی۔ ہر عام و خاص، امیر و غریب۔ ہندو و مسلمان سب کی رسائی تھی خسروؒ کو بھی یہاں ہر قسم کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملتا تھا اور ان کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کا۔ خسروؒ کو شاہی درباروں سے جو انعام و اکرام ملتے وہ اکثر اس دربار میں حاضری دینے والے غریبوں میں لٹا دیا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ صاحب کے دربار میں مجلس سماع اکثر و بیشتر منعقد ہوا کرتی تھی۔ ان میں بھی خسروؒ کی بیشتر غزلیں گائی جاتی تھیں اور اسکی شروعات

تو خسروؒ کے اس گیت سے ہوتی تھی ؎

آج رنگ ہے، رنگ ہے، رنگ ہے ری

راوی ۱ ایک مرتبہ بسنت پنچمی کے موقع پر دہلی کے مشہور کالکا مندر پر میلہ لگا ہوا تھا اور مورت پر سرسوں کے پھولوں کا مینہ برس رہا تھا اور پجاری خوشی کے مارے بیخود ہو کر ناچ رہے تھے اور گا رہے تھے۔ خسروؒ کے دل پر اس منظر کا بہت اثر ہوا۔ فوراً کچھ ہندی اور فارسی کے اشعار موزوں کئے اور سرسوں کے پھول لئے اور پگڑی ذرا ترچھی باندھ کر مستانہ وار حضرت خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت خواجہ کو خسروؒ کا یہ انداز پسند آیا اور اسی دن سے بسنت کے میلے کی بنیاد پڑی۔ چنانچہ آج بھی بعض درگاہوں پر بسنت کے میلے لگتے ہیں۔ اور ان میں بسنت سے متعلق گیت گائے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں خسروؒ کا ایک بسنتی گیت سماعت فرمائیے ؎

حضرت کھواجہ سنگ کھیلے دھمال
عرب یار بنرو بسنت منایو
بائیں کھواجے مل بن بن آیو
تا میں حضرت رسول صاحب جمالی
حضرت کھواجہ ......
سدا رکھیئے لال گلال حضرت کھواجہ ......

راوی ۲ خسروؒ کو اپنے ملک ہندوستان سے والہانہ محبت تھی۔ اسکے مقابلے میں وہ کسی دوسرے ملک کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں تو پورے ایک باب میں ہندوستان کی مختلف چیزوں مثلاً یہاں کی آب و ہوا، پھول، چرند، پرند، یہاں کے مختلف مذاہب اور مختلف زبانوں کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے اور بڑی تعریفیں کی ہیں۔ ہندوستان کو بہشت قرار دیتے ہیں اور دوسرے ممالک پر اس کی برتری دکھانے کے لئے وجہیں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہاں علم و فضیلت عام ہے۔ یہاں کے لوگ دنیا کی تمام زبانیں آسانی سے سیکھ سکتے اور بول سکتے ہیں۔ یہاں دنیا کے کونے کونے سے لوگ مختلف علوم حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔ یہاں کے لوگ علم حساب میں ماہر ہوتے ہیں۔ صفر یعنی زیرو (zero) یہیں کی ایجاد ہے۔ شطرنج کا کھیل بھی یہیں ایجاد ہوا۔ یہاں کی موسیقی بڑی پُر تاثیر ہے جس کا جواب کسی دوسرے ملک میں نہیں۔ اور آخری بات بطور تعلی کے یہ بتائی ہے کہ کسی اور ملک میں خسروؒ جیسا عظیم شاعر بھی نہیں ملے گا

راوی ۱ یہ تو ظاہر ہے کہ خسروؒ کی فارسی شاعری تعداد اور تنوع کے لحاظ سے بہت سے ایرانی شاعروں پر فوقیت رکھتی ہے۔ خسروؒ نے ہزارہا شعر کہے اور فارسی کی ہر صنف سخن یعنی، غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مرثیہ وغیرہ سب پر طبع آزمائی کی ہے۔ جن میں سے بعض مثنویوں کی اہمیت صرف ادبی ہی نہیں تاریخی بھی ہے۔ کہ انھیں پڑھ کر ان کے زمانے کے تاریخی اور سماجی حالات معلوم ہوتے ہیں، خود ایران میں بھی ایسے شاعر کم ہی نکلیں گے جنھوں نے اس قدر متنوع شاعری کی ہو۔

راوی ۲ ہندی زبان جسے خسروؒ ہندوی کہتے تھے وہ تو ان کی مادری زبان ہی تھی۔ اس میں بہت اشعار کہے۔ خود ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے کچھ شاعری ہندی میں بھی کی ہے اور اسے اپنے دوستوں کی خدمت میں نذر کیا ہے فارسی اور ہندی دونوں زبانوں پر عبور رکھنے کے باعث انھوں نے بہت سے ایسے اشعار اور دوہے لکھے ہیں جن میں

دونوں زبانوں کے الفاظ کی آمیزش ہے۔ ایک غزل بھی
ان کی ایسی ملتی ہے جس میں ان دونوں زبانوں کو ملانے
کی کوشش کی ہے۔

راوی ۱: اردو زبان جو فارسی اور ہندی کی آمیزش
سے پیدا ہوئی۔ اس کی پہلی مثال میں اس غزل کو پیش کیا
جاتا ہے۔ اس کا ایک مصرع فارسی میں ہے دوسرا ہندی
میں، یا ایک مصرعہ کا آدھا ٹکڑا فارسی میں ہے تو دوسرا
آدھا ٹکڑا ہندی میں۔ پہلے ایسی زبان کو ریختہ کہتے تھے۔
بعد میں ہندی اور پھر اردو نام پڑا۔ اس غزل کے چند
اشعار سماعت فرمائیے ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل، دُرائے نیناں، بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

راوی ۳: اپنے علم موسیقی میں مہارت کے باعث
خسروؒ میں یہ کمال تھا کہ وہ آوازوں کو ایسے الفاظ میں
منتقل کر سکتے تھے جو بامعنی بھی ہوتے تھے اور جس کی آواز
نقل کرنا چاہتے تھے۔ جیسے وہ آواز یا آوازیں بھی ان الفاظ
سے پیدا ہو جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں ان کے کئی لطیفے
مشہور ہیں۔ مثلاً ایک دفعہ خسروؒ حضرت سلطان نظام الدین
اولیاؒ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ ایک سیاح
مہمان آئے ہوئے تھے۔ پہلے دسترخوان بچھا کھانا کھایا گیا
اس کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ ان مہمان صاحب نے
اتنی باتیں کیں کہ رات زیادہ بیت گئی۔ حضرت سلطان جی
نے کچھ انگڑائیاں، کچھ جمائیاں بھی لیں لیکن وہ مہمان صاحب
سمجھے ہی نہیں کہ انھیں اب اٹھ جانا چاہیئے۔ حضرت سلطان
جی اس خیال سے کہ مہمان کی دل شکنی نہ ہو مجبوراً بیٹھے رہے۔
امیر خسروؒ بھی خاموش تھے۔ آخر آدھی رات کی نوبت بجی
اس زمانے میں جو گھنٹے بجتے تھے خصوصاً دن کو بارہ بجے اور
رات کو بارہ بجے اسکے ساتھ نوبت بھی بجتی تھی جسے آج کل
انگریزی میں (chiming) چائمنگ کہتے ہیں۔ غرض
جب یہ آدھی رات کی نوبت بجی تو حضرت سلطان جی نے
پوچھا کہ خسرو یہ کیا بجا؟ انھوں نے عرض کیا کہ آدھی رات
کی نوبت ہے۔ پھر پوچھا کہ اس میں کیا آواز آتی ہے۔ خسروؒ
نے جواب دیا کہ سمجھ میں تو ایسا آتا ہے کہ یہ نوبت کہہ رہی ہو کہ

نان کہ خوردی خانہ برو۔ نان کہ خوردی خانہ برو۔
خانہ برو۔ خانہ برو۔ نان کہ خوردی خانہ برو۔
نہ کہ بدستِ تو کردم خانہ گرو۔ خانہ برو۔ خانہ برو۔

راوی ۱: نوبت کی ہم آہنگی کے ساتھ ان الفاظ
کے معنی بھی ہیں۔ وہ یہ کہ اب تم کھانا کھا چکے، گھر جاؤ،
گھر جاؤ۔ ہم نے تمھارے ہاتھ اپنا گھر گروی تو نہیں کر دیا ہے۔
بس اب کھانا کھا چکے۔ گھر جاؤ۔ گھر جاؤ۔

راوی ۲: خسروؒ کا اسی طرح کا ایک اور لطیفہ بہت
مشہور ہے۔ یہ ایک دن ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ ایک دوکان
میں ایک دھنیا روئی دھنک رہا تھا کسی نے کہا کہ جس دھنیے
کو دیکھو ایک ہی دھن پر روئی دُھنتا ہے۔ سب ایک ہی
استاد کے شاگرد ہیں۔ کوئی بولا کہ فلانی استاد نے سب کو
ایک ہی انداز پر سکھایا ہے۔ آپ نے کہا کہ ہاں ایسا سکھایا ہے
کہ تال کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ کوئی بولا اسے لفظوں میں
کیونکر لائیں۔ آپ نے فرمایا اسو اسطرح لا سکتے ہو۔

آواز۔ درپے جاناں جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت،
جاں ہم رفت، رفت، رفت، رفت۔ جاں ہم رفت
ایں ہم رفت و آں ہم رفت۔ آں ہم رفت۔ ایں ہم۔ آں ہم۔
ایں ہم۔ آں ہم۔ آں ہم رفت۔ رفتن۔ رفتن۔ رفتن دہ۔
دہ۔ دہ۔ رفتن۔ رف۔ رف۔ رفتن دہ۔ رفتن دہ۔

راوی ۲۔ دھنیے کی روئی دھنکنے کی آواز کی پوری نقل کے ساتھ فارسی کے ان الفاظ کے معنی بھی ہیں یعنی محبوب کے پیچھے میری جان بھی گئی۔ یہ بھی گیا۔ وہ بھی گیا یعنی دنیا کی ساری چیزیں میں نے دیدیں۔ جاناں اور دنیا۔ محبوب کے پیچھے جان بھی گئی اور دنیا بھی گئی۔

راوی ۱۔ اسی طرح کے بہت سے لطیفے، پہیلیاں کہہ مکرنیاں، دوہے اور گیت بھی خسرو سے منسوب ملتے ہیں ایک منظوم لغت خالق باری کے نام سے خسروؒ ہی کی لکھی کہی جاتی ہے۔ اس میں فارسی کے الفاظ کے معنی ہندی میں بتائے ہیں مثلاً "خالق باری" سرجن ہار۔ واحد ایک۔ بدا کرتار۔

اگر خالق باری واقعی امیر خسروؒ کی تصنیف ہے۔ تو قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کا سہرا پہلے پہل خسروؒ ہی کے سر باندھا جا سکتا ہے۔

راوی ۲۔ خسروؒ کا ایک مشہور گیت سن لیجیے۔ اس گیت میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک لڑکی اپنی سسرال میں ہے۔ برسات کی رت آئی ہے اور وہ اپنی ماں کو یاد کرتی ہے اس طرح گاتی ہے۔ خسروؒ کے اس مشہور گیت میں کس خوبصورتی کے ساتھ جذبات کی عکاسی کی گئی ہے ؎

اماں میرے باوا کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری کہ ساون آیا
اماں میرے بھائی کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری کہ ساون آیا
اماں میرے ماموں کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری کہ ساون آیا

راوی ۲۔ ۱۳۲۴ء میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا دلی میں انتقال ہوگیا۔ اُس زمانے میں خسروؒ غیاث الدین تغلق کے ساتھ بنگال گئے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے اور اپنے پیر کے وصال کی خبر معلوم ہوئی تو بیتاب ہوگئے۔ درگاہ پہونچ کر اپنا سر مزار مبارک پر دے مارا اور ہندی کا یہ دوہا بڑی دردناک آواز میں پڑھا ؎

گوری سووے سیج پر، مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے کر رین بھئی چوندیس

راوی ۱۔ اپنا سب مال و اسباب خیرات کر دیا اور سیاہ لباس پہن کر حضرت سلطان جی کے مزار پر آکر ایسے بیٹھے کہ جیتے جی وہاں سے نہ اٹھے۔

راوی ۲۔ چھ ماہ کے بعد ہندوستان کا یہ مایۂ ناز شاعر اپنے وطن ہندوستان کا عاشق زار، قومی ہم آہنگی اور یک جہتی کا علمبردار ۱۳۲۵ء میں اپنے بنانے والے سے جا ملا۔ اور اپنے پیر کے مزار کے پائنتی جگہ پائی۔ انکا عرس حضرت نظام الدین اولیاؒ کے عرس کے ساتھ اب بھی ہر سال بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے ؎

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیو کو دوؤ بھئے اک رنگ

خسروؔ کے آثار عظیمہ و خصوصی

(الف) دواوین :-

	سال تصنیف	
۱- پہلا دیوان بنام "تحفۃ الصغر"	۶۷۱ھ	بعمر ۲۰ سال
۲- دوسرا دیوان بنام "وسط الحیاۃ"	۶۸۳ھ	" ۳۲ "
۳- تیسرا دیوان بنام "غرۃ الکمال"	۶۹۳ھ	" ۴۲ "
۴- چوتھا دیوان بنام "بقیہ نقیہ"	۷۲۱ھ	بعمر ۷۰ "
۵- پانچواں دیوان بنام "نہایۃ الکمال"		آخر عمر

(ب) تاریخی مثنویاں :-

۱- قران السعدین	۶۸۸ھ	بعمر ۳۷ سال
۲- مفتاح الفتوح	۶۹۱ھ	بعمر ۴۰ سال
۳- عشقیہ یا دول رانی خضر خاں	۷۱۵ھ	بعمر ۶۴ "
۴- نُہ سپہر	۷۱۸ھ	بعمر ۶۶ "
۵- تغلق نامہ		آخر عمر

(ج) خمسہ یا مثنویات پنج گنج :-

۱- مطلع الانوار بجواب مخزن الاسرار از نظامی گنجوی	۶۹۸ھ	دو ہفتہ کے اندر مکمل ہوئی
۲- شیریں و خسرو بجواب خسرو شیریں "	۶۹۸ھ	بعمر ۴۴ سال
۳- مجنوں و لیلیٰ بجواب لیلیٰ و مجنوں "	۶۹۹ھ	بعمر ۴۷ سال
۴- آئینہ سکندری بجواب سکندر نامہ "	۶۹۹ھ	بعمر ۴۷ سال
۵- ہشت بہشت بجواب ہفت پیکر "	۷۰۱ھ	بعمر ۵۰ سال

(د) دیوانِ غزلیات :-

(ہ) نثری تصنیفات :-

۱- اعجاز خسروی (رسائل الاعجاز) ۷۱۹ھ میں مکمل ہوئی

۲- تاریخ علائی (خزائن الفتوح) ۷۱۱ھ

۳- افضل الفوائد

بہ تقلید فوائد الفواد از حسن سجزی

(و) ہندوی

منظومات

عہدِ خسروؔ کے سلاطین دہلی

۱- محمد غیاث الدین بلبن	۶۶۴ — ۶۸۶	ہجری
	۱۲۶۵ — ۱۲۸۷	عیسوی
۲- معز الدین کیقباد	۶۸۶ — ۶۸۹	ہجری
	۱۲۸۷ — ۱۲۹۰	عیسوی
۳- جلال الدین فیروز خلجی	۶۹۸ — ۶۹۵	ہجری
	۱۲۹۰ — ۱۲۹۵	عیسوی
۴- محمد علاء الدین خلجی	۶۹۵ — ۷۱۵	ہجری
	۱۲۹۵ — ۱۳۱۵	عیسوی
۵- مبارک شاہ قطب الدین خلجی	۷۱۶ — ۷۲۰	ہجری
	۱۳۱۶ — ۱۳۲۰	عیسوی
۶- غیاث الدین تغلق	۷۲۰ — ۷۲۵	ہجری
	۱۳۲۰ — ۱۳۲۴	عیسوی
۷- محمد بن تغلق	۷۲۵ — ۷۵۲	ہجری
	۱۳۲۴ — ۱۳۵۱	عیسوی

خسروؔ کے اولیائے نعمت اور ملازمتیں

۱- کشلو خاں عرف ملک چھجو برادرزادہ سلطان بلبن	۲ سال	
۲- بغرا خاں ابن سلطان بلبن	۳ سال	
۳- سلطان محمد فرزند بزرگ سلطان بلبن	۵ سال	
۴- امیر علی حاتم	۲ سال	
۵- سلطان معز الدین کیقباد	۱ سال	ملک الشعرا کا خطاب ملا
۶- جلال الدین فیروز خلجی	۵ سال	ملک الشعرا کے ساتھ امیر بھی بنائے گئے
۷- محمد علاء الدین خلجی	۲۰ سال	
۸- مبارک شاہ قطب الدین خلجی	۴ سال	
۹- غیاث الدین تغلق	۴ سال	

سید امیر حسن نورانی (دہلی یونیورسٹی)

امیر خسرو بحیثیت فن کار

صدیوں سے ہندوستان کی سرزمین ایک عظیم الشان تہذیب و تمدن اور علمی و فنی سرمایہ کی امانت دار ہے۔ ہزاروں سال کی تاریخ بعض حیرت انگیز شخصیتوں کے رنگا رنگ کارناموں سے بھری ہوئی ہے۔ امیر خسرو کا شمار بھی ہندوستان کی اہم ترین شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ ان کی پہلودار اور نادر شخصیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر حیثیت سے انکا جائزہ لیا جائے۔ اور اس ماحول اور اس کے پس منظر کو بھی پیش نظر رکھا جائے جس میں خسرو نے آنکھیں کھولیں۔ وہ ایک وسیع المشرب انسان تھے۔ ان کے اختراعی ذہن نے کئی میدان سر کئے۔ ایک طرف ان کی شاعرانہ سحر کاری کے عجیب و غریب کرشمے نظر آتے ہیں، تو دوسری طرف فن موسیقی میں جدت و اختراع کے دلکش نمونے۔ ان کے سوچنے کا انداز حکیمانہ تھا صوفیوں اور درویشوں کی محفلوں میں وہ عارف کامل اور صوفی باصفا نظر آتے ہیں۔ بادشاہوں کے درباروں میں رموز مملکت و سیاست کے ماہر کی حیثیت سے نمایاں مقام پر فائز تھے۔

امیر خسرو کی ذات ایرانی، تورانی، عربی اور ہندوستانی تہذیب کا سنگم تھی۔ اور ان سب کی آمیزش سے ہندوستان میں جو تہذیب نشو و نما پا رہی تھی، خسرو اسکے خاص نمایندہ تھے۔ ان کا درد مند دل انسان دوستی کا منبع تھا۔ ذہن کی رسائی فکر و نظر کی بیداری، اخلاقی اقدار کی ترویج اور وطن دوستی نے ان کی عظمت کا پایہ بلند کر دیا۔ اُن کی عام شہرت کا خاص سبب حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور خاص و عام سے یکساں سلوک ہے۔ اسی لئے ہر محفل میں وہ صدر نشین نظر آتے تھے۔ ترکی نژاد۔ امیر خسرو۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان کو اپنے وطن سے جس درجہ محبت تھی اس کا اندازہ ان کے کلام سے ہوتا ہے۔ جس طرح انھوں نے شاعری میں مہارت حاصل کی۔ اسی طرح علم موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا، شاعری اور موسیقی کا ایک دوسرے سے گہرا ربط ہے اور جب کسی شخصیت میں دونوں کی آمیزش ہو تو اسے یگانہ روزگار کہا جا سکتا ہے۔ خسرو کی مہارتِ فن موسیقی میں مسلّم ہے۔ انھوں نے کئی راگ راگنیاں ایجاد کی ہیں۔ کئی طرزیں ان کی نکالی ہوئی ہیں۔ عام روایت کے مطابق

ستار انھیں کی ایجاد ہے۔

امیر خسرو کا مرتبہ شاعری میں بہت بلند ہے، وہ پہلے ہندوستانی شاعر ہیں جن کو ایرانیوں نے صفِ اول کے فارسی شعراء کا ہم پلّہ تسلیم کیا ہے۔ شعر گوئی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ انھوں نے غزل اور مثنوی کی صنف پر خاص طور پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی شاعری میں قومی، ملکی اور ملّی اثرات بہت نمایاں ہیں۔ دنیا کی بعض ممتاز شخصیتوں کی طرح وہ بھی اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوئے۔ اور اپنے دَور کے ماحول پر انھوں نے گہرا اثر ڈالا۔

امیر خسرو کی مثنویاں ان کے عہد کی آئینہ دار ہیں، جن سے اس دَور کے تاریخی حالات اور واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ اگر ان کی مثنویات کا تاریخی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ہندوستان کے ایک طویل عہد کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ جس سے ملکی، سماجی اور معاشرتی حالات کا بخوبی علم ہوسکے گا۔

ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی تشکیل میں امیر خسرو کا بڑا حصہ ہے انھوں نے وطن دوستی کا حق خوب ادا کیا ہے ان کے اشعار میں جا بجا حبِ وطن کے جذبات نمایاں نظر آتے ہیں۔

آج سے سات سو سال پہلے امیر خسرو نے موسیقی، پہیلیوں، گیتوں، کہہ مکرنیوں کے جو پودے لگائے تھے۔ وہ اب ایک لہلہاتے اور مہکتے چمن کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں، جن کی رنگا رنگی اور مہک سے دل و دماغ کیف و سرور سے لبریز ہوجاتے ہیں۔ ان کے اختراعی کمالات کئی میدانوں میں ظاہر ہوئے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی تشکیل کے ابتدائی دَور میں ان کی خدمات نمایاں ہیں۔

امیر خسرو ترک تھے، ان کے اجداد وسط ایشیا کے باشندہ تھے یہ وہ علاقہ ہے جہاں آریا تہذیب نے جنم لیا تھا، اس علاقہ کی جغرافیائی حد بندی قدرت نے کچھ اس طرح کی ہے کہ ایک طرف کوہستان الطائی ہے اور دوسری طرف بحر کیسپین اس کے نیچے پامیر کا مشہور پلیٹو اور سلسلۂ کوہ قراقرم مشرق میں گوبی کا ریگستان اور مغرب میں دریائے آمو، یہ خطّہ تہذیب کا قدیم ترین گہوارہ کہلاتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں یہ علاقہ دریاؤں، جھیلوں اور قدرتی آبشاروں سے سرسبز و شاداب تھا لیکن امتدادِ زمانہ سے آب و ہوا میں تبدیلی آئی، اور سارا علاقہ بے آب و گیاہ بن گیا، بارش کی قلت نے نخلستانوں کو ریگستانوں میں تبدیل کردیا۔ ان حالات میں وہاں زندگی گزارنا دشوار ہوگیا تو ترکستان کے باشندے ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور سرسبز و شاداب علاقوں کی تلاش میں نکل پڑے۔ ترک تورانی نسل کے وہ باشندے تھے جو وسط ایشیا، اور چینی ترکستان میں آباد ہوگئے تھے۔ وسط ایشیا سے بہت سی قومیں جوق در جوق ہندوستان آئیں ان میں مسلمان ترک بھی آئے، کیونکہ ان کے وطن کو وحشی تاتاریوں کی بے پناہ یلغار نے تباہ و برباد کردیا تھا، تاتاریوں نے آندھی اور طوفان کی رفتار سے متعدد ایشیائی ممالک کو تاخت و تاراج کردیا تھا۔

ہندوستان میں سنہ ۱۲۰۶ء میں جو حکومت قائم ہوئی تھی وہ مزاج کے اعتبار سے ترکی ایرانی تھی یعنی اس میں ایران کا احساسِ جمال اور ترکستان کی سخت کوشی کی آمیزش بڑے تناسب سے پائی جاتی تھی اور وہ ہندوستان کی آریائی فضا میں بے جوڑ نہیں معلوم ہوتی تھی بلکہ اس کے حسن کو نکھارنے میں معاون ثابت ہوئی۔ اصابتِ رائے کے باوصف ترکوں

ین عدم برداشت اور تنقیدی شدت کا جذبہ نمایاں تھا —
امیر خسرو کے سوانح نگار استاد محترم ڈاکٹر محمد وحید مرزا نے لکھا ہے کہ :-

"بنو عباس کے ابتدائی دور ہی سے سرکش عربوں اور ایرانیوں کو دبانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ان کی نظر جفاکش ترکوں پر پڑی - ترکوں کو بنی عباس کے ابتدائی دور سے دلیری اور شجاعت کی بنا پر خاص امتیاز حاصل تھا۔ ان کی سپہ گری کی ڈھاک تھوڑے عرصہ میں عالم اسلامی پر بیٹھ چکی تھی۔ یہی ترک آگے چل کر عربوں کے بجائے اسلام کے سب سے بڑے مددگار ثابت ہوئے ۔۔۔ اس زمانہ کے نظام کے مطابق سپاہیوں کی تقسیم دھائیوں میں ہوتی تھی، سب سے چھوٹی فوجی جماعت میں دس سپاہی ہوتے تھے۔ اس کے بعد، سَو، پھر ہزار اور پانچ ہزار وغیرہ کی جماعتیں ۔۔۔۔۔۔ اسی اعتبار سے فوجی افسروں کے عہدے متعین ہوتے تھے۔ یہ نظام ہندوستان میں مغل عہد تک قائم رہا۔۔۔۔ ۔۔۔۔ اس تقسیم میں ہزار کے عدد کو خاص اہمیت حاصل تھی، مختلف علاقوں سے لڑائی کے زمانہ میں ہزار ہزار سپاہی لئے جاتے تھے اور ہزار سپاہیوں کا دستہ ہزارہ کہلاتا تھا اس سلسلہ میں امیر خسرو کا یہ شعر دلچسپی سے خالی نہیں ہے ؎

گر ز دشمن بود ہزار سوار
چشم تو میر آں ہزارہ بود

یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ ہزارہ کہلاتا تھا اور جس علاقے سے لیا جاتا تھا اس علاقہ کے نام سے پکارا جاتا تھا بعض صورتوں میں اپنے قبیلہ کے سردار یا مورثِ اعلیٰ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ مدتوں جاری رہا"[1]

انھیں جنگ جو ہزارہ ترکوں میں خسرو کے والد امیر سیف الدین محمود بھی تھے ان کے قبیلے کا نام ہزارہ لاچین تھا۔ امیر خسرو نے خود اپنے کو کئی جگہ خسرو لاچین کے نام سے یاد کیا ہے۔ لاچین ترکی لفظ ہے جس کے معنی باز یا شاہین کے ہیں اور غلام کے معنی بھی ہیں۔ دوسرے معنی زیادہ درست معلوم ہوتے ہیں جس کی تصدیق خسرو کے اس شعر سے ہوتی ہے ؎

خسرو کہ در عہد تو سلطانِ سخن
خسرو لاچین سلطانی شدہ است

بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ لاچین امیر خسرو کے والد کا نام تھا مگر کسی مستند ماخذ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی اور خود امیر خسرو نے اپنے والد کا نام امیر سیف الدین لکھا ہے، ہو سکتا ہے کہ لاچین انکے اجداد میں سے کسی کا نام ہو۔ دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ ان کا اصل وطن شہر کش تھا جو اب قبۃ الخضرا کے نام سے مشہور ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ ہزارۂ لاچین سے تھے جو قرشی اور ماورغ کے اطراف میں آباد تھا اور چنگیز خاں کے زمانہ میں یہ لوگ بلخ اور اس کے آس پاس آباد تھے وہاں سے ہندوستان آئے۔ ڈاکٹر وحید مرزا دولت شاہ کے بیان کو زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔ تاہم مولانا جامی کے بیان کو غیر مستند بھی نہیں کہا جا سکتا۔ قرین قیاس یہ ہے کہ ان سب ہی شہروں میں ان کے خاندان کے لوگ کچھ عرصہ رہے ہوں گے

---

[1] حیات خسرو صفحہ ۱۲ از ڈاکٹر وحید مرزا مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد

ترک قبیلے جو شمال کی مردم خیز زمینوں سے نکل کر آرہے تھے وہ لڑائیوں میں قسمت آزمائی میں مصروف رہے ان کے بعض قبیلوں نے ہمالیہ کی طویل و عریض فصیل کو پار کرلیا۔ کوہ ہندوکش کو عبور کیا۔ کچھ غزنی پر قابض ہوگئے اور وہ غزنوی کہلائے جنھوں نے شمالی ہند پر قبضہ کیا۔ دوسری طرف انھوں نے ایرانی سلطنت کا خاتمہ کیا وہ ایران سے گذر کر بغداد تک پہونچے اور خلفائے اسلام کے خادم بن گئے ان کو مذہب اسلام کی سادگی و سچائی نے گرویدہ بنالیا اور وہ حلقہ بگوشِ اسلام بن گئے۔ چغتائی نسل کے ایک ترک بابر نے ہندوستان فتح کیا۔ اور اس کے خاندان نے ہندوستان پر صدیوں حکومت کی اور قومی یکجہتی اور اتحاد و اتفاق کی داغ بیل ڈالی۔ اس خاندان نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا اور اس کی ترقی و آرائش کے لئے جو کارنامے انجام دیے وہ تاریخ عالم کا ایک سنہرا باب ہے۔

امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین محمود بھی ایک معزز ترک قبیلہ کے سردار تھے اور شمس الدین التمش کے عہد میں ہندوستان آئے۔ سلطان نے انکی عزت و تکریم کی۔ اپنی ذاتی قابلیت اور خاندانی شرافت کے باعث ارکینِ سلطنت میں شامل کرلئے گئے۔ اور اس عہد کے ممتاز امیر نواب اعتماد الملک کی دختر کے ساتھ انکا عقد نکاح ہوا۔

امیر خسرو خود اپنے بیان کے مطابق بمقام پٹیالی سنہ ۶۵۱ھ / ۱۲۵۳ء میں پیدا ہوئے، یہ مقام اسوقت اترپردیش کے ضلع ایٹہ میں واقع ہے۔ پٹیالی اب ایک قصبہ ہے لیکن پہلے ضلع کا صدر مقام بھی رہا ہے اور دریائے گنگا کے دامن میں آباد تھا۔ اب دریا اس سے دور ہوچکا ہے۔ سلطان بلبن کے عہد میں حفاظتی قلعہ بھی یہاں بنایا گیا تھا جس کا ذکر امیر خسرو نے ایک مثنوی میں کیا ہے۔ یہ مثنوی دیوان تحفۃ الصغر میں شامل ہے، اسوقت خسرو کا تخلص سلطانی تھا۔

گرچہ ایں از قضائے یزدانی ست
پٹیالی چہ جائے سلطانی ست

بادشاہ اکبر کے عہد میں پٹیالی ایک مستقل ضلع ہوگیا تھا جس کا ذکر آئین اکبری میں موجود ہے۔ امیر خسرو کا نام ابو الحسن[له] اور لقب یمین الدولہ تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے "ترک اللہ" کا خطاب دیا تھا۔ پہلے سلطانی تخلص رکھا، پھر خسرو۔ عام طور سے امیر خسرو کے نام سے شہرت پائی۔ ان کے دو بھائی اور تھے۔ ایک اعزالدین شاہ۔ دوسرے حسام الدین احمد۔

خسرو چار سال کی عمر تک پٹیالی میں رہے اس کے بعد اپنے والد ماجد کے ہمراہ دہلی چلے گئے۔ جب آپکی عمر نو سال

ل مولانا شبلی نعمانی نے، بیان خسرو میں سن ولادت ۶۰۵ھ ہجری تحریر کیا ہے جو کسی طرح درست نہیں۔ کیونکہ ۶۰۵ھ ہجری میں غلام خاندان کا پہلا بادشاہ قطب الدین ایبک فرمانروا تھا ۴۴

۴۴ اور شبلی نے یہ خود لکھا ہے کہ جب امیر خسرو سن رشد کو پہونچے تو دہلی کے تخت پر غیاث الدین بلبن صدر نشین تھا اور اسکا زمانہ حکومت ۶۶۴ھ ہجری سے شروع ہوا ہے، اسلئے علامہ شبلی کی لکھی تاریخ ولادت کے متعلق خیال ہوتا ہے کہ کسی نقل نویس یا کاتب کی غلطی سے یہ سن غلط درج ہوگیا ہے۔ قرآن السعدین میں امیر خسرو نے خود لکھا ہے کہ ۶۸۸ھ ہجری میں انکی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ اس حساب سے انکی ولادت ۶۵۱ھ ہجری درست معلوم ہوتی ہے۔

له تاریخ فرشتہ میں آپکا نام ابو الحسن لکھا ہے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے یہی نام لکھا ہے۔ لیکن الیٹ نے اپنی تاریخ کی تیسری جلد میں آپ کا نام یمین الدولہ محمد حسن لکھا ہے۔

کا تھی۔ [illegible] میں آپکے والد امیر سیف الدین کسی لڑائی میں شہید ہو گئے۔ امیر خسرو ابتدا ہی سے اپنی والدہ کی نگرانی میں تعلیم و تربیت حاصل کر رہے تھے والد کا سایہ سر سے اُٹھا تو خوش قسمتی سے نانا نواب عماد الملک کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ جنہوں نے ان کی تعلیم و تربیت کا اچھا انتظام کر دیا۔ ابتدا ہی سے ان کو شعر و شاعری کا شوق تھا، والد کی وفات پر کم سنی میں مرثیہ لکھا تھا۔ نانا کی نگرانی میں علوم متداولہ عقلی و نقلی میں خاص مہارت حاصل کر لی۔ ابتدا ہی سے ان کے شاعرانہ کمالات کی شہرت ہونے لگی تھی۔ اس زمانہ میں شہرت اور عزت کا خاص ذریعہ شاہی دربار تک رسائی تھی، سب سے زیادہ معزز اور با اثر وہی سمجھا جاتا تھا جس کا تعلق دربار سے ہو یا بادشاہ کے کسی وزیر، یا شاہزادے سے ہو، امیر خسرو کی رسائی سب سے پہلے بلبن کے بھتیجے ملک چھجو کے دربار میں ہوئی دو سال اس کے یہاں ملازم رہے، اس کے بعد بلبن کے بیٹے بغرا خاں حاکم سامانہ کے مصاحب مقرر ہوئے۔ جب بلبن نے لکھنوتی (بنگال) کے حاکم تغرل کی بغاوت فرو کی اور وہاں کی حکومت بغرا خاں کے سپرد کر دی تو امیر خسرو بھی ان کے ساتھ بنگال چلے گئے۔ اس زمانہ میں سلطان بلبن کا بڑا بیٹا سلطان محمد (معروف بہ خان شہید) اہل فضل و کمال کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے امیر خسرو کو اپنے دربار میں جگہ دی اور جب سلطان محمد کو ملتان کی حکومت ملی تو وہ امیر خسرو کو بھی ساتھ لے گیا۔

بد قسمتی سے کچھ عرصہ بعد تیمور خاں (ایران کے تاتاری حکمران ارغون خان نبیرۂ ہلاکو خاں کا قومی سردار) نے لاہور اور دیپال پور کو فتح کیا اور ملتان پر حملہ آور ہوا۔ سلطان محمد نے سخت مقابلہ کیا اور شہید ہو گیا۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ امیر خسرو کو بھی تاتاریوں نے قید کر لیا، دو سال تک قید و بند کی مصیبتیں اٹھائیں اس کے بعد کسی طرح سے رہا ہو گئے۔ اور دہلی چلے گئے۔ جہاں چند دن قیام کیا اور پھر اپنے وطن پٹیالی کی راہ لی۔

۶۸۶ھ ہجری میں سلطان بلبن نے وفات پائی تو اُس کا پوتا کیقباد تخت نشین ہوا۔ اس نے امیر خسرو کو اپنے دربار میں بلایا۔ مگر اس کے وزیر ملک نظام الدین کو امیر خسرو سے کچھ پرخاش تھی۔ اسلئے وہ کیقباد کے بلانے پر نہیں گئے اور مشہور امیر خان جہاں کی ملازمت اختیار کر لی جب خان جہاں صوبہ اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا تو امیر خسرو بھی اس کے ساتھ چلے گئے۔ دو برس بعد اپنی والدہ کی خواہش پر دلی واپس آ گئے۔ اس زمانہ میں جلال الدین خلجی امراء کے طبقہ میں بہت با اثر اور امتیازی شان کا حامل تھا۔ اس نے امیر خسرو کی بڑی قدر کی۔ اور جب غلام خاندان کے آخری بادشاہ کیقباد کے بعد جلال الدین خلجی تخت نشین ہوا تو اُس نے دل کھول کر امیر خسرو کی قدر کی اور ان کے کمالات کی خوب داد دی۔ جلال الدین خلجی کے بعد علاء الدین خلجی کا دَور آیا اُس نے بھی امیر خسرو کی تعظیم و تکریم میں کوئی کمی نہیں کی اور ایک ہزار تنکہ (اس زمانہ کا سکّہ) وظیفہ مقرر کر دیا۔ علاء الدین کے بعد قطب الدین مبارک شاہ بادشاہ ہوا۔ اُس نے بھی امیر خسرو کو شاہی نوازشوں سے محروم نہیں کیا۔ بلکہ انکے مرتبہ میں اور اضافہ کر دیا۔ خسرو نے مثنوی "نہ سپہر" اس کے نام پر لکھی۔ اور بادشاہ نے انعام میں خسرو کو ہاتھی کے وزن کے برابر تول کر روپیہ بطور انعام دیا۔ جب خلجی خاندان سے حکومت خاندان تغلق میں منتقل ہوئی اور پہلا فرمانروا سلطان غیاث الدین تخت نشین ہوا تو اس نے بھی گزشتہ حکمرانوں کی طرح امیر خسرو کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی قدرد

منزلت کو باقی رکھا۔ اور اپنے دربار میں معزز جگہ دی اور اپنا مشیرِ خاص بنایا۔ امیر خسرو نے تغلق کے ساتھ بنگال کا سفر کیا وہاں کے دوران قیام میں ان کو اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ کی وفات کی اطلاع ملی، جن سے امیر خسرو کو بے پناہ محبت تھی، اس خبر کو سنتے ہی خسرو نے دہلی کا رُخ کیا۔ اور وہاں پہونچ کر اپنا سارا سامان اور اسباب خیرات کر دیا اور خود حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر گوشہ نشینی اختیار کی۔ مرشد کی جدائی کا ان کو بے پناہ غم تھا۔ اس کے بعد وہ صرف چھ ماہ دنیا میں رہے ۷۲۵ھ ہجری میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اپنے مرشد کی پائنتی انکے مرقد اطہر سے بالکل قریب دفن کئے گئے

عام حالات اور خصوصیات

امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین بہت بہادر آدمی تھے وہ اپنے قبیلہ کے ساتھ تیرھویں صدی عیسوی میں ہندوستان آئے اس وقت قطب الدین ایبک کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کا غلام شمس الدین التمش تخت نشین تھا۔ امیر سیف الدین اپنے ہمراہیوں کے ساتھ فوج میں شامل ہو گئے اور پٹیالی میں قیام کیا۔ غالباً یہ مقام ان کو بطور جاگیر عطا ہوا تھا۔ مورخ برنی نے لکھا ہے کہ ان کو بارہ سو تنکہ وظیفہ ملتا تھا۔ امیر سیف الدین نے ہندوستان آنے کے بعد عماد الملک کی بیٹی سے شادی کی، ان بیوی کے بطن سے ۶۵۱ھ ہجری میں امیر خسرو بمقام پٹیالی پیدا ہوئے۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ جب امیر خسرو پیدا ہوئے تو ان کے والد ان کو ایک خرقہ میں لپیٹ کر ایک پڑوسی مجذوب بزرگ کے پاس لے گئے انھوں نے دیکھتے ہی کہا کہ تم ایک ایسے بچے کو میرے پاس لائے ہو جو بڑا ہو کر خاقانی (فارسی کا بلند مرتبہ شاعر) سے بھی سبقت لے جائے گا۔[1] یہ روایت ان کے سب ہی سوانح نگاروں نے کم و بیش نقل کی ہے۔ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ امیر خسرو کو بچپن ہی سے شعر کہنے کا شوق تھا جیسا کہ خود انھوں نے دیوان تحفۃ الصغر کے مقدمہ میں لکھا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ خسرو نے اپنے والد کا مرثیہ بھی لکھا تھا جبکہ ان کی عمر سات سال کی تھی۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ اس وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ وہ اس دور کے مشہور عالم شیخ شہاب الدین کو اپنا کلام بغرض اصلاح دکھاتے تھے۔

امیر خسرو کے دو بھائی اور تھے جیسا کہ فرشتہ نے لکھا ہے۔ عز الدین علی شاہ اور نصیر الدین محمود یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ دونوں امیر خسرو کے حقیقی بھائی تھے یا سوتیلے۔ اس سلسلہ میں ایک شبہ اور وارد ہوتا ہے، کہ امیر خسرو کی ولادت ۶۵۱ھ ہجری میں ہوئی اور ۶۵۸ھ ہجری میں ان کے والد کسی لڑائی میں قتل ہو گئے۔ ان کی عمر ۸۵ سال تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خسرو کی ولادت کے وقت ان کے والد کی عمر ستتّر سال کی تھی۔ ان کے جانشین عز الدین علی شاہ ہوئے اور امیر خسرو عماد الملک کی نگرانی میں آ گئے، اگر عماد الملک کی دختر سے نکاح کے بعد امیر خسرو کو امیر سیف الدین کی پہلی اولاد قرار دیا جائے تو خیال ہوتا ہے کہ عماد الملک نے اپنی لڑکی کی شادی اتنے معمّر شخص کیوں کر دی۔ اور اگر امیر خسرو سے قبل ان کے دو حقیقی بھائی موجود تھے تو وہ یقیناً خسرو سے کافی بڑے

---

[1] یہ روایت سیرۃ اولیاء میں ہے جو ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے کیونکہ اسکے لکھنے والے سید محمد مبارک علائی معروف بہ امیر خرد تھے دیکھئے سیرۃ الاولیاء صفحہ ۳۰۱

ہوں گے لیکن حالات اور قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دونوں بڑے بھائی سوتیلے تھے۔ خسرو کے بیان کے مطابق ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔ بہر حال عماد الملک کے گھر میں امیر خسرو نے ناز و نعم میں پرورش پائی ان کی والدہ پڑھی لکھی خاتون تھیں انھوں نے خسرو کی تربیت پر خاص توجہ کی۔

امیر سیف الدین دہلی آنے کے بعد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ (متوفی ۷۲۵ھ ہجری) کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے۔ وہ امیر خسرو اور ان کے دونوں بھائیوں کو ساتھ لیکر ایک بار نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں گئے۔ خسرو اسوقت بہت چھوٹے تھے۔ خسرو کی رہائش گاہ نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ سے بہت قریب تھی۔ امیر خسرو کو بچپن سے ہی نظام الدین اولیاؒ سے بڑی محبت و عقیدت تھی۔ جب سن بلوغ کو پہونچے تو نظام الدین اولیاؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ وہ خسرو سے بڑی محبت و شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ خسرو اپنا کلام آپ کو سناتے تھے۔ اسی زمانہ میں امیر خسرو کی ملاقات خواجہ حسن دہلوی سے ہوئی جو عمر بھر ان کے مخلص دوست رہے۔ دونوں میں مخلصانہ تعلقات تھے۔ ضیاء الدین برنی مؤلف تاریخ فیروز شاہی بھی آپکے دوستوں میں تھا۔

حضرت نظام الدینؒ اور امیر خسروؒ

امیر خسرو کو نظام الدین اولیاؒ سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی، خسرو کے والدان کو بچپن ہی میں ان کی خدمت میں لے گئے تھے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد خسرو آپکی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ ایک زبردست روحانی تربیت گاہ تھی۔ امیر خسرو کو روحانیت سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا لیکن اپنے مرشد سے بڑی عقیدت تھی۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی بادشاہوں شاہزادوں، اور امرا کی مصاحبت میں بسر کی۔ ایسی حالت میں ان کے لئے بہت مشکل تھا کہ وہ تزکیۂ نفس اور معرفت وسلوک کی راہ اختیار کرتے۔ لیکن نظام الدین اولیاؒ امیر خسروؒ پر بہت مہربان تھے۔ خسرو نے اپنی اکثر مثنویوں میں حمد و نعت کے بعد آپ کی تعریف کی ہے، خمسہ کی سب مثنویوں میں آپ کی مدح موجود ہے۔

نظام الدین اولیاؒ سے ان کو اس درجہ قربت حاصل تھی کہ جس وقت چاہتے ان کے پاس چلے جاتے تھے جبکہ دوسرے بلا اجازت نہیں مل سکتے تھے، دوسرے لوگ نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں باریابی کے لئے امیر خسرو سے سفارش کراتے تھے۔ خسرو نے اس قربت اور تعلق خاطر کا ذکر جا بجا اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ بعض لوگوں کو اسی سبب سے خسرو سے حسد پیدا ہو گیا تھا۔ جب کوئی شخص ہمت کر کے آپ سے کہتا کہ جیسی نظر خسرو پر فرماتے ہیں مجھ پر بھی کیجئے، تو جواب ملتا پہلے خسرو جیسی قابلیت و استعداد پیدا کرو آپ نے خسرو کو ترک اللہ کا خطاب دیا تھا اور یہ دعا بھی کی تھی کہ خسرو ان کے قریب دفن ہوں، آپ نے ایک بار خسرو سے یہ بھی فرمایا کہ میں سب سے تنگ آجاتا ہوں مگر تم سے نہیں۔ اس سلسلہ میں بہت سے واقعات مختلف تذکروں میں موجود ہیں اور بعض دور از قیاس باتیں بھی ہیں جو عقیدتمندوں کی من گڑھت معلوم ہوتی ہیں۔

مسلک و مشرب

امیر خسرو نے بہت مصروف زندگی گزاری، انھوں نے سات بادشاہوں

کا زمانہ دیکھا۔ اور ہوش سنبھالنے کے بعد سے آخر عمر تک بادشاہوں اور امراء کی مصاحبت میں وقت گزارا۔ ان کی ذہانت و جودتِ طبع کا یہ کرشمہ تھا کہ زمانہ کے حالات کے مطابق اپنے کو ہر ماحول کا عادی بنا لیتے تھے۔ دنیا کے اکثر ممتاز لوگ اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوتے تھے اور بعض اپنے ماحول پر اثر انداز ہوتے اور اس کو بدلنے کی کوشش کی۔ امیر خسرو اپنے ماحول کے اثرات سے متاثر ہوئے مگر ماحول پر اثر انداز نہیں ہو سکے۔ البتہ ان کے شاعرانہ کمالات نے اس عہد کے ادبی و شعری ماحول کو ضرور متاثر کیا؛ بلکہ ان کی فارسی شاعری اور زبان دانی کا ایران و افغانستان کے علمی و ادبی حلقوں نے اعتراف کیا۔

امیر خسرو کی شاعری میں تمام آبائی، قومی اور ملّی اثرات نمایاں ہیں۔ ان کی وطن دوستی بھی مسلّم ہے جس میں اُن کے گھریلو اثرات کا بھی حصّہ تھا۔ باپ خالص ترک تھے اور ان کا سایہ بچپن میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ ماں کی گود اور نانا کی سرپرستی میں تربیت پائی۔ ماں عماد الملک راوت کی بیٹی تھیں جو خالص ہندوستانی نسل سے تھیں۔ مادری زبان ترکی اور ملکی زبان فارسی تھی جو اس عہد میں حکومت کے علاوہ اہل علم کی زبان تھی۔ اور عوام میں بھی اسکے اثرات پھیل رہے تھے، امیر خسرو ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں رہے۔ پنجاب، بنگال اور اودھ میں بہت دن قیام کیا، ہر طبقہ کے لوگوں سے ربط و ضبط رکھا۔ ہندوستان کی تہذیب و معاشرت اور مختلف علاقائی زبانوں سے ان کو واقف ہونے کا موقع ملا۔ وہ اپنے فارسی اشعار میں ہندی و سنسکرت کے الفاظ بھی استعمال کرتے تھے۔ اور نہایت دلچسپ انداز میں۔ ان کے ایسے مشہور اشعار میں چند یہ ہیں ؎

اے دہلی و اے بتانِ سادہ
پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

گجری، تو کہ در حسن و لطافت چو مہی
آن دیگِ دہی بر سرِ تو چترِ شہی
از ہر دو لبت قند و شکر می ریزد
ہر گاہ بگوی کہ دہی لیہو دہی

سر آن دو چشم گردم کہ چون ہندوانِ رہزن
ہمہ را بنوکِ مژگان زدہ بر جگر کٹارا

امیر خسرو نے اپنے وطن ہندوستان کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ اور اپنی مثنوی نُہ سپہر میں ہندوستان کی ان خصوصیات کا دلچسپ انداز میں تذکرہ کیا ہے جو کسی اور ملک کو حاصل نہیں ہیں۔ ساتھ ہی یہاں کے دریاؤں قدرتی مناظر، پھولوں پھلوں اور دوسری چیزوں کی تعریف کی ہے۔ ہندوستانی زبان، رسم و رواج اور عام تہذیبی اور معاشرتی ماحول سے ان کی واقفیت اور دلچسپی کا اظہار ان کی تصانیف سے بخوبی ہوتا ہے۔ ان کی پہیلیاں کہہ مکرنیاں، ڈھکوسلے اور بہت سے ہندی اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ہندی یا اسوقت کی رائج ہندوستانی زبان میں بھی شاعری کی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کا کوئی ایسا مجموعہ دستیاب نہیں ہوا، نہ تذکرہ نگاروں نے ایسے کسی مجموعہ کا ذکر کیا ہے۔ البتہ ان کی ہندوستانی شاعری اور اس میں ان کی مہارت کا ذکر

اکٹھے لیا ہے۔ اگر یہ بات درست ہوتی تو جس طرح ان کی اور تصانیف محفوظ رہ گئیں ہندی کلام کا کوئی مجموعہ تو محفوظ ہوتا۔ چند متفرق اشعار، پہیلیاں وغیرہ ان سے منسوب ہیں جو ان کے چند متفرق رسائل کے مجموعوں میں شامل نہیں لیکن ان کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کا کام اب تک نہیں ہوا ہے۔ نہ ایسے قطعی ثبوت فراہم ہوتے ہوئے جن کی روشنی میں یہ کہنا ممکن ہو کہ خسرو ہندوستانی زبان کے شاعر بھی تھے، یہ اور بات ہے کہ انھوں نے اپنے فارسی کلام میں کہیں کہیں ہندی کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

امیر خسرو کو فن موسیقی سے بہت دلچسپی تھی، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس فن میں بہت سے راگ راگنیاں اور بعض آلات موسیقی ایجاد کئے ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے فن موسیقی سے دلچسپی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن موسیقی میں مہارت اور ایجادات کے سلسلہ میں تحقیقی نقطۂ نظر سے کوئی فیصلہ کن بات ابھی سامنے نہیں آتی ہے، معاملہ قیاس آرائیوں اور اندازوں کی کشمکش سے باہر نہیں نکل سکا۔

امیر خسرو کو عام طور پر ایک صوفی و درویش کی حیثیت سے بھی پیش کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے نہ صرف مرید تھے بلکہ انکی قربت خاص بھی حاصل تھی۔ ان پر حضرت نظام الدینؒ کی خاص نظر عنایت تھی اور اس درجہ کے بعض دوسرے مقرب لوگ رشک و حسد میں مبتلا ہو گئے تھے۔ آپ نے امیر خسرو کو ترک اللہ کا خطاب دیا تھا۔ درباری مصاحبت کے باوجود امیر خسرو آپ کی خدمت میں حاضری دیتے رہے۔

نظام الدین اولیاؒ کے یہ اشعار جو خسرو کے متعلق لکھے تھے قابل ذکر ہیں ؎

خسرو کہ بنظم و نثر مثلش کم خاست
ملکیت ملک سخن آن خسرو راست
آن خسرو ماست ناصر خسرو نیست
زیرا کہ خدای ناصر خسرو ماست

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ ان کی شعری اور نثری صلاحیتوں کے معترف تھے، لیکن تصوف و سلوک کے سلسلہ میں کوئی اشارہ ان اشعار میں نہیں ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کا ایک مقولہ بھی کتابوں میں ملتا ہے کہ آپ نے فرمایا، "اے خدا اس ترک کے سینے کا سوز مجھے عطا کر دے"۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان کے دل میں عشق حقیقی کی گرمی تھی جو معرفت و سلوک کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیر خسروؒ نہایت ذہین اور ہوشیار انسان تھے، ان کا اولین مطمح نظر یہ تھا کہ شاہی دربار میں ان کو سربلندی حاصل رہے اور جاہ و منصب میں اضافہ ہوتا رہے۔ ان کا رویہ بھی سیاسی اعتبار سے ان کی ذہانت کا غماز ہے۔ شاید ہی کبھی کسی سے ان بن ہوتی ہو، بادشاہ بدلا تو یہ بھی بدلے دربار کا جو رنگ دیکھا اسی کو اختیار کر لیا۔ ایسے شخص کے لئے یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ تزکیۂ نفس کے لئے صوفیائے کرام جیسی عبادت و ریاضت میں وقت صرف کرتے، اور اس تربیتی نصاب کو پورا کرتے، جو صوفیا کی خانقاہوں میں متداول تھا اور بڑی ریاضتوں اور آزمائشوں کے بعد کامیابی سے ہمکنار ہونے کا موقع ملتا تھا۔ امیر خسرو سلوک و تصوف کی راہ سے نہیں گزرے۔

ایک ساتھ دو کشتیوں میں پیر رکھنا ناممکن تھا۔ اس لئے یہ عام خیال غلط ہے کہ امیر خسرو ایک بلند پایہ صوفی باصفا بھی تھے۔ انھوں نے تصوف و اخلاق کے رموز و نکات کو سمجھا اور ان سے واقفیت ضرور حاصل کی۔ مثنوی مطلع الانوار اور بعض دوسری مثنویوں کا موضوع اخلاق و تصوف ہے۔ مگر عملی اعتبار سے ان کو اس سے کوئی خاص تعلق نہ تھا۔

امیر خسرو کے عہد کے متعلق پروفیسر محمد حبیب نے لکھا ہے کہ :

"ہندوستان کی بہترین اور بدترین سوسائٹی کا عطر یہاں جمع ہو گیا تھا۔ نجومی، دستکار، گویئے، قوّال، ٹھگ، جعل ساز اور ہر طرح کے بدمعاش موجود تھے۔ دہلی ہر قسم کے فنونِ لطیفہ و قبیحہ کا گہوارہ بن گیا تھا"[1]

اسی کتاب میں اس دور کی معاشرت اور حالت کی تصویر کشی اس طرح کی ہے :

"ہشیار اور چلتے آدمی کی یہاں ہر وقت گنجائش رہتی تھی۔ دلّی کے نواح اور گلیوں میں قرساق، طوائفیں اور جواری سارے ہندوستان سے اپنے ہتھکنڈے آزمانے جمع ہو گئے تھے ان سب کے ساتھ بڑی تعداد میں صوفیا آ گئے تھے، گویا کہ خداوند تعالیٰ نے ان برائیوں کا مصلح بھیجدیا تھا۔ مگر شہر بدستور بہاڑ پہ لڑھکنے والے پتھر کی ایسی سرعت سے جہنم کے منھ میں سر کے بل گرتا گیا، اور حضرات صوفیا باوجود اپنی انتھک کوششوں کے اس کو برائے نام سنبھال سکے۔ اس دھوپ چھاؤں والے شہر کی حالت امیر خسرو کے طبعی رجحان کو بہت راس آئی۔ اس حالت نے انکو بہت کچھ سکھانا چاہا اور وہ سیکھنے پر آمادہ بھی نکلے۔ انھوں نے دلّی کا ہر رُخ سے تعاقب کیا۔ یہاں واعظوں کی خطابت اور صوفیا کے پُر کیف مکالمے ہوں یا یہاں کی رقاصاؤں کے دلربایانہ عشوے، ان کی نظر سے نہیں بچے۔ جب انھوں نے لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو گہرے گہرے انسانی جذبات سے ان کا دل مملو تھا۔ بقول سعدیؔ ؎

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم
ز ہر گوشۂ خرمنے یافتم[2]

مذکورہ بیان کی تائید امیر خسرو کے ان اشعار سے بھی ہوتی ہے۔

ایں چہ زماں ست کہ در ہر طرف
ہست فسق اہلِ جہاں را شرف
ہر نفسے کار کند بیشتر
خواریٔ دیں باشد ازیں بیشتر
آں کہ بفرصتے نکند کاہلی
متقی اش نام کنند و ولی

دلّی کے حالات کی تائید امیر خسروؔ کی اس منظر کشی میں اگر کسی قدر مبالغہ بھی ہو تب بھی اس وقت کی عام حالت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ امیر خسرو کے حالات زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عوام سے بھی ربط

---

[1] حیاتِ امیر خسرو صفحہ ۶ از پروفیسر محمد حبیب مترجم حیات اللہ انصاری مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد

[2] حیاتِ امیر خسرو پروفیسر حبیب ص۸

مشہور رکھتے تھے، اور لوگ ان کی سوجھ بوجھ کے قائل تھے لیکن ایک صوفی اور درویش کی حیثیت ان کو حاصل نہ تھی اس کوچہ میں انھوں نے قدم رکھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے ان کو صد درجہ محبت تھی ان کی دعائیں اور نیک خواہشات خود کو حاصل رہیں۔ اس لئے جب انھوں نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے انتقال کی خبر بنگال سے واپسی پر راستہ میں سنی تو بیقرار ہو کر تیز رفتاری سے دہلی پہونچے اور اپنا سارا مال و اسباب تقسیم کرکے حضرت کی قبر کی مجاوری اختیار کی اور صرف چھ ماہ کے بعد ... میں انتقال کیا۔ اور اپنے پیر و مرشد کی پائینتی میں دفن کئے گئے۔ ان کا مزار بھی دوسرے اولیاء اللہ کے مزارات کی طرح زیارت گاہ خاص و عام ہے اور ان کا سالانہ عرس نہایت اہتمام سے ہوتا ہے۔ امیر خسرو کو یہ ہر دلعزیزی و عزت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے منظور نظر ہونے کا باعث حاصل ہوئی، ان کا شمار اولیاء اللہ میں کیا جاتا ہے۔

امیر خسروؒ دوسروں کی نظر میں

امیر خسرو کی شہرت و عظمت کی اصل بنیاد ان کی شاعری ہے، اسی کے ساتھ ان کے علم و فضل خداداد ذہانت و طباعی کا اعتراف ان کے معاصرین کے علاوہ ہر دور کے ہندوستانی، ایرانی اور تورانی علما و شعرا نے بھی کیا ہے۔

خواجہ امیر حسن، (حسن سنجری) نہ صرف خسرو کے معاصر تھے بلکہ ان کے دوستوں میں تھے ملتان کے زمانہ قیام میں انکے ساتھ تھے۔ مغلوں کے ہاتھوں دونوں گرفتار ہوئے تھے حسن اس دور کے نامور عالم اور شاعر تھے، خسرو سے ان کو بڑی عقیدت و محبت تھی۔ کہتے ہیں ؎

خسروا زراہِ کرم بپذیرد
آں چہ من بندہ حسن می گویم
سخنم چوں سخنِ خسرو نیست
سخن این ست کہ من می گویم

مشہور مؤرخ ضیاء برنی خسرو کا ہم عصر اور ہم نشین تھا وہ اپنی مشہور تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے:۔

امیر خسرو، خسرو شاعران سلف، و خلف بودہ است۔ در اختراع معانی و کثرت تصانیف غریبہ، نظیر نداشتہ و ہر چہ نسبت طبع لطیف، و موزوں کند، باری تعالیٰ و نادر دران ہنر میسر آمد گردانیدہ بود۔ و وے عدیم المثال آفریدہ۔ و در قرن متاخر، از نوادر اعصار پیدا آورد۔

فارسی کا مشہور شاعر خواجو کرمانی نے کہا تھا:

سوختم این نسخہ خسروی
در طبق موہبت مولوی

مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کا خراج عقیدت یہ ہے:۔

اہل دل از فکر چو مشغل نہند
بادہ را از قدح دل نہند
اشعار آں بادہ بجامی رساں
رونق نقش بہ نظامی رساں
بر سر خسرو کہ بلند اختر است
از کف درویش گلے در خور است

ہاشمی کرمانی فارسی کا ممتاز شاعر خسرو کی تعریف

میں رطب اللسان ہے ؎

خانۂ خسرو جو گہر بار شد نامۂ او مطلع الانوار شد
کرد دراں نامہ تکلف بسے گفت جوابے کہ چہ گوید کسے
فہم رموزش نکند ہر کسے زاں کہ معانی است بے درپے
گفتۂ او در در نظر نکتہ داں
می دہد از علم لدنی نشاں

ملاّ نورالدین ظہوری فرماتے ہیں ؎

بساطِ ادب برکراں افگند
چو خسرو غزل درمیاں افگند

آزاد بلگرامی جیسے ماہر علوم خسرو کے کمالات کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں ؎

اے خسروِ شوخاں چہ کند وصفِ تو آزاد
خوبانِ عملِ فتنہ ز دیوانِ تو یابند

دوسرا مصرع امیر خسرو کا ہے، جس پر آزاد نے اپنا مصرع لگا کر شعر مکمل کیا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں :-

امیر خسرو دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سلطان الشعراء برہان الفضلاست در وادیٔ سخن یگانۂ عالم و نقادۂ نوع بنی آدم ست۔ وے در سخن عالمے است، از عوالم خداوندی، کہ پایاں ندارد۔ و اورا از مضامین و معانی، در اطوار سخن، و انواع آن، دست داد۔ کہ ہیچ کس را از شعرائے متقدمین و متاخرین نداده۔

مشہور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی نے خسرو کے متعلق لکھا ہے کہ :-

از جملہ شاعران کہ در زمان سلطان علاء الدین بہ وجود ایشان مزین و مشرف بود یکے خسرو شاعرِ علیہ الرحمۃ والرضوان کہ آفاق کران تا کران از نظم و نثر وے مملو و مشحوق است و خمسہ را در سن ششصد و نود و ہشت بنام سلطان علاء الدین در مدتِ دو سال تمام ساختہ و ازان جملہ مطلع الانوار را در دو ہفتہ گفتہ،

دولت شاہ سمرقندی ہندوستان کے فارسی گو شعراء سے تعصب برتتا تھا اس کے باوجود اس نے خسرو کے لئے لکھا ہے کہ :-

کمالات او از شرح مستغنی است و ذاتِ ملک صفاتِ او بہ غنائمِ عالمِ معنیِ غنی گوہر کان ایقان و درِّ دریائے عرفان است۔ عشقبازیِ حقائق را در شیوۂ مجاز پرداختہ بلکہ با عرائس نقائص حقائق پرداختہ ...... بادشاہِ خاص و عام است از آن ست کہ خسرو نام است و ...... در حق او مرتبہ سخن گزاری ختم و تمام است۔

اگر ہندوستان اور ایران کے مؤرخوں اور تذکرہ نگاروں کی تمام رائیں خسرو کے متعلق جمع کر دی جائیں تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ یورپ نے متعدد مستشرقین نے نہ صرف امیر خسرو کو خراجِ تحسین پیش کیا بلکہ ان کے تحقیقی حالات اور کارناموں پر بہت کچھ لکھا ہے، ان کی تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔

امیر خسرو کی تصانیف

خسرو کو فارسی نظم و نثر دونوں میں کمال حاصل تھا ان کی شاعری کی شہرت عام ہے لیکن نثر مشکل ہے، اس کے

علاوہ نظم کے مقابلہ میں نثر کا ذخیرہ بہت کم ہے، جو کچھ ہے وہ صنائع و بدائع سے اس قدر مرصّع ہے کہ اس کے مفاہیم کو سمجھنا آسان نہیں اسی لئے اس طرف کم توجہ کی گئی۔ نثر میں ان کی سب سے بڑی اور اہم کتاب اعجاز خسروی ہے۔ ان کی چند دستیاب کتابیں حسب ذیل ہیں :-

(۱) **دیوان تحفۃ الصغر** : اس میں ۱۶ سال کی عمر سے ۱۹ سال کی عمر تک کا کلام درج ہے۔

(۲) **دیوان وسط الحیات** : اس دیوان میں ۲۰ سال سے ۳۴ سال کی عمر تک جو کچھ کہا موجود ہے وہ قصائد بھی شامل ہیں جو سلطان شہید اور ملک چھجو وغیرہ کی مدح میں لکھتے ہیں۔

(۳) **غرۃ الکمال** :- اس میں ۳۴ سال کی عمر سے لیکر ۴۳ سال تک کا کلام شامل ہے۔ اسکے دیباچہ میں اپنے مختصر حالات بھی لکھے ہیں اس میں وہ قصائد بھی ہیں جو کیقباد اور جلال الدین خلجی کی مدح میں لکھے تھے۔ یہ دیوان خسرو نے صرف دو ہفتہ میں مرتب کیا اور اس پر دیباچہ لکھا، جیسا کہ خود انھوں نے بیان کیا ہے۔

(۴) **نہایۃ الکمال** یہ پانچواں اور آخری دیوان ہے علاوہ غزلیات کے قطب الدین مبارک شاہ کا مرثیہ اور اس کے ولی عہد کی مدح میں قصیدہ بھی موجود ہے۔

(۵) **بقیہ نقیہ** :- اس دیوان میں کم از کم ۷۱۵ھ ہجری کے بعد تک کا کلام درج تھا اور سلطان علاء الدین خلجی کا مرثیہ بھی شامل ہے یہ عہد پیری کے کلام پر مشتمل ہے۔

مطبع منشی نولکشور نے خسرو کے تمام دواوین کا ایک اچھا انتخاب "دواوین عناصر خسرو" کے نام سے شائع کیا فارسی کی بدولت امیر خسرو کا کلام ہندوستان اور ایران کے اہل ذوق کی نظر سے گزرا، اس کے متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ بعض دیوان علٰحدہ بھی دہلی۔ کلکتہ۔ لاہور اور لکھنؤ سے شائع ہوئے لیکن مکمل مجموعہ دواوین کسی نے شائع نہیں کیا۔ چند سال قبل ایران کے ممتاز عالم و ادیب آقا سعید نفیسی نے ۷۴۳ھ ہجری کے لکھے ہوئے قلمی نسخے کی مدد سے دیوان خسرو کا ایک جامع نسخہ مرتب کرکے شائع کرایا۔ لیکن اس میں بہت سی غزلیات شامل ہونے سے رہ گئیں۔ سعید نفیسی کا مرتبہ دیوان فارسی ٹائپ میں تہران سے شائع ہوا تھا۔

۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر نورالحسن لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی نے "دیوان خسرو" کا ایک نہایت جامع نسخہ مرتب کیا جس میں دیوان مرتبہ سعید نفیسی میں جو غزلیات شامل ہونے سے رہ گئی تھیں ان کو بھی شامل کیا ہے اس لئے اب تک شائع ہونے والے دواوین میں سب سے زیادہ جامع ایڈیشن ہے جسے نولکشور اکیڈمی لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ اس میں ۹۷۶ صفحات ہیں اور سائز ۱۸×۲۲ ہے مکمل مثنویات سے قطع نظر اس میں قصائد رباعیات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اور ابتدا میں ایک جامع مقدمہ خسرو کے حالات اور شاعرانہ کمالات پر موجود ہے۔

امیر خسرو نے فارسی زبان کے بلند پایہ و ممتاز شاعر نظامی گنجوی کی پانچ ضخیم مثنویوں کے جواب میں جو خمسۂ نظامی کہلاتی ہیں، پانچ طویل مثنویاں تصنیف کیں، جن سے ان کی مہارت فن اور غیر معمولی شاعرانہ کمالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا معیار کسی طرح نظامی کی مثنویوں سے کم نہیں ہے۔ ان کا مختصر تعارف ضروری ہے، ان کے علاوہ

دوسری مثنویوں کے نام بھی درج کئے جارہے ہیں :-

(۱) قرآن السعدین :- یہ امیر خسرو کی سب سے پہلی مثنوی ہے جو انھوں نے ۳۶ سال کی عمر میں لکھی تھی۔ اسمیں ملک کیقباد اور بغرا خاں (باپ بیٹے) کی مصالحت کا حال لکھا ہے۔ خمسہ نظامی کے جواب میں جو مثنویاں لکھی ہیں، وہ خود ان کی بیان کردہ ترتیب کے مطابق یہ ہیں :- مطلع الانوار[۱] - شیریں خسرو[۲] - مجنوں لیلیٰ[۳] - آئینہ اسکندری[۴] - ہشت بہشت[۵] -

(۲) مطلع الانوار :- یہ نظامی گنجوی کی مثنوی مخزن الاسرار کا جواب ہے اسکو سلطان علاءالدین خلجی کے نام منسوب کیا ہے۔ یہ مثنوی صرف دو ہفتہ میں مکمل کی تھی۔ اس وقت خسرو کی عمر ۴۸ سال تھی۔ اسمیں ۳۱ ۳۳۱ اشعار ہیں۔ اس کا نہایت صاف اور صحیح ایڈیشن مقدمہ کے ساتھ علی گڑھ سے شائع ہو چکا ہے پہلی بار اس کو مطبع نولکشور نے شائع کیا تھا۔ یہ خمسہ خسروی کا پہلا حصہ ہے۔ اور اس میں اخلاق و تصوف کے مضامین ہیں۔

(۳) مثنوی شیریں خسرو : یہ مثنوی بھی نظامی کی خسرو شیریں کے جواب میں لکھی تھی ۶۹۸ھ میں مکمل ہوئی۔ اس میں چار ہزار ایک سو چوبیس اشعار ہیں۔ یہ بھی علی گڑھ سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ خمسۂ خسرو کی دوسری مثنوی ہے۔

(۴) آئینہ اسکندری :- یہ نظامی کی مثنوی سکندر نامہ کا جواب ہے اور چار ہزار چار سو پچاس اشعار پر مشتمل ہے۔ ۶۹۹ھ میں مکمل ہوئی تھی۔ اس کے متعدد اڈیشن نولکشور پریس نے شائع کیے علی گڑھ سے اس کا نہایت صحیح اور خوبصورت اڈیشن شائع ہو چکا ہے۔

(۵) ہشت بہشت :- نظامی کی مشہور مثنوی ہفت پیکر کا جواب ہے۔ یہ ۷۰۱ھ ہجری میں تمام ہوئی اس میں تین ہزار تین سو بیاسی اشعار ہیں۔ مطبع نولکشور سے کئی بار شائع ہوئی۔ علی گڑھ سے ایک صاف اور خوبصورت ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔

(۶) لیلیٰ مجنوں :- یہ بھی نظامی کی مثنوی کا جواب ہے جسے خسرو نے ۶۹۸ھ ہجری میں مکمل کیا تھا۔ اس میں کل دو ہزار چھ سو ساٹھ اشعار ہیں۔ نولکشور پریس نے متعدد بار شائع ہوئی۔ علی گڑھ سے بھی اس کا نہایت اچھا اڈیشن شائع ہوا تھا۔ ان سب مثنویوں کو انسٹیٹیوٹ پریس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے تحقیقی مقدمات کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اب یہ کمیاب ہیں۔

(۷) تاج الفتوح :- اس میں سلطان جلال الدین کی تخت نشینی سے پہلے سال (۶۸۹ھ ہجری) سے ۶۹۰ھ ہجری تک کے حالات نظم کئے ہیں۔

(۸) مثنوی نہ سپہر :- اس میں ہندوستان کی تعریف میں بہت کچھ لکھا ہے یہ دراصل علاءالدین کے بیٹے خضر خاں اور دیول رانی (والئ گجرات کی لڑکی) کی داستان عشق ہے۔ اس میں چار ہزار دو سو اشعار تھے۔ لیکن جب خضر خاں مارا گیا تو امیر خسرو نے تین سو انیس اشعار دیول رانی کے حال میں اور بڑھا دئے یہ مثنوی ۷۱۵ھ میں مکمل ہوئی۔ اور سب سے زیادہ اہل ذوق کی توجہ کا مرکز بنی۔ اسکے متعدد اڈیشن شائع ہوئے۔

(۹) اعجاز خسروی :- یہ کتاب تین ضخیم جلدوں میں مطبع نولکشور سے شائع ہو چکی ہے۔ اس میں نثر نگاری کے اصول و ضوابط اور صنائع و بدائع میں سینکڑوں صنائع خود اختراع کئے ہیں۔ تاریخی حالات حالات۔ اور بعض مفید

یا ان کا ذکر آ گیا ہے۔ زبان مشکل استعمال کی ہے فارسی نثر میں اپنے طرز کی انوکھی کتاب ہے۔

(١٠) تغلق نامہ :

یہ امیر خسرو کی زندگی کے آخری دَور کی تصنیف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کی آخری مثنوی ہے اس کا مکمل نسخہ کہیں دستیاب نہیں ہوا، اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ یہ پایہ تکمیل کو نہ پہونچ سکی تھی۔ یا ممکن ہے مکمل نسخہ ضائع ہو گیا ہو۔ عہد جہانگیر میں اُس کے حکم سے حیاتی کاشی یا جدید تحقیق کے مطابق حیاتی گیلانی نے اس میں اضافہ کرکے مکمل کیا۔ حیاتی نے لکھا ہے کہ اول آخر سے ناقص تھی اس نے مکمل کی۔ اس کو ہاشمی فریدآبادی نے اپنے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۳۳ء میں حیدرآباد سے شائع کرایا۔ یہ مثنوی خسرو نے تغلق کی فرمائش پر تصنیف کی تھی۔ اس میں غیاث الدین تغلق اور اس کے عہد کے حالات نظم کئے ہیں حیاتی کے اضافہ کردہ اشعار کا ایک مسودہ الہ آباد میوزیم میں محفوظ ہے جس کو کچھ دن ہوئے ڈاکٹر مقبول احمد شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی نے صحت کے ساتھ مع مقدمہ شائع کرا دیا ہے۔

(١١) تاریخ علائی معروف بہ خزائن الفتوح

اس میں علاء الدین خلجی کے ابتدائی اور درمیانی دَور کے حالات لکھے ہیں۔ (یعنی ٦٩٠ھ ہجری سے ٧١١ھ ہجری تک) تاریخ فرشتہ میں علاء الدین کے دہلی پہونچنے کا زمانہ ٦٩٤ھ لکھا ہے لیکن طبقاتِ اکبری کے مؤلف اور ضیاء برنی نے ٦٩٥ھ لکھا ہے۔ امیر خسرو نے ۲۲ ذی الحجہ ٦٩٥ھ ہجری متعین کی ہے چونکہ خسرو خاندان خلجی کے عموماً اور خاص طور پر عہد علائی کے مورخ اور شاعر تھے اس لئے ان کا بیان سب سے زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔

(١٢) افضل الفوائد :

اس میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات جمع کئے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی متعدد اور تصانیف کا ذکر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں اور کتابوں کے ساتھ "مناقب ہند تاریخ دہلی" کا نام بھی شامل کیا ہے مگر جو کتابیں اب تک دستیاب نہیں ہیں ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

امیر خسرو کے بیان کے مطابق ان کے لکھے ہوئے اشعار کی تعداد تقریباً پانچ لاکھ ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد میں اختلاف ہے بعض نے بانوے لکھی ہے، بعض کے نزدیک ننانوے اور چند روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک سو ننانوے ہے۔ ان میں سے جو کتابیں دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گئیں وہ سب شائع ہو چکی ہیں۔ بقیہ کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ تلف ہو گئیں یا ان کا وجود ہی نہ تھا۔

"خالق باری" کے نام سے ایک مختصر منظوم لغت کو خسرو کی تصنیف کہا جاتا ہے اور یہ کتاب ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوتی رہی ہے۔ عوام و خواص دونوں بیحد مقبول ہے لیکن تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ کتاب ان کے نام سے غلط منسوب ہو گئی ہے۔ اس سلسلہ میں محققین نے بہت چھان بین کی لیکن اس کی اصل کا سراغ نہیں ملتا۔

(١٣) جواہر خسروی: مجموعہ رسائل امیر خسرو

یہ مجموعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڈھ سے ١٩١٦ء میں مقتدیٰ خاں شیروانی کی نگرانی میں شائع ہوا تھا اس میں متعدد رسائل شامل ہیں۔ (١) "نصاب بدیع العجائب" اس کا نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن سے حاصل کیا گیا تھا یہ غلط اور مسخ شدہ تھا۔ دوسرا نسخہ مطبوعہ مطبع محمدی

[illegible] ہجری میں چھپا تھا اور مولوی ابن حسن نے اس کی صحت کی تھی۔ سب سے اچھا نسخہ کتبخانہ دارالعلوم دیوبند میں موجود ہے جو صحت و صفائی کے علاوہ مشکل الفاظ کی شرح پر مشتمل ہے۔ علی گڈھ کے اڈیشن میں ان سب نسخوں کو پیش نظر رکھا گیا تھا ان کے علاوہ ملک کے دوسرے کتبخانوں میں بھی اس کے قلمی نسخے موجود ہیں بعض نسخوں پر دوسرا نام درج ہے۔ نصاب بدیع کے ایک نسخہ پر مصنف کی جگہ مولوی محمد بدیع کا نام لکھا ہوا ہے بدیع العجائب کا ایک نسخہ ایشیاٹک لائبریری کے گورنمنٹ کلکشن میں موجود ہے جس پر مصنف کی جگہ مولانا عبدالرحمٰن جامی کا نام درج ہے۔ رضا لائبریری رام پور میں ایک نسخہ شرح بدیع العجائب کا ہے اس کے شارح محمد شریف بن شیخ برخوردار ہیں۔ ان سب رسائل کو عموماً امیر خسرو سے منسوب کیا گیا ہے۔ اسی طرح چند اور رسائل بھی ہیں لیکن یہ سب اہل تحقیق کے نزدیک مشتبہ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ اجزا امیر خسرو کے قلم سے نکلے ہوں۔

ایک رسالہ جو رباعیات پیشہ وراں ہے اسمیں مختلف پیشہ وروں کے نام اور ان کے کاموں کو نظم کیا ہے کل ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ بدیع العجائب ۱۷ صفحات پر ہے اسی کے ساتھ ۱۲ صفحات کا ایک رسالہ نصاب ثلث ہے اس میں ایک نظم موسوم بہ گھڑیال شامل ہے۔

مجموعہ جواہر خسروی میں خالق باری بھی شامل ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بہت ضخیم کتاب تھی جس کے تمام اجزا ضائع ہو چکے ہیں یہ اس کا خلاصہ ہے۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ خالق باری اختصار ہے اس ضخیم لغت کا جو امیر خسرو نے کئی جلدوں میں مکمل کی تھی۔ مگر کسی مستند ذریعہ سے اب تک اس کی تصدیق نہیں ہو سکی ہمیں معلوم آزاد نے کس بنا پر لکھا ہے۔ خالق باری کے پچاسوں قلمی اور مطبوعہ نسخے ملتے ہیں۔

اس مجموعہ میں ۴۰ صفحات پر مشتمل ایک اور رسالہ ہے جس میں چیستان۔ پہیلیاں۔ کہہ مکرنیاں اور دو سخنے ہیں اور ان کو عام شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ انھیں کی بنا پر امیر خسرو کو ہندی و سنسکرت میں ماہر اور اردو کا اولین شاعر سمجھا جاتا ہے۔

امیر خسرو کی بعض تصانیف کے بہترین مکمل اور خوبصورت قلمی نسخے ترکی کے کتبخانوں میں موجود ہیں، ایران اور ایشیائی روس کے بعض کتبخانوں میں بھی کچھ قلمی نسخے موجود ہیں۔ مذکورہ ممالک کے علمی حلقوں میں امیر خسرو کی شہرت عام ہے، ان کے کلام کو پسند کیا جاتا ہے۔

بسلسلہ مضمون صفحہ ۸۴

۳۔ میں عشق میں کافر ہو گیا ہوں مجھے اسلام کی ضرورت نہیں ہے میری رگ رگ زنار بن گئی ہے مجھے زنار کی کیا حاجت ہے،

۴۔ مسجد، مندر، میکدہ اور کلیسا میں ہر جگہ صرف تیرا ہی ذکر ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ انسان فطرتاً بُرا نہیں ہے۔ وہ فساد کو نہیں امن۔ نفرت کو نہیں محبت کو پسند کرتا ہے۔ اگر چند مفاد پرست افراد کی ریشہ دوانیاں اور ارباب سیاست کی مداخلت اندازیاں نہ ہوں تو آج بھی خسرو کا وہ پیغام ہماری زندگی کی آواز بن سکتا ہے ؎

ما و عشق یار اگر در کعبہ و در بت کدہ
عاشقانِ دوست را با کفر و ایماں کار نیست

([illegible])

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

خسرو شیریں سخن

دانی کہ ہستم در جہاں من خسرو شیریں زباں
گرنائی از بہر دلم، بہر زباں من بیا

یہ خسرو شیریں زباں، مادرِ ہند کا سچا سپوت، علوم و فنون کا آفتاب تاباں، انسانیت و ظرافت کا پیکر، حقانیت و روحانیت کا علمبردار، اردو اور ہندی زبانوں کا سنگم ہی نہیں تھا بلکہ فارسی زبان کا بھی پہلا ہندوستانی شاعر تھا، جس کی سخن فہمی اور سخن سنجی کا لوہا مشاہیر ایران کو بھی ماننا پڑا۔

ہندوستان میں فارسی کا آغاز محمد غوری کے زمانہ سے ہی ہو گیا تھا۔ امراء و اراکین سلطنت کی مادری زبان فارسی تھی۔ ان میں سے بیشتر ادبی و شعری ذوق بھی رکھتے تھے، مگر اس کی حیثیت ثانوی سے زیادہ نہیں تھی، خلجی دورِ حکومت میں سلطنت کے استحکام کے ساتھ ساتھ، شعر و ادب کی طرف بھی باقاعدہ توجہ کی گئی۔ یہی زمانہ حضرت امیر خسرو کا تھا قدرت نے انھیں ایسی ہمہ گیر اور متنوع صلاحیتیں عطا کر دی تھیں، جنھوں نے خسرو کو، نہ صرف، اردو کا بلکہ، ہر دور کا، عبقری انسان اور عظیم ترین فنکار بنا دیا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے اپنے محبوب اور عزیز مرید، کے لیے اسی لئے تو فرمایا ہے ؎

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست
ملکیت ملک سخن آں خسرو راست
آں خسرو ماست، ناصر خسرو نیست
زیرا کہ خدائے ناصر خسرو ماست

خسرو کو بھی اپنے پیر سے والہانہ محبت و عقیدت تھی، ان کی محبت و شیفتگی کے سیکڑوں واقعات ایسے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خسرو کو اپنے پیر سے کتنا عشق تھا اور وہ ان کی خدمت و اطاعت کرنا اپنے لئے، دولت کونین سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ کوئی مفلوک الحال حضرت نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کی خدمت میں اپنی بپتا عرض کی، آپ نے اس کو اپنی پاپوش دے کر رخصت کر دیا بیچارہ بہت پچھتایا کرتا چلا آیا، پاپوش سے میری مفلسی اور پریشانی کیسے دور ہوگی،

اسی کشش و تیغ میں وہ دہلی سے روانہ ہوا ر راستہ میں ایک سرائے میں قیام کیا، اسی سرائے میں حضرت امیر خسرو آکر ٹھہرے مسافروں سے معلوم کیا کہ کوئی دہلی سے تو نہیں آیا ہے اس پریشان حال نے بتایا کہ میں آرہا ہوں، پوچھا کچھ لائے ہو، اس نے بڑی بے نیازی سے کہا کہ ہاں حضرت محبوب الٰہی کی پاپوش لایا ہوں، امیر خسرو بیچین ہوگئے۔ اس سے پاپوش مانگ کر اپنے سر پر رکھ لیں، اور ان پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی، جو کچھ مال و متاع، زر و جواہر تھے، سب اس کی نذر کر دیئے اور پاپوش سر پر رکھے ہوئے، دہلی کی طرف روانہ ہوگئے۔ محبوب الٰہی کی خدمت میں اسی بیخودی اور سرمستی کے عالم میں حاضر ہوئے۔ یہ تھی پیر سے محبت و عقیدت، اور یہ تھی محبوب الٰہی کی روحانیت، کہ ایک مفلوک الحال کو بظاہر کچھ نہ دے کر اتنا کچھ دے دیا کہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہی، اپنے مرید کے "سوز عشق" کی بڑی قدر کرتے تھے اور دعا فرماتے تھے کہ

"الٰہی بسوز سینۂ این ترک، مرا بہ بخش"

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر یہ جائز ہوتا تو میں یہ وصیت کر جاتا کہ خسرو کو میری قبر ہی میں دفن کرنا تاکہ ہم دونوں ہمیشہ ایک ساتھ رہیں۔

لیکن پیر نے اپنے چہیتے مرید کو ہمیشہ کے لئے اپنی پائنتی میں جگہ دی۔ جب حضرت محبوب الٰہی کا وصال ہوا اور اس کی خبر حضرت امیر خسرو کو معلوم ہوئی تو ان کا صبر و قرار رخصت ہوگیا۔ فوراً غم سے کپڑے چاک کر ڈالے اپنے چہرے پر سیاہی مل سے تابانہ خانقاہ کی طرف چل دیے، دروازہ پر پہونچے تو بڑے سوز سے یہ شعر پڑھا۔

این مکانیست کہ منزل گہ جاناں بودہ است
راہ آمد شد این سرو خراماں بودہ است

گریہ و زاری کرتے ہوئے اندر پہونچے، مزار مبارک دیکھا، اور کہا

"سبحان اللہ آفتاب در زیر زمیں و خسرو زندہ"

کل تک جس کے نورانی چہرہ کی زیارت کرکے، سرور باطنی حاصل ہوتا تھا، آج وہ روئے مبارک مزار کے اندر روپوش ہوگیا، غم مفارقت کی تاب نہ لا سکے عشق و محبت کی کشش نے بیخود کر دیا۔ اپنا سر مزار مبارک پر دے مارا، اور بڑے سوز و گداز کے ساتھ یہ دوہا پڑھا:۔

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے رین بھئی چہوں دیس

یہ چند بول، دل کی گہرائی سے نکلے تھے، الٰہی خدا جانے کتنی تاثیر تھی، کہ فضاؤں میں انھیں کی گونج سنائی دینے لگی، کتنا اعجاز تھا کہ آج بھی وہ کروڑوں دلوں کو متاثر اور آنکھوں کو پُرنم کر دیتے ہیں۔ اس ترک اللہ کے عرفان و عشق کی یہ کرامت ہے کہ محبوب الٰہی کا عرس مبارک، اسی دوہے سے شروع کیا جاتا ہے سامعین کی نظروں کے سامنے، پیر کی شفقت و محبت اور مرید کی عقیدت و وارفتگی کا منظر پیش کرکے ان کو روحانی کیف و سرور عطا کرتا ہے۔

محبوب الٰہی کے وصال کے بعد خسرو کا صبر و قرار رخصت ہوگیا، وہ ہر لمحہ اپنے پیر کی یاد میں مضطرب رہتے اور شمع کی طرح پگھلتے رہتے، انھوں نے اپنا تمام اثاثہ راہ خدا میں خیرات کر دیا، دنیا اور اس کے علائق سے کنارہ کشی

اختیار کرکے، ماتمی لباس پہن لیا، اور مزار مبارک پر آکر ایسے بیٹھ کر مرکر ہی اٹھے۔ مفارقت پیر میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے اور شب و روز آہ و زاری کیا کرتے تھے۔

چشمہائے عاشقاں را خواب نیست
یک زماں آں چشمہا، بے آب نیست
خواب را با دیدۂ عاشق چہ کار
چشم او چوں شمع باید اشکبار

آخر وہ ساعت آگئی جب خسرو کی مراد بر آئی، ہجر محبوب، وصل محبوب سے بدل گیا۔ ۸ ر شوال ۷۲۵ھ کو ان کی عارضی مفارقت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی ان کی بیقراری کو قرار آگیا۔ اور اپنے پیر کی پائنتی دفن ہوکر 'فنا فی الشیخ' ہونے کی مثال رہتی دنیا تک قائم کرگئے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خسرو کو خسرو سخن بنانے والا، یہی سوز عشق، کرب و اضطراب، درد و اثر، اور غم و گداز ہے، شاعری کا ملکہ فطری تھا، ذہانت و فطانت خدا داد تھی۔ قدرت نے انھیں 'جامع صفات و کمالات' بنایا تھا، بچپن ہی سے ان کی ذہانت، موزونی طبع، اور شیریں سخنی کے جوہر ظاہر ہونے لگے تھے، وہ خود لکھتے ہیں کہ:۔

"میرے والد مجھے مکتب بھیجا کرتے تھے لیکن میں ردیف اور قافیہ کے چکر ہی میں رہتا تھا۔ میرے قابل استاد سعد الدین محمد خطاط جو عام طور پر قاضی کے لقب سے مشہور تھے۔ مجھے خوش نویسی سکھانے کی کوشش کیا کرتے تھے لیکن میں مہ جبینوں کے خط کی تعریف میں شعر کہتا رہتا تھا اور اپنے استاد کی پوری کوشش کے باوجود طرۂ یار کی طرح دراز اور مسلسل تھی، میں زلف اور رخسار کے شوق سے باز نہ آتا تھا۔"[1]

شاعری میں انھوں نے پہلے اپنے بڑے بھائی اعز الدین علی شاہ سے مشورہ کیا، اس کے بعد خواجہ شمس الدین خوارزمی جو سلطان ناصر الدین محمود کے دربار میں سب سے بڑے عالم اور بلند پایہ شاعر تھے، کو اپنا کلام دکھانے لگے خسرو جیسے باکمال شاگرد پر خواجہ کی خاص شفقت تھی، خسرو نے استاد کی توجہ خصوصی اور اصلاح کے سلسلے میں لکھا ہے۔

دید ہر نکتہ را رقم بر رقم
رنج بر خود نہاد منت بہم
شمع من یافتہ ضیا از وے
مس من گشتہ کیمیا از وے
ہرچہ او گفت من نہادم گوش
بر کشیدم بکس شربت نوش
صد ہزار آفریں بر آں دل پاک
کہ بروں برد زیں چمن خاشاک
آنچہ او دید بس نہایت دید
خس و خارے ز گلشنے بر چید

خسرو نے "ہشت بہشت" اور دیوان غرۃ الکمال میں خواجہ کے فضل و کمال کی بہت تعریف کی ہے۔ فطری ملکۂ شاعری، خداداد ذہانت و تخیل، علمی و ادبی ماحول، باکمال استاد کی خصوصی توجہ اور پیر کی کیمیا اثر روحانیت بدرو، نظر نے خسرو کو وہ ہمہ گیری، اور شیریں سخنی عطا کی جس کی نظیر فارسی شاعری میں مشکل سے ملے گی۔ وہ

[1] دیباچہ تحفۃ الصغر

ہر صنف سخن پر قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ، مرثیہ کوئی صنف ہو خسرو کے انداز بیان نے اس کو ادب کا شاہکار بنا دیا۔ ان کی جدت پسند طبیعت، نکتہ شناس نظر اور مضمون آفریں عقل نے زبان و بیان کو حسن و جمال، رعنائی و زیبائی، دلکشی اور دلآویزی کا بے مثل پیکر اور دلکش مرقع بنا دیا۔ ان کے کلام میں فصاحت و بلاغت کے سارے محاسن بدرجہ اتم موجود ہیں، شاعری میں ان کی جدت و ندرت اور وسعت و جامعیت پر حیرت ہوتی ہے —

فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری، خاقانی، طالب، یقیناً اپنے اپنے رنگ میں باکمال استاد ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک نے کسی ایک ہی صنف میں اپنے کمالات کے جوہر دکھائے ہیں، اسی لئے یہ مشہور ہوگیا کہ

در شعر سہ تن پیمبرانند　　ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را　　فردوسی و انوری و سعدی

یہ سب شعرا ایران کے تھے اور اہل زبان تھے لیکن جامع صفات نہ تھے، خسرو ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی، ایسی ہمہ گیر طبیعت رکھتے تھے اور مذاق شاعری میں انھیں اتنا درک تھا کہ وہ "خسرو اقلیم معانی" اور بادشاہ جہاں شیریں زباں، تسلیم کئے گئے۔ امیر خسرو نے یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ اصناف سخن میں سے کس صنف میں کس شاعر کی پیروی کرتے ہیں :

غزل میں = سعدی کے
مثنوی میں = نظامی کے
قصیدے میں = خاقانی و سنائی، رضی الدین نیشاپوری اور کمال الدین اسماعیل کے

اپنی فارسی شاعری کے متعلق بھی انھوں نے اظہار خیال کیا ہے، اس رائے میں، ان کا انکسار نمایاں ہے ورنہ حقیقت میں ان کا فارسی کلام اس سے کہیں بہتر اور بالا تر ہے۔ غرۃ الکمال کے دیباچہ میں شاعر کی تین قسمیں لکھی ہیں :-

۱۔ استاد تمام : جو کسی خاص طرز کا موجد ہو۔
۲۔ استاد نیم تمام : جو خود کسی طرز خاص کا موجد تو نہ ہو لیکن اس کا پیرو ہو اور اس میں کمال بہم پہونچائے۔
۳۔ سارق : جو اوروں کے مضامین سرقہ کرے۔

اسی طرح استاد تمام کیلئے چار شرطیں لکھی ہیں۔
۱۔ طرز خاص کا موجد ہونا۔
۲۔ اس کا کلام شعرا کے انداز پر ہو۔
۳۔ صوفیوں اور واعظوں کے طریقہ پر نہ ہو۔
۴۔ غلطیاں اور لغزشیں نہ کرتا ہو۔

اپنی بابت وہ لکھتے ہیں کہ: "میں استاد نہیں ہوں اس لئے کہ چار شرطوں میں سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں یعنی میں سرقہ نہیں کرتا، اور میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر نہیں لیکن بقیہ دو شرطیں مجھ میں نہیں ہیں۔ اول تو میں کسی طرز خاص کا موجد نہیں دوسرے میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا۔

اس اعتراف کے باوجود خسرو کے کلام میں جتنے محاسن صوری و معنوی دونوں اعتبار سے پائے جاتے ہیں وہ کسی ایک فارسی کے شاعر میں نہیں ہیں۔

ان کے قصیدے فارسی شاعری کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ زور کلام، بندش الفاظ، علوئے تخیل

سے ان کے قصائد بھرے ہوئے ہیں۔ مولانا جامی نے
گو خسرو کو خاقانی کے قصائد کے ہم پلہ نہیں بتایا لیکن
غزل میں خاقانی سے بہتر بتایا ہے۔

"ہر چند در قصیدہ بپائے او نرسیدہ، اما
غزل را از وے گذرانیدہ"[1]

تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاتا، کہ
شکوہ الفاظ، ندرت بیان، اور جدت ادا میں
قصائد خسرو پر خاقانی و انوری رشک کر سکتے ہیں
قصیدے میں "گریز" پر اگر کمال حاصل نہ ہو، تو قصیدہ نگار
کامیاب نہیں ہو سکتا، اس نقطہ نظر سے خسرو کے
قصائد اپنی مثال آپ ہیں، خسرو کا دل "عشق و محبت"
کا گہوارہ تھا، وہ قصیدوں میں بھی بڑی خوبی سے محبت
بھرے نغمے سناتے ہیں۔

شیریں دہانِ یار کہ راحت بجاں دہد
آبِ حیات از آں لبِ شکر فشاں دہد
اینک ز کشتگان فراقت یکے منم
کس را مباد کاں لبِ شیریں زباں دہد
اے باغباں ز سوز دلِ بلبلاں بترس
گل را رہا مکن کہ صبا را عناں دہد

قصائد خسرو میں اخلاقیات اور عزتِ نفس کا
درس بھی دلنشیں انداز میں ملتا ہے ؎

مرد پنہاں در گلیمے بادشاہے عالم است
تیغ خفتہ در نیامے پاسبانِ کشور است
ناکس ار کس ہر کہ حرص مال دارد دوزخی است
عود و سرگیں ہر چہ در آتش فتد خاکستر است

زندگی مرد چیست خواب نہادن ز سر
پس چو بیروں رفت خواب پا ز نفس داشتن
ننگ فگندن بود در صفِ مردان عیب
دانۂ تسبیح را دام ہوس داشتن

اس قدرت و کمال کے باوجود خسرو کو سلاطین و
امراء کے لئے قصائد لکھنا بار خاطر ہوتا تھا ان کے نزدیک
اس نوع کی قصیدہ نگاری سے دل مردہ ہو جاتا ہے ؎

از گفتنِ مدح دل بمیرد شعر ار چہ تر و فصیح باشد
گردد ز نفس چراغ مردہ گر خود نفس مسیح باشد

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خسرو نے قصائد مصلحت
وقت کے پیشِ نظر لکھے کہ آن کی شاعری کا اصل میدان نہیں
تھا، ان کی فطری مناسبت "بیانِ دردِ محبت" سے تھی،
اور اس کے لئے غزل سب سے زیادہ موزوں صنف تھی،
اس لئے غزلوں میں ان کا کمالِ فن، پوری دلکشی و رعنائی،
اور زیبائی کے ساتھ نمایاں ہے غزل میں، خسرو نے شیخ
سعدی سے متاثر و مستفید ہونے کا اعتراف کیا ہے ؎

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از خمخانۂ سعدی کہ در شیراز بود

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

جلد سخنم دارد شیرازۂ شیرازی

شیخ سعدی بھی خسرو کو یگانۂ روزگار سمجھتے تھے سلطان
شہید حاکم ملتان نے شیخ سعدی سے درخواست کی کہ وہ
ہندوستان تشریف لائیں۔ شیخ سعدی نے ضعیفی کا عذر
کیا اور سلطان کو لکھا کہ:

"در ہند خسرو بس است"

شیخ سعدی کے علاوہ ایران کے دوسرے اساتذہ نے بھی

---

[1] بہارستان جامی

خسروؔ کو غزلگوئی میں صاحبِ کمال تسلیم کیا ہے۔ جامیؔ نے خسروؔ کی شیریں سخنی، قدرتِ بیان، اور جدّتِ ادا کی تعریف کی ہے، اور یہ اعتراف کیا ہے کہ ؎

جامی از خسروؔ ہمی گیرد طریقِ سوز و درد
طور او بود خیالات محال انگیختن

خواجہ حافظ شیرازی خسروؔ کو "طوطیِ ہند" کہتے ہیں ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زیں قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اسی شیریں بیانی نے عرفیؔ جیسے باکمال شاعر کو بھی یہ کہنے پر مجبور کیا ؎

بہ روحِ خسرو ازیں پارسی شکر دادم
کہ کامِ طوطیٔ ہندوستاں شود شیریں

"غزلیاتِ خسرو" اعلیٰ تخیل، سوز و گداز، والہانہ اندازِ بیان، دلکشی و رعنائی، تاثیر اور حلاوت کا مرقع ہیں۔ ان کا دل عشق و محبت سے سرشار ہے۔ غمِ محبوب ان کا عزیز ترین سرمایۂ حیات ہے، کرب و اضطراب، کسک اور تڑپ کی وہ مجسم تصویر ہیں۔ 'یادِ محبوب' ان کا دن رات کا مشغلہ، یہی جذبات و احساسات، جب الفاظ کے پیکر اور شعر کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو سخت سے سخت دل بھی متاثر ہوکر بےچین ہوجاتے ہیں۔ کس سوز و گداز کے ساتھ، والہانہ انداز میں اپنی آرزو کا اظہار کر رہے ہیں ؎

دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا
تنم از بیدلی بیچارہ شد، بیچارہ تر بادا
گر اے زاہد دعائے خیر می گوئی مرا، ایں گو
کہ آں آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادا
چو با تر دامنی خو کردہ خسروؔ با دو چشمِ تر
بآبِ چشمِ مژگاں دامنش ہموارہ تر بادا

ان کا محبوب حسن و جمال میں بے مثل و بےمثال ہے کائنات کی حسین سے حسین چیز بھی اس کی گرد کو نہیں پہونچتی خسروؔ حیران ہیں کہ 'جمالِ محبوب' کو تشبیہ دیں تو کس سے دیں؟ ؎

مہش گویم ولیکن مہ سخن گفتن نمی داند
گلش گویم ولیکن گل گہر سفتن نمی داند

گر مہ چو تو با جمال باشد | خورشید کم از ہلال باشد
بر زد رخِ زیں نظیر رویت | در آئینہ ہم خیال باشد
جانا چو توئی دگر نیاید | مردم ز تو خوب تر نیاید
ہم رنگ رخت سمن نگیرد | ہم تنگ لبت شکر نیاید

اے گل صفت حسنت بر وجہ حسن گویم
سر تا بقدم جانے، کفر است کہ تن گویم
زلفے کہ از او آید بوئے چو دمِ عیسیٰ
بس فکر خطا باشد گر مشک ختن گویم
پیراہن خود گلہا سازند قبا در خوں
گر از رخِ جاں بخشت وصفے بہ چمن گویم

فراقِ محبوب میں خسروؔ اتنے زیادہ بے اختیار و بیخود ہوجاتے ہیں کہ انھیں دنیا و ما فیہا کی خبر نہیں رہتی، ان کی بےچینی اور بےقراری، انھیں محویت کے عالم میں محبوب کے پاس پہونچا دیتی ہے اور خسروؔ اس سے اپنی دل کی ایک ایک خلش بیان کرنے لگتے ہیں۔ مکالمہ کا یہ انداز بڑا دلنشیں ہے ؎

گفتم کہ "ترا آخر دل خانہ نمی باید؟"
گفتا کہ "بے گنجم ویرانہ نمی باید"
گفتم کہ "بسوزم جاں بر آتشِ روئے تو"
گفتا کہ "چراغم را پروانہ نمی باید"

گفتم کہ "منم محرم در مجلس خاص تو"
گفتا کہ "حریف ما دیوانہ نمی باید"
گفتم کہ "بدام غم ہر لحظہ مرا مفگن"
گفتا کہ "چنیں مرغے بے دانہ نمی باید"
گفتم کہ "زعشقم دہ پروانۂ آزادی"
گفتا "خط عارض بس پروانہ نمی باید"
گفتم کہ "بود مونس در ہجر تو خسرو را"
گفتا کہ "خیال ما بیگانہ نمی باید"

مکالمت کا یہ والہانہ انداز، خسرو کی سیکڑوں غزلوں میں پایا جاتا ہے۔ خسرو کی غزل نغمات محبت کا مرقع ہے۔ وہ خود فنا فی المحبت والمحبوب، ہیں۔ ان کو محبوب کی ہر ادا پیاری معلوم ہوتی ہے۔ اس کا ہر ستم ان کے لئے کرم ہے۔ وہ اس کے تغافل پر بھی ناز کرتے ہیں۔ ان کے یہاں شگفتگیٔ محبت اور جور محبوب کا ذکر، بڑے دل نشیں انداز میں ملتا ہے ؎

دل ز تن بردی و در جانی ہنوز
درد ہا دادی، و درمانی ہنوز
آشکارا سینہ ام بشگافتی
ہم چناں در سینہ پنہانی ہنوز
ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز
ما ز گریہ چوں نمک بگداختیم
تو بہ خندہ شکرستانی ہنوز
پیری و شاہد پرستی ناخوش است
خسروا تا کے پریشانی ہنوز

خسرو کو حسن و عشق کے معاملات و حادثات کے بیان کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ ان کی غزلوں میں جذبات اور واردات کی بھرپور ترجمانی پائی جاتی ہے۔ ناز حسن و نیاز عشق، سرمستی و سرشاری کی جیسی دلکش تصویر، ان کی غزل ہے۔ سعدی کے علاوہ کسی اور فارسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی ؎

نہ بے یادت برآید یک دم از من
نہ بے رویت جدا گردد غم از من
دلم را خون تو می ریزی و ترسم
کہ خواہی خوں بہائے دل ہم از من
مرا از ہر کہ دیدی بیش کشتی
مگر کس را نمی بینی کم از من

خسرو نے غزلیات میں واقعہ گوئی کی بنیاد ڈالی مولانا آزاد بلگرامی نے خزانہ عامرہ میں لکھا ہے:

"اما ناسخ نقوش معنوی، امیر خسرو دہلوی کہ معاصر شیخ سعدی ست، بانیِ وقوع گوئی گردید و اساس آں را بلند ساخت"

بہ یارے سوئے من آمد بشوخی دل ز من بستد
بدو گفتم چہ خواہی کرد گفتا کار می آید
چو رفتم بر درش بسیار دربان گفت کایں مسکیں
گرفتار است گوئی کایں طرف بسیار می آید
نشستی در دل و گوئی کہ دل در من نہاں کردی
نمی دانی کہ آخر بر دلم ایں بار می آید

خسرو کی ہر غزل جدّت اسلوب و ندرت بیان کی مرقع ہے ؎

گلستاں نسیم سحر یافتہ است
صبا غنچہ را خفتہ در یافتہ است
چناں خواب دیدہ است نرگس بخواب
کہ گویا یکے جام زر یافتہ است

فلک نگر کہ چہ خط کرد بر جریدۂ حسن
جفا درست و وفا داریت خطا آموخت؟
جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی
ز غمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

مے میان شیشۂ ساقی نگر　　آتشے گویا کہ آب آلودہ اند

پیش تو خواہیم کہ آہے کنیم　　آہ کہ آں ہم نتوانیم کرد

خسرو نے تصوف کے رموز و نکات، آفاقی و ابدی صداقتیں، انسانیت کی اعلیٰ قدریں، بڑی سادگی و دلکشی کے ساتھ غزلوں میں بیان کی ہیں ؎

ہیچ کس نیست کہ او را بہ جہاں دردے نیست
وانکہ درویش نہ باشد بہ جہاں ہیچ کس نیست
صوفی ما دعویٰ پرہیزگاری می کند
باش تا ساقی مستاں روئے خود بنمایدش
ہستیٔ من رفت و خیالش نماند
ایں کہ تو بینی نہ منم بلکہ اوست
بسکہ پروانہ شود سوختۂ شمع ز عشق
عارف از سوختگی عاشق پروانہ شود

دلم جز کوئے تو مسکن نداند
تماشائے گل و گلشن نداند
حدیث درد با افسردگاں نیست
کہ ایں رہ دل شناسد تن نداند
خدایا دوست کامش دار، ہر چند
کہ درد خسرو آں دشمن نداند

خسرو کی غزل تسلسل خیال، ربط اور ہم آہنگی کا حسین پیکر ہے، وہ بڑے دلکش انداز میں اپنے درد نہاں کا اظہار کرتے ہیں، محبوب سے ایک لمحہ بھی جدا رہنا ان کے لئے قیامت ہے، نظارۂ جمالِ یار سے محرومی، انھیں ماہی بے آب کی طرح تڑپاتی ہے، ایک ایک سے وہ اپنے محبوب کی کیفیت بے قرار ہو کر دریافت کرتے ہیں صبا کو مخاطب کرکے کس والہانہ انداز میں کہہ رہے ہیں ؎

اے صبا باز بگوئی کہ جاناں چوں است
آں گل تازۂ واں غنچۂ خنداں چوں است
با کہ مے می خورد آں ظالم و در مے خوردن
آں رخ پرخوی و آں زلف پریشاں چوں است
چشم باہوش کہ ہشیار نہ باشد مست است
چشم میگونش کہ دیوانہ کند آں چوں است
روئے در زلف بت عیار کہ آں ہر دو خوش اند
دلِ دیوانۂ من پہلوئے ایشاں چوں است
ہم بجان و سر جاناں کہ کم و بیش مگوئے
گو ہمیں یک سخن راست کہ جاناں چوں است

محبت میں جیسے اور جتنے احساسات وجذبات پیدا ہوتے ہیں، اور دل و دماغ کو بے چین رکھتے ہیں ایک ایک پل، جس عالم کرب میں گزرتا ہے، خسرو نے ان سب کی بدرجہ اتم ترجمانی کی ہے۔ انھیں عشق صادق کے اثر ہونے کا یقین ہے وہ جانتے ہیں کہ "عشق اول در دل معشوق پیدا می شود" وہ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ محبوب بھی مفارقت میں تڑپ رہا ہے اور "دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی" لیکن دل کو قرار نہیں آتا، صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک جاتا ہے بیخودی میں اپنے پیدا کرنے والے سے عرض کرنے لگتے ہیں

کہ وہ دانا و بینا ہے اور سب کے حالات جانتا ہے۔

یارب اندر دل جدا کہ آں گل خنداں چو نست
ماہ تاباں من اندر شب ہجراں چو نست

من چو یعقوب از گریہ شدہ ام دیدہ سفید
آخر آں یوسف گم گشتہ بزنداں چو نست

من در ینجا خاک بزندانِ غم اندر دوریِ او
او ز من دور، بصحرا و بیاباں چو نست

درد فراق کی شدت نے اب یہ حال بنا دیا ہے

جاں ز ہجرت جیست زار افتادہ اے
دل ز عشقت بے قرار افتادہ اے

من کیم ذرہ حزینے بے دلے
غم خورے، بے غم گسار افتادہ اے

جاں غریبے بے نصیبے از حبیب
دور از یار و دیار افتادہ اے

مبتلائے بے نوائے در بلا
جاں نثارے، دل فگار افتادہ اے

پائے در گل، دست بر دل، سر بہ پیش
رفتہ عزت، سخت خوار افتادہ اے

بے دلے، بے دلبرے، بے مونسے
بے زر و بے زور، زار افتادہ اے

لیکن ملاقات محبوب کے خیال سے ہی خسرو سرمستی و سرشاری، مسرت و انبساط کے جذبات سے از خود رفتہ ہو جاتے ہیں۔

خرم آں روزے کہ من با دوست کارے داشتم
با وصال او بہ شادی روزگارے داشتم

داشتم بارے از یں اندیشہ کامد جاں بروں
بر زباں راندمی آرم کہ یارے داشتم

خوش نیاید کایم از خانہ بروں کایں خانہ را
دوست می دارم کہ دردے دوستدارے داشتم

نیست رنجے گر شوم از غم ہوشد و رنج ست و بس
کاں ز تار موئے خوباں یادگارے داشتم

عشق گوید "خسرو اوقتے دلی خوش داشتی"
ایں زماں چوں نیست چوں گویم کہ آمے داشتم"

مختصر یہ کہ خسرو نے غزل میں شیخ سعدیؒ کی پیروی کرتے ہوئے بھی اپنی جامعیت و انفرادیت قائم رکھی، زبان کی شیرینی اور بیان کی دلآویزی، سوز و گداز اور درد و کرب، سادگی و پرکاری، معاملہ بندی و سراپا نگاری، وارفتگی و وارفتگی، خودداری عشق و تمنا کی حسن اور واردات دل کی ترجمانی نے غزل کو عشق و محبت کا تاج محل بنا دیا ہے۔ غزلیات خسرو، فارسی ادب کا ایسا شیریں، صاف اور شفاف سرچشمہ ہے جس کی شیرینی اور روانی چمنستان شاعری اور دلدادگان شعر و سخن کو ہمیشہ مستفیض کرتی رہے گی۔

غزل کی طرح خسرو کو مثنوی نگاری میں بھی وہ کمال حاصل تھا جس کی مثال فارسی شاعری میں مشکل سے ملے گی۔ نظامی کو فارسی کا بہترین مثنوی نگار تسلیم کیا گیا ہے خسرو نے بھی نظامی کی پیروی کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے خمسۂ نظامی کے طرز پر تین سال کی قلیل مدت میں ایک خمسہ لکھا خمسۂ نظامی اور خمسۂ خسرو کی مثنویوں کا موضوع بھی تقریباً ایک ہے، خسرو نے مثنویوں کے ناموں میں بھی زیادہ تبدیلی نہیں کی۔

خمسۂ نظامی	خمسۂ خسرو
۱۔ مخزن الاسرار	۲۔ مطلع الانوار

۲۔ خسرو و شیریں ۲۔ شیریں و خسرو
۳۔ لیلیٰ و مجنوں ۳۔ مجنوں و لیلےٰ
۴۔ اسکندر نامہ ۴۔ آئینہ سکندری
۵۔ ہفت پیکر ۵۔ ہشت بہشت

خسرو نے ان پانچوں مثنویوں کی تصنیف اسی ترتیب سے کی ہے، فرماتے ہیں ؎

داری اول بگنبد دوار | روشنائی ز مطلع الانوار
کردی آنگہ بانشاط تمام | شہد شیریں و خسرو اندر جام
باز در عالم خردمندی | شور مجنوں و لیلیٰ افگندی
پس وہاں پُر دُر دُرے کردی | شرح راز سکندری کردی
دیں زماں کز جواہر انجم | می نگاری صحیفۂ انجم
پس تو لیسم ز کلک مشک سرشت | نام این ہشت خانہ ہشت بہشت

یہ پانچوں مثنویاں، گنجینۂ عشق و محبت، اور صحیفۂ تصوف و معرفت ہیں، ان میں اخلاق و مذہب، حسن و عشق، رزم و بزم، پند و موعظت، عبرت و بصیرت وغیرہ کو بڑی خوبی، روانی اور سلاست و دلکشی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ہزاروں اشعار ضرب المثل کی حیثیت سے مشہور ہو چکے ہیں: ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | خطبۂ قدس ست بہ ملک قدیم
بار کہ در صحبت از انساں گزیں | کز تو خردمند شود ہم نشیں
خداوندا دلم را چشم بکشائے | بمعراج یقینم راہ بنمائے
عالم ز تو شد بحکمت آباد | حکمت ز تو یافت آدمی زاد
خدایا جہاں پادشاہی تراست | ز ما خدمت آید خدائی تراست
یکے خورد در خواب نان و کباب | یکے را نیاید خود از نان و خواب
اے کتابندہ خزانۂ جود | نقش پیوندگار گاہ وجود
بودنی را ہمیشہ بود از تو | بُود تا بُود را وجود از تو

خسرو نے "خمسہ خسرو" سے قبل مثنوی قرآن السعدین معز الدین کیقباد کی فرمائش پر صرف ۶ ماہ کی قلیل مدت میں لکھی۔ مثنویوں میں خسرو کا یہ نقش اول بھی، بعض حیثیتوں سے منفرد و بے مثال ہے۔

سلطان جلال الدین فیروز شاہ کی تخت نشینی کے پہلے سال کے حالات پر مشتمل خسرو نے مثنوی مفتاح الفتوح لکھی، یہ تاریخی مثنوی ہے۔ جس میں حالات واقعات کی جزئیات نگاری میں کمال دکھایا ہے۔ ایک اور تاریخی مثنوی تغلق نامہ ہے جس میں سلطان غیاث الدین تغلق کے حالات و فتوحات کا بیان ہے۔ خسرو نے کہیں بھی تاریخی حقائق کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ عشقیہ مثنویوں میں "مثنوی خضر خاں و دول رانی" حسن و عشق کی سچی داستان ہونے کی وجہ سے بڑی موثر اور دلکش ہے۔ خسرو نے جذبات حسن و عشق کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے حقیقت نگاری، وصف نگاری اور جزئیات نگاری سے یہ مثنوی سہ آتشہ بن گئی ہے۔

علاء الدین خلجی کی خواہش پر خسرو نے مثنوی نہ سپہر لکھی، اس مثنوی پر سلطان نے خسرو کو گرانقدر انعام دیا۔ خسرو نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے ؎

چنیں بخششے کز تو جسم یافتم
ز شاہان پیشینہ کم یافتم

اس مثنوی کے سپہر سوم میں خسرو نے ہندوستان کو ہر حیثیت سے تمام دنیا سے افضل ثابت کیا ہے خسرو کو اپنے وطن سے محبت ہی نہیں عشق تھا۔ یہ جذبہ اتنی شدت اختیار کرتا گیا کہ انھیں اپنے وطن ہندوستان کی ہر چیز، حسن و خوبی میں یکتا و بے مثل معلوم ہونے لگی۔ یہ مثنوی خسرو کے کلام کی بے ساختگی و روانی، اسلوب کی دلکشی و جدت اور الفاظ کی مناسبت کا بہترین مرقع ہے۔

خسرو کی مثنویوں میں، زبان و بیان کی ہر خوبی موجود ہے۔ مناظر فطرت کی مصوری، واقعات کے جزئیات کی تفصیل تسلسل بیان، جدت و ندرت، جذبات انسانی کی عکاسی نفسیات کا صحیح ادراک، طرفہ آفرینی، اختراع کی کرشمہ سازی ان مثنویوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

خسرو قصائد، غزل اور مثنویات ہی میں یگانہ و منفرد نہیں تھے بلکہ مرثیے رباعیات و قطعات میں بھی۔ انکے مرثیے غم کا تاج محل ہیں۔ سلطان محمد اور اختیار الدین خاں کی موت پر انکے مرثیے غم و الم کا مرقع ہیں۔ سلطان محمد کی موت، تاتاریوں کا ظلم و ستم، اہل ملتان کی گریہ و زاری اور ملتان کی تباہی و بربادی کو اتنے درد انگیز اور مؤثر انداز میں بیان کیا ہے کہ سخت سے سخت دل بھی پگھل جاتا ہے۔

واقعہ است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید
آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید
راہ در بینا و عالم داد سیل فتنہ زا
رخنۂ کامسال در ہندوستاں آمد پدید
مجلس یاراں پریشاں شد چوں برگ گل زباد
برگ ریزی گوئی اندر گلستاں آمد پدید
بسکہ آب چشم خلقے شد رواں در چار سو
پنج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید

سلطان جلال الدین خلجی کے بیٹے اختیار الدین خان خاناں کی موت پر، خسرو کو دلی صدمہ ہوا۔ انھوں نے ایک دردناک مرثیہ لکھا۔ ایک ایک لفظ سے انکے درد و کرب اور غم و الم کی کیفیت معلوم ہوتی ہے ؎

چہ روز است ایں کہ خورشید تاباں را نمی بینم
دگر شب شد چرا ماہ درخشاں را نمی بینم
دو روز است کہ اندر ابر ماندہ آفتاب من
کہ اندر چشمہا جز ابر و باراں را نمی بینم
نگین خاتم شاہی بہ کان سنگ پنہاں شد
دلم چوں لعل خوں شد زاں سبب کاں را نمی بینم

خسرو کے قطعات و رباعیات، تصوف و معرفت، مذہب و اخلاق، حکمت و موعظت کا لافانی سرمایہ ہے ؎

زا فسردگاں مجو اثر زندگی دل
نے از مزاج ظالم سوزندہ خوے خوش
نے مشعلہ بر آتش لالہ تواں فروخت
نے از گل چراغ تواں یافت بوے خوش

ایک اور قطعہ میں فرماتے ہیں ؎

روشن دلاں صاف دروں را خلل بود
در کار خلق چشم کشادن بخیر و شر
پوشیدہ نیست نزد ہمہ کس کہ طاس را
سوراخ عیب باشد و غربال را ہنر

رباعیاں معرفت و تصوف کا گنجینہ ہیں ؎

از غیر محمد ار نداری خبرے
کن از رہ عقل در شہادت نظرے
اشہد و محمد ست پیوستہ بہم
یعنی کہ میان ایشاں نہ گنجید دگرے

جاناں منشیں بر گزرے تیزی آہ
آتش رسدت ز آتش انگیزی آہ
تا در سر کوے تو نہ پنداری سہل
شب گردی گریہ و سحر خیزی آہ

غالبؔ نے کہا تھا ؎

حسنِ فروغِ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

خسرو مجسم سوز و گداز تھے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہی کے چہیتے مرید، سرور کائنات کے سچے شیدائی،

خالق کائنات کے مقبول بندے، علوم دنیوی و دینی دونوں کے عالم باعمل تھے، مولانا عبدالماجد دریا بادی کے الفاظ میں:

"عارفوں کا سردار، شاعروں کا تاجدار، شعر و ادب کے دیوان اس کی ادبی عظمت کے گواہ ہیں، خانقاہیں اور سجادے اس کے مرتبہ روحانی سے آگاہ، سر مشاعرہ آجائے تو میر محفل اسے پائیے۔ خاندان چشتیہ اہل بہشت کے کوچے میں آنکلے تو حلقہ ذکر و فکر میں سر مسند جلوہ اس کا دیکھئے۔ اچھے اچھے شیخ دم اس کا بھر رہے ہیں، معرفت و طریقت کے خرقہ پوش کلمہ انکے نام کا پڑھ رہے ہیں۔"

'حمد و نعت و منقبت' میں خسرو کو خصوصیت حاصل ہے، ان کا دل و دماغ، عرفان الٰہی اور عشق رسول کا مخزن ہے۔ اپنے پیر سے انھیں جو محبت و عقیدت تھی، وہ اظہر من الشمس ہے، سچ مچ وہ فنا فی الشیخ ہو چکے تھے وہ "با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ خالق کائنات کی حمد و ثنا کرنا، انسان کے بس کی بات نہیں۔ امیر مینائی نے کیا خوب کہا ہے ؂

بشر سے حمد الٰہی امیر نا ممکن
یہ بار اٹھائے کہاں حوصلہ پرائی کا

حضرت امیر خسرو عجز و انکسار کے اعتراف کے ساتھ کہہ رہے ہیں ؂

اے ز خیال ما بروں در تو خیال کے رسد
با صفت تو عقل را لاف کمال کے رسد
گر ہمہ مردم و ملک خاک شوند بر درت
دامن عزت ترا گرد زوال کے رسد
زاں چمنے کہ بلبلش روح قدس نمی سزد
گلخنیان خاک را بوئے وصال کے رسد

نعت میں عقیدت و محبت کے جذبات، ادب و احترام کے ساتھ بیان کرتے ہیں ؂

زہے روشن ز رویت چشم بینش
وجودت کیمیائے آفرینش
رسل را ذات تست آں خاتم جبت
کہ قرآں آمدہ نقش نگینش
لبش چوں انگبیں ریزہ در افتد
ملائک چوں ملک درانگبینش

ایک اور نعت میں لکھتے ہیں :-

جز خدا کس قدر تو نشناخت زانکہ
کس خدا را ہمچو تو نشناختہ
عاصیان زرد رو را کردگار
از برائے روئے تو بنواختہ
بندہ خسرو تا نویسد نعت تو
ز آتش دل جان خود بگداختہ

اسی آتش دل کی ترجمانی نے کلام خسرو کو "خسرو کلام" بنا دیا، ان کا کلام بہشت بہل نگینہ ہے جس کی آب و تاب جنت نگاہ، روح پرور، حیات بخش اور ایمان افروز ہے۔ اور جس کی زبان میں اتنی شیرینی، حلاوت اور گھلاوٹ ہے کہ بڑے بڑے با کمال مشاہیر سخن نے اس سے فیض حاصل کرنے پر فخر کیا ہے۔ غالب نے خسرو کو "اقلیم سخن کا کیخسرو" کہا اور اپنے کلام کو مزیدار بنانے کے لئے یہ حقیقت پسند اعتراف بھی۔

اقلیم سخن کے کیخسرو کی شیریں سخنی کے متعلق ہی ہو سکتا ہے ؂

غالب مرے کلام میں کیونکر مزہ نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے "خسرو شیریں سخن" کے پاؤں

خود خسرو نے اپنے کو "خسرو شیریں زباں" کہا ہے ؂

بہ باغ مجلس خود ہم چو بلبل
نگہ کن خسرو شیریں زباں را

شعبۂ فارسی
ڈاکٹر آصفہ زمانی لکھنؤ یونیورسٹی

امیر خسرو اور نعت گوئی

"نعت" کے لغوی معنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف بیان کرنے کے ہیں۔ یہ وہ صنف سخن ہے جس کا تعلق براہ راست قلب سے ہوتا ہے۔ یہاں دماغی کاوش کا گزر نہیں نعت گو خوبصورت الفاظ کے پھندوں میں نہیں پڑتا۔ نہ ہی اندازِ بیان کا افسوں ہی درکار ہے، بلکہ یہ وہ مقام ہے جہاں ایک والہانہ انداز اور قلبی کیف و سرور اور وجدانی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جب اس قسم کے تاثر سے شاعر سرشار ہوتا ہے تو پھر وہ اشعار وجود میں آتے ہیں جو از دل خیزد بر دل ریزد کے صحیح طور پر مصداق ہوتے ہیں۔ یہاں دل رہبر کا کام انجام دیتا ہے اور عقل رہنما بن جاتی ہے۔

نعت، شعر و ادب کی سب سے سنجیدہ اور نازک صنف سخن ہے۔ یہ راستہ اتنا دشوار گذار ہے کہ عرفی جیسا عظیم المرتبت شاعر بھی اس راستہ پر چلتے ہوئے ایک بار جھجک اٹھا اور یوں گویا ہوا ؎

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا ست
آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را

(ترجمہ) (عرفی جلدی مت کرو یہ نعت کا میدان ہے کوئی صحرا نہیں۔ آہستہ چلو کیونکہ نعت کہنا گویا تلوار کی دھار پر چلنا ہے)

بیشک اس راستہ کی ہر منزل اگر پُر نور ہے تو ذرا سی لغزش پُر نار بھی ہو سکتی ہے۔ بقول مرزا مائل دہلوی ؎

راہ عشق مصطفیٰؐ دشوار ہے دشوار ہے
ہر قدم پُر نور ہے اور ہر قدم پر نار ہے

یہاں اسلوب بھی اتنا ہی بلند و برتر ہونا چاہیئے۔ جتنی وہ ذاتِ اقدس عالی و ارفع ہے۔ عرفی ہی کی زبان سے سنئے ؎

ہشدار کہ نتواں بہ یک آہنگ سرودن
نعتِ شہ کونینؐ و مدیح کئے و جم را

(ترجمہ) (ہوشیار ہو کہ ایک ہی لہجے میں عرب و عجم کے شہنشاہ (رسول اکرمؐ) اور دنیاوی ممدوحین کیکاؤس اور جمشید جیسے بادشاہوں کی مدح کرنا نہیں ممکن)

وہ ذاتِ اقدس جو شہِ کونینؐ ہے اُس کی ..... مدح کرنے والے کے لئے اگر زمانہ مسند جم کو نئے سرے سے سجائے تو وہ بھی شہنشاہ عرب و عجم کی مسند آرائی کرنے سے

قاصر ہے ؎

دوران کہ بود تا کند آرائشِ مسند ؟
مداحِ شہنشاہِ عرب را و عجم را

(ترجمہ) (زمانہ کی کیا مجال ہے کہ شہنشاہِ عرب و عجم کے مداح کے لئے مسند آرائی کرے)۔

رسول کریمؐ کی ذاتِ گرامی اور آپ کا پیغامِ حق، کائنات کے لئے کیا مقام رکھتا ہے۔ یہ موضوع اسقدر وسیع ہے کہ آج چودہ سو سال تک لاکھوں تصانیف کا موضوع رہنے کے بعد بھی پوری طرح تعریف و مدح سے تشنہ ہے۔ آپ کی ذاتِ اقدس ایسی جامع الصفات ہے جس کو قلم کی گرفت میں مکمل طور سے لایا ہی نہیں جا سکتا، جو عربی فارسی اور اردو کے لاکھوں شعرا کا موضوع بنتی رہی اور تا ابد یہ سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا۔

عربی زبان کے مایۂ ناز شاعر حساّن ابن ثابت، عبداللہ بن رواحہ۔ اور کعب بن زہیر کا کلام عشقِ رسولؐ کا صحیح آئینہ دار ہے۔ یہ عشقِ رسولؐ ہی تھا جس نے انکے فن کو وہ بلندیاں عطا کیں جو ایک کامل وجدان اور ذوقِ اکمل رکھنے والے ہی شخص کو نصیب ہو سکتی ہیں۔ حسان ابن ثابت کا شمار مخضرمی شعراء میں ہوتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا حساّن کفارِ قریش کے مظالم کا جواب ہجو سے دو روح القدس تمہاری مدد فرمائیگے۔ حساّن ابن ثابت نے فرمایا میں آپکی ذاتِ اقدس کو اسطرح نکال لونگا جس طرح گندھے آٹے سے بال۔ اس شاعرِ رسولؐ کے مدحیہ اشعار بے مثال ہیں۔ ذیل کے اشعار میں "احسن" اور "اجمل" کی رعایت قابلِ غور ہے ؎

وَاَحْسَنُ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِي
وَاَجْمَلُ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

(ترجمہ:- میری آنکھ نے آپ سے زیادہ حسین کسی کو نہیں دیکھا اور آپ سے زیادہ جمیل کسی جمیل کو کسی عورت نے نہیں پیدا کیا)

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ
كَاَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

(ترجمہ:- آپ پیدا کیئے گئے تمام برائیوں سے پاک و صاف گویا کہ آپ اپنی مرضی کے مطابق پیدا ہوئے)۔

اور اب کعب ابن زہیر کے اس قصیدے پر نظر کیجئے جو عربی ادب میں "قصیدہ بانت سعاد" یا "قصیدۂ بُردہ" کے نام سے مشہور ہے۔ خاص طور پر اس کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے جس پر شاعر کو رسول کریمؐ نے اپنی ردائے مبارک انعام کے طور پر مرحمت فرمائی ؎

اِنَّ الرَّسُولَ لَنُورٌ يُسْتَضَاءُ بِهٖ
مُهَنَّدٌ مِنْ سُيُوفِ الْهِنْدِ مَسْلُولُ

(ترجمہ:- بے شک، رسولؐ یقیناً نور ہیں کہ جن کے ذریعہ روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ آپ ہندوستان کی برہنہ تلواروں میں سے ایک بے نیام تلوار ہیں)۔

یہ وہ شعر ہے جس پر حضور کریمؐ نے اصلاح بھی فرمائی اور "سیوف الہند" کی جگہ "سیوف اللہ" کی اصلاح کرکے شعر کو فرش سے عرش پر پہونچا دیا۔ اس اصلاح کے بعد اہلِ ذوق خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپکی صفتِ عالمگیری جو محدود ہوئی جاتی تھی صرف ایک لفظ کے رد و بدل سے کس پایہ کو پہونچ گئی۔

یہ وہ ابتدائی نقوش ہیں جو نعتِ رسولؐ میں عرب شعرا نے پیش کیے۔ بعد کو نہ صرف عرب بلکہ ایران و ہندوستان نے ان نقوش کو خوب سے خوب تر بنالیا۔ حافظ۔ جامی۔ سعدی۔ عرفی۔ غالب و اقبال کی روح اس میدان میں

اور نکھر آئی ہے اس سلسلہ میں حسان العجم خاقانی کا نام توصیفِ اول میں رکھا جاسکتا ہے جو زیارتِ رسولؐ کے موقع پر جان کا تحفہ لیکر حاضر ہوتا ہے ؎

پاسباں گفتا چہ داری؟ نو رہا گفتم شما
کان زر دارید و من جاں نو رہا آوردہ ام

(ترجمہ:- پاسباں نے پوچھا یہاں آئے ہو تو کوئی تحفہ بھی لائے ہو، میں نے عرض کیا کان زر ذات اقدس۔ تو آپکے پاس ہے میرے پاس جان کے علاوہ کیا تحفہ تھا وہی لیکر آیا ہوں)۔

جہاں تک امیر خسروؔ کے یہاں مدح رسولؐ کا سوال ہے۔ اگرچہ تعداد میں کم سہی لیکن جو کچھ بھی ہے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے عقیدت کے پھول ہیں جس کی خوشبو سے روح وجد کرنے لگتی ہے۔ خسروؔ کے خمیر میں ابتدا ہی سے تصوف کچھ ایسا رچ بس گیا تھا اور اپنے پیر و مرشد نظام الدین اولیاؒ کے حلقۂ ارادت میں سلوک و طریقت، ریاضت و درویشی کی تعلیم نے کچھ ایسا سحر کر رکھا تھا کہ انکی روح بچپن ہی سے مذہب کی طرف ایک بے چین کشش رکھتی تھی۔ بنظر غور دیکھا جائے تو مذہب اور فنونِ لطیفہ کا گہرا تعلق ہے خواہ وہ مصوری ہو یا نقاشی، رقص ہو یا موسیقی ان سب فنون میں دوسرے رشتوں کی بہ نسبت مذہبی عقیدہ زیادہ کارفرما رہا ہے اور ہر اعلیٰ ادب کے پسِ پشت روح مذہب کی کارفرمائی نسبتاً زیادہ رہی ہے۔ خواہ وہ ایلورا اور اجنتا کی تصاویر ہوں یا مہابھارت اور رامائن کی کتھا، میرا بائی کے بھجن ہوں یا انیسؔ کے مرثیے، بحیثیت ایک اعلیٰ فن کے انکے پسِ پشت روحِ مذہب محرکات کا کام کرتی رہی ہے۔ خسروؔ کی ہشت پہل شخصیت میں جہاں وہ بیک وقت فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں میں لاکھوں[۱] اشعار کی صورت میں اپنی روح کو بے نقاب کرتے نظر آتے ہیں اور اصنافِ سخن کی ہر زلف کو سنوارتے ہیں وہاں نعت گوئی میں بھی اپنی ذہانتِ طبع کی دھوم مچا دیتے ہیں۔ نظم سخن کی ہر صنف میں خاقانی۔ نظامی اور سعدی ہمیشہ انکے پیش نظر رہتے ہیں۔

خسروؔ نے اگرچہ متعدد بادشاہوں کا زمانہ دیکھا (عہد بلبن سے لیکر غیاث الدین تغلق تک) اور ان کے دربار سے وابستہ رہے لیکن رعونت اور بے جا تکبر انکے قریب نہیں پھٹکا امیر[۲] کے لقب سے نوازے گئے۔ بادشاہوں کی صبحیں انکی نئی غزل سے شروع ہوتیں اور انکی شامیں انکی نئی غزل کی لے پر ختم ہوتیں۔ پھر بھی انھوں نے دنیا کے جاہ و جلال کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ بلکہ لاکھوں طلائی سکوں کے عوض مرشد کی جوتیوں کو سر سے لگا لینے میں ہمیشہ فخر سمجھا۔ دولت شاہ سمرقندی رقمطراز ہے کہ وہ اپنی دولت و حشمت کی زندگی سے بیزار تھے آخری زمانے میں تو درباری ملازمت سے علٰحدگی چاہتے رہے۔ اور آخر ملازمت ترک کرنے کے

---

[۱] سلطان حسین بایسنقر نے اپنے ایک شاعر ندیم سیفی کو یہ کام سونپا تھا کہ وہ خسروؔ کی تمام منظوم تصانیف جمع کرکے انھیں احتیاط سے نقل کرلے اس نے برسوں میں ایک لاکھ تیس ہزار اشعار جمع کئے اور جب پتہ چلا کہ تنہا فارسی میں امیر کے کلام کا چوتھائی حصہ ہے تو ہمت ہار دی۔
(بحوالۂ رسالہ "آجکل" نومبر ۱۹۷۲ء دہلی۔ مضمون ظ انصاری "امیر خسروؒ کے غیر ملکی قدرداں")

[۲] جلال الدین خلجی نے جس وقت انھیں اپنا ندیم خاص بنایا اور مصحف داری کا امین بنایا اسوقت "امیر" کے خطاب سے سرفراز کیا "امیر خسرو" "عہد فن اور شخصیت" ص۱۸
(عرش ملسیانی)

بعد فقراء کی خدمت میں لگ گئے اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کو اپنا پیر و مرشد مان کر زندگی سلوک و طریقت میں گذار دی — یہ تھا خسرو کا کردار ایسے میں جب وہ مدح رسول کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو یہ الفاظ ادا کرتے ہیں ؎

حرص بہ خاکت کشد شارعِ دیں گیر ازآنک
بے روشِ مصطفیٰ راہ بر افلاک نیست

(ترجمہ :۔ لالچ تجھے پستی کی طرف لے جائے گا اسلئے دین کا راستہ اختیار کرو کیونکہ حضرت محمدؐ کی روش کے بغیر آسمانوں کی بلندیوں تک پرواز نہیں ممکن)۔

چشمِ من و پائے شرع گرچہ کہ حیف ست ازآنک
خاکِ رہِ مصطفیٰ بے بصرے را دہند

(ترجمہ :۔ میری آنکھیں اور بانیٔ شریعتؐ کے پائے مبارک کا کوئی جوڑ نہیں لیکن اس کا جواز صرف یہ نکلتا ہے کہ حضرت مصطفیٰ کے راستے کی مٹی اندھوں کو دی جاتی ہے کہ ان میں بصارت پیدا ہو جائے) ؎

از ظلماتِ عدم راہ کہ بردے بروں
گر نہ شدے نورِ تو شمع روان ہمہ

(ترجمہ :۔ اگر آپکا نور سب کی روحوں کی روشنی نہ بنجاتا تو عدم کی تاریکیوں سے کوئی شخص قدم باہر نہ نکال سکتا)

یہ حقیقت مسلم ہے کہ جذبات و احساسات اپنے عہد کے اتار چڑھاؤ سے برانگیختہ ہوتے ہیں۔ خسرو کا عہد وہ عہد تھا جہاں روز ایک عروج کو پستی کا منہ دیکھنا پڑتا، ان دنیاوی حادثات کا انکے احساس ذہن نے گہرا اثر قبول کیا۔ ہر بڑا فنکار دوسرے عام آدمیوں سے زیادہ سریع الحس ہوتا ہے۔ خسرو نے ۱۲۵۳ء سے ۱۳۲۵ء تک کئی اتار چڑھاؤ دیکھے، ان اختلافات زمانہ نے انکے طبع نازک پر تازیانے کا کام کیا۔ ان کو اگر نجات کا ذریعہ اور سکون قلب کا راستہ نظر آیا تو پائے مصطفیٰ ہی میں ؎

خاک رہ عاشقاں سرمۂ چشم است لیک
چون کنم از دست چوں دیدۂ من پاک نیست

(ترجمہ :۔ عاشقوں کے راستے کی مٹی آنکھوں کے لئے سرمہ ہے لیکن میں اسے کیسے حاصل کروں جبکہ میری آنکھیں خود پاک ہیں)۔

خسرو کی ہمہ رنگ شخصیت کے ہر پہلو سے ناقدین نے پردے اُٹھائے ہیں لیکن مدح رسولؐ سے وہ کیونکر عہدہ برآ ہوئے ہیں اس پر لوگوں نے کم توجہ دی، حالانکہ یہی وہ اصلی کسوٹی ہے جس سے کوئی شخص صحیح معنوں آنکا جاسکتا ہے، اسلئے کہ بادشاہوں کی مدح سے تو دنیاوی جاہ و منصب، عزت و احترام سبھی کچھ خریدا جاسکتا ہے، لیکن کسی شخص کا نعتیہ کلام ایک ایسا کلام ہے جہاں دنیاوی صلہ کا گذر نہیں، جو خالص دل کا معاملہ ہے، جہاں روح کو بالیدگی حاصل ہو رہی ہے اور امیر خسرو نے اس راہ گذر کو انتہائی کامیابی کے ساتھ سر کیا ہے۔ یہاں عقیدت و احترام بھی ہے احتیاط و پابندی بھی ہے، آداب عاشقی سے بھی واقف ہیں۔ وہ یوں کہ ممدوحیت کو محبوبیت کا درجہ نہیں دیتے۔ یعنی تغزل کا رنگ لانے کے بجائے خالص شریعت کے دائرے میں محدود نظر آتے ہیں۔ کہیں پر بھی قرآنی تعلیمات سے تجاوز نہیں کرتے۔ حدود عقائد کی صحت (Authencity) کا ہر وقت لحاظ ہے ؎

پیش رو[1] کوکبۂ انبیا
کوکبش از منزلتِ کبریا

(ترجمہ :۔ نبیوں کے ستاروں کے پیش رو، اور انکا ستارہ بارگاہِ

---

[1] تذکرۃ الشعراء ص۱۰۶

[1] قرآن السعدین

خداوندی سے تعلق رکھنے والا ہے)۔ ؎

خاتمش از ہفت فلک حلقہ ساز
یافتہ از مہر نبوت طراز

(ترجمہ:۔ انکی انگوٹھی ساتوں آسمانوں کو اپنے حلقہ میں لئے ہوئے ہے۔ اور اسپر نبوت کی مُہر کا نقش ہے)۔

ختم نبوت شدہ برہانِ او
مصحفِ ختم آمدہ درشانِ او

(ترجمہ:۔ خاتم النبیین ہونا ہی انکی سب سے بڑی دلیل ہے۔ قرآنِ پاک آخری کتاب کے طور پر انھیں کی خدمت میں پیش ہوا)۔

نور نخستش چو علم برکشید
شامِ عدم را سحر آمد پدید

(ترجمہ:۔ اُنکا اولین نور جب بلند ہوا تو عدم کی شام صبح میں تبدیل ہوگئی)۔

خسرو ادب شناسِ محبت تھے لہٰذا "سنتِ عشاق" سے صحیح معنوں میں واقف تھے ؎

سنتِ عشاق نیست دل بہ ہوس داشتن
قالبِ خاکی چو باد ہمرہِ خس داشتن

(ترجمہ:۔ عاشقوں کا طریقہ حرص کرنا نہیں ہے۔ خاکی جسم کو ہوا کی طرح خس و خاشاک کے ساتھ ڈال دینا بھی انکا شیوہ نہیں)

خسرو کے نعتیہ کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کہیں بربے جا مبالغہ اور غلو کی حدوں کو پار کرکے اغراق تک پہونچنے کی کوشش نہیں کرتے حالانکہ ڈاکٹر سید عبداللہ قصیدے میں مبالغہ کو اسکی برائی نہیں سمجھتے انکا کہنا ہے کہ "قصیدے میں اگر مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے تو اُصولاً اسمیں کوئی خاص برائی نہیں کیونکہ اس میدان میں شاعر ایک لحاظ سے متحیر اور ششدر کر دینے والے استعجاب کو اُبھارتا ہے جس سے اُسے رعب اور دہشت کا اثر پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہ مبالغے کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔"

خسرو نے نبی کریمؐ کی ذات کو حیثیات اور معمہ کبھی نہیں بنایا آپ بھی ہماری ہی طرح ایک انسان تھے۔ انما انا بشر مثلکم کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے۔ نائب حق کے تصور کو فوق البشر کا درجہ دینے سے احتراز کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یکسر شان میں قصیدہ خواں ہیں لیکن متانت و شائستگی (Sobriety) کا دامن ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹتا۔

احمد مرسل کہ ز چرخ علو یافتہ
نامۂ تلک الرسل فضل ازو یافتہ

(ترجمہ:۔ احمد مرسلؐ جن سے آسمانوں کو بلندی حاصل ہوئی۔ تلک الرسل کا مکتوب انھیں کی فضیلت ظاہر کرتا ہے)۔

موضوع کے اعتبار سے جدّت (Innovation) بھی ہے ساتھ ہی ساتھ تخلیقی شان (Creative beauty) بھی نمایاں ہے۔ اور زبان کا تو کہنا ہی کیا گویا تسنیم و کوثر کی دھلی زبان استعمال کرتے ہیں، تعجب ہوتا ہے کہ یہ آج سے ساڑھے چھ سو سال پہلے کی زبان ہے؟ کمیت (quantity) میں کیفیت (quality) کا اندازہ کرنا ہو تو خسرو کے ان مدحیہ اشعار پر نظر کیجئے جو مدح رسولؐ میں ہیں انھوں نے خونِ جگر سے گلستانِ سخن کی آبیاری کی ہے۔

شعرائے قدیم کا ایک دستور یہ بھی رہا ہے کہ وہ اپنے دیوان کی ابتدا عموماً حمد، نعت یا منقبت سے کرتے تھے، چنانچہ خسرو نے بھی بحیثیت صنف کے اس کو کہیں نہیں برتا، یا تو اپنے دیوان اور خمسہ کی ابتدا حمد و نعت سے کرتے ہیں یا جب

۱؎ ترکی کے شہر "انکارہ" کے کتب خانہ میں ایک مذہب قلمی نسخہ جو ۱۳۶۷ء میں شیراز میں لکھا گیا تھا۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

دل پر اداسیوں کے مہیب سائے منڈلاتے ہیں تو وہ آپکے سایۂ عاطفت میں تسکین پانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ "ایک اچھے شعر کے لئے تین خصوصیات کا اہتمام ضروری ہے۔ فکر، جذبا ور قدرتِ بیان" فکر خواہ کیسی ہی ہو جذبات کا لگاؤ بہرحال ہوتا ہے اور جذبہ خواہ خوشی کا ہو یا غم کا۔ خسروؔ کی فکر عمیق جب مدح رسولؐ کے جذبہ سے سرشار ہوتی ہے اسوقت انکی بے پناہ قدرتِ بیان یوں جوش میں آتی ہے کہ نطق خود انکی زبان کے بوسے لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور فصاحت و بلاغت انکے قدم چومنے کے لئے بیچین ہو جاتی ہے۔

زہے روشن زردیت چشم بینش
وجودت کیمیائے آفرینش

(ترجمہ:۔ کیا کہنا آپکے روئے روشن سے نگاہیں روشن ہو گئیں اور آپکا وجود دنیا کے لئے کیمیا کا درجہ رکھتا ہے)۔

رسل را ذات تست آں خاتم جست
کہ قرآں آمدہ نقشِ نگینش

(ترجمہ:۔ آپکی ذات رسولوں کے خانوادے سے ہے اور آپکی انگوٹھی پر نقشِ قرآنی ہے)۔

رسالت اور توحید دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ بیشتر شعراء ان دونوں میں فرق نہیں رکھتے۔ خسروؔ جہاں حمد باریتعالیٰ میں رطب اللسان ہیں وہاں انکا رنگ کچھ اسطرح ہے ؎

اے ز خیالِ ما بروں در تو خیال کے رسد؟
با صفتِ تو عقل را لافِ کمال کے رسد؟

(ترجمہ:۔ اے وہ کہ جو ہمارے خیالوں سے ماوراء ہے اور تجھ تک ہمارے خیال کی رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔ اور تیری صفات کا ادراک عقل کے لئے کیسے ممکن ہے عقل انکے بارے میں حصولِ کمال کا دعویٰ کیسے کر سکتی ہے)۔ یا ؎

زباں کہ بر درِ معنی کلید گفتار ست
ز بہر شکر و سپاس یکے جہاں دارست

(ترجمہ:۔ زباں جو معنی کے دروازے پر گفتگو کی کنجی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک مالک ارض و سما کے شکر و سپاس کے لئے بنائی گئی ہے)۔ اور جہاں نعت رسولؐ فرماتے ہیں وہاں اُنکی شوخی یوں نمایاں ہوتی ہے ؎

مرا زیں نعت "سلطانِ سخن" خواندہمی گردوں
زہے سلطانِ خسروؔ گر شہ آں خواند مسکینت

(ترجمہ:۔ اس نعت گوئی کیوجہ سے زمانہ مجھے سلطانِ سخن کہتا ہے سلطان کہنا کیا ہی بڑی بات ہے اے خسروؔ اگر مجھے تیرے دروازے کا مسکین و گدا بھی کہا جاتا تو بہتر تھا)۔۔ اقلیم نعت گوئی کے اس تاجدار نے جہاں دوسرے اصناف سخن سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوا ہے۔ جسکی قدرت بیان کو اہلِ ایران و توران تک نے سراہا ہے۔ اس نازک میدان کو بھی جس پر چلنا تلوار کی دھار پر چلنے سے کسی طرح کم نہیں، اپنی خداداد صلاحیت اور ذہن رسا سے خوب طے کیا ہے واقعی جس پر خود اسی کا مصرع صادق آتا ہے

بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگری

(بقیہ نوٹ ملاحظہ ہو) موجود ہے جس کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے ؎

حمد رانم بر زباں للہ رب العالمین

اس کے بعد گیارہ غزلیں ہیں جو حمد و نعت سے متعلق ہیں۔ انکی ترتیب اس غزل سے ہوتی ہے ؎

اے باد برقع بر فگن زاں روئی آتشناک را
وی دیدہ گر صفرا زنم آبی بزن ایں خاک را

(بحوالہ مضمون ڈاکٹر امیر حسن عابدی "امیر خسرو کی نادر تصنیفات ترکی میں" رسالہ "آجکل" امیر خسرو نمبر۔ نومبر ۱۹۷۴ء)

ڈاکٹر صفدر علی بیگ
ریڈر شعبۂ نفسیات، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

امیر خسرو کی صوفیانہ شاعری

صوفیوں کے عقیدے میں خدا کی ذات ہی سب سے اہم ترین ہے جس کے تصور میں انسان مستغرق ہو جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ انسانی عقل کے بس سے باہر ہے کہ وہ خدا کو سمجھ سکے اور اس کی تعریف و تحدید کر سکے۔ دماغِ انسانی زمان و مکان میں محدود ہے اس لئے جو شئے زمان و مکان کے حدود سے ماورا ہو، اس تک اس کی رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔ خسرو کا دعویٰ ہے کہ ذہن و دماغ سے خدا کو سمجھنا خارج از امکان ہے ؎

حکیم گفت شناسم بہ عقل یزداں را
زہے کمال حماقت و ایں چہ گفتار است

فلسفی نے کہا کہ میں خدا کو عقل سے پہچانتا ہوں کیا کہنے اس حماقت کے اور اس بات کے بے تکے پن کے۔ کیا کہوں خدا سے مخاطب ہو کر دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

در نیائی بہ فہم عالمیاں
در نہ گنجی بہ وہم آدمیاں۔

اے خدا تو دنیا والوں کی عقل و فہم میں نہیں آسکتا نہ تو انسانوں کے وہم میں محدود ہو سکتا ہے۔

آدمی خود ہی ایک پُراسرار مخلوق ہے اسکی روح اور روحانی طاقت بصیرت و وجدان، استعداد و صلاحیت حقیقتِ ابدی سے اس کا رشتہ اور بہت سی ایسی باتیں ہیں جنھوں اسے ایک معمّہ بنا رکھا ہے۔ عبدالکریم جیلی کے الفاظ میں انسان خود اپنے اندر ایک پُراسرار دنیا ہے جو باوجود اعلیٰ دماغی قوتوں کے جب وہ اپنے آپ کو سمجھنے سے قاصر ہے تو پھر اسکے لئے خدا کا ادراک کیسے ممکن ہے۔ امیر خسرو کہتے ہیں ؎

آنکہ خود را شناخت نتواند
آفرینندہ را کجا داند؟

جو انسان اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکتا وہ اپنے پیدا کرنے والے کو کہاں جان سکتا ہے۔

خود نمائی حسن کا جبلّی تقاضہ ہے وہ حیران آنکھوں تحسین آمیز نظروں، محبت کرنے والے دل اور پرستش کرنیوالی روح کی تلاش میں رہتا ہے، اور مسلسل آرائشِ جمال میں

مصروف رہتا ہے تاکہ اپنے عاشق کو ہمیشہ لبھاتا رجھاتا رہے
حسن ربانی یا حسن کا منتہا بھی اپنے حسن کی نمائش اکثر اور
دائمی طور پر دلوں کو جیتنے کے لئے کرتا رہتا ہے۔ اب
امیر خسرو کا نظریہ ان کے اشعار میں ملاحظہ کیجئے ؎

جمال مطلق آمد جلوه آہنگ
مقید گشت یک رنگی بصد رنگ

جب وہ جمال مطلق جلوہ نما ہوا تو اس کی وحدت یکرنگی
سیکڑوں متنوع رنگوں میں آ گئی ؎

چوں جمالت آیت رحمت شد اندر شان خلق
آخر ایں چندیں زہجر کشتم تاویل چیست

جب خلق میں تیرا جمال رحمت کی نشانی ہے تو پھر جو میں تاب نظارہ
نہ لا کے قتل ہو گیا اس کا سبب کیا ہے ؎

منادی کرد حسن جلوه مشتاق
کہ ایک درد ما کو جان عاشق

وہ حسن جو جلوہ نمائی کے لئے بیتاب تھا اس نے منادی کرا دی
ہے کہ میں بس اسی عاشق کا مشتاق ہوں جو جان کا نذرانہ دے۔
ربانی حسن انسان کی تشنگی کو بڑھاتا ہے اس کا سبب خود
اس کا میلان ظہور ہے۔ مگر وہ کبھی خود کو مکمل آشکار نہیں کرتا
خسرو شکایت کرتے ہیں ؎

رخ چہ پوشی چوں حدیث حسن تو پنہاں نماند
گل بصد پرده درا داز بوئے خود مستور نیست

اے خدا جب تیرے حسن کا چرچا گلی گلی ہے تو تیرے منہ چھپانے
سے فائدہ؟ پھول ہزار پردوں میں نہاں رہے مگر اپنی مہک
کی وجہ سے چھپ نہیں سکتا۔

حسن حقیقی نہ تو خود کو پوشیدہ ہی رکھ سکتا ہے نہ
مکمل بے حجاب ہو سکتا ہے کیونکہ اگر آشکار ہو جائے تو ہر سالس
سینے میں رک جائے اور ہر آنکھ ہمیشہ کے لئے پھٹی کی پھٹی رہ جائے
حضرت امیر خسرو کہتے ہیں ؎

چہ پوشی پرده بر روئی کہ آں پنہاں نمی ماند
وگر بے پرده می داری تنی را جاں نمی ماند

خدایا وہ چہرہ جو چھپ نہیں سکتا اس پر پردہ ڈالنے سے
حاصل؟ مگر تو بالکل بے پردہ بھی تو ہو نہیں سکتا کیونکہ اگر
ایسا ہوا تو سب کی روح تن سے نکل جائے گی۔
ہاں اگر خدا اپنے حسن بے پایاں کو بے حجاب کر دے تو
پیغمبر بھی غش کھا کے گر پڑیں اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔
امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

مسیح و خضر را آں روئی نمائی
بکش جانم مرا گر زنده مانند

امیر خسرو کا عشق

کائنات کا حسن ہر فرد بشر کو مسحور کر لیتا ہے اس کا دل
موہ لیتا ہے۔ اور ہر کس و ناکس اس کی چاہ و الفت میں پھنس جاتا
ہے۔ سادہ و پرکار۔ عاقل و دانا، زیرک و بے وقوف، سبھی اسکے
عاشق ہیں۔ تاہم اہل بصیرت جانتے ہیں کہ نہ تو اس کا حسن دائمی
ہے نہ اس کی یہ کشش و جاذبیت ہی مستقل ہے۔ مادی شے مسرور کن
تو ہوتی ہے مگر لمحاتی طور پر بلکہ یہ اکثر دکھ رنج و محن اور مایوسی
کا سبب ہوتی ہے۔ تاہم صوفیا کہتے ہیں کہ پہلے آدمی کو فطرت کی
اس آنی جانی حسن سے اور فانی انسان سے محبت کرنا سیکھنا چاہیے
کیونکہ کائنات کا حسن اور اسکی محبت ہی حسن کی کائنات کل (خدا)
کی محبت کی سمت قدم اٹھاتی ہے۔ عبدالرحمٰن جامی کہتے ہیں ؎

متاب از عشق رو گرچہ مجازاست
کہ آں بہر حقیقی کارسازاست

عشق مجازی سے نہ کترا ؤ کہ یہی مجازی عشق تو عشق حقیقی کا زینہ ہے۔ محبت میں لو لگاتا ناگزیر ہے اور جب کوئی شخص کسی مرئی صورت سے لو لگاتا ہے تو اس کا دل و دماغ غیر مرئی حسن کو حاصل کرنے کے لئے تجربہ کار ہو جاتا ہے مشاہدہ میں آنے والی شے کی محبت ہی حسن نادیدہ کی محبت کا راستہ ہموار کرتی ہے۔ مگر یہ جبھی ممکن ہوگا کہ انسان اس فانی حسن کی محبت کو وسیلہ و ذریعہ ہی قرار دے نہ کہ منزل آخر یا خاتمہ۔ خسروؒ کا دعویٰ ہے فانی حسن کی محبت کے توسل سے آدمی کی رسائی حسنِ ازل تک ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کی محبت خالص پاک و پرخلوص ہو؎

آنکہ ز حق پاکی چشمش عطا ست
منع ز رخسار بتانش خطا ست

جس کسی کو منجانب اللہ نظر کی پارسائی عطا ہو گئی ہو اسے معشوقوں کے رخسار کو چومنے سے منع کرنا گناہ ہے۔

اس کے علاوہ ایک دوسری حقیقت یہ بھی ہے کہ حسنِ مجازی کے عشق میں ناکامیاب ہو جانے والا عاشق اکثر حسنِ حقیقی کی طرف لپکتا ہے حسنِ ازل اس مایوس و نا امید روح کو جو حسنِ مجازی کی محبت میں دیوانہ ہو گیا ہے تسلی و تشفی دیتا ہے اور اسے دائمی مسرت و بے انتہا خوشی کی طرف کھینچ لاتا ہے۔ افلاطون کے قول کے مطابق حسنِ مطلق کے عاشق کو نئی اور درخشاں زندگی بطور انعام ملتی ہے جس میں وہ مادی زندگی کے درد و الم کو بھول کر نظارۂ حسنِ مطلق کا لطف اٹھاتا ہے اور ایسی خوشی پاتا ہے جو ہر خوشی سے اعلیٰ و ارفع ہوتی ہے۔ خسرو خدا سے کہتے ہیں؎

تا تو نمودی جمال نقش ہمہ نیکواں
رفت بروں از دلم نقش تو از جاں نہ رفت

جب تو جلوہ نما ہوا تو تمام حسینوں کے نقوش جمال میرے دل سے معدوم ہو گئے مگر تیرا نقش دلفریب میری جان میں جم کر رہ گیا۔

حسن محبت کا جنم داتا اور محبت، زندگی کا حسن ہے چاہے وہ حسین خیالات ہوں یا عمل و کردار بقول افلاطون محبت ایک ملہمانہ دیوانگی ہے اور خدا کی ایک خوبصورت بخشش جو انسانیت کے لئے برکت و سعادت اور اخلاقیات کا سرچشمہ ہے ایک شخص کی خدا تک رسائی صرف محبت ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ محبت کنندگان خدا کی بارگاہ میں ایک اعلیٰ رتبہ رکھتے ہیں۔ خواجہ بندہ نواز کے عقیدے کے بموجب دو عالم پر محبت کی حکمرانی ہے یہی محبت کائنات کی روح ہے اور وہ سوائے خدا کے کچھ اور نہیں؎

عقل درد سر است ازیں معنی
عارفاں عاشقِ جنوں باشد

معرفت جنون سے حاصل ہوتی ہے ہوش سے نہیں۔ عارفانِ عشق جنون کے بندے ہوتے ہیں۔ اس طرح عقل فقط درد سر بن کے رہ جاتی ہے۔

عشق خداوندی رفتہ رفتہ انسان کو فنا فی اللہ کر دیتی ہے اور وہ اپنی جبلت اور اس کے تقاضوں سے آزاد ہو جاتے ہیں پھر وہ خدا کی درگاہ میں ..... آگسٹائن کے یوں فریادی ہوتا ہے۔

"خدایا میری ہڈیوں کو اپنی محبت میں شرابور کر دے"

جب تو نے ہمیں اپنے لئے بنایا ہے تو پھر ہمارے دلوں کو تیرے سوا کوئی سکون نہیں دے سکتا۔

عظیم امام حضرت زین العابدینؓ جو فرماتے ہیں:۔

"خدایا! میں نے تیری تمنا میں سب کچھ تج دیا ہے اور مجھے بس

اب تیری ہی چاہ ہے کیونکہ ایسا نادان کون ہوگا جو تیرے عشق کا لذت آشنا ہونے کے بعد ماسوا کی محبت کا خیال بھی کرے اور تیرے جوار میں آجانے کے بعد کون ہے جو دوسری طرف رخ کرے تو عشاق کا مدعا و مطلوب ہے میں تجھی سے تیری محبت کی بھیک مانگتا ہوں۔"

ان مدارج سے گذر کر عاشق اپنے محبوب خدا کو شب و روز اور ہمہ وقت اپنے سامنے نگراں و استادہ پاتا ہے۔ جو ہر لمحہ اس کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا ہو اور بغلگیر ہونے کے لئے باہیں پھیلائے ہو۔

پیغمبر، امام، صوفیا اور اہل باطن خدا کی محبت میں خود کو نفس کشی اور ایثار کا مجسمہ بنا لیتے ہیں۔ اور جو شخص خود کو مٹا دیتا ہے وہ رضا و توکل کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ توکل کی شدت اسے ہر ذاتی و نجی مطلب سے دست کش کر دیتی ہے اور وہ زندگی کے ہاتھوں میں ایک مردہ کی مثال ہو جاتا ہے۔

امیر خسروؒ خدا سے خطاب کرتے ہیں ؎

اثرے نماند باقی ز من اندر آرزویت
چہ کنم چو سیر دیدن نتواں رخ نکویت

"خدایا تیری آرزو کی شدت نے میرے اندر زندگی کا کوئی اثر باقی ہی نہیں رکھا اب اور میں کیا کروں جبکہ تیرے روئے خوب کو جی بھر کے دیکھنا بھی ممکن نہیں۔"

سلسلہ روحانی امیر خسرو رح

خواجہ ابو احمد ابدال چشتی

ولادت ۲۶۰ھ | ۳۵۵ھ وفات

عثمان ہارونی

" ۵۳۰ھ | ۶۰۴ یا ۶۱۷ھ "

خواجہ معین الدین اجمیری

" ۵۳۷ھ | ۶۲۳ھ "

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح

| ۶۳۳ "

خواجہ فرید الدین گنج شکر رح (بابا فرید)

| ۶۶۴ھ "

محمد نظام الدین سلطان الاولیاء بدایونی ابن احمد غزنوی ثم بدایونی ابن علی دانیال بخاری

۶۳۴ھ | ۷۲۵ھ

امیر خسرو رح

۶۵۲ھ | ۷۲۵ھ

ڈاکٹر سلام سندیلوی

امیر خسرو کی حیات اور شاعری

اگر فارسی شاعری میں کوئی "طوطیٔ ہند" پیدا ہوا تو وہ امیر خسرو ہیں۔ اگر خاکِ ہند سے کوئی "شکر سخن" ابھرا تو وہ امیر خسرو ہیں۔ اور اگر عرفی جیسے خوددار شاعر نے کسی کی روح کو شکر پیش کی تو وہ امیر خسرو ہیں۔ ان کی فارسی دانی کا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان کے مشہور اردو شاعر غالب نے ان کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ غالب نے چودھری عبدالغفور کو ایک خط میں لکھا ہے :-

"ہندوستان کے سخن وروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ کے سوا کوئی استادِ مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ خسرو کیخسروِ قلمروِ سخن طرازی ہے۔"

"امیر خسرو ترکستان کے ایک قبیلہ لاچین سے تعلق رکھتے تھے۔ انکے والد سیف الدین محمود اس قبیلے کے سردار تھے جب چنگیز خاں نے ترکستان پر حملہ کیا تو ان کے والد صاحب ہندوستان میں محمد تغلق کے عہد میں تشریف لائے۔ محمد تغلق نے ان کو ایک اعلیٰ عہدہ پر مامور کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ ایک جنگ میں شہید ہو گئے۔

امیر خسرو ۶۵۲ھ میں پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کو امیر سیف الدین محمود ایک خرقے میں لپیٹ کر کسی مجذوب کے پاس لے گئے۔ مجذوب نے امیر خسرو کو دیکھ کر کہا کہ یہ خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو فارسی کے اساتذہ کے مقابل میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

ابتدا میں امیر خسرو نے خوش نویسی کی تعلیم مولانا سعدالدین خطاط سے حاصل کی مگر اُن کو اس فن سے لگاؤ نہیں تھا بلکہ وہ شاعری کی طرف رجحان رکھتے تھے چنانچہ وہ بچپن ہی سے شعر موزوں کرنے لگے۔ انکے بچپن کے اشعار کو جب اُس دَور کے استادِ سخن خواجہ عزیزالدین نے سنا تو وہ حیرت زدہ ہو گئے۔

رفتہ رفتہ امیر خسرو کی شاعری کی شہرت دھوپ اور چاندنی کی طرح ہندوستان کے مختلف گوشوں میں پھیلنے لگی ان کی شہرت سے متاثر ہو کر غیاث الدین بلبن کے درباری امیر کتلو خاں نے ان کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ اسکے بعد

انھوں نے غیاث الدین بلبن کے بیٹے بغرا خاں کی ملازمت اختیار کی جو لکھنوتی کا حاکم تھا۔ جب امیر خسرو دہلی واپس آئے تو سلطان خاں شہید کے ملازم ہو کر ملتان چلے گئے۔ پھر وہ دو سال تک اودھ کے حاکم خان جہاں کے ملازم رہے مگر ماں کی محبت ان کو دہلی کھینچ لائی۔ جب کیقباد بادشاہ ہوا تو اس نے بھی اپنے دربار میں امیر خسروؒ کو جگہ دی۔ اور اسی کی فرمائش سے انھوں نے قرآن السعدین مثنوی کہی۔

جب خلجی خاندان کی حکومت قائم ہوئی تو امیر خسرو نے جلال الدین خلجی کے دربار میں ملازمت حاصل کر لی۔ جلال الدین خلجی کے قتل کے بعد علاء الدین خلجی تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی امیر خسروؒ کی بڑی قدر کی۔ علاء الدین خلجی کا بیٹا قطب الدین مبارک جب بادشاہ ہوا تو امیر خسروؒ نے اس کے نام پر "نہ سپہر" مثنوی کہی۔ اس مثنوی سے بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اور امیر خسروؒ کو ہاتھی کے برابر تول کر روپے دیئے۔

جب غیاث الدین تغلق نے دہلی کی حکومت سنبھالی تو اس نے امیر خسروؒ کی بہت قدر کی۔ امیر خسروؒ نے اس کے نام پر "تغلق نامہ" لکھا جس میں تغلق خاندان کے حالات بہت تفصیل سے پیش کئے۔ غرضیکہ امیر خسروؒ نے ہر بادشاہ کے زمانے میں عزت حاصل کی۔

امیر خسروؒ کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ انکی شخصیت کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ان کی شاعری ہے۔ انھوں نے غزل گوئی کے فن کو خاص طور سے ترقی دی۔ اور اس وادی میں ایران کے مشہور شاعر سعدی کو اپنا رہبر بنایا۔ اس کے باوجود امیر خسروؒ کی شاعری میں ہندوستانی عناصر شامل ہیں۔ اسی لئے ان کے اسلوب کو "سبک ہندی" کہتے ہیں۔

امیر خسروؒ نے بھی قصائد پر بھی طبع آزمائی کی ہے چونکہ انھوں نے غلام خاندان، خلجی خاندان، اور تغلق خاندان کے بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا اور انکے دربار سے وابستہ رہے تھے۔ اسلئے انھوں نے مختلف بادشاہوں کی شان میں قصیدے کہے ہیں۔

امیر خسروؒ نے مثنویوں کی بھی تخلیق کی ہے۔ قرآن السعدین۔ مطلع الانوار۔ شیریں خسرو۔ آئینہ سکندری۔ لیلیٰ مجنوں۔ ہشت بہشت۔ تاج الفتوح۔ نہ سپہر اور دول رانی ان کی مشہور مثنویاں ہیں۔

امیر خسروؒ کی رباعیات بھی کافی مقبول ہوئی ہیں خاص طور سے پیشہ وروں کے بارے میں ان کی رباعیات کافی دلکش ہیں۔ چنانچہ انھوں نے درصفت حجام پسر۔ درصفت قصاب پسر۔ درصفت کاہ فروش بچہ۔ درصفت گازر بچہ۔ درصفت بزاز پسر اور درصفت نعل بند پسر وغیرہ۔ رباعیاں کہی ہیں۔

امیر خسروؒ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک بزرگ صوفی بھی تھے۔ انھوں نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ امیر خسروؒ نے تصوف کی منزلیں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے چراغ معرفت کی روشنی میں طے کیں۔ وہ خواجہ صاحب سے بیحد عقیدت رکھتے تھے اور خواجہ صاحب بھی اُن پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ جب امیر خسرو بنگال میں تھے۔ اسوقت انکو خواجہ صاحب کے وصال کی خبر ملی۔ وہ فوراً دہلی واپس آئے۔ ماتمی سیاہ لباس پہنا۔ اور اپنے مرشد کے مزار شریف کے مجاور بن گئے مگر وہ اپنے پیر طریقت کی جدائی کو برداشت نہ کرسکے۔ اور چھ ماہ کے بعد ۷۲۵ھ میں انتقال فرما گئے۔

امیر خسروؔ صرف قرطاس و قلم ہی کے مالک نہیں تھے۔ بلکہ وہ تیر و تیغ میں بھی ماہر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی جنگ کا وقت آیا تو انھوں نے شمشیر کے بھی جوہر دکھائے۔ جب غیاث الدین بلبن کا بیٹا سلطان محمد قاآن ملتان کا حاکم ہوا تو وہ امیر خسروؔ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اسی دوران میں تیمور خاں بیس ہزار سواروں کے ہمراہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ وہ لاہور اور دیپال پور کو فتح کر کے ملتان کی طرف بڑھا۔ سلطان محمد نے تیمور خاں کو جنگ میں شکست دی اسی اثنار میں ظہر کی نماز کا وقت آ گیا۔ سلطان محمد اپنے لشکریوں کے ساتھ نماز میں مشغول ہو گیا۔ اس موقع پر تاتاریوں نے اس پر حملہ کر دیا اور اس کو قتل کر دیا۔ تاریخ ہند میں سلطان محمد کو "خان شہید" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس جنگ میں امیر خسروؔ بھی شریک تھے۔ شاہی لشکر کی شکست کے بعد دیگر سپاہیوں کے ساتھ امیر خسروؔ کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ وہ دو سال تک منگولیوں کی قید میں رہے۔ رہائی کے بعد وہ دہلی تشریف لائے۔ انھوں نے خان شہید پر دو مرثیے کہے تھے جو بڑے دردناک ہیں — امیر خسروؔ نے جب یہ مرثیے بلبن کے دربار میں پڑھے تو سارے درباری رو پڑے اور ہر طرف سے صدائے فریاد و فغاں بلند ہوئی۔ سلطان بلبن اپنے بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکا۔ اور جلد ہی اس دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔

امیر خسروؔ کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ایک زبردست موسیقی داں تھے۔ انھیں کے عہد میں ایک مشہور ماہر موسیقی نایک گوپال بھی تھا جسکے بارہ سو شاگرد تھے۔ ایک بار سلطان علاء الدین خلجی نے دونوں کو موسیقی کے مقابلے کے لئے طلب کیا۔ اس مقابلے میں امیر خسروؔ نے کامیابی حاصل کی۔ امیر خسروؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے فارسی اور ہندی راگوں کے امتزاج سے نئے راگ پیدا کئے چنانچہ انھوں نے مجیر۔ سازگری۔ ریمن۔ عشاق۔ موافق غم۔ زیلف۔ فرغنہ۔ سرپردہ۔ باخرز۔ فردوست۔ اور کئی راگ ایجاد کئے ہیں۔

اگرچہ امیر خسروؔ کی شخصیت بہت جامع ہے۔ مگر وہ دراصل اپنی شاعری کی بنا پر مشہور ہوئے ہیں۔ انھوں نے فارسی قصائد بھی کہے ہیں۔ فارسی مثنویوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ فارسی مرثیوں کی بھی تخلیق کی ہے۔ اور فارسی رباعیات پر بھی قلم اٹھایا ہے مگر انکا خاص میدان غزل گوئی ہے۔

چونکہ امیر خسروؔ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے اور ان کی رہنمائی میں وہ تصوف کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے اس لئے ان کی غزل کا نمایاں عنصر تصوف ہی ہے۔ ان کے کلام میں عشق حقیقی کی آنچ لپکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جو اہل باطن کے دل کو پگھلا دیتی ہے۔ دراصل امیر خسروؒ عشق الٰہی میں سرشار ہیں اور انکے درد دل کا کوئی درماں نہیں ہے — چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔ ؎

سرے دارم کہ ساماں نیست اورا
بہ دل دردے کہ درماں نیست اورا

امیر خسروؔ کی ملکیت صرف ایک ویران دل ہے ؎

مرا ملکے است اے سلطان خوباں
کہ جز دلہائے ویراں نیست اورا

امیر خسروؔ مشاہدۂ حق کے لئے بیتاب ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ان پر قبض کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ اور وہ بسط کے خواہشمند رہتے تھے۔ جیسا کہ وہ مندرجہ ذیل شعر میں فرماتے ہیں۔ ؎

برائے انتظارم ہست چشم
کہ خوابے ہم پریشاں نیست اورا

امیر خسروؒ کے مندرجہ شعر سے بھی اشتیاق دیدار ظاہر ہوتا ہے ؎

از سر بالین من برخیز اے ناداں طبیب
دردمند عشق را دارو بجز دیدار نیست

امیر خسروؒ کے مندرجہ ذیل شعر میں بھی وعدۂ دیدار کا رنگ ملاحظہ فرمایئے ؎

شاد باش اے دل کہ فردا بر سر بازار عشق
مژدۂ قتل است، اگرچہ وعدۂ دیدار نیست

محبوب کے انتظار پر امیر خسروؒ نے ایک نہایت حسین شعر کہا ہے ؎

خبرم رسیدہ امشب کہ نگار خواہی آمد
سر من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد

اسی قسم کا مندرجہ شعر بھی ہے ؎

ہمہ آہوانِ صحرا سر خود نہادہ بر کف
بہ امید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد

امیر خسروؒ کو محبوب کے عشق میں صبر نہیں حاصل ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

بسیار شدم عاشق دیوانہ ازیں پیش
آں صبر کہ ہر بار بُد ایں بار ندارم

ایک شعر میں امیر خسروؒ نے شکر کا عالم پیش کیا ہے ؎

نمی دانم چہ منزل بود، شب جائیکہ من بودم
بہ ہر سو رقص بسمل بود، شب جائیکہ من بودم

امیر خسروؒ نے مندرجہ ذیل شعر میں مشاہدۂ حق کا ذکر کیا ہے چونکہ انھوں نے رات میں محبوب کا جلوہ دیکھا ہے، اس لئے ہم اس مشاہدہ کو مسامرہ سے تعبیر کرسکتے ہیں ؎

پری پیکر نگارے، سرو قدے، لالہ رخسارے
سراپا آفت دل بود، شب جائیکہ من بودم

امیر خسروؒ نے شریعت، طریقت اور معرفت کی منزلیں طے کی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ حقیقت کی منزل میں بھی داخل ہوگئے ہیں جہاں من و تو کا فرق ختم ہوگیا ہے۔ چنانچہ امیر خسروؒ فرماتے ہیں ؎

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

غرضیکہ امیر خسروؒ کی صوفیانہ شاعری بہت پاکیزہ اور ارفع و اعلیٰ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ درجہ اول کے صوفی شاعر ہیں۔

امیر خسروؒ کے یہاں فلسفیانہ خیالات کا بھی عکس ملتا ہے۔ انھوں نے مندرجہ ذیل شعر میں فلسفۂ فنا پر روشنی ڈالی ہے ؎

گر نو بہار آید و بہ سوز دوستاں
گوئے صبا، کہ آں ہمہ گلہا گیا شدند

امیر خسروؒ نے انسانی حیات کو فانی قرار دیا ہے ؎

اے گل چو آمدی ز زمیں، گو چگونہ اند
آں روئے ہا کہ در تہ گرد فنا شدند

عوام کا کیا ذکر خواص بھی تہِ خاک سوتے ہیں ؎

آں سروراں کہ تاج سر خلق بودہ اند
اکنوں نظارہ کن کہ ہمہ خاک پا شدند

غرضیکہ امیر خسروؒ نے مختلف طریقوں سے دنیا کی بے ثباتی کو ثابت کیا ہے اور فلسفۂ فنا کی وضاحت کی ہے۔

امیر خسروؒ کی اخلاقی شاعری بھی قابل قدر ہے۔ ان کے کلام میں جا بجا اخلاقی رموز و نکات ملتے ہیں جن سے ہماری زندگی میں اجالا پھیلتا ہے۔ مثلاً امیر خسروؒ کو خدا پر اعتماد ہے اسلئے وہ ناخدا کی پرواہ نہیں کرتے ہیں ؎

ناخدا در کشتیٔ ما گر نباشد، گو مباش
ما خدا داریم، ما را ناخدا درکار نیست

امیر خسروؒ نے مندرجہ ذیل شعر میں خلائق دنیا دی سے گریز کرنے کی تلقین کی ہے ؎

بازیچۂ ایست طفل فریب ایں متاع دہر
بے عقل مرداں کہ بدیں مبتلا شدند

ایک شعر میں امیر خسرو نے دنیا کی بے وفائی کا شکوہ کیا ہے ؎

خسرو گریز کن کہ وفا رفت زیں جہاں
ز اہل جہاں کہ ہیچ جہاں بے وفا شدند

امیر خسرو کی غزلوں کا اسلوب بھی بہت حسین ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں موسیقیت کے عناصر بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محفل سماع میں اکثر و بیشتر قوال انھیں کی غزلیں گاتے ہیں۔ امیر خسرو کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں بربط و رباب کی ساری جھنکاریں موجود ہیں ؎

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز
درد ہا دادی و درمانی ہنوز
آشکارا سینہ ام بشگافتی
ہم چناں در سینہ پنہانی ہنوز
ملک دل کردی خراب از تیغ ناز
و اندریں ویرانہ سلطانی ہنوز

امیر خسرو کی شاعری کی ایک خصوصیت، جدت طرازی ہے۔ وہ معمولی مضمون کو اس انداز سے نظم کرتے ہیں کہ اس میں کہکشاں کی چمک پیدا ہو جاتی ہے مثلاً ایک شعر میں انھوں نے محبوب کی قیمت کا ذکر کیا ہے ؎

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

یہ شعر اس قدر مشہور ہوا ہے کہ ضرب المثل بن گیا ہے۔

امیر خسرو کے مندرجہ ذیل شعر میں نزاکت خیال اپنے عروج پر ہے ؎

دلم بربودی و ترسم کہ درد آں رسدت
دلم بہ زلف نگہدار و درد باز رساں

امیر خسرو کو محبوب کا کس قدر لحاظ ہے؟ وہ یہ نہیں چاہتے ہیں کہ محبوب کو تکلیف پہونچے۔ اسی لئے وہ محبوب سے التجا کرتے ہیں کہ تو میرا دل، اپنی زلف میں رکھ لے مگر اسکے اندر جو درد ہے وہ مجھے واپس کر دے۔ امیر خسرو نے یہ شعر نہایت حسین انداز میں کہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو جیسی جامع شخصیت کے ادیب ہندوستان کی خاک سے بہت کم ابھرے ہیں۔ امیر خسرو ایک شگفتہ گلاب ہیں جن کو باد صرصر کے جھونکوں سے کبھی گزند نہیں پہونچے گا۔ بلکہ ان کی خوشبو اور سرخی میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا۔

حیاتِ امیر خسرو نظم کے آئینے میں

سانجھی چودیس[لہ]

ساحر لکھنوی

اسلام اے رودکش خلد و ارم جنت نشاں
اے مرے پیارے وطن اے کشور ہندوستاں

تیری رفعت، تیری عظمت، تیری شوکت بے مثال
ذرے ذرے سے عیاں ہے حسنِ فطرت کا جمال

تیرا ہر اک منظرِ دلکش ہے ایسا شاہکار
صنعتیں ہوں مانی و بہزاد کی جس پر نثار

پتھروں میں دستِ فطرت کی ہے وہ کاری گری
محوِ حیرت ہو کے بت بن جائے فنِ آذری

کوہ و صحرا، برگ و سبزہ، جھیلیں، دریا، آبشار
لہلہاتے کھیت، باغات اور صف بستہ چنار

اے مہابیر اور گوتم، کے اُصولوں کے امیں
اے کرشن و رام کی روحانی قدروں کے امیں

ذرہ ذرہ ہے ترا اک سجدہ گاہِ خاص و عام
اے زمینِ نانک و چشتی تجھے میرا سلام

صاحبِ صدق و صفا اہلِ نظر پیدا کئے
خاک نے تیری بھی اربابِ نظر پیدا کئے

تو کہ رنگارنگ تہذیبوں کا دلکش امتزاج
تیرے سر پہ ہے اخوت اور رواداری کا تاج

ایک جانب ہے فضا میں شور اگر ناقوس کا
گونجتی ہے اک طرف اللہ اکبر کی صدا

قومی یک جہتی کی اک تفسیر کہنا چاہیئے
تجھ کو تو اخلاص کی تصویر کہنا چاہیئے

ہے لبوں پر آج سب کے قومی یک جہتی کی بات
ہر طرف ہے عام تہذیبی ہم آہنگی کی بات

دیکھئے جس سمت یک جہتی ہی کی تبلیغ ہے
یعنی ہر جانب رواداری ہی کی تبلیغ ہے

لہ کتابی صورت میں شائع شدہ ایک طویل نظم کا اقتباس

اے وطن پیارے وطن، میرے وطن، ہندوستاں
مصلحت کا جو تقاضا ہو، مگر یہ ہے عیاں

ہے کئی صدیوں پرانا قومی یک جہتی کا نام
یعنی ہندوستان میں تہذیبی ہم آہنگی کا نام

سات صدیوں کا اُدھر طے کرکے ہم سب فاصلہ
دیکھیں ماضی کے دریچوں سے جو منظر ہند کا

وہ عظیم انسان آ جائے گا جب پیشِ نظر
ایک پیکر میں نہاں تھے جس کے کتنے ہی ہنر

ہاں وہی مجموعۂ اوصاف کہتے ہیں سب جسے
اہلِ دانش لائقِ عزت سمجھتے ہیں جسے

وہ، کہ شاعر، ماہرِ موسیقی اور فن کار تھا
متقی، صوفی و دیں دار اور دنیا دار تھا

اک مورخ، اک ادیب اور اک مکمل آدمی
عام تھی جس کی بغیر تفرقہ دریا دلی

اونچی لے میں گاتا تھا جو قومی یک جہتی کے گیت
تھے لبوں پر جس کے تہذیبی ہم آہنگی کے گیت

جس کے گُن گاتا ہوا ملتا ہے ہر تاریخ داں
یعنی خسروؒ، جس کو کہیے طوطیِ ہندوستاں

اس کو ہندوستان سے اُلفت بھی اس درجہ سوا
جا بجا اِس کے فضائل کا کیا ہے تذکرہ

جوشِ اُلفت میں فقط یوں ہی نہیں دعوے کیے
اَپنے دعووں میں دلائل اور براہیں بھی دیے

ہند کے مذہب کا بڑھایا اِس طرح سے مرتبہ ۱؎
کر دیا عالم کے سارے مذہبوں کا تجزیہ

ماسوا اسلام کے ہر ایک پر ترجیح دی
محترم حالانکہ ہیں سارے مذاہب عالمی

کرتا تھا ہندوستاں سے عشق یوں دیوانہ وار
یہ حدیث اکثر سناتا تھا بہ شانِ افتخار

اپنے جان و تن نہ شیخ و برہمن سے عشق ہو
صاحبِ ایماں ہے وہ جس کو وطن سے عشق ہو ۲؎

●

کِش ۳؎ کہ تھا اک شہر جو واقع تھا ترکستان میں
والدِ خسروؒ وہیں سے آئے ہندوستان میں

ترکوں کے لاچیں قبیلے کے تھے مردِ باوقار
لوگ کرتے تھے انھیں امرائے بلخ میں شمار

ہر طرف چھانے لگا جب فتنۂ چنگیز خاں
آئے سیف الدین ہجرت کرکے تب ہندوستاں

۱؎ نُہ سپہر کلکتہ ۱۹۱۸ء — ۱۶۴ — ۱۶۵ م

برہمن از ہستی او ماندہ نقش
از مثنوی کشتی بر دوئی رفتہ و بس

عیسویاں زوج و ولد بستہ برد
ہندو ازیں جنس نہ پیوستہ برد

قوم مجسم رقم جسم زدہ
برہمنانے دم ازیں قسم زدہ

اختریاں ہفت خدا بردہ گماں
گفتہ یکے ہندو و ثابت ہماں

قوم مشبہ سوئے تشبیہ شدہ
ہندو ازیں باش پہ تنزیہ شدہ

خلق دگر نور و ظلم ماندہ بدل
ہندو ازیں باہمہ پیوند گسل

۲؎ حب الوطن من الایمان

۳؎ فرشتہ و دولت شاہ

حکمراں تغلق[1] تھا ہندوستان میں یہ وہ دور تھا
علم و فن کی منزلیں تھیں جس کی نظروں میں سوا

رفعتیں ہی رفعتیں تھیں طالعِ بیدار میں
مل گیا اک محترم عہدہ انھیں دربار میں

چشمِ سلطاں میں جو صد درجہ تھا ان کا احترام
کرتے تھے آنکھوں کو فرشِ راہ سب ہی خاص و عام

یوں تو پہلے سے تھے سیف الدین کے دو لختِ جگر[2]
ہاں مگر ملنا تھا خسروؒ کا بھی جیسا اک پسر

چھ سو اکیاون تھا ہجری میں جو پیدائش ہوئی
بارہ سو ترپن ولادت کا تھا سنِ عیسوی

مولدِ خسروؒ بنا عظمت کا اک آئینہ دار
یعنی پٹیالی، ضلع ایٹہ میں گنگا کے کنار

کمسنی ہی میں یتیمی سایہ افگن ہو گئی،
شفقتوں کی روشنی تاریکیوں میں کھو گئی

ان دنوں تھی عمرِ خسروؒ کی ابھی کل سات سال
انکے والد کا ہوا اک جنگ میں جب انتقال

ہو گئی اندھیر دنیا ایک بیوہ کے لئے
آ گئی واپس جو وہ میکے تو خسروؒ ساتھ تھے

تھے عماد الملک نانا صاحبِ علم و ہنر
رفعتیں یہ تھیں کہ کہتا تھا زمانہ بادشاہ گر

بولتا تھا ہندوی سارے کا سارا خاندان
شیرِ مادر کی طرح خسروؒ نے پائی تھی زباں

اک تو تربیت مثالی اس پہ ذہنِ لاجواب
ہو گئے خسروؒ بھی بڑھ کر آپ ہی اپنا جواب

کر لئے حاصل ریاضت سے علومِ ظاہری
قابلیت نے عطا کی، سربلندی، برتری

رحمتِ حق سے ہوئی اقبال مندی بھی عطا
دن بہ دن بڑھنے لگا رتبہ سوا سے اور سوا

مختلف صوبوں میں جاتے تھے سلاطیں جب کبھی
ساتھ میں ہوتے تھے خسروؒ بھی بصد دانشوری

جس علاقے میں جہاں رہتے، جہاں کرتے قیام
غور سے پڑھتے تھے خسروؒ فطرت و ذہنِ عوام

اس طرح معلوم ہو جاتا ہے قوموں کا مزاج
دیکھتے تھے پوری دلچسپی سے سب رسم و رواج

کوہ و دریا، موسم و صحرا گل و برگ و ثمر
ریت رسمیں اور زبانیں، سب پرند و جانور

یعنی یوں ہر منظرِ دلکش پہ تھی گہری نظر
ہو گئے وہ ان کی تخلیقات میں بھی جلوہ گر

ہے شواہد کا تنوع ذہن کی وسعت کا راز
سیرگاہِ زندگی سے، ملک سے الفت کا راز

•

ایک حقیقت ہے ضیاء الدین برنی[3] کا بیاں
وہ، کہ تھے ہم عصر خسروؒ کے یہ سب ہے عیاں

---

۱ محمد تغلق ۲ اعز الدین، علی شاہ ۳ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۹

ان کا کہنا ہے کتابیں خوب بھی تصنیف کیں — مختلف موضوعِ علم و فن پہ تخلیقات تحقیق
ایک کتب [illegible] ان کی ہی تصنیفات سے — متفق بالکل ہیں میر خورد[1] بھی اس بات سے
ایک [illegible] تخلیق ہے اک شاہ کار — اور قرونِ وسطیٰ کی تہذیب کی آئینہ دار
پانچ دیوان[2] جن کو کہتے ہیں ادب کا افتخار — ہیں قصائد ان میں کچھ تاریخ سے بھی ہم کنار
ذکر ہے کچھ خاص لوگوں کا بھی اور کچھ واقعات — اس طرح آتی ہے خود تاریخی پس منظر کی بات
[illegible] مثنویاں[3] ہیں مسلسل داستاں — جن کا حد درجہ ہے دلکش حسن و انداز بیاں
ان کے سب کردار سارے واقعات [illegible] مقام — مطلقاً ہیں غیر ملکی کچھ نہیں اس میں کلام
پھر بھی ہندوستانی تہذیب اور تمدن کی جھلک — اس طرح ان میں سمو ڈالی ہے اکثر بے جھجک
ہند [illegible] کلچر کی اور رسموں کی عکاسی کہا — اہلِ دانش نے انھیں تاریخی نقاشی کہا
حافظے تاریخ کے جن میں حقائق ہیں نہاں — بیش قیمت ورثہ ہیں وہ مثنویاں[4] بے گماں
بن گئی تاریخی دستاویز شعری کائنات — کر دیئے ہیں نظم تہذیبی سیاسی واقعات
انشا پردازی کا جن میں دلنشیں انداز ہے — نثر کا وہ کارنامہ خسروی[5] اعجاز ہے
مذہب و علم تصوف، نحو و صرف، علم نجوم — ہو فقہ یا شاعری زیرِ قلم تھے سب علوم
فارسی میں حضرت خسرو کا ہے وہ مرتبا — حافظ و سعدی کا ہمسر اہلِ دانش نے کہا
اہلِ ایراں فارسی کے یعنی اربابِ زباں — کہتے ہیں خسرو کو وہ بھی طوطیٔ ہندوستاں[6]
مانتے ہیں صدق دل سے استادِ خسروی — ہے قبول اہلِ زباں کو اجتہادِ خسروی
ہاں مگر فکر و نظر کی یہ بلندی دیکھئے — طوطیٔ ہندوستاں کی اوج بینی دیکھئے

ثانیٔ سعدی و حافظ کی ہے اک رفعت یہی
ہندوی کو کہہ دیا اپنی زبانِ مادری

---

۱ سیر الاولیاء ص ۳۰۲

۲ تحفۃ الصغر، وسط الحیوٰۃ، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ، نہایت الکمال

۳ مطلع الانوار، شیریں خسرو، آئینہ سکندری، ہشت بہشت، مجنوں لیلیٰ

۴ قرآن السعدین، مفتاح الفتوح، دول رانی خضر خاں، تغلق نامہ، خزائن الفتوح، نہ سپہر

۵ اعجاز خسروی

۶ بروحِ خسرو ازیں پارسی شکر دادم
کہ کامِ طوطیٔ ہندوستاں شود شیریں — عرفی

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زیں قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ می رود — حافظ

کلیہ یہ ہے ہر اک حساس انساں کے لئے
مضطرب رہتا ہے تسکینِ دل وجاں کے لئے

لاکھ چومے عشرتِ دنیا بھر لحظہ قدم
عارضی خوشیوں سے مٹ سکتا نہیں ہے دل کا غم

تھی قدم بوسیٔ خسروؒ میں زمانے کی خوشی
سطوت وثروت بھی تھی دولت بھی تھی عزت بھی تھی

یوں تو تھے وابستہ درباروں سے ہے یہ آشکار
یہ حقیقت ہے کہ بالکل ہی نہ تھے دربار دار

منصبِ اعلیٰ تھا حاصل فوج میں اس پر یہ حال
قابلِ نفریں نگاہوں میں رہی جنگ وجدال

لائقِ توقیر وعزت تھی عوامی زندگی
روشنیٔ کوکبِ شاہی نہ خیرہ کر سکی

تشنگی ہی تشنگی تھی تشنگی ہی تشنگی
روح جیسے خاص اک ماحول کی تھی مقتضی

زندگی ملتی نہیں ہے بھاگنے سے کو بہ کو
خدمتِ شیخ نظام الدینؒ میں لائی جستجو

ہو گئے بیعت جو شیخ الاولیاؒ کے ہاتھ پر
منزلِ روحانیت کی مل گئی اک رہ گذر

درسِ شیخ الاولیاؒ سے سچی دینداری ملی
بے تعصب ذہنیت، شانِ رواداری ملی

بن گیا جینے کا مقصد قومی یک جہتی کا کام
ہندو ومسلم کی تہذیبی ہم آہنگی کا کام

باوجود اس کے کہ ہے اسلام میں گانا حرام
ہاں مگر ایسے بھی تھے کچھ صوفیائے ذوالکرام

شوق سے سنتے تھے اکثر جو تصوف کا کلام
جانبِ حق تاکہ مائل ہو یونہی ذہنِ عوام

قاضی سعد الدین صادق، اور منہاج السراج
التمش کے دَور میں جن کا شریعت پر تھا راج

ذہن کو ان کے تھی موسیقی جو بے حد ناگوار
حکمِ شرعی سے ہوئی وہ غیر اسلامی شعار

چھن گئی انسان سے جب اس کی روحانی غذا
زندگانی ہو گئی جیسے کہ بالکل بے مزا

صرف سناٹا ہی سناٹا سا تھا ہر چار سو
سننے میں آتا نہ تھا اب نعرۂ اللہ ہو

جستہ قاضی حمید الدین ناگوری نے تب
مذہب واخلاق کی تبلیغِ پیہم کے سبب

سوئے موسیقی عوامی ذہن کو مائل کیا
پا گئی بزمِ سماع اک بار پھر سے مرتبا

بعد شمس الدین اس کا جانشیں فیروز شاہ
کھو گیا خود ایسا موسیقی کا دلدادہ بنا

شاہ بلبن کی حکومت اور بھی راس آ گئی
یوں ہوئی مقبول موسیقی کہ ہر سو چھا گئی

ذکر تھا شعر وادب کا، یہ تھا رنگ و بو کا دَور
دَورِ زرّیں تھا یہی کہیے جسے خسروؔ کا دَور

سازگار آیا جو موسیقی کو خسروؔ کا مزاج
اجتہادِ فن کے جل اُٹھے ہر جانب چراغ

ذہن یکتائے زمانہ تھا سو یکتا ہی رہا
ہو گیا آغاز ایجادات کا اک سلسلا

کہتے ہیں ہندی میں ساڑھے بارہ تالیں پہلے تھیں
ذہن خسرو سے وہی جو بیں بحروں میں ڈھلیں

تھی پکھاوج جانِ محفل، رونقِ بزمِ سرور
سربلندی وہ ملی تھی جا بجا جس پر غرور

جب پڑھا مدے پکھاوج کا غرورِ برتری
بڑھ گیا اک سازِ نو محفل میں ڈھولک آگئی

ہو گیا ایجاد پھر طبلہ بھی محفل کے لئے
سازِ نو اک اور بڑھ گیا تسکین کامل کے لئے

بزمِ موسیقی میں جادو سا جگانے کے لئے
سترہ تالیں مقرر کیں بجانے کے لئے

یہ بھی ہے خسرو کا جیتا جاگتا اک شاہکار
ہے وہی سہ تار، جس کو آج کہتے ہیں ستار

اپنے ہونے میں بھلا آزاد ہی کب ہے سرود
ابتدائی نام تھا سہ رود جواب ہے سرود

قلب کو برمائے موسیقی میں ہوا اس درجہ آگ
اس لئے ایجاد خسرو نے کئے کچھ اور راگ[1]

ہے عجب اک راگ اور ہے راگ کانی ٹھاٹھ کا
ہاں مگر دن ہی کو گانے میں ہے کچھ اس کا مزا

اس میں دھیوت دادی ہے، گندھار سم وادی بھی ہے
اور خسرو ہی کا اس میں رنگ قوالی بھی ہے

شام کو گانے کی خاطر راگ ہے ساز گری
راگ جس میں مل گئے ہیں پوریا اور پوربی

شام کا اک اور بھی ہے راگ ایمن کلیان
ہاں مگر سنگیت کا درکار ہے اس میں گیان

گائے سچے تال سر میں گر کوئی راگ عشاق
راگ کا خالق بھی اسکو مان لے گا فن میں طاق

راگ ٹوڈی مالوی سے اور بنا زوگاہ سے
صبح کو گائیں موافق راگ پوری چاہ سے

پوربی کے راگ میں تھوڑا تغیر جب ہوا
شام کے گانے کو راگ اک تب غنم بھی بن گیا

راگ زیلف بھیرویں کے ٹھاٹھ کا سمپورن راگ
آخر شب یہ لگا دیتا ہے ہر اک دل میں آگ

گن کلی سے اور گورا سے مرکب جب ہوا
دن کے گانے کے لئے تب راگ فرغانہ بنا

ہے بلاول ٹھاٹ کی سرپردہ میں جلوہ گری
صبح کو یہ راگ دکھلا دیتا ہے جادوگری

وقت اور ساعت کی اس میں کچھ نہیں ہے قید و بند
باغزو کا راگ گائیں جو بھی ساعت ہو پسند

دلکشی بھر پور ہے جس راگ میں گندھار کی
راگ ہے ایسا صنم جس کا نہیں ثانی کوئی

بھیروں اور آساوری کا ہو گیا جب امتزاج
راگ زنگولہ نے بہچانا سحر کا تب مزاج

●

---

[1] تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔ "سانجھ بھئی چو دیس" حالاتِ زندگی پر مبنی طویل نظم جو کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔

ابتدا میں ہو چکی ہے یہ حقیقت آشکار　　ان کو رکھتا تھا ہمیشہ ساتھ ہر اک تاجدار
بس غیاث الدین تغلق کا بھی یہ معمول تھا　　حضرت خسرو رہے ہمراہ وہ جس جا گیا
عازم بنگال جب سلطان ہوا المختصر　　حضرت خسرو بھی تھے تغلق کے ہمراہِ سفر
چند دن کے بعد تغلق آگیا دلّی مگر　　رہ گیا بنگال میں خسرو کا جیسا دیدہ ور
کاروبارِ مملکت میں وہ رہے مصروف ادھر　　سانحہ جانکاہ اس جانب تھا ان کا منتظر
ہوگیا اک مردِ حق مردِ خدا کا انتقال　　ان کے مرشد یعنی محبوبِ الٰہیؒ کا وصال
حضرتِ خواجہ نظام الدینؒ، شیخ الاولیا ر　　غل ہوا ہر سو انھوں نے کوچ دنیا سے کیا
یہ خبر بنگال میں جس وقت خسرو تک گئی　　قلب پر جیسے غموں کی ایک بجلی سی گری
یوں ہوئے بیتاب شیخ الاولیاؒ کے واسطے　　دو گھڑی کو بھی نہ وہ بنگال میں ٹھہر سکے
یورشوں سے جنگ کرتے تا بہ دلّی آگئے　　قبر شیخ الاولیاؒ پر آکے سب کچھ پاگئے
نام پر خواجہ کے ہر دست طلب کو بھر دیا　　پاس تھا جو کچھ بھی مال و زر نچھاور کر دیا
دل ہوا آلام کی شدت سے اس درجہ اداس　　کرلیا زیبِ بدن بس ماتمی کالا لباس
رہتے تھے دن رات شیخ الاولیاؒ کی قبر پر　　شاق تھی دل کو جدائی مرشد حق کی مگر
چھ مہینے بھی بڑی مشکل سے کاٹے ہجر کے　　بعد اس کے مرشد کامل سے جاکر مل گئے
ہجر کی شب کٹ گئی آ ہی گئی صبح وصال　　سات سو پچیس ہجری تھی ہوا جب انتقال
بعد مرنے کے تمنّائے دلی یوں مل گئی　　قبر کی جا پائی شیخ الاولیاؒ کے پائنتی
دائمی نیند اک عظیم انسان آخر سو گیا　　قوی یک جہتی کا نغمہ خامشی میں کھو گیا

مہدی خواجہ جو کہ باہر کے امیروں میں سے تھا
اس نے بنوایا بصد اخلاص ان کا مقبرا

گم ہوئے جب فکر کی گہرائی میں مُلّا شہاب　　ذہن کے مطلع پہ یہ تاریخ ابھری لاجواب

"شد عظیم المثل یک تاریخ او
واں دگر شد طوطیٔ شکر مقال"

لہ امیر یلغار کرتے ہوئے دلی واپس آئے۔ حیات خسرو از مولانا شبلی نعمانی

امیر خسرو دہلوی کی رومانی شاعری

ڈاکٹر ثروت علی (فارسی ریکارڈ سیکشن نیشنل آرکائوز آف انڈیا۔ نئی دہلی)

خسرو نے یوں تو تمام اصناف ادب پر طبع آزمائی کی لیکن غزل ان کا مخصوص میدان تھا اور ان کی رنگ تغزل رومان سے بھرا ہوا ہے۔ بقول ڈاکٹر وارالحسن (مرتب دیوان خسرو، نول کشور ایڈیشن) "وہ جو آنسو بہاتے ہیں تو دوسروں کو بھی اپنے ساتھ رونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ہنستے ہیں تو دوسروں کو بھی ہنساتے ہیں۔ رومانی فضاؤں میں سانس لیتے ہیں تو دوسروں کو بھی وہیں کھینچ بلاتے ہیں۔ ان کا رومان اور تغزل ماورائی نہیں بلکہ اسی آب و گل کا رومان ہے اور تغزل صحیح معنوں میں تغزل ہے:"

محبوب سے جدائی کا منظر کتنے ہی شعراء نے بیان کیا ہے خسرو اس منظر کی ایسی دلکش تصویر پیش کرتے ہیں کہ اس رومانی پردہ اور رقت انگیز منظر کے بیان سے کون دل ہے جو متاثر نہ ہو اور کون آنکھ ہے جو اشکبار نہ ہو جائے ؎

ابر باران و من و یار ستادہ بہ وداع
من جدا گریہ کناں، ابر جدا، یار جدا

یعنی بارش کا موسم ہے، محبوب رخصت ہو کر جا رہا ہے۔ عاشق دل گرفتہ دامن صبر کو تھامے ہوئے کھڑا ہے دونوں کی آنکھیں اشکبار ہیں اور بادل بھی اس رقت انگیز جدائی کے منظر سے متاثر ہو کر بے ساختہ اشکبار ہو گئے۔

محبوب صبح چہل قدمی کے لیے سیر گلگشت کو نکل پڑا ہوا اسے دیکھ کر سب کے سب سکتہ میں آگئے۔ نہر کے کنارے سرو کے درخت نے جو دیکھا تو ایسا مبہوت ہو گیا کہ ایک ہی پاؤں پر کھڑا کا کھڑا رہ گیا ؎

بامدادان بر چمن نازکناں می گشتی
سرو یک پا شدہ ستادہ بہ لب جوے بماند

حسن اتفاق سے عاشق کی رسائی محبوب کی زلفوں تک ہو گئی اور وہ انھیں آہستہ آہستہ کھینچنے لگا جس سے محبوب کی چشم مست بیدار ہو گئی۔ لفظی رعایتوں کے ساتھ ساتھ خسرو کی زبان سے سنئے ؎

دوش پنہاں می کشیدم زلف تو
چشم مستت ناگہاں بیدار شد

محبوب نے اپنے عاشق خسرو کو روتے ہوئے دیکھ لیا تو کہتا ہے کہ گھر جلد چلنا چاہیئے کیوں کہ بارش آگئی ہے ؎

گریۂ خسرو چو شوکرد ، گفت
خانہ بردم زود کہ باراں رسید

پھول ہیں کلیاں ہیں صرف محبوب نہیں تو کیا فائدہ ؟ اگر میرا شکریں لب محبوب ہی آغوش میں نہیں تو کوئی لطف نہیں ؎

گل و شگوفہ ہمہ ہست و یار نیست چہ سود ؟
بت شکر لب من در کنار نیست چہ سود ؟

بہار کا موسم آگیا اور ہر وہ پھول موجود ہے جسے اس موسم میں ہونا چاہیئے لیکن مجھے جس پھول (محبوب) کی طلب ہے وہی نہیں تو ایسی بہاروں سے کیا فائدہ ؎

بہار آمد و ہر گل کہ بایدآں ہمہ ہست
گلے کہ می طلبم در بہار نیست چہ سود ؟

ان کی عشقیہ شاعری فارسی ادب العالیہ میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے اور ان کی غزلوں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ معاملہ بندی کا انداز نمایاں ہے جس میں حسین تشبیہات ، نادر استعارات اور شیریں زبانی سے ندرت تاثیر کے جوہر پیدا ہوگئے ہیں۔ چند نمونے دیکھئے ؎

دلم بہ برد ، گرفتم کہ دُزد دل بنما
بہ ناز خندۂ دزدیدہ کرد و خال نمود

محبوب نے میرا دل حاصل کر لیا۔ میں نے اسے پکڑ کر کہا کہ میرے دل کا چور تو دکھلاتے جاؤ۔ محبوب نے ناز سے مسکرا کر اپنا تل دکھا دیا۔

روتے روتے بیقرار عاشق کو نیند آنے لگی تو وہ نیند سے کہتا ہے کہ اے نیند میرے پاس سے چلی جا تو میری ساتھی نہیں ہے کیونکہ آج تو مجھے کسی کی زلف پریشان کی یاد آرہی ہے ایسے میں میرے لئے سونا کہاں ممکن ؎

بردار خواب یار من نہ ای زیراکہ من امشب
سر زلف پریشانے کسے ام یاد می آید

میں نے اپنے محبوب سے ایک بار پوچھا کہ میرا خانۂ دل اس قابل نہیں کہ تم اسے اپنی قیام گاہ بنالو ، اس نے جواب دیا کہ یہ وہ خزانہ نہیں ہے جسے کسی ویرانے میں چھپایا جائے اور تمہارا دل تو ویرانہ ٹھہرا ؎

گفتم کہ "چرا آخر دل خانہ نمی باید؟"
گفتا کہ "پے گنجم ویرانہ نمی باید؟"

پھر میں نے اپنے محبوب سے درخواست کی کہ اچھا مجھے آ اجازت مل جائے کہ میں تمھارے آتش رخ پر اپنی جا کو جلا لوں تو اس کا جواب یہ تھا کہ میرے چراغ کے لئے پروانوں کی ضرورت نہیں ہے ؎

گفتم کہ "بسوزم جاں برآتش روئے تو؟"
گفتا کہ "چراغم را پروانہ نمی باید؟"

پھر عاشق التجا کرتا ہے کہ اچھا اپنی محفل خاص کا محرم بنا لیجئے تو جواب ملتا ہے کہ دیوانے میری محفل میں بیٹھنے کے لائق نہیں ہوتے ؎

گفتم کہ "شوم محرم در مجلس خاص تو؟"
گفتا کہ "حریف ما دیوانہ نمی باید!"

یہ جواب سن کر عاشق پھر التماس کرتا ہے کہ مجھے ہر وقت غم کے جال میں نہ ڈالا جائے۔ محبوب جواب دیتا ہے کہ ایسے پرندے کو دانے کے بغیر رکھنا ممکن نہیں ، غم ہی عشاق کی غذا ہے اس سے کیسے محروم کیا جا سکتا ہے ؎

گفتم کہ [illegible] عمر بہ لحظہ مرا مگن"
گفتا کہ [illegible] انی نمی باید!"

تنگ آ کر [illegible] اچھا مجھے عشق سے چھٹکارا ہی ن جائے تو جواب ملتا ہے کہ خط عارض کافی ہے کسی اور علم کی کیا ضرورت ہے ؎

گفتم کہ ز عشقم دہ پروانۂ آزادی"
گفتا "خط عارض بس، پروانہ نمی باید!"

عاشق لاجواب ہو کر پوچھتا ہے کہ اچھا یہی بتا دیجئے کہ آپ کے فراق میں خسرو کا مونس و غمخوار کون ہوگا؟ تو جواب ملتا ہے کہ کیا ہمارا خیال تمہارے ساتھ نہیں ہے اور وہ کیا کوئی غیر ہے؟ ؎

گفتم کہ بود مونس در ہجر تو خسرو را؟"
گفتا کہ "خیال ما بیگانہ نمی باید

محبوب کی پلکیں تیر کی طرح عاشق کے چبھتی ہیں لیکن وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر بہلاتا ہے کہ بلبل کو تو کانٹوں سے سامنا کرنا ہی پڑتا ہے ؎

از ناوک مژگانت افغاں نہ کنم ہرگز
گر گر گذر بلبل ہم بر سر خار افتد

کبھی خسرو انتہائی جذباتی انداز بیان اختیار کر لیتے ہیں اور ان کا والہانہ کلام عربی شعراء کی یاد دلاتا ہے ؎

باد آمد و بوئے نگارم نہ رسانید
پنہاں سخنے از لب یارم نہ رسانید

بوئے ز سر زلف نگارے بہ من آرید
یک تار از آں طرۂ مشکیں بہ من آرید

یک شب ز برائے دل من محرم من باش
بشنو ز دلم چند حدیث جگر آلود

ہمہ شب تا سحر بیدار باشم
بو کہ کاں مہ سحرگاہے برآید

اے محنت و غم سگ شمایم
گز دوست مرا بیاد گارید

گل نو رسید و بوئے ز بہار من نیامد
چہ کنم نسیم گل را کہ ز یار من نیامد

چہ خفتی خیز اے مرغ سحرخیز
ترا روزی ہمی باید مرا روز

ضیا حقانی

امیر خسرو

سفینۂ ادب اور موسیقی کے ناخدا

ہیں تاجدارِ جہانِ عرفاں، فقیر سیرت امیر خسروؒ ٭ باعتبارِ کلام شیریں ہیں شاعرِ بے نظیر خسروؒ

ابُوالحسن نام، خسرو تخلص، امیر خسروؒ مشہور تھے۔ یہانتک کہ لفظ "امیر" ان کے تخلص کا جز و بن گیا۔ امیر اس لئے مشہور تھے کہ اقلیم سخن کی بادشاہی کی طرح امارتِ دولت بھی میسر تھی، امیر خسرو ترکوں کے "قبیلۂ لاچین،، سے تعلق رکھتے تھے اور ترکستان کا مشہور شہر "تکش" ان کے والد امیر محمود سیف الدین شمس کا مسکن تھا۔ دولت شاہ اور فرشتہ، کے اقوال کے مُطابق سیف الدین امرائے بلخ میں سے تھے جو فتنۂ تاتاری و حملۂ چنگیزی کی تاب نہ لاکر وطن سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے اور بادشاہِ وقت محمد تغلق، کی جوھر شناسی کی بدولت یہ سفر موجب ظفر بن گیا۔

"پیدائش،، طوطیٔ ہند حضرت امیر خسروؒ سن ۶۵۱ ہجری مطابق ۱۲۵۳ عیسوی مقام پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے ان کے پیدائش کے سلسلہ میں حضرت علامہ شبلی نعمانی "شعر العجم" حصہ دوم ص ۱۰۸ میں لکھتے ہیں کہ جب وہ پیدا ہوئے تو امیر سیف الدین ان کو خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب، کے پاس لیگئے جس نے دُور ہی سے دیکھکر کہا کہ" وہ شخص آتا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائے گا"۔۔۔۔

"حالات" امیر خسرو کی پرورش ان کے نانا عماد الملک کے یہاں ہوئی ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے خوش نویسی کی مشق شروع کی۔ سعد الدین خطاط ان کے استاد تھے اس کے ساتھ ہی تعلیم بھی شروع ہوئی چونکہ اُستادِ ازل، ان کی فطرت میں شاعری کا جوہر بھر دیا اسلئے تقاضہ اسطرح ظاھر ہونے لگا کہ امیر صاحب لکھنے پڑھنے کی جگہ لئے سیدھے اشعار کہتے اور انھیں کی وصلیوں پر مشق کرتے تھے امیر خسروؒ کلام میں تلمیحات و اشاراتِ علمیہ دیکھکر معلوم ہوتا ہے مروجہ علوم و فنون میں ان کو پوری مہارت تھی اگرچہ کسی تذکرہ نویس نے ان کے تحصیل علم کے متعلق کچھ نہیں لکھا علامہ شبلی نعمانی نے "شعر العجم" میں یہ تحریر کیا ہے کہ "قطعی ہے کہ پندرہ بیس برس کی عمر میں یہ تمام درسی علوم فنون سے فارغ ہوچکے تھے"۔

سلطان غیاث الدین بلبن (شاہ دہلی) کے عہد میں امیر خسرو سن رشد کو پہونچے اس بادشاہ کے دربار میں تلو یا کشلو خاں ایک سربرآوردہ امیر تھا۔ خسرو اسکو اپنے قصائد اشعار سنا کے اور انعام و صلہ پاتے تھے رفتہ رفتہ امیر خسرو سلطان غیاث الدین کے درباریوں میں شامل ہو گئے اور ان کا رسوخ اس درجہ بڑھ گیا کہ سلطان جب کسی مہم پر جاتا تو امیر خسرو ساتھ رہتے تھے، سلطان کا بیٹا سلطان محمد قاآن مردم شناس، قدر دان اور خود بھی جوہر تھا اس نے بیس ہزار منتخب اشعار کی ایک بیاض تیار کی تھی جس کو وہ بہت گراں قدر اور عزیز جانتا تھا۔ اس کے اشعار امیر کو سناتا اور ان کی داد پاتا تھا اس انتخاب کی اس زمانہ میں ایسی شہرت تھی کہ اہل ذوق، اس کے اشعار نقل کرتے اور دور دور لے جاتے تھے جب شہزادہ کا انتقال ہوا تو وہ بیاض سلطان غیاث الدین کے ہاتھ سے امیر علی (شاہی دوات دار) کو ملی اور امیر علی کے بعد امیر خسرو کے ہاتھ آئی اس اثناء میں امیر خسرو کا آفتاب چمکنے لگا۔ اور دیکھنے والوں کی نظروں کو خیرہ کرنے لگا تھا تاتاریوں کے بادشاہ ہلاکو خاں کا پوتا ارغو خاں، ایران میں حکمراں تھا، اس کے ایک امیر تیمور خاں نے بیس ہزار سواروں سے لاہور پر حملہ کیا اور تاخت و تاراج کے بعد جب وہ واپس جانے لگا تو اموالِ غنیمت کے ساتھ امیر خسرو کو بھی اپنے ساتھ "بلخ" لے گیا امیر خسرو کو مجبوراً بلخ میں قیام کرنا پڑا۔ مگر جب کچھ دنوں کے بعد ان کو نجات ملی تو پھر واپس آ گئے حضرت امیر خسرو نے اس مجبوری اور بندش سے متاثر ہو کر ایک مرثیہ لکھا تھا جو عرصۂ دراز تک دہلی کے گوشہ گوشہ میں پڑھا جاتا رہا اور اسکو پڑھنے اور سننے والے دامنِ صبر و ضبط چاک کرتے تھے اس طرح سلطان محمد قاآن کی وفات پر امیر خسرو نے جو مرثیہ لکھا تھا اس کے اثر کا یہ نتیجہ ہوا کہ سلطان غیاث الدین نے جس وقت اس کو سنا تو اس قدر رویا کہ بخار آ گیا۔ اور بالآخر اسی بخار میں اس نے سفرِ آخرت کیا۔

بیعت: "۶۷۱ھ میں حضرت امیر خسرو نے خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی یا بیعت کی صورت میں عشق و محبت کا درس جاری کیا۔ ۔ ۔ یہ بات بہت مشہور ہے کہ امیر خسرو نے بیعت کے بعد جو کچھ ان کے پاس تھا، راہ محبت میں لٹا کر اپنے دامن میں "سرمایۂ فقر" کے سوا اور کچھ نہ رکھا امیر خسرو کو اپنے پیر کے ساتھ محبت نہیں عشق تھا کہا جاتا ہے کہ اسی عشق نے طبیعت میں اتنا گداز پیدا کر دیا تھا کہ ان کا ہر شعر نشتر نہیں بجلی بن گیا۔ جو سننے والوں کے دلوں پر اثر کرتا ہے۔

عادات و خصائل: حضرت امیر خسرو نے امارت کے آغوش میں آنکھ کھولی دولت کے سایہ میں ہوش سنبھالا اور بادشاہوں میں زندگی بسر کی لیکن ان کی طبیعت میں خاکساری تھی خوشامد اور جاہ پرستی سے وہ ہمیشہ متنفر رہے اور اظہارِ رائے میں کبھی دریغ نہ کیا سلطان علاؤ الدین خلجی جیسے سخت گیر بادشاہ کے دربار میں تھے لیکن موقع آتا تو صاف گوئی میں کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ ۔

عشق و محبت: حضرت امیر خسرو اپنی اس خصوصیت میں تنہا نظر آتے ہیں کہ ان کا دل احساس

دردِ محبت کا احساس تھا، پیرسے عشق تھا تو ایسا کہ پرستش کی حد کو پہونچ گیا تھا۔ ماں سے ایسی محبت تھی کہ اڑتالیس سال کی عمر میں اپنی ماں کو یاد کرکے اس طرح روتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ چھوٹا بچہ بلک رہا ہے (شعرالعجم حصہ دوئم صفحہ ۱۲۵) بھائی کے ساتھ ایسی محبت تھی کہ انکے انتقال پر مرثیہ لکھتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ، الفاظ میں جگر کے ٹکڑے پیوست کر دیئے ہیں "حسن" کے ساتھ ایسا اُنس تھا کہ ظاہر میں نظروں میں یہ طرۂ "امتیاز" "داغ" نظر آتا تھا گویا عشقِ حقیقی اور مجازی دونوں کی ایک جگہ انتہا ہوگئی تھی ایسے شخص کے گداز، درد۔ تڑپ اور سوز کا کیا کہنا! لیکن جہاں خوں نابہ فشاں کی رنگینی تھی وہیں ستم کی شوخی بھی نمایاں تھی یعنی ان کی طباعی اور ہمہ گیری نے بزمِ ادب کو ہر طرح سے آراستہ کیا تھا جہاں وہ رُلانا جانتے تھے وہیں ہنسانا بھی ان کو آتا تھا۔

حضرت امیر خسرو ایک جیّد عالم۔ بے مثل ادیب اور بے بدل شاعر تھے اُنھیں عربی، فارسی۔ اور سنسکرت زبانوں پر پوری قدرت اور "فنِ موسیقی" میں خاص مہارت تھی۔ طبیعت بلاکی، موجد، اور مخترع، پائی تھی۔ راگ راگنیوں میں ان گنت، اختراعیں کیں، اُردو الفاظ کے استعمال اور اُنھیں شعر کے قالب میں ڈھالنے کی سب سے پہلے حضرت امیر خسرو نے کوشش کی ان کے ہاں ایسے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں جن کا ایک مصرع فارسی اور دوسرا اُردو ہے۔ ......حضرت امیر خسرو۔ کثیر التصانیف بزرگ تھے انکے فارسی اشعار کا اندازہ لاکھوں تک کیا گیا ہے۔ ان کا ہندی کلام بھی فارسی کلام سے کم نہ تھا۔۔۔ لیکن ہم تک نہ پہنچ سکا۔

انھوں نے فارسی کی تمام اصنافِ سخن یعنی غزل۔ مثنوی۔ قطعات رباعیاں۔ مرثیے لکھے ہیں اگر وہ درد و درد اور روانی کی تصویریں ہیں تو اُردو میں پہیلیاں۔ کہہ مکرنیاں۔ دعل جبیتاں۔ اغل۔ دوہے۔ دو سخنے اور قسم قسم کے گیتوں میں اپنے کمالِ فن کے جوہر نمایاں کئے ہیں جو لطافت ذوق اور مطائبات شاعرانہ سے لبریز ہیں جس کسی نے یہ کہا ہے بالکل سچ کہا ہے کہ امیر خسرو کی اس خصوصیت میں ان کا کوئی شریک نظر نہیں آتا کہ ان کو معانی و بیان اور نظم و نثر کے تمام اصناف پر فارسی۔ عربی۔ ترکی اور بھاشا زبانوں میں یکساں قدرت و مہارت حاصل تھی چنانچہ خالق باری اور بھاشا کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت امیر خسروؒ کو سنسکرت میں بھی دستگاہ تھی اگرچہ امیر خسروؒ کے عہد میں سنسکرت کو انحطاط اور بھاشا کو عروج حاصل ہوچکا تھا۔ شاعری بالخصوص غزل کے لیے یہ زبان قدرتاً موضوع بھی ہے اور اس وقت اس کا کافی رواج بھی ہو چکا تھا۔

موسیقی: امیر خسرو نے شاعری بالخصوص غزلوں کو رنگین کرنے کیلئے "موسیقی" میں کمال پیدا کیا تھا اور کمال بھی ایسا کہ "جگت استاد" یا نائک، کا لقب حاصل کیا تھا۔

"ہندوستان" فنِ موسیقی کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتا ہندوستانی موسیقی کا ماہر مسلّم الثبوت، استاد، سمجھا جاتا ہے حضرت امیر خسرو کے وقت میں "گوپال نائک"، فن موسیقی" میں بہت مشہور تھا اس نے امیر کا کمال دیکھا تو انگشت بدنداں رہ گیا حضرت امیر خسروؒ ہندی

راگ راگنیوں کے ساتھ فارسی کی موسیقی میں بھی کامل تھے۔ اس لئے دونوں فنوں کی ترکیب سے نئی نئی باتیں پیدا کیں ہیں... راگ دہن میں حضرت امیر خسرو کی حسب ذیل ایجادیں ملتی ہیں۔ مجیر سازنہ۔ گرہا۔ ایلمن۔ عشاق۔ موافق غنم۔ زیلف۔ فرغنہ۔ سرپردہ باخرز فردوس۔ ان کے علاوہ حسب ذیل۔ تال اور ستار۔ بھی انھوں نے ایجاد کئے تھے... قول۔ ترانہ۔ خیال۔ نقش۔ نگار۔ بسیط۔ تلانہ۔ سوہلا...

امیر خسرو اس بات کو جانتے تھے کہ تغزل کا ترنم سے کیا تعلق ہے۔ غور سے دیکھئے تو انکی غزلوں میں ایک ایک لفظ کے اندر ترنم موجود ہے جس کو مذاق صحیح محسوس کرسکتا ہے.....

تصانیف: حضرت عبدالرحمان جامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حضرت امیر خسرو نے مختلف علوم و فنون میں بانوے کتابیں تصنیف کیں ان میں حساب اور موسیقی کی کتابیں شامل نہیں ہیں اور بقول حضرت امیر آن کے فارسی اشعار کی تعداد چار لاکھ اسی قدر بھاشا کی بھی تعداد بتائی جاتی ہے

سن ۷۲۵ھ ہجری مطابق ۱۳۲۴ء عیسوی میں جب حضرت محبوب الٰہی رحمت اللہ علیہ نے رحلت فرمائی تو امیر خسرو محمد تغلق کے ہمراہ بنگالہ کی مہم پر گئے تھے کسی خاص کیفیت کے تحت بادشاہ سے اجازت لیکر یکایک دہلی پہونچے اور مرشد کے وصال کی خبر سنی۔ اسی وقت تمام دولت و ملکیت مرشد کے ایصال ثواب کیلئے فقراء و مساکین میں تقسیم کردی۔ ماتمی لباس پہن کر مزار پُرانوار پر پہونچے آستانہ سے ٹکرا کر ایک چیخ ماری کہ ؎

سبحان اللہ آفتاب در زیر زمین و خسرو زندہ

یہ کہہ کر بے ہوش ہوگئے۔

۱۷ شوال بروز چہارشنبہ ۷۲۵ھ کو جب ہوش آیا تو یہ شعر پڑھا اور قفس عنصری سے روح پرواز کرگئی ؎

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس
خسرو اپنے گھر چلو شام بھئی چو دیس

سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی پائنتی دفن کئے گئے۔ مہدی خواجہ نے سب سے پہلے سن ۸۹۷ھ مطابق ۱۴۹۱ء عیسوی بہ عہد حضرت بابر شاہ مقبرہ تعمیر کرایا۔

آخر میں اس جامع الصفات و کمالات شخصیت کا نمونۂ کلام ملاحظہ فرمایئے ؎

حمد باری

سب کوئی اس کو جانے ہے پر ایک نہیں پہچانے ہے
اٹھ دھری میں ساکھا ہے فکر کیا ان دیکھا ہے

(فارسی) نعت محمدؐ

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
سراپا رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم
خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

اُردو کی سب سے پہلی غزل

زحالِ مسکیں مکن تغافل، درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں، ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں، دراز چوں زلف در روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل، دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکین
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں، چو ذرہ حیراں، ز مہر آں ماہ گشتم آخر
نہ نیند نیناں، نہ رنگ چیناں نہ آپ آوے نہ بھیجیں پتیاں
بحق روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسروؒ
سپیت مَن کے درائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی
آں دیگِ دہی بر سرِ تو چیست سہی

از ہر دو لبت شہد و شکر می ریزد
ہر گاہ بگوئی کہ دہی لیہو دہی

یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من
ہے گنہ ہم ساتھ عجب روٹھتا ہے (روٹھا ہے)
روئے تو زدلق شکن آفتاب
سرو بہ پیش قد تو بوٹتا ہے (بوٹا ہے)

. . . .

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

پہیلی

سر کاٹوں تو ابن بنے اور پاؤں کاٹوں تو پیا لا!
امیر خسرو یوں کہے رنگ ہے اِس کا کالا
(جامن)

جیسوں کا سر کاٹ لیا
نہ مارا نا خون کیا (ناخن)

ملغنے

انار کیوں نہ چکھا ...... وزیر کیوں نہ رکھا
(دانا تھا)

گوشت کیوں نہ کھایا ڈوم کیوں نہ گایا
(گلا نہ تھا)

[illegible] اورنگ آباد

امیر خسرو

فارسی کا ایک عظیم شاعر

تیرھویں صدی عیسوی میں منگولوں کے مسلسل حملوں سے ایشیاء کے اکثر ممالک زیر و زبر ہو گئے تھے۔ اُن کی تہذیب و تمدن، علوم و فنون سب خاک میں مل گئے۔ البتہ دہلی کی سیاسی حکمت عملی کی وجہ سے ہندوستان چنگیز خاں کے ہاتھوں قتل و غارت گری سے محفوظ رہا۔ اس لیے شاہانِ دہلی کے درباروں میں بیسیوں سے زیادہ تاجدار اپنے ملکوں کو خیرباد کہہ کر یہاں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ انہی اسباب کے تحت خسرو کے والد امیر سیف الدین محمود اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان تشریف لے آئے اور پٹیالی میں سکونت اختیار کی۔ وہ نسلاً ترک لاچین تھے ترکستان کے شہر کش میں اپنے قبیلے کے سردار تھے۔

شمس الدین التمش کے دورِ حکومت میں اپنے بلند حوصلوں اور فنِ سپہ گیری میں طاق ہونے کی وجہ سے وہ بہت جلد سلطان کے دستِ راست بن گئے۔ اُنھوں نے کئی معرکوں میں داد شجاعت دی اور اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔ اسی زمانہ میں دہلی میں ایک فیاض اور باا ثر خاندان عماد الملک کا تھا۔ جن کی شہرت کے ڈنکے نواحِ دہلی میں گونجتے تھے عماد الملک اپنی فیاضی اور اولوالعزمی کے باعث بادشاہوں کے مقرب رہے۔ فوج اور عوام دونوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ امیر سیف الدین کا عقد انہی کی لڑکی سے ہوا۔ جن کے بطن سے ابُوالحسن یمین الدین خسرو ۶۵۳ھ میں پٹیالی میں پیدا ہوئے جو بالعموم امیر خسرو کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ امیر سیف الدین محمود کے دو اور بھی بیٹوں اعز الدین علی شاہ اور حسام الدین کے نام بھی تاریخی صفحات میں ملتے ہیں۔ جنھیں کوئی خاص شہرت نہ ملی۔

جیسا کہ اُوپر بتایا جا چکا ہے۔ خسرو ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے خوشحال اور آسودہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ قسمت کو ان کے ساتھ ایک طرح کی ضد تھی پھولوں کے سیج پر کانٹے کی لڑائی خود بخود پیدا ہو گئی۔

خسرو ابھی سات سال کے تھے کہ اُن کے والد کسی جنگ میں مارے گئے۔ جس کے متعلق خسرو نے کہا ہے ؎

سیف از سرم گذشت و دل من دو نیم ماند
دریائے من رواں شد دُو دُتیم ماند

اس کے بعد خسرو کی والدہ اپنے میکے چلی آئیں جہاں انکے نانا نے اُن کی پرورش کی۔

امیر خسرو کی شخصیت جامع کمالات تھی۔ وہ بیکوقت مورخ، انشا پرداز، زبان داں، ماہر موسیقی، گیت کار اور شاعر تھے۔ یہاں ان تمام اصناف پر بحث کرنا مقصود نہیں۔ بلکہ اس مقالہ میں صرف اُن کی شاعری پر اظہار خیال کروں گا۔

خسرو کی غزلگوئی: خسرو نے پانچ دیوان لکھے۔ جنکے نام "تحفۃ الصغر"، "وسط الحیوٰۃ" "غرۃ الکمال"، "بقیہ نقیہ" اور "نہایت الکمال" ہیں۔ جن کی بنیادی نوعیت ادبی ہے۔

خسرو کی غزلوں کے مطالعہ سے اُنکی قادر الکلامی، جدت اور فنی بصیرت کا پتہ چلتا ہے اُنھوں نے غزلوں میں اپنے لئے ایک نیا راستہ نکالا اور فکر و فن کو نئی وسعتوں سے روشناس کرایا۔ ہندی میں شعر کہنے کا جذبہ خسرو کے پاس اس شدت سے ملتا ہے کہ اکثر فارسی غزلوں میں ہندی کے محاورے، الفاظ، فقرے اور بعض جگہوں پر پورا مصرعہ ہندی میں کہہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے۔

زحال مسکیں، مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
چوں شمع سوزاں، چو ذرہ حیراں، زمہر آں ماہ گشتم آخر
نہ نیند نیناں، نہ رنگ چینیاں، نہ آپ آدیں نہ بھیجیں پتیاں

وہ ہر رنگ میں غزل کہتے تھے اور ہر شعر پر اُن کی شخصیت کی چھاپ ہوتی۔ اُن کی ریختی میں بھی ایک طرح کا رکھ رکھاؤ ہے۔ خسرو کی ریختی ہندی شاعری سے بہت قریب ہے۔ وہ اُردو کے پہلے باقاعدہ شاعر ہیں۔

خسرو کی غزلوں میں ندرت اور بانکپن پایا جاتا ہے سوز و گداز، معاملات عشق کا بیان، اسلوب کی جدت، عجز بیان اُن کی خصوصیات ہیں۔ ان کا طرز بیان، لب و لہجہ کی نرمی اور شیرینی اور اس میں سلاست و ترنم نے خیالات کی اثر آفرینی کو دو بالا کر دیا ہے۔ اُن کی تشبیہوں اور استعاروں میں ہندوستانی روایتیں اور ہندوستانی عقیدے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ملتے ہیں۔ اُن کی غزلیں ہندوستانی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ ان کا محبوب مذکر نہیں مونث ہے۔ ذیل کی مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

تو شبانہ می نمائی بہ بر کہ بودہ ای شب
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

ابرمی بارد من می شوم از یار جدا
چوں کنم دل بچنیں روز ز دلدار جدا

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ ای نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

وہ ہندوستان میں ایک ذہین اور پختہ کار فارسی گو شاعر تھے۔ فارسی میں ان کا مرتبہ حافظ اور سعدی کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ خود اہل ایران نے اُن کی زباندانی شعرگوئی اور اُن کی شعری افکار کی بلندی اور وسعت کی تعریف کی ہے اور اُنھیں "طوطیٔ ہند" کے نام سے موسوم

کیا ہے۔ [illegible] خسرو [illegible] اس انفرادیت سے بخوبی واقف تھے جس کا اظہار انھوں نے نظم اور نثر دونوں میں جا بجا کیا ہے "پنج گنج [illegible]" کے جواب میں خسرو نے جو دعویٰ کیا ہے وہ اُن ہی کا حصہ ہے۔

غلغلہ خسرویم شد بلند زلزلہ در قبر نظامی فگند

مگر اس دعوے کے باوجود اُنھوں نے کبھی غالب کی طرح یہ نہیں کہا تھا

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ

خسرو کی مثنوی نگاری:

"قران السعدین" "مفتاح الفتوح" "دول رانی خضر خاں" "تغلق نامہ" اور "خزائن الفتوح" کا شمار تاریخی مثنویوں میں ہوتا ہے۔ یہ مثنویاں شاعرانہ حُسن کے علاوہ جزئیات کے اعتبار سے لاجواب ہیں۔ جس میں اس عہد کے سیاسی اور تہذیبی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ جب منگول نے اُنھیں گرفتار کیا تھا اس کا حلیہ یوں بیان کیا ہے جو اِس دور کے تاریخی ادب میں نمایاں نظر آتی ہے۔

فرو بُد کہ میرا پشیما کردہ می رفت
نشستہ بر فرسے چو پلنگ در کہسار
کشادہ از دہنش نکہتے چو بوے لعل
فتادہ بر زنخش سبلتے چو موئے زہار
زماندگی قدمے گر بماند سے تشنہ
گہہ طفانہ کشیدے بجشنم گہ تکمار

"مطلع الانوار" "شیریں خسرو" "لیلیٰ مجنوں" "آئینہ سکندری" اور "ہشت بہشت" "خمسہ [illegible] نظامی" کے جواب میں ہیں۔ جس میں اُنھوں نے جا بجا نظامی کے قصہ بیان سے انحراف کیا ہے۔ ہندوستانی محاورے، ترکیبیں، استعارہ اور کردار، ان کا برتاؤ فارسی شاعری میں پیش کئے۔ ہندوستان اور ایران میں ان مثنویوں کا شمار اعلیٰ شعروادب میں ہوتا ہے

مثنوی "نہ سپہر" مبارک شاہ خلجی کے حکم پر لکھی گئی۔ جس میں ہندوستان کی تعریف میں ایک باب "کشور ہند" ہے جو اہل ہند کی تمام تر خصوصیات کو اُجاگر کرتا ہے۔

خسرو کی قصیدہ گوئی:

خسرو کا کلام قصائد پر بھی مشتمل ہے۔ اُنھوں نے خود قصائد اور مثنویوں کو اہمیت دی ہے۔ ان کے قصیدوں میں عقیدت مندانہ جذبات اور الفاظ کی شان و شوکت دونوں پائے جاتے ہیں۔ چونکہ ان کے ممدوح اور انکے درمیان روحانی اور جذباتی رشتہ ہے اس لئے قصیدوں میں تصنع، مبالغہ آرائی اور بے جا جوش و خروش کے بجائے بلا کی خنکی اور روانی پائی جاتی ہے۔ قصیدے حقیقت پر مبنی ہیں۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ خسرو نے قصیدوں میں گہری معنویت، ندرت خیال، شدت جذبات اور بلندی فکر جیسے محاسن پیدا کر دیئے جس سے قصیدوں میں واردات قلب کے لیے جگہ نکل آئی اور اظہار جذبات کے ثانیت صیغے کی گنجائش بھی۔

خسرو نے بادشاہوں کی جھوٹی تعریفوں کے پُل نہیں باندھے بلکہ قومی خدمات سے متاثر ہو کر انکی شان میں قصیدے لکھے ان قصیدوں میں ان کے سچے جذبات کار فرما تھے۔ سیدھے سادے الفاظ میں بادشاہ کے حقیقی اوصاف کا ذکر کیا اور کہیں کہیں چند نصیحتیں بھی گوش گذار کیں۔ اس سے

اُن کی اصل نیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

ترک طمع گیر ز خود شرم دار
تا نشوی چوں طمعاں شرمسار

گر ستر زال کہ در یں تنگنائے
نان زنیکی می طلبی زر خدائے

غرّہ بہ خود بیں سلطان مشو
بلبل باغی۔ مگس خوان مشو

ہشت دے وز خرمن ہستی حصے
تا تو چہ باشی کہ کمی زو بسے

خسرو کے گیت: خسرو ایک کامیاب گیت نگار تھے انھوں نے جو گیت لکھے ہیں۔ وہ ادب میں اپنا خاص رنگ اور خاص مقام رکھتے ہیں۔ چوں کہ گیت کا تعلق نظم سے ہے اور نظم کبھی بحر کے کہی نہیں جا سکتی۔ بحر کے لیے اوزان کا ہونا ضروری ہے کیوں کہ بغیر اس کے تال سم کا ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے خسرو نے بحر کے اوزان اور تال سم کے قواعد مقرر کئے۔

خسرو کے گیتوں میں زبان کی فصاحت. موسیقی، لوچ اور سنگیت سے اٹھتی، اُبھرتی اور پھیلی ہوئی لہروں کو دیکھ کر یہ یقین کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ یہ گیت سات سو برس پہلے کہے ہیں جس کا ہر بول خالص ہندوستانی مزاج کی عمدہ مثال ہے۔

اماں میرے بادا کو بھیجو ری کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بادا تو بوڑھا ری "
اماں میرے بھیا کو بھیجو ری "
بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری "

اماں میرے ماما کو بھیجو ری کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ماما تو بانکا ری "

——— ساون کا گیت

جے جے نظام الدین جگ تارن۔ تا پر نت پران کو وارن
خسرو کے پر بھو، احمد کے پوت تن من اور دھن کروں نثار

بن کے پنچھی بھئے باورے ایسی بین بجائی سانورے
تار تار کی تان نرالی۔ جھوم رہی سب بن کی ڈاری

امیر خسرو کے گیت درد انگیز بھی ہیں اور پر اثر بھی۔ جن میں ایک بلند پایہ شاعر کی تمام تر خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

امیر خسرو کی شاعری کا بہترین نمونہ اُن کی کہہ مکرنیاں، پہیلیاں اور دو سخنے ہیں۔ جن پر فنی گرفت مکمل ہے اس لئے ان کے کہے ہوئے مخلوط اشعار جو آسان اُردو یا فارسی کے ساتھ ہندی کا میل عجیب لُطف دے جاتا ہے جو ایک طرف عام پسند اور دلچسپ ہیں تو دوسری طرف گھلاوٹ اور اثر سے لبریز ہے!

سگری رین مورے سنگ جاگا
بھور بھئی تو بچھڑن لاگا
وا کے بچھڑت پھاٹے ہیا
اے سکھی ساجن ؟ نا سکھی دیا

بالا تھا جب سب کو بھایا بڑا ہوا تو کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں ارتھ کہو نہیں چھاڑو گاؤں

دو سخنے اور کہہ مکرنیاں اور پہیلیاں ترتیب فرمائے کہ دلچسپ سمجھی جاتی ہیں۔ تصنیف "خالق باری" ایک منظوم درسی کتاب ہے جس میں عربی اور فارسی کے مترادف ہندوی الفاظ کی نشاندہی کی کوشش قابلِ لحاظ ہے۔ بعض محققوں نے اسے ہندی کا پہلا لغت قرار دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

دست برنجن کنگن کہیے، پایل ہے خلخال
پائے برنجن جوڑا کہیے۔ خوبی حسن و جمال
گلوبند کو تلڑی کہیے، اور حائل رہا
بازو بند بجائے کہیے، جو پیرایۂ سنگار
انگشتری انگوٹھی کہیے، خاتم جان نگینہ
ہے انگولا گھنگرو بچھوا، جھمکا مال خزینہ
گوشوارہ در ہندی پرتوں، کرن پھول در کان
گو ہر لولو، موتی کہیے، مونگا ہے مرجان

امیر خسرو نے اپنی شاعری کے ذریعے ایک طرف عوام کا دل موہ لیا تو دوسری طرف نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام بنی نوع انسان کو ایک پیغام بھی دیا ہے۔ قوموں کی تہذیب و تمدن اور اُن کی بقا کا انحصار وسیع المشربی، رواداری، وسیع النظری اور وطن پر ہے۔ خسرو کے اشعار اور حالات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن میں گنگا جمنی تہذیب کو رواج دینا چاہتے تھے جس کی سرزمین آملکی ہو اور بالائی ڈھانچہ ایران کا۔ ہر شخص اپنے عقائد اور افکار میں آزاد ہو۔ اُن کی شاعری اس بات کا ثبوت ہے کہ انکو اپنے ملک اور اس کی ہر روایات سے بے پناہ محبت تھی۔ اُن کی والدہ ہندی نژاد تھیں انھوں نے ہندوستان کی فضا میں آنکھ کھولی اور اپنے فکر و تخیل کے لیے یہیں سے مواد حاصل کیا۔ اس طرح انھوں نے اپنی بلند نظری، فراخدلی اور حب الوطنی کا ثبوت بھی مہیا کیا۔ خسرو سے قبل سنسکرت ادب میں وطن پرستی کا اتنا ہمہ گیر جذبہ ملتا ہے اور نہ ہی خسرو کے عہد میں علمی، ادبی، مذہبی اور سیاسی سطح پر حب الوطنی کا کوئی تصور پایا گیا۔

مختصر یہ کہ امیر خسرو ہندوستان کے ایک زبردست قادر الکلام اور دیدہ ور شاعر تھے۔ اُنھوں نے ہندوستان میں شعر و ادب، علم و فن اور موسیقی، تعمیر اور متحدہ قومی تہذیب کے سلسلے میں جو بے پناہ محنت کی ہے وہ یاد رکھے جانیکے قابل ہے۔ اسی وجہ سے ہر دور کے ممتاز شعراء اور سربلند ادباء نے اُن کی خداداد صلاحیتوں اور شاعرانہ عظمتوں کا اعتراف کیا ہے۔

ڈاکٹر ولی الحق انصاری
صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

طوطئ ہند امیر خسرو دہلوی
بحیثیت فارسی غزل نگار

زمن پرس ذوقِ سخنہای خسرو
کہ من آں رہ وساز رامی شناسم

عرفی شیرازی نے اپنے ایک قصیدہ میں فخریہ انداز میں کہا ہے کہ ؎

بروحِ خسرو ازیں پارسی شکر دادم
کہ کام طوطئ ہندوستاں شود شیریں

اس طوطئ ہندوستاں کی شیریں بیانی کا اگر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس کا انحصار اس کے قصائد و مثنویات پر اتنا نہیں جتنا اس کی غزلیات پر ہے۔ وہ بھی عرفی کی طرح "قبیلۂ عشق" کا ایک فرد تھا اور اگرچہ اس نے غزل کو وظیفہ بنانا تو درکنار کبھی اپنے کو غزل گو کہلوانا بھی پسند نہ کیا لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہی صنفِ سخن اس کی شہرتِ دوام کا باعث بنی اور قصائد جو اس کی زندگی کا سرمایہ تھے یا مثنویات جنھیں وہ اپنے لئے مایۂ افتخار سمجھتا تھا، ادبی حیثیت سے طاق کی زینت بن گئے۔

فارسی غزل کی ابتدا خسرو کے عہد سے بہت ہو چکی تھی اور اس کے پیشروؤں میں رودکی، خاقانی، انوری سب ہی نے غزلیں کہی تھیں لیکن وہ اسے ا مستقل ممتاز صنفِ سخن نہ بنا سکے تھے۔ شیخ سعدی حیثیت سے یقیناً اپنے پیشروؤں سے ممتاز اور نمایاں رکھوں نے صنفِ غزل کو دوسرے اہم اصنافِ سخن م قصیدہ و مثنوی کے برابر لا کھڑا کیا۔ انھوں نے غزلیں اور اچھی کہیں لیکن ملک الشعراء بہار کے الفاظ میں ا دریای عقل کا موتی ہے یا وہ کلام ہے جو ایک دل سے گر کانوں کے راستے دوسرے دل میں سرایت کرجاتا ہے ا کی غزلیات اچھی ہونے کے باوجود اچھا ستعا[illegible] کہی جا سکتیں اسلئے کہ وہ سوز و گداز، جوشِ بیا

خلوص و خیالات کی غزلوں کے اشعار میں اس شدت سے نہیں ہے جیسا معیاری اشعار میں ہونا چاہیے۔ اشعار غزل کو یہ کیفیتیں عطا کرنے والا اور غزل کو صحیح معنی میں غزل بنانے والا ایک ایرانی نہیں بلکہ ہندوستانی ہے جس کا لوہا اہلِ ایران کو بھی ماننا پڑا۔ اور وہ شاعر شیریں بیان طوطیٔ ہندوستان امیر خسرو ہے۔ جس کی غزلیات کیا بحیثیت ہیئت اور کیا بحیثیت معنی مکمل غزلیں ہیں جن کے اشعار شعر کی کسی بھی تعریف کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔

خسرو کی غزلیات میں حسنِ معنی اور حسنِ صورت دونوں بدرجۂ اتم موجود ہیں وہ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے موسیقار بھی تھے۔ وہ شعر کی تاثیر کے ساتھ ساتھ نغمہ کی کشش اور اثر سے بھی واقف تھے ان کی غزلیات شعر و موسیقی کا امتزاج ہیں اور ظاہر ہے کہ جس کلام میں ان دونوں فنونِ لطیفہ کی کیفیتیں موجود ہوں اس میں تاثیر کیوں نہ پیدا ہوگی۔

خسرو نے اپنی غزلیات کے لئے مترنم بحریں اختیار کیں۔ انھوں نے ردیف و قافیہ کے انتخاب میں بھی موسیقی کو پیشِ نظر رکھا اور الفاظ کی ترتیب و نشست میں بھی نغمگی کا انھیں خیال رہا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی غزلوں کے بیشتر اشعار میں تیر و نشتر کے خواص پیدا ہوگئے اور کوئی تعجب کی بات نہیں اگر ان کے ایک شعر پر وجد کرتے ہوئے ملا علی احمد جان بحق تسلیم ہوگئے[1] انھوں نے اپنی غزلوں کے لئے چھوٹی اور بڑی دونوں قسم کی بحریں

---

[1] وہ شعر یہ ہے ؎ ہر قوم راست راہی دینی و قبلہ گاہی
من قبلہ راست کردم برطرف کجکلاہی

استعمال کیں۔ لیکن ہر حال میں کلام کی شگفتگی، تاثیر اور روانی ان کے پیشِ نظر رہی جس کی مثالیں انکے کلام میں بکثرت موجود ہیں۔ چند ایسی شگفتہ غزلوں کے مطلع درج ذیل ہیں ؎

جانِ من از آرام شد آرام جانِ من کجا
ہجرم نشان فتنہ شد، فتنہ نشانِ من کجا

بشگافت غم ایں جان جگر خوارۂ ما را
یارب چہ وبال آمدہ سیارۂ ما را

بشگفت گلہا در چمن ای گلستانِ من بیا
سر دالیستادہ منتظر سرو روان من بیا

جز صورتِ تو ماہ سما را چہ تواں گفت
جز طرۂ تو دام بلا را چہ تواں گفت

از چشم تو کہ ہست ز تو جان شکار تر
دل نیست در جہاں ز دل من فگار تر

دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا
تنم در بیدلی بیچارہ شد، بیچارہ تر بادا

چوں بگیتی ہر چہ می آید رواں خواہد گذشت
خرم آنکس کو نکو نام از جہاں خواہد گذشت

ہر دی چوں تو در خلخ و نوشاد نباشد
ایں تازگی اندر گل و شمشاد نباشد

ای ترک کمان ابرو من کشتۂ ابرویت
ملک ہمہ ہند و چین بدہم بہ یکی مویت[1]

---

[1] حافظ کا مشہور مطلع اس شعر کی بازگشت معلوم ہوتا ہے ؎
اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

دل فسردهٔ بالای یکی تنگ قبا شد
باز این زبرای دل تنگم چه بلا شد

زاہد ما دوش باز در رہ بت پا نہاد
دین قلندر گرفت خانۂ یغما نہاد

مناز ای بت چنیں کہ چنیں ہم نماند
قرار جہاں این چنیں ہم نماند

تنگ نبات چوں بود، لب بگشا کہ ہمچنیں
آب حیات چوں رود، خیز بیا کہ ہمچنیں

جاناں روان کن راحتی اے راحت جان ہمہ
با ما ہمہ تلخی مکن ای شکرستان ہمہ

باز ہی ابر بہاری از کجا آید ہمی
کز بلای جان مسکیناں بلا آید ہمی

چھوٹی بحروں میں روانی اور شگفتگی کے ساتھ شعر کہنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن خسرو کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں کم از کم الفاظ میں اپنے لطیف خیالات کو ادا کرنے کی کتنی صلاحیت تھی۔ ان کی سیکڑوں غزلیں چھوٹی بحروں میں ہیں لیکن ایسی غزلوں میں بھی وہی شگفتگی، وہی حسن، وہی دلکشی، وہی ترنم موجود ہے جو ان کی مترنم بڑی بحروں میں کہی ہوئی غزلوں میں پایا جاتا ہے۔ چند ایسی غزلوں کے مطلعے درج ذیل ہیں:-

با غم عشق تو می سازیم ما　　با تو پنہان عشق می بازیم ما

دیوانہ شدم در آرزویت　　ای چشم جہانیاں برویت

مارا دل زار مستمند است　　وا دیختہ خم کمند است

مرا در سر ہوای نازنینی ست
کز و تاراج شد ہر جا کہ دینی ست

مفلسی از بادشاہی خوشتر است
مفسدی از پارسائی خوشتر است

تن پاکت کہ زیر پیرہن است
وحدہٗ لاشریک لہ چہ تن است

یار ما دل ز دوستاں بر داشت
مہر دیرینہ از میاں بر داشت

رخ آں شوخ پنہانی ببینید
کمال صنع یزدانی ببینید

دل ما را شکیب از جان نباشد
ور از جان باشد از جانان نباشد

جفا کن بو کہ این دل باز گردد
دمی با جان من دمساز گردد

گرمہ چو تو با جمال باشد
خورشید کم از ہلال باشد

گل رنگ نگار ما ندارد
بوی خوش یار ما ندارد

با یار زمن خبر بگوئید
دی راز نهفته تر بگوئید

زہی روی شگفتہ لالہ زاری
در حسن ترا گل پردہ داری

ای آرزوی ہزار سینہ
وندر دل تو ہزار کینہ

تا دل نہ تو ام بغم نشستہ
جان در گذر عدم نشستہ

لیکن اس سے صرف یہی نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ خسروؔ کے کلام کا ترنم محض مترنم الفاظ اور بحروں کا مرہونِ منت ہے۔ ایک بڑا شاعر الفاظ کا پابند نہیں ہوتا بلکہ الفاظ اس کے پابند ہوتے ہیں اور یہ بات خسروؔ کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انھوں نے ایسے مشکل قوافی میں بھی غزلیں کہی ہیں جن میں شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے شعر کہنے کی ہمت کی ہو۔ اسی طرح انھوں نے مشکل زمینوں اور طویل ردیفوں میں بھی غزلیات کہیں لیکن کہیں بھی انکے کلام کی روانی، نغمگی اور دلکشی میں فرق نہیں آنے پاتا۔ ان کی درج ذیل غزلیں ان کی اس خصوصیت کی آئینہ دار ہیں :-

سروی چو در او چہ و تر تنز نباشد
گل مثل رخ خوب تو البتہ نباشد
زد ند قبا بر قدت از گل سوری
تا خلعت زیبای تو از لتہ نباشد
در جنت فردوس کسی را نگذارند
تا داغ غلامی تواش بپتہ نباشد

این حسن و لطافت کہ تو کافر بچہ داری
در چین و خطا و ختن و ختہ نباشد

یا ایک دوسری غزل کے یہ چند اشعار :-

آب حیات من کہ نم از من دریغ داشت
خاک رہش شدم، قدم او زمن دریغ داشت
من ہر شبی نشستہ ز ہجرش بروز غم
او پرسش بروز غم از من دریغ داشت
گرگہ بہ بوی او شدمی زندہ پیش ازیں
آن نیز باد صبحدم از من دریغ داشت
کردند اگر وفا کم اگر بیش نیکوان
او ہر چہ ہست بیش و کم از من دریغ داشت

یا درج ذیل غزل :-

دل رفت ز تن بیرون، دل ار ہماں در دل
افتادہ سخن در جان، گفتا رہماں در دل
گفتم کہ کنم یادش، ماند کہ بماند جاں
شد کیسہ ہمہ خالی طرار ہماں در دل
یک شہر پر از خوباں دہ باغ پر از گلہا
صد جای ہم دیدہ دلدار ہماں در دل
در کعبہ و بتخانہ ہر جا کہ رود خسروؔ
دل باد ز تو بد خود بیدار ہماں در دل

یا یہ غزل :-

عمرم در آرزوی تو رفتست و میرود
صبرم بجستجوی تو رفتست و میرود
رفتی و بوی زلف تو ماند و ہزار دل
دنبال تو ببوی تو رفتست و میرود

یا ان کی یہ مشہور غزل :-

دلم در عاشقی آوارہ شد، آوارہ تر بادا
تنم از بیدلی بیچارہ شد، بیچارہ تر بادا
شنیدم عزیزان زلف تو عیاری دارد
بخوبی غمزہ ہا چشم تو عیارہ تر بادا
رخت تازہ است بہر مردن خون تازہ تر خواہم
دلت خارہ است، بہر کشتن من خارہ تر بادا
گر آن زاہد دعائی خیر میگوئی مرا این گو
کہ این آوارہ کوی بتان آوارہ تر بادا
ہمہ گویند کز خونخواریش خلقے بجان آمد
من این گویم کہ بہر جان من خونخوارہ تر بادا
چو با تر دامنی خو کرد خسرو با دو چشم تر
بآب چشم پاکان دامنش ہموارہ تر بادا

یہ سنگلاخ زمینیں ہی ان کی ایجاد نہیں ہیں بلکہ انھوں نے ایک سے زیادہ شگفتہ طرحیں بھی نکالیں اور ان میں ایسی غزلیں پیش کیں جو زمانہ مابعد کے شعرا کے لیے نمونہ بن گئیں اور حافظ اور عرفی ایسے قادر الکلام شاعروں تک نے ان پر غزلیں کہنا فخر سمجھا مثلاً[1] ؎

من بندۂ آن روی کہ دیدن نگذارند
دیوانۂ زلفی کہ کشیدن نگذارند　　یا

نہ پندارم کہ من در سینہ سودائی دگر دارم
زباں با خلق در گفت است و دل جائی دگر دارم

خسرو عروض دانی کے مدعی نہ تھے پھر بھی اپنی موزونیت طبع کے بل پر انھوں نے ایسی مشکل بحروں میں بھی غزلیں کہیں جن میں شعر کہنا آسان نہیں ہے۔ مثلاً انکی درج ذیل غزلیں ملاحظہ ہوں ؎

روزگاری است کہ در خاطرم آشوب فلان است
روزگارم چو سر زلف پریشان از آن است
ما ہمانیم کہ بودیم و زیارت بہ ارادت
یار مشکل ہمہ آنست کہ با ما نہ ہمان است
سرو دغافل و آنگہ نکنند نیز نگاہی
زانکہ خسرو ز پیش نعرہ زنان جامہ دران است

ای نازنین کہ ماہ منی امشب　　یا
رحمی بکن چو شاہ منی امشب

طرز ادا شاعری کا دوسرا نام ہے، خیال ایک ہی ہو سکتا ہے لیکن دو مختلف شاعروں کے انداز بیان اور طرز اظہار ان کے اشعار میں زمین و آسمان کا فرق پیدا کر سکتے ہیں خسرو کے یہاں خیالات کی ندرت زیادہ نہیں ہے لیکن جن خیالات کو بھی انھوں نے اپنے اشعار میں ادا کیا ہے ان میں اپنے انوکھے طرز ادا سے ایک خاص کیفیت پیدا کر دی ہے۔ بات وہ وہی کہتے ہیں جو دوسروں نے بھی کہی لیکن ان کا انداز بیان کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ان کی کہی ہوئی بات بالکل نئی معلوم ہوتی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار جن میں انکا انداز بیان نمایاں ہے درج ذیل ہیں ؎

دی زہد فروختیم بسیار
امروز ز می بہانہ گیرم

---

[1] ان دونوں غزلوں کی زمینوں میں عرفی کی غزلیات موجود ہیں جن کے مطلعے درج ذیل ہیں ؎

گر باد شوم بر تو وزیدن نگذارند
در حسن شوم، روی تو دیدن نگذارند
لبش در گفتگو و من تمنائی دگر دارم
زمین را بوسم اما چشم بر جائی دگر دارم

ان کے علاوہ بھی متعدد عرفی کی ایسی غزلیں ہیں جو خسرو کی غزلوں کی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ یہی حافظ کا بھی حال ہے۔

غمزهٔ تو همه روز با مداد بود
که آفتاب نیارد شدن بلند آنجا

چون مست را خبر نبود از جفائی دهر
بر هوشیار نیز شراب و کباب نیست

آنچه یک خند آب حیوان کرد
لب لعلت هزار چندان کرد

ز من چون دل ربودی رفت جان نیز
که در دل داشت شوقت این و آن نیز

بپرسی که چگونه‌ای، چه گویم
کز مرده برون نیاید آواز

بتم ناگه آمد به پیش و ز دستم
فرو ریخت هر گل که برچیده بودم

بر رندی و بشوخی و بصد ناز
دل از من برد و آنگه پارسا شد

شب که بخنده زدی بر جگر من نمک
قابل مرهم نماند داغ که بر سینه بود

دی همی رفت و زلبش دیده که غلطیده بخاک
گفت یارب که کجا پای نهم راه کجاست

ازین ره رفت خسرو، خلق گویند
چو بیند جا بجا از خون نشانها

عالم تمام پر ز شهیدان خفته گشت
ترک مرا خدنگ بلا در کمان هنوز

هردم کرشمهائے وی افزون دآنگهی
خسرو ز بند او به امید امان هنوز

هر دو عالم قیمت خود گفته‌ای
نرخ بالا کن که ارزانی هنوز

خیالات خواہ کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں لیکن اگر لطفِ بیان نہ ہو تو شعر محض فلسفہ، منطق یا کچھ اور بن کر رہ جاتا ہے غزل کے لئے تو خصوصاً ایک خاص زبان اور مخصوص فصیح اور شیریں الفاظ درکار ہوتے ہیں۔ یہی شیرینیٔ الفاظ اور لطفِ زبان ہے جس نے حافظ کو فارسی کے بزرگ ترین شعرا کی صف میں لا کھڑا کیا ہے لیکن اس میدان میں بھی اہلِ زبان نہ ہونے کے باوجود خسرو کسی بھی ایرانی شاعر سے حتیٰ کہ حافظ تک سے پیچھے نہیں ہیں اور فارسی کے بزرگ ترین شاعر بھی ان کی زبان کی لطافت و فصاحت کے معترف ہیں اور خود انھیں بھی اپنی زباندانی پر ناز ہے جس کا کہ انھوں نے حافظ ہی کی طرح جا بجا اپنے اشعار میں اظہار کیا ہے۔ مثلاً

دانی که هستم در جهان من خسرو شیرین زبان
گرنائی از بهر دلم، بهر زبان من بیا

من خسرو شکرشکن اما بذکر دوست
خواهم ز ذوق کام و زبان را فرو برم

بردن نمی رود از کام تلخی هجرم
اگرچه من بسخن خسرو شکر خایم

ان کی غزلیات میں سہل ممتنع کی مثالیں بے شمار ہیں سیدھی

سادگی اور روزمرہ کی زبان میں وہ اس طرح شعر کہتے ہیں گویا محبوب ان کے سامنے موجود ہے اور اس سے وہ بے تکلفی کے انداز میں گفتگو کر رہے ہیں۔ اس لطف بیان اور فصاحت کلام کے نمونے ان کی ہر غزل میں ملتے ہیں مثال کے طور پر یہاں مشتی از خرداری چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں

شگفت گلہا در چمن، ای گلستان من بیا
سرو ایستادہ منتظر، سرو رواں من بیا
از گریۂ من ہر طرف پر لالہ و گل شد زمیں
وقتی بگلگشت ای صنم در گلستان من بیا
ہر طرۂ تو آفتی ہر نرگس تو فتنہ ای
گرچہ بلای عالمی، از بہر جان من بیا

جان من از آرام شد آرام جان من کجا
ہجرم نشان فتنہ شد، فتنہ نشان من کجا
آمد بہار مشک دم سنبل دمید و لالہ ہم
سبزہ بصحرا زد قدم، سرو رواں من کجا
از گریہ ماندم پا بگل وز دوستان گشتم خجل
جان از جہاں بگسست دل، جان و جہان من کجا

بعد ازیں با کس نہ پیوندیم دل
بعد ازیں با خود نپردازیم ما

ما بیخبر نظارہ بودیم
جان رفت و خبر نکرد ما را

ای ترک کمان ابرو من کشتۂ ابرویت
ملکی ہمہ ہندوچین بدہم بیکی مویت

مسجد چہ روم چندیں آخر چہ نماز است ایں
روئیم بسوی قبلہ دل جانب ابرویت

ماجرای دوش میپرسی کہ چوں بگذشت حال
ای سرت گردم، چہ میپرسی، بدشواری گذشت

نظارہ ہم نکرد کہ سوختن مرا
آنکس کہ آتشم زد و از من کراں گرفت

زلفین تو سرگشتہ چو باد سحرم کرد
خاک سر کویت چو صبا دربدرم کرد

سروی چو تو در خلخ و نوشاد نباشد
ایں تازگی اندر گل و شمشاد نباشد
گفتی کہ سرت خاک کنم بر سر ایں کو
ای خاک بران سر کہ بدیں شاد نباشد

زاہد ما دوش باز در رہ بت پا نہاد
دین قلندر گرفت خانۂ یغما گذاشت
دل کہ بہ تسبیح داشت در خم زنار بست
سر کہ بمحراب بود پیش چلیپا نہاد

در شہر فتنۂ شد میدانم از کہ باشد
ترکیست صید افگن، میدانم از کجا باشد
ای شمع رخ تو مطلع نور
زیں حسن و جمال چشم بد دور
زہی دیدہ کز شوخی و چابکی کجا می نماید کجا می زند
از چشم تو کہ ہست ز جان فگار تر
دل نیست در جہاں ز دل من فگار تر

پندکہ گویند بہ دلسوزیم   سوختہ را سوختہ تر می کنند

بی رخت از پا فتادم بی لبت رفتم ز دست
قدر بلبل گل شناسد قدر بادہ می پرست

مست من چون جرعہ نوشی بادہ بر من بریز
در دجام خود بریں رسوای مرد و زن بریز

دل ز من بردی و در جانی ہنوز
درد با دادی و درمانی ہنوز

آشکارا سینہ را بشگافتی
ہمچناں در سینہ پنہانی ہنوز

ملک دل کردی خراب از تیغ کیں
وندریں ویرانہ سلطانی ہنوز

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ ای
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

نازنیناں و چار بالش ناز   خاکساران و آستان نیاز
ای کہ تعلیم کنی در عشق   یک نظر بر جمال او انداز

گر فتنۂ عشق بیدار نشد   کہ خلوت نشیں سوی خمار شد
بگوئید با پیر دیر مغاں   کہ ایں کفر و تسبیح زنار شد
ایا عاشقاں موسم زار نیست   کہ احوال یاراں چنیں زار شد
ایا دوستاں موسم یار نیست   کہ کارم بدینگونہ دشوار شد

نہ قراری کہ لب فرو بندم   نہ مجالی کہ بر کشم آواز

ترک سفید روی و سیہ چشم و لالہ رنگ
مثلت نزاد مادر ایام شوخ و شنگ
زلف تو بر رخ تو ہر آں کس کہ دید گفت
بگرفت ملک چین و حبش بادشاہ زنگ

با تیر چشم جادو و ابروی چوں کماں
داری قد کشیدہ تر از قامت خدنگ
در سنگ سیم باشد و ایں طرفہ تر کہ تو
داری درون سینۂ سیمین دلی چو سنگ

نی دسترسی نہ یار دارم   نی طاقت انتظار دارم
ہر جور کہ از تو بر من آید   از گردش روزگار دارم

شعر کی ظاہری و معنوی لطافت میں حسین تراکیب، بدیع استعارات، لطیف تشبیہات، اور برمحل صنائع و بدائع کا استعمال خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ خسرو کی غزلیات کا ایک سرسری مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ تمام لطائف شعری ان کے کلام میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ نہایت سلیقہ اور لطافت سے برتے گئے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف مستعمل تشبیہات کو استعمال کیا ہے بلکہ نئی تشبیہات و استعارات سے فارسی غزل کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ اسی طرح بہت سی تراکیب بھی ان کی اپنی ایجاد کردہ ہیں۔ صنائع بدائع کے استعمال میں انھوں نے اپنی نثری تصنیف اعجاز خسروی میں الگ راستہ اختیار کیا ہے اور مختلف صنعتوں کو اس بے ساختہ انداز میں برتا ہے کہ شعر کی لطافت میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے پاتا بلکہ اسکے حسن میں اضافہ ہوتا ہے، مثال کے طور پر چند اشعار پیش ہیں :-

چو مشک ما ہمہ کافور شد از سردی عالم
جوانان راز ما دل سرد شد کو آں جوانیہا
مخندای کامران عیش بر تلخی عیش من
کہ من ہم داشتم اندازۂ خود کامرانیہا
ز نقد خوشدلی مفروش دو روزہ حیات خود
کہ خواہد رایگاں رفتن متاع کامرانیہا

گل من سبزه زاری کرد پیدا
زمانه نو بهاری کرد پیدا

زلفت سرو پاشکسته زان است
کز سرو بلندت او فتاده

در خم گیسوی کافر کیش داری تا رها
هر گره کردن باکاست این زنار ها

یارسیم انداز من آخر کجاست
یارب او سیمرغ شد یا کیمیاست

باز آی و بنشین ساعتی آخر چه کم خواهد شدن
گر شادگردانی دمی یاران غم فرموده را

دیوانه میکنی دل خانه خراب را
مشکن نیاز سلسلهٔ مشک ناب را

من چو ز سر خواستم چشم تو یکبار جست
خنجر تو ده بدست ترک کهن کینه را

می نالم از بلای تو میریزم آب چشم
این نالهٔ من است بگویا صدای آب

چون شدی در تاب از من داد دشنام رقیب
سگ زبان بیرون کند چون گرم گردد آفتاب

افسوس ازین عمر که بر باد هوا رفت
کاری به جهان نی بمراد دل ما رفت

جان دید چو خونریزی سلطان خیالش
بسته کفن و تیغ و بزیر علمش رفت

ز سلطان خیال اقطاع غم شد، چون کنم
شحنهٔ جان را ز سلطان خرد منشور هست

آب حیات من که نم از من دریغ داشت
خاک رهش شدم، قدم از من دریغ داشت

ای سلسبیل راحت وای چشمهٔ حیات
بر تشنگان سوخته لطفی، که در همند

گرچه پر داغ است جان من ز هجران نگار
داغ مهرش بر جبین دوستی دارم هنوز

دو چشمت آفت دلهاست هر یک
دو زلفت عقد مشکلهاست هر یک

ز بند دو جهان آزاد گردم
اگر تو همنشین بنده باشی

ترک سپید روی و سیه چشم و لاله رنگ
مثلت نزاد مادر ایام شوخ و شنگ

بر خاک درت رفتیم و رفتیم
دعای دولتت گفتیم و رفتیم

بیرون میا ز پرده که ما را شکیب نیست
اینک بلند گفتمت از کس حجیب نیست

برماست نظم خسرو نازک زنی ندانم
کاهو هندوم من یا اشتر حجیزم

فقر است و صد هزار معانی درو چو موی
آنرا گلیم کرده و در سر کشیده ام

درد سرش به از سر است و من سر بریده را
آن سر کجا که در سر آن درد سر کنم

ای زده ناوکم بجان یک دو سه چار و پنج و شش
کشته چو بنده هر زمان یک دو سه چار و پنج و شش

گفته بوعده که گهی یک شب از آن تو شوم
روز گذشته در میان یک دو سه چار و پنج و شش

گفت صبا ز غیرتم کاید اگر ز کوی تو
همره بوی تست جان یک دو سه چار و پنج و شش

بیش در تو ہر نفس از ہوس دہان تو
بوسہ زنم بر آستاں یک دو سہ چار د پنج و شش
منع دو چشم کن کہ شد از دل خستہ ہر دمی
رایت آں دو ناتواں یک دو سہ چار د پنج و شش
گاہ نظارہ چوں کہ تو جلوہ کنی جمال را
کشتہ شوند عاشقاں یک دو سہ چار د پنج و شش

گفتم کہ ترا آخر دل خانہ نمی باید
گفتا کہ پے گنجم ویرانہ نمی باید
گفتم کہ بسوزم جاں بر آتش روی تو
گفتا کہ چراغم را پروانہ نمی باید
گفتم کہ شوم محرم در مجلس خاص تو
گفتا کہ حریف ما دیوانہ نمی باید
گفتم کہ بدام غم ہر لحظہ مرا مفگن
گفتا کہ چنیں مرغی بی دانہ نمی باید
گفتم کہ ز عشقم ده پروانۂ آزادی
گفتا خط عارض بیں، پروانہ نمی باید
گفتم کہ بود مونس در ہجر تو خسرو را
گفتا کہ خیال ما بیگانہ نمی باید

زہی نمودہ از آں زلف و عارض و لب خوب
یکی سواد و دوم نقطہ و سیم مکتوب[1]
سواد و نقطہ و مکتوب اوست بر دل من
یکی بلا و دوم فتنہ و سیم آشوب
بلا و فتنہ و آشوب او بود ما را
یکی مراد و دوم مونس و سیم مطلوب
مراد و مونس و مطلوب ہر سہ از من شد
یکی جدا و دوم غالب و سیم مطلوب

---

[1] شمس الدین محمد بن قیس رازی نے سیاقۃ الاعداد کی ایسی ہی چند دوسری مثالیں بھی دی ہیں جو درج ذیل ہیں ؎

بمن نمود رخ و چشم و زلف آں دلبر
یکی عقیق و دوم نرگس و سوم عنبر ۴۴

۴عقیق و نرگس و عنبرش ببستند نداز من
یکی حیات و دوم قوت و سوم پیکر
حیات و قوت و پیکر سہ مایہ بود مرا
یکی ضعیف و دوم قاصر و سوم لاغر
ضعیف و قاصر و لاغر شود بمحنت عشق
یکی سپہر و دوم کوکب و سوم گوہر
(ادیب صابر)

یا

ز عکس روی و لب و عارضش بر ند صفا
یکی سہیل و دوم زہرہ و سوم جوزا
سہیل و زہرہ و جوزا ز نور او شدہ اند
یکی نژند و دوم والہ و سوم شیدا
نژند و والہ و شیدا شوند بیش رخت
یکی پری و دوم لعبت و سوم حورا
(قوامی گنجوی)

بر و لب و رخ دلبند من نمود مرا
یکی لطیف و دوم دلبر و سیوم (کذا) زیبا
لطیف و دلبر و زیبا چو یار من نبود
یکی پری و دوم یوسف و سیوم (کذا) حورا
پری و یوسف و حورا چو او نداشتہ اند
یکی سرشت و دوم سیرت و سیوم (کذا) سیما
(امیر معزی)

حیا و غالب و مغلوب ہر سہ باز آید
یکی غلام و دوم دولت وسیم مرکوب
غلام و دولت و مرکوب با سہ چیز خوش است
یکی حضور و دوم شادی وسیم محبوب
حضور و شادی و محبوب من بود خسرو
یکی شراب و دوم ساقی وسیم محبوب

خسرو کی غزلیات کے مضامین کا جہاں تک تعلق ہے ان میں بھی رنگا رنگی نظر آتی ہے۔ ان کی بیشتر غزلوں میں تغزل اپنے لفظی معنی میں نمایاں ہے۔ اس قسم کے اشعار میں شوخی، رندی۔ سراپائے محبوب، معاملہ بندی وغیرہ کے مضامین کو خسرو نے نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ ان کے اس قسم کے اشعار میں بے ساختگی اور روانی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور بہترین انداز میں جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ محبوب کے ایک ایک انداز کو انھوں نے نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ وہ بلائے جان ہوتے ہیں لیکن محبت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب انکے مظالم کو ظلم سمجھنا خود ایک ظلم ہوتا ہے عشق محبوب رگ و ریشہ میں پیوست ہوتا ہے لیکن یہی غم جاناں حاصل حیات بھی ہوتا ہے اور اسکی بیقراریاں ہی قرار بن جاتی ہیں۔ یہ غم وہ کیفیت ہوتا ہے جسمیں سوی اپنے کوئی محرم راز اور غمگسار ہو ہی نہیں سکتا۔ ان تمام خیالات اور عشق و محبت کی کیفیتوں کو خسرو نے اپنی غزلیات میں پیش کیا ہے اور اسی خاص رنگ تغزل میں کہے گئے ان کے بعض اشعار ایسے ہیں جن کا جواب آئندہ بھی کوئی شاعر نہ پیش کر سکا۔ اور ایسے ہی اشعار خسرو کی حیات جاوید کے ضامن ہیں۔ انکے ایسے چند اشعار جن میں ان کا یہ رنگ نمایاں ہے پیش کئے جاتے ہیں ؎

دل ز تن بردی و در جانی ہنوز
دردہا دادی و در مانی ہنوز
آشکارا سینہ ام بشگافتی
ہمچناں در سینہ پنہانی ہنوز
ملک دل کردی خراب از تیغ کیں
واندریں ویرانہ سلطانی ہنوز
ہر دو عالم قیمت خود گفتہ ای
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز
خون کس یارب نگیرد دامنت
گرچہ در خون نا پشیمانی ہنوز
جان ز بند کالبد آزاد گشت
دل بگیسوی تو زندانی ہنوز

عالم تمام پر ز شہیدان فتنہ گشت
ترک مرا خدنگ بلا در کماں ہنوز
ای ساقی بدمست مزن تیغ کہ در تن
خوں آنقدرم نیست کہ در جام برآید
سرتا بقدم جملہ ہنر و اردو خوبی
عیش ہمہ آنست کہ بیندہ نسازد
برندی و بشوخی و بصد ناز
دل از من بردو انگہ پارسا شد
وفا و مہربانی کرد یا خلق
چو دور خسرو آمد بیوفا شد
از جاشنی درد جدائی چہ آگہ اند
یک شب کساں کہ تلخ نکردند خواب را
ز عشقش گاہ میرم گہ زیم باز
طریق زندگانی من این است

ببرد جانم وای کاشکی ندهد باز
براد بوسه و یارب که باز بستاند

ز بهر آنکه نه بینم برابرت سایه
زدود سینه جهانی سیاه خواهم کرد

دل بسی برده ای نکو بشناس
آنکه مجروح تر از آن مست

اگر به تیغ ببرند بند بند مرا
تو ذکر وصل خودم کن که باز پیوندم

اگر قضاست که میرم بعشق تو آری
بکارهای قضا و قدر چه کار مرا

بجاعتم طلبند و بعشرتم خوانند
من و غم تو بکار دگر چه کار مرا

آفت جمال شاهد و ساقیست بیهده
بد نام کرده اند شراب و کباب را

دی همی رفت و زبس دیده که غلطیده بخاک
گفت یارب که کجا پای نهم، راه کجاست

وز کجا گشت پدید این همه خوبان یارب
آسمان این چه بلا بود، که بر ما داشت

عاشق و مستم و رسوائی خویشم هوس است
هرچه خواهم که کنم، هیچ مگوئید مرا

دل ندارم غم جانان زچه بتوانم خورد
بیش از این گرچه غمی بود، دلی هم بود است

ستمی کز تو کشد مرد، ستم نتوان گفت
نام بیداد تو جز لطف و کرم نتوان گفت

عاشق سوخته دل زنده بجان دگر است
زین جهانش چه خبر کو بجهان دگر است

بار عشقت بر دلم باری خوش است
کار من عشق است و این کاری خوش است

بتی کز دیدنش جان مست گردد
درون جان من پیوست گردد

ما بی‌خبر از نظاره بودیم
جان رفت و خبر نکرد ما را

نه قراری که لب فرو بندم
نه مجالی که بر کشم آواز

مده پندم که من در سینه سودای دگر دارم
زبان با خلق در گفت است و دل جای دگر دارم

همی خواهم ترا بینم نظر سوئی که من دارم
بخوبان دیدنم خوش شد، عجب خوئی که من دارم

زین غم که بکس نمیتوان گفت
شبهاست که غمگسار خویشم

گفت از رویم آرزوی تو چیست
آرزویم همین که می بینم

نتوان رنج عشق او بشنید
من بیچاره بین که می بینم

من از دست دل دوش دیوانه بودم
همه شب در افسون و افسانه بودم

دل و جان و تن و خیالش یکی شد
همین من در آن جمع بیگانه بودم

گذشت آنکه من صبر و دین داشتم
تو گوئی نه آن و نه این داشتم

عشق و محبت کی کیفیتوں اور حسن کے بیان کے علاوہ رندانہ مضامین بھی تغزل کی جان ہوتے ہیں۔ خسرو کے حالات زندگی سے کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے خود کبھی بھی رندانہ زندگی بسر کی لیکن یہ ان کی شاعری کا اعجاز ہے کہ رندانہ مضامین کو بھی وہ احاطۂ غزل میں اس خوبی سے لاتی ہیں جیسے عاشقانہ اور عارفانہ مضامین کو اور اس قسم کے مضامین کو بھی وہ اس خوبی سے نظم کرتے ہیں کہ گویا وہ ایک زندگی ہائے رندانہ گزار چکے ہیں۔ رندانہ انداز میں کہے گئے اشعار میں خسرو نے بھی تقریباً وہی باتیں کہی ہیں جو انکے بعد خواجہ حافظ نے اپنے اشعار میں پیش کیں۔ حافظ ہی کی طرح جفائی دہر سے نجات پانے کے لئے ہی خسرو بھی شراب کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں اور خیام کی طرح خوش باشی کی تعلیم اس وجہ سے دیتے ہیں کہ کار جہاں کو سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ حافظ اور خیام کی طرح وہ بھی زہد ریائی کے خلاف ہیں اور اس کی کھل کر مذمت کرتے ہیں اور ایسے زہد پر رندی کو ترجیح دیتے ہیں۔ زندگی کا جو لمحہ بھی خوشی خوشی بسر ہو جائے انکے نزدیک وہی حاصل زندگانی ہے۔ ان مضامین پر ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں :۔

رسم قلندر خوش است بی سر و پا زیستن
کار جہان را کسی چون سر و پایے ندید

بت پرستم من مگرہ کہ تو زاہد خوانی
وانکہ تسبیح بدستم نگری، زنار است

آشکارا عشق بازی با بتاں
از نہفتہ زہد ریائی خوشتر است

چوں مست را خبر نبود از جفای دہر
بہ ہوشیار بہ ز شراب و کباب نیست

می نوش کہ دور شادمانیست
خوش باش کہ روزگار فانیست
ہر دم کہ بخوشدلی بر آید
سرمایۂ حاصل جوانیست
ساقی دل مردہ زندہ گرداں
زاں می کہ چوں آب زندگانیست

گاہ خمار صد نیت توبہ می کنم
چوں ساقی آید آں ہمہ از یاد میرود

وقت گل است نوش کن بادہ چوں گلاب را
بلبل نغمہ ساز کن بلبلۂ شراب را

ساغر لالہ ہر زماں باد نشاط می دہد
بیں کہ چہ موسمی است خوش نقل و می و کباب را

خسرو کی شخصیت کے متعلق علما میں اختلاف ہے۔ کچھ انھیں زاہد عبادت گذار اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید کی حیثیت سے ایک درویش کامل سمجھتے ہیں اور ایک دوسرا گروہ دربارداری اور امرا کی صحبت کی وجہ سے خسرو کو محض دنیا دار سمجھتا ہے اور انکے تصوف کو بھی ویسا ہی روایتی تصوف خیال کرتا ہے، جیسا کہ غیر صوفی شاعروں کے کلام میں پایا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک مکمل صوفی تھے اور صوفی کی تعریف میں جو یہ کہا گیا ہے کہ اس کی مثال بط کی ہوتی ہے۔ جس طرح بط پانی میں رہتی ہے لیکن پانی اسکے پروں کو پرواز سے نہیں روک سکتا اسیطرح صوفی دنیا میں رہتے ہوئے بھی علائق دنیوی سے آزاد رہتا ہے۔ خسرو اس قول کی زندہ تفسیر تھے۔ وہ دنیا دار

کی زندگی بسر کرتے تھے، درباروں سے متعلق رہتے تھے۔ درباری شان میں قصائد کہتے تھے، عشقیہ اور رزمیہ مضمون اور واقعات کو نظم کرتے تھے، عوام سے جہلیں کرتے تھے لیکن ان سب باتوں کے باوجود انکی اصل توجہ اصلاح باطن کی طرف تھی اور انھوں نے عرفان کی وہ منزلیں طے کر لی تھیں جن کے بعد وہ حضرت محبوب الٰہی کے محبوب بن گئے تھے۔ عشق انکی فطرت تھی اور حضرت نظام الدین اولیاء کی صحبت میں یہ جذبہ مجاز سے حقیقت کی طرف مڑ گیا تھا۔ وہ دنیا کی حقیقت سے واقف تھے وہ سمجھتے تھے کہ انسانی زندگی کا ہر لمحہ مشیت ایزدی کا تابع ہوتا ہے اور اس میں رد و بدل کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے اور انسان دست مشیت میں محض ایک کھلونا ہے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ آفتاب حقیقت کی منزل بہت بلند ہے اور اس تک اسی وقت رسائی ہو سکتی ہے جب انسان دونوں دنیاؤں سے گذر جائے وہ سمجھتے تھے کہ بندگی نفس سے نجات تزکیہ باطن کے لئے ضروری ہے۔ اور جب نفس کی غلامی سے نجات مل جاتی ہے تو عارف کی ہر شے میں جلوۂ محبوب حقیقی نظر آتا ہے۔ فہم انسانی حقیقت ازلی اور ذات الٰہی کا احصار نہیں کر سکتی اور عقل بشری صفات الٰہی کا حصر کرنے سے قاصر ہے۔ دنیا بے حقیقت شئے ہے اور ماورائی ذات الٰہی جو کچھ بھی ہے اسکی حیثیت سراب سے زیادہ نہیں عقلمند وہ ہے جو ان سے دل نہیں لگاتا۔ خسرو نے ان خیالات کا جا بجا اپنی غزلوں میں اظہار کیا ہے اور ان کا خلوص اظہار اس بات کا گواہ ہے کہ جن کیفیتوں کو انھوں نے بیان کیا ہے وہ ان سے گذر چکے ہیں۔ اپنے ان عارفانہ خیالات کے اظہار میں بھی شاعرانہ طرز ادا اور اظہار بیان کا دامن خسرو کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا بلکہ انمیں جوش بیان اور خلوص اظہار کا اضافہ ہو جاتا ہے خسرو کے عارفانہ کلام کی کچھ مثالیں پیش ہیں :-

رندان پاکباز کہ از خود بریدہ اند
از ہر چہ ہست حسن دلآرام دیدہ اند

آزاد گشتہ اند بکلی ز ہر دو کون
در جان و دل غلامی جانان خریدہ اند

با غم نشستہ اند و ز شادی گذشتہ اند
از تن رمیدہ اند و بجان آرمیدہ اند

از گفتگوی نیک و بد خلق رستہ اند
تا مرحبای از لب دلبر شنیدہ اند

پایۂ آں آفتاب ہست بغایت بلند
کس نرسیدش جز آنک بر دو جہاں پا نہاد

چوں رہروان ز منزل ہستی گذشتہ اند
بی خویش رفتہ اند و بہ مقصد رسیدہ اند

ما بیخبر از نظارہ بودیم   جان رفت و خبر نکرد مارا

ای من غلام دولت آں نیک بندہ ای
کز بندگی نفس بہ آزاد میرود

منازای بت چیں کہ چیں ہم نماند
قرار جہاں این چنیں ہم نماند

نہ جم ماند اینجا نہ نقش نگینش
چہ نقش نگیں، بل نگین ہم نماند

براں دلفریبی کہ گیتی نماید
خرد مند را دل نہادن نشاید

تا دامن از بساط جہاں برکشیدہ ایم
رخت از خرد بکوی قلندر کشیدہ ایم

فقریست وصد ہزار معانی درو چوں موی
آنرا گلیم کردہ و بر سر کشیدہ ایم

عاشق سوختہ دل زندہ بجان دگر است
زیں جہانش چہ خبر کو بجہان دگر است

مائیم و نشان بے نشانی
کس میل دیار ما ندارد

اہل خرد کہ از ہمہ عالم بریدہ اند
دانند خرد کہ از چہ بکنم آرمیدہ اند

دانندگان کہ وقت جہاں خوش بدیدہ اند
خوش وقت شان کہ گوشہ عزلت گزیدہ اند

محرم درون پردۂ مقصود نیستند
جز عاشقان کہ پردۂ عصمت دریدہ اند

عرفان کی منزل طے کرنے کے بعد عارف کی نظر میں ایک بے حقیقت چیز اور مال دنیا کی طرف اہل عرفان کی نظر نہیں اٹھتی اور جب یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ دنیا خود بے حقیقت ہے تو سالک پر یہ بھی حقیقت آشکار ہوجاتی ہے کہ دنیا میں جتنے دن بھی رہنا ہے شائستگی کے ساتھ رہا جائے۔ جتنا وقت بھی یہاں ملے اس کا صحیح مصرف کیا جائے۔ دنیا سے جب جانا ہی ہے تو یہاں جتنا وقت بھی ملے اسے اس طرح بسر کیا جائے کہ یہاں سے جانے کے بعد نیک نامی سے انسان یاد کیا جائے۔ چند روزہ زندگی کو دوسروں کی عیب جوئی میں ضائع کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ خود اپنے محبوب پر نظر ڈالی جائے اور خود اپنی اصلاح کی جائے۔ انسان جو کچھ بھی اہل دنیا سے سنتا ہے وہ خود اسی کی گفتگو کی بازگشت ہوتی ہے۔ وہ جیسا دوسروں کو کہے گا ویسا ہی اپنے متعلق سنے گا بھی۔ خسرو کی حقیقت شناسی نے ان میں جو اخلاقی قدریں پیدا کردی تھیں انھوں نے اپنے اشعار غزل میں بیان کیا ہے جس کے چند نمونے درج ذیل ہیں :-

دولت و محنت چو ہر دو بر کسی تابندہ نیست
زیں دولت غمگین چرا شد زاں دولت شاد چیست

چوں بگیتی ہر چہ می آید رواں خواہد گذشت
خرم آنکس کو نکو نام از جہاں خواہد گذشت

خسروا لبتان متاعی در دکان روزگار
کیں بہار عمر ناگہ رایگاں خواہد گذشت

گر ہوشمند قدمی خسرو مسکیں گہ گاہ
عیب او پوش کہ ایں شیوۂ اہل نظر است

بیدار شو دلا کہ جہاں جائے خواب نیست
ایمن دریں خرابہ نشستن صواب نیست

خسرو نگوی بد کہ دریں گنبد از صدا
خلق انچہ گفتہ اند ہماں راشنیدہ اند

ضائع مکن بخندہ و بازی مثال گل
ایں پنج روزہ عمر کہ برباد می رود

خسرو نہ کود کیم کہ جو ییم سرخ و زرد
چوں بالغان دل از زر و گوہر کشیدہ ایم

خسرو بظاہر ایک خوش مزاج اور بے فکرانسان تھے لیکن ان کی غزلوں کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایک کامیاب مصاحب اور زندہ دل درباری ہونے کے باوجود ان کا دل درد آشنا تھا۔ خانخاناں عبدالرحیم کی مدح میں عرفی شیرازی نے یہ شعر کہا تھا ؎

بمجلس غم گداز و عشرت افزا ایک درخلوت
بہ شادی دشمنش یابی بہ اندہ مہرباں بینی

یہ شعر خواہ خان خاناں کے حسب حال ہو یا نہ ہو خسرو

کے حسب حال ضرور ہے۔ خوش باشی کے باوجود وہ ایک حساس اور غم آشنا دل رکھتے تھے۔ اور ان کی غزلیات بتاتی ہیں کہ غم کس حد تک ان کی زندگی میں رچا بسا ہوا تھا۔ ان کو تکلیف تھی کہ انکے دل میں جو غم ہے وہ ایسا نہیں ہے جسے کوئی بانٹ سکے اور بانٹنا کیا معنی اس کا سمجھنا بھی آسان نہیں۔ اس غم کی موجودگی میں دنیا کے عیش و آرام بیکار ہیں۔ ان کا غم، غم عشق اور غم روزگار دونوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اہل دنیا کی بیوفائی اور چمن روزگار کے گل و غنچوں سے محرومی بھی ان کے غم کا ایک بڑا سبب ہے۔ خسرو نے اپنے اس غم کا اظہار اپنی غزلیات میں جا بجا کیا ہے جس کی چند مثالیں یہ ہیں :-

خسروم من گل از خون دل خود رستہ
بوی من ہست جگر سوز مبوئید مرا

غم کہ مرا در دل است کس نکند باورم
پیش کہ پارہ کنم وای من این سینہ را

برما عتم طلبند و بعشرتم خوانند
من و غم تو، بکار دگر چہ کار مرا

با ہر غمی کہ آید راضی شو ای دل آنرا
با مزا نیا فریدند از بہر بیغمی را

گر باغ پر شگوفہ و گلزار خرم است
مارا چہ سود گر دل ما بستۂ غم است

صد چاک شدہ سینہ و صد پارہ شدہ دل
این بیخبران جامہ دریدن نگذارند

سینۂ خسرو ز غم غنچہ صفت خون گرفت
کز چمن روزگار برگ و نوایی ندید

شب کہ بخندہ زدی بر جگر من نمک
قابل رحم نماند داغ کہ بر سینہ بود

بگذار تا بہ قحط وفا جان دہم از انک
تخم وفا کہ کاشتہ بودیم بر نداد

دانا بے پردہ ای نکو لبشناس
سینہ کہ مجروح تر از ان من است

غزل داخلی کیفیتوں کے اظہار کے لئے موزوں ترین صنف سخن ہے لیکن جہاں سخن معشوق گفتن سے بڑھ کر اس میں فلسفہ و تصوف تک کے خیالات ادا کرنے کی صلاحیت ہے وہیں اس میں یہ صلاحیت بھی ہے کہ خارجی مضامین کو بھی کامیابی سے ادا کیا جا سکے۔ خسرو کی غزلیات اس معنی میں بھی کامیاب غزلیں ہیں۔ ان میں ہمیں بہت سے ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو محاکات کی بہترین مثال قرار دیے جا سکتے ہیں مثلاً ایک غزل میں وہ بہار کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں :-

خیز کہ جلوہ میکند چہرۂ دلکشای گل
عالم بیخودی خوش است خاصہ کہ در ہوای گل

نادکشای بوستاں سکہ بنام گل زدہ
خطبۂ بلبلاں ہمہ نیست مگر ثنای گل

تاج مرصع آورد شاخ ز ہر شگوفہ
تخت زمردیں زند بخت بزیر پای گل

ابر و اسپہ میبرد دبہر نظارۂ چمن
سرو پیادہ میشود پیش درمرای گل

یا ایک دوسری غزل میں محبوب کا سراپا ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :-

ترک سپید روی و سیہ چشم و لالہ رنگ
مثلث نزاد ما در ایام شوخ و شنگ
با تیر چشم جادو و ابروی چون کمان
داری قد کشیدہ تر از صامت خدنگ

حافظ کی طرح خسرو نے بھی اپنی غزلیات میں قصائد کی نسبت بھی بیان کی ہے اور اشعار غزلیات کو بادشاہوں کی مدح کے کام میں بھی لاتے ہیں۔ مثلاً ؎

خجستہ آفتابی در شرف سلطان جلال الدین
کز دہر دم جہاں را طالع فرخندہ می آید

میگوئی ہر دم خسروا سلطان مبارک را دعا
در راست خواہی قبلہ را آن قطب دوران را ببیں

صرف یہی نہیں کہ ذکر معشوق کے بجائے مدح ممدوح کو خسرو نے اپنی غزلوں میں جگہ دی بلکہ قصائد کی ایک دوسری خصوصیت یعنی واقعات کو ایک تسلسل کے ساتھ بیان کرنے کو بھی انھوں نے اپنی غزلوں میں اپنایا۔ دوست کے خط پانے کے بعد کی کیفیت کو درج ذیل مسلسل غزل میں کس خوبی سے بیان کرتے ہیں ؎

چو نام تو در نامہ ای دیدہ ام
قیامت کہ بر دیدہ مالیدہ ام
بیاد زمیں بوس درگاہ تو
سراپای آں نامہ بوسیدہ ام
ز نام تو آں نامہ نامدار
سر بندگی بر نہ پیچیدہ ام
جز این یک ہزار ہشت مکتوب را
وگر نیست باری من این دیدہ ام
کہ آنہا کہ در روی تو خواندہ ام
جوابی ازو باز نشنیدہ ام

یا حسینوں کے متعلق کس طرح سے اظہار خیال کرتے ہیں ؎

زمن بشنو ای دل کہ خوباں چہ چیز اند
عزیزان قومند و قومی عزیزند
بلعلی چو آتش جہانی بسوزند
بہ تیغ مژہ خلق را خون بریزند
کماں ابروانند با تیر غمزہ
بخوں ریختن ہمچو شمشیر تیزند
بجز دوز چشمانش خود کس ندیدہ است
کہ مستاں بہشیار مردم ستیزند
بچشم آہوانند و مردم بصورت
ازاں ہمچو آہو ز مردم گریزند
نشستن بدیشاں کجا میتوانند
کساں کز سر دین و دنیا نخیزند
نیابند یک ذرہ بی مہر ایشاں
اگر خاک خسرو پس از مرگ بیزند

متذکرہ بالا سطور سے اندازہ ہوگا کہ اگر خسرو کو طوطی ہندوستان کہا جاتا ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہے۔ شعر اور خصوصاً غزل کے شعر کے لئے خیالات اور حسین انداز بیان دونوں ضروری ہیں اور غزلیات خسرو کے سرسری مطالعہ ہی سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ خیالات اور طرز ادا دونوں میں خسرو کسی بھی دوسرے غزل گو فارسی شاعر سے کم نہیں ہیں۔

کلامِ خسرو

(ڈاکٹر ولی الحق انصاری صدر شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی)

ڈاکٹر ولی الحق انصاری نے غزلیاتِ خسرو کو اردو غزل کے پیکر میں بڑی خوبی اور روانی کے ساتھ پیش کیا ہے اس سے دونوں زبانوں پران کی قدرت و مہارت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ (مرتب)

آنکہ بردہ است دلم زلف پریشان اینست
آنکہ کشتہ است مرا نرگس فتان اینست

لے گئی دل جو مرا زلف پریشاں ہے یہی
جس نے مارا ہے مجھے نرگس فتاں ہے یہی

آمد آں سرو خراماں و بجا کم بنشست
دہ کہ با جان رود از سرو خراماں اینست

خاک پر آج مری پھرے وہ بت مست خرام
فکر جاں کس کو اگر سرو خراماں ہے یہی

زآشنائی غلطم باشد و می گفت حکیم
دانم آں زود کش و دیر پشیمان اینست

جانتا ہوں کہ ہے اک آفت جاں اس کا خیال
یعنی وہ زود کش و دیر پشیماں ہے یہی

گر غمی گیردت از کشتن من عیب مگیر
چہ کنم خاصیت خون مسلماں اینست

قتل کرنے کا اگر تجھ پہ ہے غم ردِ عمل
کیا کروں خاصیت خون مسلماں ہے یہی

من ہمی گویم سوز خود و تو می خندی
آنکہ بر سوختہ ریزند نمک آں این است

داستان غم دل اس پہ تری خندہ زنی
دل مجروح کے زخموں کا نمکداں ہے یہی

ہمہ شب جان منست و غم ہجراں تا روز
عاقبت در سر ایشان رود ار جاں اینست

جان کے ساتھ غم عشق ہے شب تا بہ سحر
جائیگی عشق بتاں ہی میں اگر جاں ہے یہی

تیغ عشق است و بجا باش نباشد خسرو
سر تسلیم فرود آر کہ فرماں اینست

برش تیغ محبت سے ولی ڈر کیسا
سر تسلیم جھکا، عشق کا فرماں ہے یہی

(۲)

یاران کہ بودہ اند ندانم کجا شدند
یارب چہ روز بود کہ از ما جدا شدند

یاران غمگسار نجانے وہ کیا ہوئے
یارب وہ کیا گھڑی تھی جو ہم سے جدا ہوئے

گر نو بہار آید و پرسد ز دوستاں
گوای صبا کہ آں ہمہ گلہا گیا شدند

پوچھے جو آکے فصلِ گل احوالِ دوستاں
کہ ای صبا کہ گل وہ سنبل گیا ہوئے

ای گل چو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند
آں رو یہا کہ در تہ گردہ فنا شدند

کس حال میں ہیں زیرِ زمیں اے گلو بتاؤ
وہ گلعذار جو تہِ گردِ فنا ہوئے

آں سروراں کہ تاج سرِ خلق بودہ اند
اکنوں نظارہ کن کہ ہمہ خاک پا شدند

شاہانِ باوقار جو تھے آبروئے خلق
اب گردشِ فلک سے وہی خاک پا ہوئے

خورشید بودہ اند کہ رفتند زیرِ خاک
آں ذرہا کہ در ہمہ اندر ہوا شدند

جو اُڑ رہے ہیں خاک کے ذرّوں کی شکل میں
خورشید تھے جو زینتِ دوشِ ہوا ہوئے

بازیچہ ایست طفل فریب ایں متاعِ دہر
بی عقل مرد ماں کہ بدیں مبتلا شدند

یہ سب متاعِ دہر ہے بازیچۂ فریب
اے وائے اس فریب میں جو مبتلا ہوئے

خسرو گریز کن کہ وفا رفت ایں زماں
ز اہلِ جہاں کہ ہمچو جہاں بیوفا شدند

ان سے بھی منہ کو موڑ لے خسرو کہ آجکل
اہلِ جہاں بھی مثلِ جہاں بے وفا ہوئے

حسن عباس فطرت :-

دکن اور امیر خسرو

" پری خصلت حسینانِ عشوہ طراز بخوبی در قعت ہیں کہ دیوگیری (مہاراشٹر) کا کپڑا کتان سے زیادہ باریک ہوتا ہے کبھی تمھیں اس پر آفتاب کا دھوکہ ہوگا کبھی ماہتاب کا اور پھر تم کہوگے کہ یہ تو خود اپنا ہی سایہ ہے "

نکو دامند خوبانِ پری کیشش
کہ لطف دیوگیری از کتاں بیش

ز لطف آں جامہ گوئی آفتاب است
و یا خود سایۂ یا ماہتاب است

امیر خسرو اصلاً عہدِ خلجی کے شاعر تھے جبکہ دہلی سلطنت کی کشمیر سے کنیا کماری تک پہونچ گئی تھیں اور صدیوں بعد ایک مکمل نقشہ، ہند کا ظہور جغرافیائی پردہ پر ہوا تھا۔ خسرو امیر تو تھے ہی، مگر اس سے زیادہ فطرت کے پجاری یا سیلانی اور قلندر تھے۔ بنگال ہوکر چتوڑ اور ملتان، اودھ ہوکر دہلی اور دوآبہ، انھوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ ہر باغ و بن میں بسیرا کیا۔ ہر شاخ پر چہکے اور ہر چوٹی پر اڑان بھری "طوطیٔ ہند" کا بر معنی لقب اُن کی حیات و خصائل کی بہت حسین علامت ہے امیر خسرو کی وہ شاعری جس کا طول و عرض چار اور پانچ لاکھ ابیات کے مابین بتایا جاتا ہے۔ اس کا خام مواد یا مال مسالا صرف دوآبے سے نہیں بلکہ ہندوستان کے اکثر نشیب و فراز اور بہت سے گلی کوچوں، تال اور پنگھٹ کی دھول مٹی سے فراہم ہوا تھا۔ ورنہ آج ہمارے سامنے ان کی وسعتِ بیان اور جامعیتِ کمال کا وہ سیلِ رواں ہرگز نہ ہوتا جس کی لہر لہر گنگنا دینے والی کے لئے سمندر منتھن بن گیا ہے۔ ان کا وطن ہند، زبان ہندوی وہ خود ترکِ ہندی اور طوطیٔ ہند۔ سو وہ دہلی کے نزدکن والے ترجیں وا لاچین کی ان کی نظروں میں کوئی سمائی تھی سے

بُتانِ ہند را نسبت ہمیں است
بہر یک موئے شاں صد ملک چیں است

(ہند کے حسینوں کا ایک بال سو چین پر بھاری ہے) ۔

لائقِ توجہ بات یہ ہے کہ امیر دوآبکو ہندوستان اور پورے برصغیر کو ہند سے موسوم کرتے تھے۔

یوں تو خسرو کے بہت زیادہ سفر کا حال ہمیں تاریخ سے نہیں ملتا اور بیرونِ ہند کے سفر کا تو کہیں ذکر نہیں ہے۔ مگر جس انداز سے وہ اپنے اشعار اور مثنوی و قصائد میں مادرِ وطن کا تقابل دوسرے ممالک سے کرتے ہیں اور جزو جزو کی تفصیل، اعتماد و پختگی کے ساتھ مدلل طور سے ظاہر کرکے ہند کو افضل قرار دیتے ہیں وہ بالکل آنکھوں دیکھی لگتی ہے اور یہی ان کا

شاعرانہ اعجاز ہے۔ اسی طرح جب خسرو فضائل ہند کا شمار اور گنتی کرتے ہیں تو کتنے ہی عنوان، موضوع، انسان، چرند پرند میوے، پھل، علم و فن، رسم و رواج وغیرہ ایسے ملتے ہیں، جن کا وجود اور چلن دکن ہی میں ہے اور شمالی ہندوستان کے لئے اس کی حیثیت بدیسی جیسی ہے اور [illegible] پوری وابستگی بلکہ والہانہ شغف اور طویل قیام و گہرے مشاہدے ہی سے ممکن ہے۔ مگر تمام ماخذ کو کھنگالنے کے بعد ضعیف و قوی روایتوں کو ملا کر ان کے دو یا تین سفر دکن ثابت ہوتے ہیں۔ صرف ایک سفر متفقہ ہے جو انھوں نے علاء الدین خلجی کے بیٹے شاہ مبارک قطب الدین اور ملک خسرو خاں کی ہمرکابی میں ۱۳۱۸ء میں کیا تھا اور اس کا اعتراف و اقرار قوی انداز میں مثنوی نہ سپہر کے اندر امیر خسرو نے بھی کیا ہے[۹]

من از دیدۂ خویش گویم سخن
نہ از افسانہ و داستان کہن

بہرحال اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس صورت میں انکے کمالِ فن پر اعتقاد اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

مطرب ہندوستان

عہد خسرو میں دنیائے اسلام کا آفتاب علم و کمال، ذکر و فن نصف النہار پر تھا۔ قرطبہ و غرناطہ، مصر و بغداد، ایران و سمرقند، بلخ و ہرات ایشیائے کوچک، حکمت و فلسفہ، سائنس و ادب، فنونِ لطیفہ کا مخزن اور نعمہائے گوناگوں سے معمور تھا۔ روحانی و مادی علوم و فنون کے اہل کمال کی ہوڑ لگی ہوئی تھی۔ فلسفۂ یونان کی توضیح و تشریح میں اسلامی فلاسفہ کا سکہ چل رہا تھا۔ اصفہان نصف جہان تھا۔ قاہرہ و اندلس جنت نگاہ و فردوس گوش[۱]۔ رسل و رسائل کے وسیلے سامان تھے۔ ہندوستان کی شہرت سن کر غول کا غول وسط ایشیائی مسلمان چلا آرہا تھا اور یہاں آنے کے بعد خود کو برتر اور اہل ہند کو حقیر سمجھ کر زندگی بسر کرتا تھا۔ اکثر ہندی نژاد مسلمان طبقاتی برتری کے جذبے سے مجبور ہو کر اپنا رشتہ جھوٹ موٹ کے شجروں کا سہارا لے کر باہری مسلمانوں کی کسی نہ کسی اعلیٰ شاخ سے جوڑ لیا کرتے تھے۔ اس پس منظر میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ امیر خسرو ہندوستان کی مدح سرائی اتنے اونچے سُر میں کرتے ہیں کہ تمام عالم پر ہند کی فوقیت ثابت کرتے ہیں تو ان کے حوصلہ و خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ انھوں نے ہندی ہونے پر فخر کیا۔ اپنے اور بیگانے دونوں سے ان کی نوک جھونک چلتی رہی اور پورے اعتماد، شیرینی و لطافت، منطقی دلیلوں، شاعرانہ ترنم و خوبصورتی کے ساتھ حب وطن کے "نغمۂ الٰہی" کو قاف سے تا قاف پہونچا دیا۔ اور یوں کہ دنیا گوش بر آواز ہو گئی، مسحور ہو گئی۔ نہ کسی حجت کا یارا رہا نہ انکار کی گنجائش۔ قادر الکلامی کا حال یہ ہے کہ خسرو نے اپنی شاعری میں ایسی ایسی چیزوں سے دلیل کا کام لیا ہے جن کی بظاہر بہت معمولی حیثیت ہے بلکہ اسکی [illegible] جاتی تھی۔ اور دوسری بات ہم نے یہ پائی ہے کہ مجموعی طور پر اکثر ان اشیاء کی فوقیت و حسن و خوبی بیان کر کے مخالف کا منہ بند کیا ہے جو دکنی تھیں۔

وابستۂ دکن

اعداد کے مشہور جادوگر "راما نجن"[۲] کی حیرت انگیز ذہانت

---

[۱] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: تاریخ علوم و ادبیات ایران جلد سوم ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا۔ اور تاریخ عالم کی جھلکیاں۔ از جواہر لال نہرو

[۲] تنجور کا باسی ۲۰ ویں صدی کا وہ ریاضی داں جسے اہل یورپ اب تک یاد کرتے ہیں۔

... سے کہ ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب امیر خسرو ہندوستان
... باشندوں، جوتشیوں اور نجومیوں کی فضیلت بیان کرتے
... تو ان کی نظر اول اول دکن ہی پر پڑتی ہوگی جس طرح وہ
... جادوں کی تعریف کرتے ہیں تو پہلے بنگال کا خیال آتا ہے۔ اسی
... سپیروں اور جوگیوں کا بیان دکن کی طرف ذہن کو منتقل
... ہے جہاں آج بھی ناگ پنچمی کے دن بچے بوڑھے سانپوں کے
... ساتھ بے ضرر رفیقوں کی طرح کھیلتے ہیں۔ جانوروں میں ان کا
... خصوصیت کے ساتھ ہاتھی اور اس کی ذہانت ہے جو
... ایرانیوں کے لئے ہندوستان کا انوکھا جانور تو ہے ہی، مگر
... کے جنگلات اس کا خاص مسکن ہیں۔ اس کے بعد بندر کا
... ہے اور رامائن کی کہانیوں کے مطابق جنوب ہی اس کی
... مرز بوم ہے۔ پھلوں میں کیلے کی تعریف میں امیر خسرو
... قلم توڑ دیا ہے جو بلا شبہ دکن کا سدا بہار پھل ہے اور پان
... کے دکنی ہونے کی گواہی مارکو پولو، البیرونی اور ابن بطوطہ
... نے دی ہے ؎

موز ھماں میوہ بے خستہ نگر
برگ ز تنبول نگرنا ئب خور

... امیر خسرو خربوزہ اور آم کی تعریف میں زمین و آسمان
... قلابے ملا دیتے ہیں اور دہلی کے اہلِ علم کو دنیا بھر کے
... ارباب علم سے بہتر قرار دیتے ہیں وہاں دکن کے ہر پھل و میوے
... کو مقابلے کے لئے سامنے لاتے ہیں اور فلاسفۂ ہند کو
... یونانیوں سے برتر بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے
... تحفے دو ہیں۔ ایک کیلا۔ دوسرا پان۔ ہندوستان میں
... خراسان کے سب میوے پیدا ہوتے ہیں جبکہ خراسان میں
... ہندوستان کا ایک میوہ بھی نہیں ہوتا اور اسمیں الائچی،
... لونگ، کافور کو بھی امرود و انگور کے ساتھ شامل کرتے ہیں ؎

صفتش آں کاں طرف از میوہ تر
نیست چوں امرود چو انگور دگر
میوہ دگر کم نگری گر محلش
لاچی و کافور و قرنفل بدلش

اسی طرح سنترے کا ذکر ہے۔ آج بھی سارے ہندوستان میں ناگپور اور سنترہ کا تصور توام ہوتا ہے۔

سویدائے دکن

حسینانِ ہند کی فضیلت امیر خسرو کا محبوب موضوع ہے
اس شاعر حُسن شناس کی نظر میں ساری دنیا کے حسینوں میں کوئی نہ کوئی کمی ہے۔ مثلاً ختن والوں میں ملاحت نہیں، سمرقند وبخارا کے حسینوں میں شیرینی مفقود ہے، خراسانیوں میں دلآویزی کی کمی تو مصر و روم کے معشوق چست و چالاک نہیں مگر خوبانِ ہند کا کیا کہنا۔ ان میں ملاحت، صباحت، غمزہ و ادا اور لبوں پر تبسم بھی ہے، چھل بل ہے، اور عجز و انکسار بھی۔ ہندوستان کے حُسن کی ایسی جامع و مکمل صورت گری وہی کر سکتا ہے جس نے حسنِ بنگالہ و کشمیر کے ساتھ ساتھ مہاراشٹر، تلنگانہ اور مالابار کی سیاہ فام سندریوں کی انگ انگ پھڑکتی جوانی کو دیکھا ہو اور شوخی و شرارت کے ساتھ ان متانت اور بھید بھری تندرست و توانا حسیناؤں سے بھی نظر ملائی ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ اس وقت کسی حاسد نے خوبرویانِ ہند کے سیاہ رنگ پر طنز کر دیا۔ امیر خسرو کے دل پر بڑی چوٹ لگی، نہ فقط اس لئے کہ اہلِ دکن کی اکثریت سیاہی مائل ہوتی ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ شاید ان کو اپنے نو مسلم نانا کی یاد آگئی جن کا رنگ بھی گوارا نہ تھا۔ ماں سے بے پناہ محبت کی وجہ سے وہ اس رنگت پر اعتراض سن کر آپے سے باہر ہو گئے۔ وہ معترض کو اس طرح

منہ توڑ جواب دیا ؎

ہندرا اے مدعی طعنہ بہ تاریکی مزن
زانکہ اندر ظلمت او آب حیواں مدغم است

(ہندوستانیوں کی سیاہ رنگت پر طعنہ زنی کرنے والے! خاموش رہ کہ اس رنگ میں آبِ حیات[1] کی آمیزش ہے)۔

دوسری جگہ "دول رانی خضر خاں" نامی مثنوی میں ہے ؎

سیہ را خود بدیدہ جایگاہ است
کہ اندر دیدہ ہم مردم سیاہ است

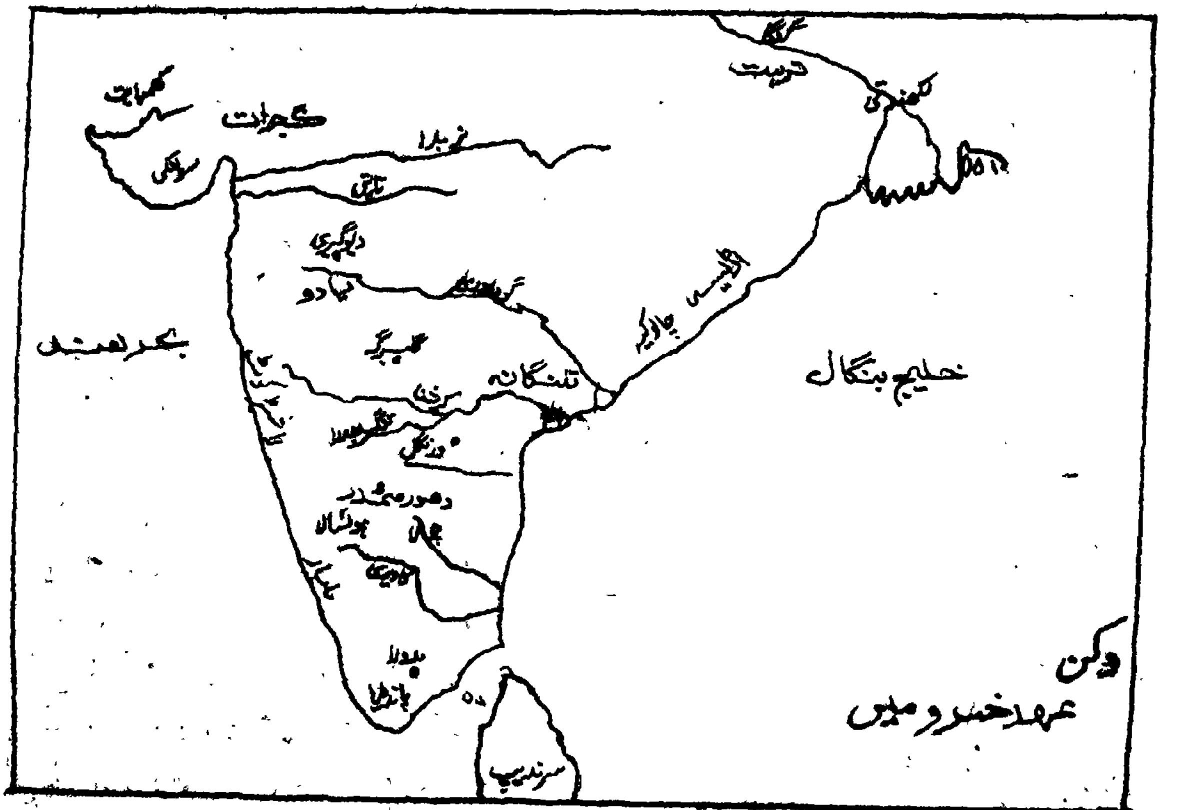
(سیاہ رنگت کو تو آنکھ میں جگہ دی گئی ہے اور جگہ کی پتلی میں تو ہر شخص سیاہ ہی نظر آتا ہے)۔

وہ اپنے نانا کی سیاہ رنگت کا بیان فخریہ انداز میں کرتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ میں اُن کا بیٹا ہوں ؎

ز نسلِ عارضِ اسود منم آں نسخۂ معنی
کسی کز اصل خویشتن یک یک نشانے بازدادمن

امیر کا عہدہ اس زمانے میں تیسرے نمبر پر ہوتا ہے۔ سب سے بڑا الغ خاں یا خان خاناں جو لاکھ سواروں کا افسر ہوتا، دوسرے ملک یا ملک غازی۔ اس کے ماتحت دس ہزار سوار ہوتے۔ تیسرا نمبر امیر کا تھا جو ہزار سواروں پر حاکم ہوتا۔ امیر خسرو کو دو سو ترک اور دو ہزار ہندوستانی غلام دیے گئے جن پر

[1] آبحیات کے دریا کا نام چشمۂ ظلمات یا بحرِ ظلمت ہے یعنی سیاہی کا چشمہ یا دریا۔



ان کو بڑا ناز تھا ۔۔

خسان [illegible] گم وقت دگمسر لای دہم امجبسرہ

[illegible] برمیہ بیں طرفہ دریائے کرزاوم من

دکن کا مستند مورخ

میگستھنیز کے بیان سے قبل اسلام دکن میں علی الترتیب تین حکمراں خاندانوں کا پتہ چلتا ہے[1] ۔ جیرو، چیرا، چورا ۔ پانڈیوں ۔ بعد کے مورخین ساتواہن، چالوکیہ اور راشٹرکوٹ کی ہلکی سی معلومات دیتے ہیں ۔ مارکو پولو جو تیرھویں صدی میں یہاں آیا ۔ گھوما پھرا ۔ وہ تو نام بھی نہیں بتاتا ۔ کہتا ہے کہ پانچ بھائیوں کی "عدیدہ" حکومت تھی اور خوب عیش اڑا رہے تھے ۔ البتہ ہیرے جواہرات کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ منہ میں پانی بھر آئے ۔ لہٰذا ہم ہر تفصیل سے دامن بچا کر راشٹرکوٹ کی سلطنت میں آجائیں تو بہتر ہے ۔ جن کی سلطنت کے حدود بنگال سے لنکا تک پہونچ گئے تھے ۔ فارغ البالی اور مال و دولت کی کثرت کا کچھ اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا ایک عرب سفیر اس خاندان کے ایک راجا کی تعریف یوں کرتا ہے کہ روئے زمین پر بس تین بادشاہ ہیں :۔
خلیفۂ بغداد، چین کا بادشاہ اور بھارت کا اموگھ ورش ۔

دیوگیری کا یادو راج جس جہاراشٹر کا آخری عالی مرتبہ سلسلہ تھا جسے راشٹرکوٹ کا معنوی وارث کہہ لیجیے ۔ اس خاندان نے تاریخ، تمدن و تہذیب میں بہت نمایاں رول ادا کیا ۔ سنسکرت اور مقامی زبان کو بہت ترقی دی ۔ نقاشی، صورتگری، سنگتراشی، موسیقی و شاعری کی خصوصی سرپرستی کی اور برآمدی تجارت کو بہت فروغ بخشا ۔ سندھن اس خاندان کا سب سے

۱؎ تاریخ تمدن ہند

عظیم بادشاہ ہوا ہے جو بہت بہادر اور علوم و فنون کا قدرداں تھا ۔ اسی کے عہد حکومت میں دیوگیری کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا تھا ۔ یادو راج ہی میں مراٹھی زبان کو سرکاری درجہ حاصل ہوا ۔ مشہور جیوتشی بھاسکر آچاریہ، شاعروں میں نام دیو، مکند راج کے علاوہ سوامی چکردھر، سنت گیا نیشور، پنڈت ہیماوری اسی سلطنت کے چاند تارے تھے جو خلجی حملے کے قبل و بعد دو سو برس تک قائم رہی ۔

دیوگیری خود دولت کا خزانہ تھا اور دکن کا دروازہ بھی ۔ اس شہر کی فوجی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ ہر مرتبہ جنوب کی طرف جاتے ہوئے دہلی کے لشکر نے یہی راستہ اختیار کیا ۔ اس کی صنعت و حرفت، تجارت اور مال و دولت کی فراوانی میں اتنی زبردست کشش تھی کہ علاءالدین خلجی کڑہ کی آرام دہ صوبیداری چھوڑ کر خفیہ طور پر کئی مہینے غیر معروف راہوں کا دشوار گذار و پہاڑی سفر کرکے ۱۲۹۴ء میں یہاں آدھمکا ۔ راجہ رام دیو کے عہد میں اس نے دیوگیری کو تسخیر کیا ۔ اور اسقدر مال غنیمت لیکر واپس ہوا جس کی تفصیل پڑھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں[2] ۔ اس کی خوشحالی کی سب سے بڑی وجہ بیرونی تجارت اور تاتاری حملوں سے محفوظ رہنا تھا ۔

یہاں سے دکنی تہذیب اور شمال کی دھاروں کا ملاپ شروع ہوجاتا ہے ۔ خلجیوں کے حملے اور آمد و رفت ۱۳۱۳ء تک جاری رہتے ہیں اور آندھرا، تلنگانہ، میسور تقریباً پورا دکن ان کا ہوجاتا ہے ۔ دیوگیری کا نام قطب آباد پھر محمد بن تغلق کے زمانے میں اپنی دولت و ثروت کے باعث دولت آباد ہوجاتا ہے ۔ دہلی و دولت آباد ایک ٹرین کے دو ڈبے جیسے ہوجاتے ہیں ۔ یہاں نئی راجدھانی بنتی ہے اور پھر اُجڑتی ہے لیکن کتنے

۲؎ تاریخ فرشتہ و تاریخ عالم کی جھلکیاں

ہی میں بس جاتے ہیں۔ صوفیائے کرام میں حسن سنجری، برہان الدین غریب، رجو قتال اور بہت سوں کو یہ مٹی اتنی بھا جاتی ہے کہ مر کر بھی نہیں چھوٹتی۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی درگاہ آج بھی خلائق کی زیارتگاہ ہے۔ بعد میں صوبہ دار خود مختار ہو جاتے ہیں بہمنی سلطنت قائم ہو جاتی ہے اور پھر وجیانگرہ عادل شاہی، ایسی کئی حکومتیں قائم ہو جاتی ہیں اور اندر اندر تہذیبی لین دین کا عمل زور وشور سے جاری رہتا ہے۔

امیر کا احسان تاریخ پر

اگر شکسپیئر نہ ہوتا تو ملکہ الزبتھ کے دور کے سماجی، سیاسی اور تمدنی حالات کی بھرپور اور رس بھری معلومات سے دنیا تشنہ لب رہ جاتی۔ یہی حال امیر خسرو کا ہے۔ خلجی و تغلق حکمرانوں کی تمام مہمات اور دکن کے نکتہ بہ نکتہ حالات ہماری دسترس سے بالکل باہر ہوتے۔ امیر خسرو اپنی جملہ خوبیوں کے ساتھ ہی اپنے عہد کے پہلے مورخ و مشاہد ہیں جنھوں نے مروجہ رسوم و رواج، صنعت و حرفت، معیشت و معاشرت، علوم و فنون و عقائد پر بیش قیمت اور سچی معلومات کا خزانہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ دکن کے بعض اہم واقعات کی تاریخ کا تعین امیر خسرو کی مشہور نثری تصنیف "خزائن الفتوح" یا "تاریخ علائی" تمام کی تمام حالاتِ دکن کا کچا چٹھا پیش کر دیتی ہے۔ مثنوی "نہ سپہر" کا تیسرا سپہر "افضلیت ہند بر سائرِ عالم" کے موضوع کو سمیٹے ہے تو پہلا اور دوسرا حالاتِ دکن کا بہترین عکاس و نقاش ہے۔ آج کا ہر بڑا مورخ فخر سے یہ کہتا ہے کہ امیر خسرو کی تصنیفات ہی اس عہد کی مستند دستاویز ہیں۔ ۱۳۰۹ء میں ملک کافور ورنگل، تلنگانہ کے ارادہ سے چلتا ہے۔ اور دیوگیری میں قیام کرتا ہے۔ والی دیوگیری راجہ رام دیو اپنی رعایا اور فوج سمیت دہلی کے لشکر کا استقبال کرتا ہے اور کچھ دن مہمان رکھ کر مہم ورنگل کے لئے مزید کمک کا انتظام کر کے لشکر کو رخصت کرتا ہے۔ "خزائن الفتوح" میں امیر خسرو نے اس کی نقشہ کشی یوں کی ہے۔

"جب لشکرِ شاہی شہر میں داخل ہوا تو ایسا لگا کہ وہ قصرِ شداد میں پہونچ گئی ہو۔ باغ و بہار، سرسبز و شاداب مسرت انگیز اور تعجب خیز۔ وہاں کی ہر شاہراہ چمنستان تھی جہاں صراف سونے چاندی کے سکے اچھال رہے تھے۔ قسم قسم کے کپڑے تھان کے تھان دوکانوں میں موجود تھے جو بہار و بنگال سے لے کر خراسان تک کہیں نہیں مل سکتے تھے۔ ایسے ملائم و خوشرنگ کہ جیسے پہاڑوں پر گل لالہ یا چمن میں ریحان و نسرین۔ عمدہ اور نفیس قسم کے میوے، تازہ بتازہ رس بھرے پھلوں سے سارا بازار معطر اور لالہ زار بنا ہوا تھا۔ سوتی، اونی اور چرمی ملبوسات تانبے، پیتل اور فولاد کی زرہ بیں سپاہیوں کے لئے تر رکھی تھیں طرح طرح کے برتن قرینے سے سجے ہوئے تھے۔ جو بھی چاہے مناسب قیمت پر خرید لے۔ عدل و انصاف ایسا تھا کہ ؎

نہ ترکے کرد بر ہندو جفائے

نہ ہندو را مخالف بود رائے"

ملک کافور دیوگیری سے تلنگانہ کی راجدھانی ورنگل آیا تاکہ پرتاپ رودر کو شکست دے (امیر خسرو کے الفاظ میں لدّر دیو) وہاں اسے عظیم الشان فتح حاصل ہوئی اور بہت سے ہیرے جواہرات اور کثیر مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ ان ہیروں میں ایک ہیرا ایسا بھی تھا جس کا مثل و نظیر دنیا بھر میں نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ہیرا "کوہ نور" رہا ہو جو چند مؤرخین کے بیان کے بموجب دکن سے حاصل ہوا تھا۔

دکن کی موسیقی اور رقص

چودھویں صدی کا سیاح ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ:

ازخلف میں دکن خصوصاً دولت آباد موسیقی کا گہوارہ تھا"

ہوتا تھا ماہر موسیقی سہاگ رنگ کا رسیا جہاں پہونچ جہاں کے خطے ہو گئیں تو پھر ایسی نغمہ ریز زمین پر آکر کیا کیا ہوگا ۔ ان کی گرما گرم صحبتیں ہوتی ہوں گی ۔ غرض یہ سنتے ہی کہ امیر خسروؒ یہاں کی موسیقی و رقص پر ریجھے اور لکھا ہے کہ چنگ کی آواز سے زہرہ بھی نالہ و فریاد کرنے لگتی ہے ہی موسیقی آہوانِ صحرا کو مدہوش کر دیتی ہے اور یہاں نغمے سے مُردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں ؎

دگر سرود جناں کز خراش ہر زخمہ
چو چنگ خویش کند زہرہ نالہ و فریاد
عجب مباد اگر مردہ زندہ گردد ازاں
کہ لفظ در دل ہر نغمہ جان باز نہاد

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ہندی موسیقی ایک ایسی آگ ہے جو سب دل و روح دونوں کو جلا دیتی ہے اور دوسرے تمام ممالک سے بہتر ہے ۔ اس سے آگے بڑھ کر جب وہ رقاصاؤں کا نقشہ کھینچتے ہیں تب تو قیامت ہی سر پر ناچتی دکھائی دیتی ہے رقاصائیں خضر خاں فرزند علاؤالدین خلجی کی شادی میں بلائی گئی تھیں ۔ آپ بھی کچھ سنئے کہ وہ کیا تھیں ؟

" ان کے مژگاں سے سینے چھلنی ہو جائیں ۔ انکی دزدیدہ نگاہوں سے غم کا فور ہو جائے ۔ وہ پلکیں جھپکائیں تو جوان ہاتھ ملتے رہ جائیں اور ہنسیں تو جانیں تلف ہو جائیں ۔ انکے تِل جیسے موتی کی ڈبیہ ، ان کے ابرو کی کمان پر جانیں قربان ، ان کے گیسوؤں میں ایسے پیچ و خم جیسے سانپ صندل میں لپٹا ہوا ۔ ان کی نیم خواب و نیم بیدار آنکھوں کو دیکھ کر نیند حرام ہو جائے ۔ ان کے دہن ، غنچہ کی طرح کبھی بند ہوں کبھی شگفتہ ،

ان کے زنخداں سیب جیسے ۔ اگر ان کا پسینہ ٹپکے تو اس میں ان کی ناز و ادا شامل ہو کر دکھائی دے ؎

از به مژگانے یکے صد سینہ سفتہ
چہ غم دارد مرا دز دیدہ گفتہ
تا عرق کز روئے بر طناز می ریخت
کرشمہ می چکید و ناز می ریخت

اسی سے ملتا جلتا انداز گانے والیوں کی تعریف میں ملتا ہے اور موسیقی کی ایک ماہر دکنی خاتون ترمتی کا ذکر بھی انھوں نے بڑے رومانی پیرایہ میں کیا ہے ۔

دیوگیری

ملک کافور کے قتل کے بعد دیوگیری کی حکومت دہلی کے حلقۂ اطاعت سے نکل گئی تو ۱۳۱۸ء میں علاءالدین خلجی کا بیٹا مبارک شاہ قطب الدین لشکر لیکر دیوگیری پر حملہ آور ہوا رام دیو کا نائب راگھو اور اس کا داماد راجپال پہاڑیوں میں چھپ گئے مگر خلجی تلواروں سے بچ نہ سکے ۔ امیر خسرو بادشاہ کے ہمرکاب تھے ۔ انھوں نے اس معرکہ کا حال نہ سپہر میں درج کیا ہے اور اس کے بعد جب لشکر دیوگیری سے وار نکل گیا تو وہاں بھی امیر خسروؒ موجود تھے ؛ اس کا بیان بھی مثنوی میں موجود ہے ۔ دیوگیری کا نام قطب آباد رکھا گیا ۔ امیر خسروؒ ہی ہیں کہ قلعہ دیوگیری کی دیواریں اتنی شفاف و عمودی تھیں کہ اس پر کیڑا بھی نہیں چڑھ سکتا تھا ۔

نہایۃ الکمال امیر خسروؒ کا آخری دیوان ہے جسمیں تغلق سلاطین کے قصائد ہیں اس میں ایک مثنوی ، در تعریف تغلق آباد ہے جسمیں دہلی کی نئی آبادی کا ذکر ہے مثنوی "صحیفۃ الاوصاف" جو تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہے اسمیں قطب آباد (دیوگیری) کا

---

۵۵ ؎ (ترجمہ) ابن بطوطہ کا سفرنامہ

حال درج ہے۔

امیر خسروؒ کا دوسرا سفرِ دکن غیر مستند اور اندازاً اس وقت ہوا جب غیاث الدین تغلق تختِ دہلی پر بیٹھا اس نے سلطنت کی بکھری ہوئی قوتوں کو اکٹھا کرنے کی خاطر ۱۳۲۱ء میں اپنے بیٹے جونا خان محمد بن تغلق کو دکن کی مہم پر روانہ کیا۔ تاکہ ورنگل (تلنگانہ) کے سرکش راجہ پرتاپ رودر دیو کو دوبارہ اپنا مطیع بنائے۔ اب دیوگیری پوری طرح دہلی سلطنت کا حصہ بن چکا تھا۔ شہزادہ منزلیں مارتا ہوا پہلے دیوگیری پہونچتا ہے اور پھر آگے نکل جاتا ہے۔ فتحیاب ہونے کے بعد جو قصیدہ امیر خسروؒ نے اس کی شان میں کہا، وہ دیوان نہایۃ الکمال میں ہے۔ اُن کے اندازِ بیان سے قیاس آرائی کی جاتی ہے کہ شاید خسروؒ ساتھ رہے ہوں۔ عجیب وجد آفریں انداز ہے۔

دکن : جنّت کا نمونہ

"گل و گلزار، شاد و آباد جیسے جنّتِ شدّاد، وابستے استصاف و شفاف۔ پاک و پاکیزہ کر خود بولتے ہیں کہ ہم اسلامی حکومت کی جنت ہیں۔ اس کی شہرت سُن کر رشک و حسد سے مصر نے اپنا پیرہن اتار کے نیل کے دریا میں پھینک دیا۔ بغداد کا دل دوپارہ ہوگیا ہے۔ ہوا ایسی خوشگوار کہ اس دنیا میں اسکی مثال نہیں بلکہ دوسری دنیا میں ممکن ہے جس کا وعدہ نیکوکاروں سے کیا گیا ہے کیا معطر ہوا ہے کہ جس کی خوشبو سے تمام پھولوں میں مہک جاگ اُٹھتی ہے۔ ہر باغ بازار معلوم پڑتا ہے۔ یہاں کے میووں اور پھلوں کا کیا بیان ہو۔ دنیا بھر کے میووں کے لئے باعثِ رشک یہاں کے کیلے چاند کے چھلکے ہیں اور روزِ عید کی طرح نشاط و لطف انگیز۔ آم اور اس کی حلاوت جیسے شہد اور دودھ سنہری سیپیوں میں بند کر دیے گئے ہوں۔ اور تو اور یہاں ایک عجیب و غریب پتہ پایا جاتا ہے جس کا نام تنبول (پان) ہے جو منہ کو خوشبودار کرتا ہے اور دل کو فرحت بخشتا ہے۔ یہاں موتی اور بیش قیمت نگینوں کی بہتات ہے۔ شاید اب سمندر اور معادن میں اس سے بہتر اور زائد پیداوار کی صلاحیت ہی نہیں۔ یہاں کے کپڑوں کی عمدگی کا بیان مشکل ہے۔ اگر چاند کی جلد کو کوئی جلّاد اس سے علیحدہ کر سکے اور پھر اس جلد سے دیوگیری (مہاراشٹر) کے کپڑے کا موازنہ کیا جائے تو یہ باریکی میں بازی جیت لے گا۔ اس کا سو گز سوئی کے ناکے میں سما سکتا ہے۔ یہ اتنا باریک ہے کہ جب لباس بنا کر پہنا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بدن پر صاف شفاف پانی پڑ رہا ہے"۔ ۱؎

لباس قطرۂ آبے تو انش گفتن اگر
چکد ز چشمۂ خود قطرہ ہا معتاد

دکن کے شہروں کے علاوہ امیر خسروؒ نے بعض ہندوستانی قدیم قلعوں کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کی خوبصورتی، پائیداری اور تعمیری محاسن کو بیان کیا ہے۔ ایک قلعہ کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں: "وہ آسمان کی طرح بلند اور سنگِ خارا سے منقش تھا۔ گویا ہندوؤں کی بہشت ہو۔ در و دیوار کی تصاویر مانی کو شرمندہ کرتی تھیں۔ پتھر کی سیکڑوں مورتیاں ایسی دیکھنے میں آئیں جو موم سے نہیں بنائی جا سکتیں۔ اس کے باغ میں کئی مندر تھے جن پر سونے چاندی کے کلس لگے تھے۔ ۱؎

جس طرح امیر خسروؒ نے شہر دیوگیری کی آبائی جغرافیائی خوبیوں اور موسم کی دلکشی کا ذکر بار بار کیا ہے اس کے پیشِ نظر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ جب محمد بن تغلق نے دیوگیری کو دارالسلطنت کی شکل دینی چاہی تو امیر خسروؒ کے پیش کردہ خیالات کی پرچھائیں اسکے ذہن پر رہی ہو۔

۱؎ خزائن الفتوح" حرف فتح دکن بعہد علاء الدین

۱؎ مفتاح الفتوح

کا پر تسلسل نہیں بلکہ اس میں بہت سے دلچسپ مباحث آگئے ہیں
۔ ہر گز نہ سمجھنا چاہئے کہ ان کی تصنیفات صلہ و انعام کی لالچ
و طلب کے ذریعۂ ظہور میں آئیں۔ وہ دنیا کو مایا سمجھتے تھے۔
اور زر و جواہر کو کنکر پتھر۔ انھوں نے کہا ہے کہ "میرا سخن بجائے
خود ایک گنجینہ ہے اس کے سامنے گنج زر کی بساط کیا۔ شاعری
سے مجھے جو ملتا ہے اسے میں غرباء میں بانٹ دیتا ہوں۔ اگر
سلطان مجھے فریدوں و جمشید کا خزانہ عطا کر دے تو میرے ایک
حرف کا صلہ نہ ہوگا ؎

دہ ہم گنج فریدوں و جم — ہدیۂ یک حرف نبود بلکہ کم
یک بیت را ز من نتواند خرید کس
زیرا کہ کس بہشت بریں را بہا نکرد

امیر خسروؒ کا شاہکار

میری نظر میں امیر خسروؒ کا شاہکار ان کی مثنوی دول رانی خضر خاں ہے جس میں انھوں نے گجرات کے راجا کرن دیو کی نازک اندام و پری پیکر بیٹی اور علاء الدین خلجی کے بیٹے خضر خاں کی داستانِ عشق کو نظم کیا ہے۔ یہ طربیہ و المیہ شاعری کی اعلیٰ مثال ہے، اور اس میں سوز و گداز، جوش و خروش اور جادو بیانی اپنے کمال پر ہے۔ اس کا ایک نام عشقیہ بھی ہے۔ دو محبت بھرے دلوں کی جاں سوز وارداتِ قلبی اور درد و مہجور عاشقوں کی ایسی المیہ کہانی ہے جس میں تجسس، تحیّر، فنی محاسن اور رنگا رنگی سے نئی جان ڈالی گئی ہے۔ ساری کہانی کا کینوس دکن ہے۔ اور مرکزی کردار دکن کی ایک راجکماری چار ہزار سے زائد اشعار کی اس مثنوی میں خسروؒ نے جذبۂ وطن پرستی، تاریخی واقعات کی صحت کے ساتھ کئی ہندی الفاظ کو فارسی میں لکھا ہے۔ بعض سازوں اور پھولوں کے نام ہندی میں دیے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیوں کا پیوند بھی لگایا ہے۔ غزل کے ٹکڑے بھی ہیں۔ بہرحال جتنی دلکشی اور جاذبیت خسروؒ کی اس مثنوی میں ہے وہ اس قسم کی دوسری مثنویوں میں نہیں۔

دکنی ادب اور امیر خسروؒ

مقالہ کا عنوان یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ ہم دکن اور مہاراشٹر میں ادب و ثقافت کے ان خطوط کی کھوج لگائیں جنھوں نے امیر خسروؒ کے عکسِ جمال سے روشنی پائی اور یہ بھی کہ طوطیٔ ہند کے زمزموں کی صدائے بازگشت کہاں تک اور کس انداز میں یہاں پہونچی۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تیرھویں صدی کے آخر میں مراٹھی و دکنی ادب کے سوچنے کی دھارائیں اسی سمت مڑ گئی ہیں جو خاص امیر خسروؒ کی ڈگر تھی ان کی انسان دوستی، رواداری، جذبۂ خدمتِ خلق صوفیانہ دھکیانہ شاعری کے ساتھ موسیقی کا عوامی سطح پر جاندار استعمال معاشرے کے لئے بھولا ہوا سبق ثابت ہوئی اور ہر طرف سے اس کی پذیرائی شروع ہوگئی۔ اور شمال و جنوب دونوں طرف بھکتی کال کا آغاز ہوگیا جس کے جملہ عناصر ترکیبی وہی تھے دکن کی دھرتی پر بھی عوامی شعراء اور سنت و بھگت کی ٹولیاں اُبھر آئیں۔ ذات پات کے بھید بھاؤ کو ختم کرنے کا وہ وسیع آدرش جو امیر خسروؒ کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے، مراٹھی ادب میں بھی عام ہونے لگا۔

خسروؒ اپنے فرسودہ سماج کے باغی، مساوات کے نقیب اور شاعرِ وطن تھے جنھوں نے کبھی کہا ؎

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زُنّار نیست

پھر کئی بار کہا ؎

دیں ز رسول آمدہ کالئے زمرۂ دیں
حُبِ وطن است ز ایماں بہ یقیں

اور بار بار کہا ؎

کشور ہند است بہشتے بہ زمیں

ساز و آواز کا یہ رقص حیب لفظ اتصال و فروغ پر آتا ہے تو ہمارا ختر میں سنت نکارام اور رام ذہن کی مدھرانی میں ڈھل کر جذبۂ ملی اور قومی اتحاد کا نغریں جاتا ہے دلوں کو گدگداتا، دماغوں میں ہیجان اور احساس کو جھنجوڑتا ہے۔ تاریخ کی مٹی کروٹ لیتی ہے اور جدید ہمارا شرما کا تصور لے کر پردۂ تاریخ پر شیواجی، رواداری و حق پسندی کا پیکر بن کر نمودار ہوتے ہیں۔ ادب میں گہرے اور باریک فلسفیانہ خیالات داخل ہوتے ہیں۔ زبانِ فارسی کا اثر لغت در اسلوب نگارش میں جگہ بنا لیتا ہے اور انکا تہ و داسو یت ایسے ادیب و شاعر ظاہر ہوتے ہیں جو ہندوستانی ادب میں لافانی مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

امیر خسروؒ اور ان کے مراٹھی و دکنی معاصرین کا تقابلی مطالعہ ایک دلچسپ مگر سنگلاخ موضوع اور اہلِ شوق سے جرأتِ رندانہ کا طالب ہے۔ دیکھنا ہے کہ اس کا سہرا کس کے سر بندھتا ہے۔ بقولِ غالبؔ ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

امیر خسرو حقائق کی روشنی میں

محمد ایوب واقف
ایم۔ اے

مخدوم و محترم! تسلیم و نیاز۔

والا نامہ صادر ہوا تھا۔ جواب اس لئے نہ دیا کہ جلد ہی مضمون روانہ کرنا تھا۔ میں ان دنوں کچھ ادبی کاموں میں مصروف ہوں لیکن آپ کا حکم ٹالا بھی کیسے جاسکتا تھا۔ مضمون انتہائی افراتفری میں لکھا اور نقل کیا گیا ہے۔ دوسرے کچھ حضرات سے بھی میں نے کہا تھا کہ وہ امیر خسرو پر مضامین لکھیں۔ ایک صاحب نے لکھ کر بھیج دیا۔ وہ اپنے مضمون کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں۔ اور لوگوں نے لکھا تو فوراً روانہ کروں گا مصیبت یہ ہے کہ یہاں کے کچھ رسالے بھی خسرو نمبر نکال رہے ہیں ایک تو بمبئی میں مضامین لکھنے والوں کا خاصا قحط دوسرے یہ نمبر لکھنے والے عنقا ہوگئے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ کچھ مضامین اور حاصل ہو جائیں۔ مضمون رسید بہت جلد عنایت فرمائیے تاکہ اطمینان ہو۔

خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔ پرسانِ حال احباب کو سلام مسنون۔

(مخلص محمد ایوب واقف)

"True seat of culture is the mind of man" اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر قسم کی شائستگی اور تہذیب کا اصل محل انسان کا ذہن ہے۔ آج ہم جس قدر بھی معیارِ اقدار (Standard of values) کے مالک ہیں وہ ہمارے ذہن کے عملِ ارتقاء (Evolutionary Process) اور یہ بھی ایک امرِ مسلمہ ہے کہ (Process) ذہنِ انسانی کا تدریجی ارتقاء انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ اور آدم تا ایں دم یہ تدریجی ارتقاء جاری ہے۔ اور غالباً اس وقت تک رہے گا جب تک دنیا کا وجود باقی ہے۔ ابتدائی ایامِ زندگی سے لیکر آج تک کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ کائنات کے دھندلکوں میں اپنی کھوئی ہوئی منزل تک رسائی حاصل

کرنے کیلئے ذہن انسانی نے بڑے بڑے انقلابات رونما کئے ہیں بڑی بڑی جنگیں لڑی ہیں بڑی بڑی تحریکیں چلائی ہیں بڑے بڑے مسلمہ رجحانات سے اختلاف کی جرأت کی ہے۔ غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ انسان کی ایسی تمام ترسعی و جانفشانی کا واحد مقصد تاریخ کے صفحات پر اپنے انفرادی نقوش کو ثبت کرنا تھا تغیر پسند مزاج اور ہر لمحہ اپنی ہیئت کو متبدل کرنے والے نظام نے بہ استثنائے چند انسانی کوششوں کے سب کو ریگ رواں سمجھ کر فراموش کر دیا۔ کچھ شخصیتوں نے بلاشبہ اپنے ذہن وفکر کی امکانی قوتوں (potentialities) کا سہارا لے کر وہ کام کیا کہ آشوب زمانہ بھی ان کے فکر وفن کے محل کو مسمار نہ کر سکا سیکڑوں سال کی طویل مدت گذر جانے کے باوجود بھی وہ زندہ ہیں اور عوام وخواص میں مقبول ہیں۔ اس طرح کی عظیم اور منفرد خصوصیات کی مرکب شخصیتیں زندگی کے ہر میدان میں چاہے وہ موسیقی ہو یا مصوری، ادب ہو یا سنگ تراشی ملیں گی۔ ایسی ہی بے نظیر شخصیتوں میں حضرت امیر خسرو کی شخصیت بھی شامل ہے جو چھ سو سال پہلے پیدا ہوئے تھے لیکن اپنی شخصیت اور فن کے اوصاف حمیدہ سے آج بھی قلوب کو مسحور کرتے ہیں وہ ایک ایسے یکتائے روزگار فنکار تھے جن کی نواسنجیوں نے گردوپیش کے حالات کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ آج کی صحبت میں ہم انھیں امور سے بحث کرینگے جنھوں نے امیر خسرو کی شخصیت کو سمندر سے زیادہ وسیع، پہاڑ کی چوٹی سے زیادہ بلند اور الماس سے زیادہ قیمتی بنا دیا ہے۔

منگولیوں کے بہیمانہ عمل سے ۱۲۲۰ء کے آس پاس وسط ایشیاء انتشار کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ چنگیزی بربریت نے لوگوں کو آشفتہ حال کر دیا تھا۔ انسانیت کی اہانت اور بیباری ظلم انسانیت پسندوں کے لئے باعث انفعال بن چکی تھی۔ آخرالامر سید فطرت منگولیوں کے مسلسل وضیع سلوک اور اپنی آزردگی و آشفتگی سے تاب نہ لاکر دور افتادہ اور دشوار گذار علاقوں کے قبیلے مع خویش پیوند بے خانماں ہو کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ انھیں خانماں برباد قبیلوں میں ایک قبیلۂ لاچین بھی تھا جو ان ناگفتہ بہ حالات کا شکار ہو کر ہندوستان پہونچا۔ اس وقت شہاب الدین التتمش دہلی کے تخت شاہی پر متمکن تھا۔ خدا اسے اپنی رحمتوں سے نوازے کہ اس نے نہ صرف قبیلہ لاچین کے افراد کو اپنے یہاں پناہ دی بلکہ اپنے اعلیٰ اخلاق، دردمندی اور انسان دوستی سے بندگان آفرید کے زخموں کو پُر کرنے کی کوشش کی جیسے چنگیزی ستم انگیزیوں نے لگایا تھا اس نووارد قبیلے میں ایک تھے "امیر سیف الدین محمود" یہ قبیلہ لاچین کے رئیس بخت سفید ترک تھے جنھیں اللہ نے امیر خسرو جیسے جامع الصفات شخصیت کے مالک بیٹے سے نوازا۔ امیر خسرو نے نہ صرف اپنے قبیلے بلکہ پورے ہندوستان کو تاریخ عالم میں سورج کی طرح چمکا دیا۔ ان کی عظمت کے بیان کا خامۂ ناچیز کیا حق ادا کر سکتا ہے۔ ان کے سوز قلب کی محبوب الٰہی قسم کھایا کرتے تھے، تان سین فن موسیقی میں انھیں نائک مانتا تھا۔ حافظ جیسے استاد فن نے انھیں طوطیٔ ہند کے لقب سے نوازا۔ مرزا شاہ محمود نبیرۂ مرزا شاہ رخ والیٔ ہرات وخراسان نے ان کی شان میں یہ کہا کہ ؎

چیں گلدستۂ معنی کی خسرو
بروں آورد از شاخ ضمیرش

ان کی شاعری کے شوخ رنگ کی خوشہ چینی مولانا جامی جیسے بے مثل شاعر نے کی۔ ہرات کے شاعر اشرف نے انکے

خمسے کے طرز سے "ہشت اورنگ" سپردِ قلم کی۔ عبداللہ ہاتفی درکمال خجندی نے ان کی شاعری کی شمع سے اپنی شمعِ شاعری روشن کی، علی شیر نوائی نے ان کی مدح سرائی کو روز و شب کا مشغلہ قرار دیا، شہزادہ سلطان محمد ان کے کلام کا گرویدہ ہوا۔ معز الدین کیقباد نے انھیں ملک الشعراء جیسے خطاب سے سرفراز کیا۔ جلال الدین خلجی نے انھیں مصحف دار بنایا۔ ہندوستان میں ساحل مدراس سے تا کوہِ ہمالیہ ان کا نام زبان زدِ خاص و عام تو ہے ہی مگر روسی ترکستان تبریز، اصفہان، ہرات، بخارا، استنبول، انقرہ، قونیہ برسا، بغداد، سمرقند وغیرہ علوم و فنون کے مراکز میں بھی انھوں نے اپنی بوقلموں شخصیت کی وہ دھاک بٹھائی کہ سار[illegible] انگشت بدنداں رہ گئی۔

ہندوستان کے اس فرزندِ نامدار کی ہمہ گیر شخصیت پر علامہ اقبال کا یہ شعر کس قدر صادق آتا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

امیر خسرو نے ۶۵۲ھ مطابق ۱۲۵۴ء میں سرزمین ہند کے ایٹہ ضلع کے مومن پور نامی مقام میں آنکھ کھولی۔ مومن پور کو دارا شکوہ نے اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف "سفینۃ الاولیاء" میں مومن آباد لکھا ہے۔ یہ وہی مومن آباد ہے جسے دوسرے مورخین و محققین نے امیر خسرو کی پیدائش کے ضمن میں مومن پور لکھا ہے یہاں اس امر کو بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ امیر خسرو کو ان کے والد اپنے ساتھ باہر سے نہیں لائے تھے جیسا کہ والہ داغستانی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "امیر خسرو کے والد انھیں اپنے ساتھ لے کر آئے تھے" یہ والہ داغستانی کا امیر خسرو کی جائے پیدائش کے متعلق یہ بیان انتہائی غیر ذمہ دارانہ اور گمراہ کن ہے۔ اس لئے کہ امیر خسرو نے خود ہی اپنی جائے پیدائش کے متعلق واضح طور پر کہدیا تھا

آنست یکی کیں زمیں از دور زمن
ہست مرا مولد و ماوی و وطن

امیر خسرو نے جب خود ہی اس طرح کا بیان دے دیا تو یہ اتفاقِ زمانہ سے یہ ملک (ہندوستان) میری پیدائش کی جگہ اور نشو و نما حاصل کرنے کا مقام و وطن ہے تو پھر شک و شبہ کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے بہت ممکن ہے کہ والہ داغستانی کے پیشِ نظر امیر خسرو کا یہ شعر نہ رہا ہو۔ یا فاضل محقق کو یہ شعر کسی اور کا ذہن میں آیا ہو جسے امیر خسرو کی ذات سے منسوب کر دیا گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو کی جائے پیدائش یہی جنت نشان ہندوستان ہے جس کے ذرّوں کو تا حیات امیر خسرو نے سُرمۂ چشم و جاں بنایا۔

یہ بات غلط نہیں بلکہ مشاہدے سے ثابت ہوتی رہی ہے کہ عظیم شخصیتوں کی انفرادی خصوصیات کی جھلکیاں بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ ان کی چال، ڈھال عادات و اطوار، بات چیت ان کا رہن سہن عام بچوں سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ امیر خسرو کی شخصی زندگی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ان کی پیدائش کے بعد انھیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر جب ان کے والد ایک مجذوب بزرگ کے پاس لیکر گئے تو اس بزرگ نے امیر کے دمکتے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتے ہی کہدیا "اے امیر لاچین تم میرے سامنے اس بچے کو لیکر آئے ہو جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے نکل

جائے گا۔ اور اس کے بعد امیر خسرو کی پچھتر سالہ زندگی کی معجز نوائی ان کا ذوقِ دل افگاری ہندوی و فارسی پر ان کے محاسن و مناقب سے اس مجذوب کی پیشین گوئی سچ ہی تو ثابت ہوئی ابھی نو ہی سال کے تھے کہ شاعری جیسے مشکل کام (اس زمانے میں شعر گوئی ہرا یرے غیرے نتھو خیرے کا کام نہیں ہوا کرتی تھی) کو شروع کر دیا خود کہا ہے۔

"دراں صغر سن کہ دنداں می افتاد سخن می گفتم" -

اول تو اُنھیں قدرت نے ہی شاعرانہ رجحان Peonew ؎ عطا کیا تھا ۔ ۔ ۔ دوسرے کچھ بزرگوں کی حوصلہ افزائی افزائی سے ان کی شعر گوئی کو بڑی افزائش حاصل ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ امیر خسرو بہت جلد اس مقام پر پہونچ گئے جہاں تک پہونچنے کیلئے دوسروں کو ایک مدت درکار ہوتی ہے اور ۸۰ سال تک پہونچتے پہنچتے ملک الشعرائی Poet ship اُنھیں نصیب ہوگئی" تحفۃ الصغر کے دیباچے میں اُنھوں نے اپنے بچپن کے شاعرانہ ذوق اور ایک بزرگ کی حوصلہ افزائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک بار وہ اپنے استاد خواجہ سعد الدین کے ساتھ خواجہ آسیل کوتوال کے یہاں گئے ہوئے تھے۔ وہیں پر ان کا سابقہ مشہورِ زمانہ فاضلِ علوم و ادبیات خواجہ عز الدین سے ہوا۔ خواجہ عز الدین نے خواجہ سعد الدین سے ان کی شعر گوئی و خوش الحانی کا ذکر کیا تو موصوف نے اپنے ہاتھ کا شعری مخطوطہ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اس میں سے کچھ اشعار پڑھو۔ اُنھوں نے حکم کی تعمیل کی جب وہ پڑھ چکے تو احسنت آفریں کی صدا بلند ہوئی۔ پھر ان کے استاد خواجہ سعد الدین نے خواجہ عز الدین سے مخاطب ہو کر کہا کہ

خسرو کی تخلیقی صلاحیت کا بھی اندازہ لگانا چاہیئے" اُستاد کی اس خواہش پر خواجہ عز الدین نے اُنھیں (خسرو کو) چار مختلف معنوں کے الفاظ بال، انڈا، تیر اور تربوز دیا اور کہا کہ ان الفاظ کو شعر میں اس طرح درج کرو کہ ان کے درمیان کا فرق جاتا رہے۔ حسبِ ارشاد اُنھوں نے فوراً ایک شعر میں مختلف معنوں کے ان الفاظ کو ہم معنی بنا کر پیش کر دیا۔ ان کی اس فی البدیہہ شعر گوئی اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیت کو خواجہ عز الدین نے تسلیم کر لیا اور ان کو مستقل طور پر شعر کہتے رہنے کی تلقین کی۔ امیر خسرو کی تخلیقی صلاحیت کی ایسی مثالیں کئی ایک ہیں ایک بار وہ پیاسے ایک کنوئیں پر پہونچے وہاں اتفاق سے چار عورتیں پانی لینے آئی تھیں امیر خسرو نے ان سے درخواست کی کہ وہ اُنھیں پانی پلا دیں تو پانی بھرنے والی عورتوں نے بر بنائے مذاق، ان سے کہا کہ وہ اس شرط پر پانی پلائیں گی کہ جب وہ کھیر، چرخا کتا اور ڈھول کو ملا کر ایک کبت کہہ دیں عورتوں کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ خسرو نے یہ کبت تخلیق کر کے سنا دی۔

کھیر پکائی جتن سے چرخا دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

لا پانی لا

امیر خسرو کی ابتدائی فکر سے جس قدر کلام جمع ہوا وہ بھی بہت (؟) قیمتی ہے۔ شروع شروع کا ان کا کلام ان کے لیے طغرائے فخر رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن آج ادب کے ہر کہہ و مہ کے لیے وہ یقیناً طرۂ افتخار بن چکا ہے خدا کا شکر ہے کہ خسرو نے اپنے ابتدائی ایام کے کلام کو ضائع نہیں کیا بلکہ تحفۃ الصغر"

کے نام سے مرتب کر دیا ورنہ ان کی فنی زندگی کے اولیں تجربے گوشہ گمنامی میں رہ جاتے اور ان کے ناقدین و محققین کے لئے ان کے ذہنی ارتقاء کا پتہ چلانا مشکل ہو جاتا۔

امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنے ذہین اور سلیم الطبع بیٹے کے لئے معیاری تعلیم کا بندوبست کریں اور ان کے لیے یہ ممکن بھی تھا کیوں کہ وہ بادشاہ وقت کے اخص الخاص لوگوں میں سے تھے۔ شاہی عمارت بھی ان کے لئے ہمہ وقت حاضر رہتی تھی۔ مگر قدرت کا کیا کون ٹال سکتا ہے۔ ابھی وہ اس غور و فکر میں تھے ہی کہ پروانہ اجل آ پہنچا اپنے لخت جگر کو عمر کے ساتویں سال میں چھوڑ کر امیر سیف الدین راہیٔ عدم ہوئے باپ کی رحلت کے بعد نانا عماد الملک نے امیر خسرو کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ عماد الملک اس زمانہ میں شان اور عزت و مرتبے کے ایک منارہ تھے۔ وہ بادشاہ تو نہیں تھے لیکن بادشاہوں کو تخت پر بٹھانا اور تخت سے الگ کرنا ان کا تفریحی شغل بنا ہوا تھا۔ سلطان التمش ان کی جی جان سے قدر کرتا تھا۔ قرائن سے تو یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ عماد الملک کے یہاں سلطان المشائخ محبوب الٰہی نے بھی کچھ دنوں تک قیام فرمایا تھا۔ جب نانا کا امیرانہ کر و فر اور ان کی علم دوستی کا معیار یہاں تک پہونچا ہوا ہو تو خسرو کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کس درجہ کا رہا ہوگا اسکا اندازہ کرنا مشکل نہیں یہ سب تو خسرو کے حوصلہ کو بلند سے بلند تر کرنے کی قدرتی ترکیب تھی لیکن خود خسرو کی حاضر دماغی، سخن آرائی، بذلہ سنجی، معاملہ فہمی، عافیت بینی، تر دستی و تر زبانی ان کی نادرہ کار دقیقہ آفریں طبیعت اور ذوقِ آگہی نے عروش الکمال پر انھیں براجمان کرنے میں بہت بڑا رول ادا کیا۔ دنیا کے معاملات کو سمجھنے کی شعوری کوشش انھوں نے شروع ہی میں کر دی تھی۔ ان کی اس انفرادی خصوصیت نے انھیں تیز فہم (Quick - eyed) اور باخبر (Quick - eared) بنا دیا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ اپنی پوری زندگی میں کبھی سبک سر یا لاابالی (light-minded) نہ ہوئے امیر خسرو شاید اس حقیقت سے باخبر تھے کہ جس عہد میں وہ سانس لے رہے ہیں اس میں اگر انھوں نے خود کو سبک سر اور لاپرواہ بنایا تو پانی کے آبلہ کی طرح ٹوٹ کر اپنا وجود کھو دیں گے۔ اور دنیا میں ان کی شخصیت تک کا نشان نہ ملے گا۔

اور خسرو اپنا وجود کھونے نہیں بلکہ اسے ہشت پہلو اور جامع الکمالات بنانے کی تمنا لیکر پیدا ہوئے تھے اس لیے اپنے خواب کی تکمیل کے لئے انھوں نے بڑے بڑے جتن کئے بڑی ریاضت اور مجاہدہ سے کام لیا۔ اور شاید خسرو کی اس ریاضت اور مجاہدہ مسلسل کا کرشمہ ہے کہ زمان و مکان کی ساری بندشیں توڑ کر ان کی شخصیت کائنات پر چھا گئی۔

امیر خسرو نے ہوش سنبھالتے ہی اپنی زندگی کی راہ متعین کر لی تھی۔ اور اس راہ پر مستقل مزاجی سے چلتے رہنے کے لیے انھوں نے اپنے دل و دماغ کو آمادہ بھی کر لیا تھا دوسر شاعروں کی طرح گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اور فن میں ہمہ تن مستغرق رہ کر اپنی منزل مقصود تک پہونچنا ان کو آسان نہ لگا یا پھر یہ کہ وہ دنیا اور مافیہا سے الگ تھلگ رہ کر جینے میں لطف محسوس نہ کرتے۔ اس لئے انھوں نے انسانی

سماج سے براہ راست تعلق پیدا کر لیا رواداری۔ وسیع المشربی
فراخدلی، کشادہ ذہنی، خوش اخلاقی، غربا پروری، اخلاق
مندی کو اپنی زندگی کا دائمی شعار بنایا۔ وہ جس عہد کی
یادگار ہیں وہ سر تا سر شہنشاہیت کا دور تھا۔ پورے
انسانی سماج پر سلاطین کی گرفت تھی اس لیے خسرو نے
بادشاہوں کے درباروں سے وابستگی کو مقتضائے وقت
کے عین مطابق سمجھا یوں بھی ان کے نانا عماد الملک کی
وفات کے بعد ان پر بہت سی گھریلو اور سماجی ذمہ داریاں
آ گئی تھیں۔ امیر خسرو کل ۷۵ سال زندہ رہے عمر کے بیسویں
سال سے انھوں نے درباری زندگی شروع کر دی تھی۔
اس طرح ۵۵ سال کے لگ بھگ انھوں نے اپنے شب
و روز سلاطین کے درباروں میں گزارے۔ شاید وہ ہندستان
کے پہلے اور آخری شاعر ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ سات
مختلف بادشاہوں کے ادوار دیکھے بلکہ ان کے درباروں
سے معاملت بھی رکھی۔ سب سے پہلے انھوں نے جس سلطان
کے دربار میں باریابی حاصل کی وہ سلطان غیاث الدین
بلبن کا بھتیجہ اور اس کا حاجب محمد کشلی خاں عرف ملک
چھجو تھا جس کی مدح میں امیر خسرو نے لاجواب قصیدہ سپرد قلم
کیا جس کا ایک شعر یوں ہے۔

چرخ را گفتم کہ خورشیدت کجاست
آسمان روئے ملک چھجو نمود

اس کے بعد بغرا خاں، شہزادہ سلطان محمد، امیر علی سر
جاندار، معز الدین کیقباد، جلال الدین خلجی، سلطان
علاؤ الدین خلجی، اور قطب الدین مبارک شاہ کے درباروں
سے مسلسل ان کی وابستگی رہی۔ یہ درست ہے کہ امیر خسرو نے
اپنی زندگی کا بڑا حصہ بادشاہوں کے درباروں میں گزارا
اس اعتبار سے وہ یقیناً شاہ پرست (Royalist)
کہے جا سکتے ہیں لیکن اپنی طویل درباری زندگی میں انھوں
نے کسی بھی مقام پر کروفر شاہی کے سامنے اپنی عزت و توقیر
کو گھٹنے نہ دیا اور نہ ہی امارت اور شاہی مرتبہ کے لئے آز و
ہوس کو کبھی راہ دی، وہ عزت و دولت دونوں کے شائق
تھے اور دونوں کے حصول کے لئے جی توڑ کوشش بھی کی لیکن
بادشاہوں کا یاد فروش بنکر وہ ان نعمت دینوی کو حاصل
کرنا اپنے لئے باعث اہانت سمجھتے تھے۔ شاید اسی لیے امیر
خسرو نے کبھی نہ تو بیجا درباداری کی اور نہ ہی خواہ مخواہ
کے لئے جی حضوری سے کام لیا دراصل یہ ان کی خود شناسی
خود نگری و خود آگاہی کا نتیجہ تھا جو اردو پر ظاہر ہوا۔
امیر خسرو کی حق پسندی، صاف گوئی، اور ان کا غیر منافقانہ
جوش و خروش تو یہاں تک پہونچا ہوا تھا کہ جس بادشاہ
کے یہاں بے راہ روی و تملق کام جوئی و تن آسانی، غرور
و بدخلقی، بدنیتی و ترش روئی، نارسائی طبع و جز رسی
اور ہنگامہ ہائے نا د نوش دیکھا اس کی مدح نہیں بلکہ قدح
کی اس کی مذمت کرکے اسے حامئ دین متین اور حامل قرآن
حکیم بنانے میں پورا زور صرف کیا۔ قران السعدین میں معز الدین
کیقباد کی عیش پرستی اور اس کے دوسرے عیوب کی طرف
اس کے ذہن کو نہ صرف منعطف کیا بلکہ اسے نصیحت بھی
کی۔ اپنی عشقیہ مثنوی دولرانی خضر خاں میں علاؤ الدین
خلجی کی گمراہ کن علتوں کی طرف اشارہ کیا، نہ سپہر
میں سلاطین و امرا کے لئے نصیحت کے طور پر بہت کچھ لکھا
کبھی کبھی تو ایسے بھی واقعات پیش آتے تھے کہ کسی بادشاہ

انھیں اپنی مصاحبت میں رکھنے کی ان کے سامنے خواہش مرکی اور امیر خسرو نے برجستہ انکار کر دیا۔ ان کے انکار سبب محض یہ ہوتا تھا کہ وہ اس کے طور طریق کو ناپسندیدگی نظر سے دیکھتے تھے ایسے وقت میں جب کہ ادنیٰ سی غلطی سلاطین بڑے بڑے لوگوں کو پھانسی کے تختے پر چڑھا کرتے تھے امیر خسرو کی یہ دلیری اور بے ریا دربار ی زندگی ل متحرک ہے اس عہد میں ان کی اس طرح کی تعمیری کوششیں ں بھلائی نہ جا سکیں گی یہ صرف خسرو کا ہی جگر تھا کہ ملک الشعرا ر الدین کو توال کے بھتیجے اور داماد نظام الدین وزیر اور ے کا فور سے محض ذہنی اختلاف کی بنا پر وہ کبیدہ خاطر ہو تھے اور ان کی آن میں قطع تعلق کر لیا۔ انصاف سے دیکھا جائے تو امیر خسرو کی سلاطین و امرا ناز برداری کرتے رہے ن کے مزاج اور ان کی طبیعت کے مطابق ان سے سلوک کرتے ہے پتہ نہیں کس طرح پروفیسر مجیب نے امیر خسرو کے بارے ں یہ بیان دے دیا کہ "انھوں نے جینے کے لیے ضرورت سے زیادہ سمجھوتہ کیے۔" جب کہ حقیقت یہ ہے کہ درحقیقت خو مرا و سلاطین سے انھیں خدا واسطے کا بیر تھا جینے کے لیے یا عیش و عشرت کیلئے غیر اخلاقی کوشش انھوں نے کبھی نہ کی ان کی کوششیں تو محض احقاقِ حق اور ازہاق باطل کے لیے ہوتی تھیں کیوں کہ یہی اہلِ حق کا شیوہ ہوتا ہے اور یہ ایک امر مسلم ہے کہ وہ اگر ہوا و ہوس کا شکار ہوئے ہوتے تو ۵۵ سال تک درباروں سے وابستہ نہیں رہ سکتے تھے۔ امیر خسرو کے لیے جو چیز منفعت بخش ثابت ہوئی وہ ان کی خوشامدانہ زندگی نہیں تھی بلکہ ان کی بے باکی بے ریائی اور ژرف نگاہی تھی۔

امیر خسرو کے اندر یہ حق گوئی دبے باکی، حسن سیرت اور فکر و خیال کا استحکام کچھ تو ان کے اپنے تدبر، فہم و فراست اور حکمت عمل کا نتیجہ تھا، نیز دوسرے ان کے روحانی پیشوا، مرکز انسانیت اور کعبۂ ہدایت دا نخداب، محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ کی تاثیر نظر کے سونے پر سہاگہ کا کام کیا امیر خسرو جو پوری عمر حق اور صداقت کے طرفدار رہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی تھی کہ ان کی ذہنی باگ دوڑ ہمیشہ سلطان المشائخ کے ہاتھ میں تھی۔ امیر خسرو اور نظام الدین اولیاؒ دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم بن گئے تھے امیر خسرو اپنے پیر و مرشد کے عشق میں ہمہ وقت سینہ فگار رہتے تھے اور حضرت نظام الدین امیر خسرو کو اپنی مادی زندگی کا سب سے بڑا حاصل سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر خدا نے ان سے سوال کیا کہ دنیا سے کیا لائے ہو تو فخر کے ساتھ کہوں گا کہ "امیر خسرو" کو لایا ہوں۔ محبوب الٰہی کے اس ارشاد سے امیر خسروؒ کی پاک دامنی، ان کے ذوق جیسدہ ایمان اور عرفان یزداں ان کے تصوف و سلوک میں انہماک اور حمایت حق کے وصف کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

جہاں تک امیر خسرو کی زبان اور ان کے فن کا تعلق ہے تو اس میں دو رائے نہیں کہ امیر خسرو قصیر اردو کے اولیں معمار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ آج جو زبان تناور درخت کی صورت میں ہمارے سامنے ہے اس کی جڑوں کو اپنے خونِ جگر سے سینچ کر اس میں بڑھنے اور وسیع سے وسیع تر ہونے کے جراثیم امیر خسرو نے ہی پیدا کئے ہیں۔ اس کے دامن میں آج جو رنگا رنگی ہے وہ امیر خسرو ہی کی

ہمہ جہت اور تہہ دار شخصیت کی مرہونِ منت ہے ہندی ہو یا ہندوی یا ہندوستانی دورِ خسرو سے قبل اس کی اہمیت ہی کیا تھی مانا کہ امیر خسرو سے قبل "مسعود سعد سلمان" نامی ایک شاعر نے فارسی کے ساتھ ساتھ ہندوی میں بھی کچھ فکرِ سخن کی تھی لیکن ہمارے سامنے تو اس کا ہندوی زبان کا کوئی ذخیرہ کلام نہیں کہ اس کا اعادہ کرسکیں کہ اس نے ہندوی زبان کو کس شکل میں امیر خسرو کو دیا۔ اگر اس امر کو بھی تسلیم کر لیا جائے کہ امیر خسرو سے قبل زبان ہندوی موجود تھی تو اس کی شکل بس ایسی ہی ہوگی جیسے ہچکولے لیتے ہوئے پانی میں کسی تصویر کا دھندلا سا ڈولتا ہوا عکس۔ خسرو نے اس ڈولتی ہوئی تصویر کو نہ صرف استقامت عطا کی بلکہ اسے اپنے فکر کی ضیا بخشیوں، سحر انگیز نکتہ طرازیوں اور وجد آفریں زمزمہ سنجیوں کے امتزاج سے واضح رنگ و روپ دے کر اس کے انگ انگ میں صہبائے رنگیں کا کیف و سرور پنہاں کیا اور صدیوں کے مد و جزر کے بعد غرقِ نور ہو کر وہی تصویر اردو کا لبادہ اپنے چہرے پر ڈال کر ہم تک پہونچی ہے اور اب اس کے چہرے پر اتنی شادابی، درخشانی اور رنگینی رواں دواں ہے کہ مہرِ درخشاں کی شعاعیں بڑھ بڑھ کے اس کی بلائیں لے رہی ہیں، اردو اپنی اس شان برتری و افضلیت کے لیے امیر خسرو کے جمالِ حکمت و دانش، کمالِ علم و ادب اور ان کے البیلے اسالیبِ بیان و اظہار کے احسان سے گراں بار ہے۔ انھوں نے فارسی کی رائج الوقت تمام اصنافِ سخن کو ہندوی زبان کی شاعری کے لئے استعمال کیا۔ فارسی اصنافِ سخن سے قطعِ نظر بہت سی خالص ہندوستانی صنفیں بھی استعمال کیں اور اپنی محیر العقول فصاحتِ کلام، معجزانہ بلاغتِ زبان کی چاشنی سے ان میں نیاپن پیدا کیا۔ ان کی پہیلیاں، گیت اور ٹھمریاں دوسرے ہزاروں انسانوں کے احساس و وجدان کو بیدار کرنے کی بھرپور طاقت رکھتی ہیں اپنے کد و کاوش سے انھوں نے اپنی پہیلیوں میں بڑی بڑی گرہیں کھولی ہیں بڑی بڑی گتھیاں سلجھائی ہیں بڑے بڑے مسئلوں کا حل تلاش کیا ہے چونکہ ان کا دل ہمیشہ عکس جمالِ روئے یار کی جلوہ گاہ رہا اس لیے ان کے کلام کے ایک بڑے حصہ پر روحانیت کا رنگ چڑھا ہوا ملتا ہے اپنے اس نوع کے کلام میں امیر خسرو سرتاپا قتیلِ آرزو نظر آتے ہیں ان کے سینے میں برق شرر بار محبت ہمیشہ کوندتی رہی اور ان کے دل کی دھڑکنیں جب شعر کے قالب میں ڈھل کر منصۂ شہود پر آتی تھیں تو ربابِ زندگی کا ہر تار مرتعش ہو اٹھتا تھا۔

امیر خسرو نے ہندوی اور فارسی میں غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی کے کئی لاکھ اشعار کی تخلیق کی اور ان کی ان تمام تخلیقات میں اس عہد کے ہندوستان کی واضح تصویر کا عکس دیر تو تلاش کیا جا سکتا ہے، وہ بنیادی طور پر مورخ نہیں تھے بلکہ رزم گہ اور بزم طرب کے انسان تھے لیکن اپنے زمانہ کی سیاست، اخلاقی اقدار، زندگی کی رنگا رنگی عشق و محبت کے پیچ و خم، پند و نصیحت، تصوف و سلوک، معرفت الٰہی وغیرہ مشغلہ ہائے حیاتِ انسانی کو اپنی شاعری کے آبگینے میں ڈھال کر ایک بیدار مغز مورخ ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ ہم تو یہاں تک لب کشائی کی جرأت کرسکتے ہیں کہ جس حسن اور سلیقے سے انھوں نے ۱۳ویں اور چودھویں صدی کے ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی اتار چڑھاؤ کی تصویر کشی جا بجا اپنی شاعری میں کی ہے اسکی مثال مورخین کی تاریخی

کتابوں میں بھی نہیں ملتی۔ اس منزل پر پہونچ کر امیر خسرو شاعر سے زیادہ "مورخ" لگتے ہیں۔

بقول جامی رحمۃ اللہ امیر خسرو نے ۹۲ کتابیں لکھی ہیں لیکن ان میں سے بیشتر دستیاب نہیں ہیں نظم و نثر میں ان کی جتنی بھی کتابیں دستیاب ہیں ان میں "تحفۃ الصغر"، "وسط الحیوٰۃ"، "غرۃ الکمال"، "بقیہ نقیہ"، "نہایت الکمال" ان کے کلام کے دواوین ہیں ان میں خسرو نے ادبیت پر زور دیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ان کی بنیاد محض شعر و ادب پر ہے۔ امیر خسرو کے یہ پانچ دیوان ان کے ادبی مقام کے تعین میں بڑا رول ادا کرتے ہیں۔ اہل نظر کی ایک نگاہ تجسس اور عمیق مطالعہ کے نتائج ہیں فارسی کے مشہور زمانہ شاعر نظامی گنجوی کے شاہکار پنج گنج کو سامنے رکھ کر امیر خسرو نے خمسہ لکھا۔ یہ خمسہ ان کی پانچ طویل مثنویوں کا مجموعہ ہے جن کے نام ہیں "مطلع الانوار"، "شیریں خسرو"، "آئینہ سکندری"، "ہشت بہشت"، "مجنوں لیلا"۔ ان مثنویوں میں امیر خسرو نے گہوارہ فارسی کے ایک سربرآوردہ فنکار کے مقابل کھڑے ہو کر ہندوستانی فارسی دانی کی نمائندگی کی ہے ان میں ایک طرف تو انھوں نے اپنے عہد کے ہندوستان کی تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی تصویر کی رو گردانی کی ہے اور دوسری طرف ان مثنویوں کے اشعار میں حلاوت آمیز (Mellifluous) سرور و انبساط کا سرچشمہ جاری کیا ہے جس پر نظر ڈالتے ہی ذہین قاری پر کیف وجدانی طاری ہو جاتا ہے۔ انھوں نے دوسری بھی چند مثنویاں سپرد قلم کی ہیں جن میں "قرآن السعدین"، "مفتاح الفتوح"، "دول رانی خضر خاں"، "تغلق نامہ" اور "خزائن الفتوح" بڑے اہم ہیں۔ ان تمام مثنویوں کی نوعیت سرتاسر رزمیہ ہے ان میں امیر خسرو نے نہ صرف یہ کہ اپنے چہرہ زیبائے فکر کے جمال کی تشہیر کی ہے بلکہ بہت سے رجال عصر کو دائمی شہرت سے ہمکنار بھی کیا ہے اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ بڑے بڑے ناموں کے نشانات وقت کے گرد و غبار میں اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں لیکن جن ناموں کو ایک شاعر آب حیات سے تیار کی ہوئی اپنے قلم کی روشنائی سے صفحۂ قرطاس پر رقم کر دیتا ہے وہ اپنی جگہ پر الماس بن کر چمکتے رہتے ہیں اور دنیائے نشیب و فراز انھیں مٹانے سے ہمیشہ قاصر رہا کرتے ہیں۔ نظم کے علاوہ امیر خسرو نے کچھ نثری تصنیفات بھی یادگار چھوڑی ہیں۔ مگر نظم کے مقابلے میں ان کا نثری سرمایہ کم ہے۔ لیکن جتنا کچھ بھی ہے اس سے کشادگی اور تازگی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نثری تصنیف "اعجاز خسروی" کو ہی لے لیجئے۔ اس ضخیم اور کئی حصوں پر مشتمل کتاب میں امیر خسرو نے اپنے قلم کو شہباز ہمت اور سیمرغ عزم بنا کر چھوڑ دیا ہے جس کی سیاہی سے نکلا ہوا ہر حرف نقش نامہ جاوید ہی نہیں بلکہ نور آفریں ([illegible]) اور توقیر حیات سے مملو ہے۔ اپنے خامۂ رنگیں سے امیر خسرو نے توضیح و تفسیر حیات کا جو کام لیا اور بند دلوں کو کھولنے کی جو سعی کی وہ محض انھیں کا کام تھا۔

امیر خسرو سرتاسر مسلم عہد حکومت کے فنکار رہے۔ اصولی طور پر انھیں اسلامی تہذیب کا پرستار اور نغمہ خواں ہونا چاہیئے تھا لیکن ایسا ہرگز نہ ہوا۔ ان کا دل ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے یکساں طور پر دھڑکتا تھا۔ اور گنگا

کی ادائے رقصِ سیمابی جمنا کا اندازِ تلاطم اور اس کی موجوں کی بیتابی دہلی کی صورت غرقِ موجہ نوراں کے لئے سکون قلب کا باعث تھیں۔ ہندوستان کی محبت ان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی اور شاید ہندوستان سے والہانہ لگاؤ ہی نے اِن سے یہ کہلوایا تھا کہ

بہشتے فرض کن ہندوستاں را
کزانجا نسبت است ایں بوستاں را

ہندوستان سے امیر خسرو کی محبت کا سیلاب یہیں نہیں تھمتا بلکہ آگے تک پہونچتا ہے

حکمت و دانائی و علم و ہنر
وانچہ کہ در ہند معانیست دگر

یہ تھی امیر خسرو کی وطن پرستی جس کے پیچھے خود امیر خسرو کے بقول یہ حدیث کارفرما تھی کہ

حُبُّ الوَطَنِ مِنَ الاِیمَان۔ ظاھر ہے یہ حدیث صرف امیر خسرو کے واسطے ہی نہیں تھی بلکہ اس کا تعلق ہر اُس شخص سے ہے جو اس بندۂ حق جسے دوسرے لفظوں میں رسولِ خدا کہتے ہیں سے عقیدت و محبت رکھتا ہے اس حدیث سے انکار رسولِ خدا کی شان میں گستاخی ہے اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہندوستان کے لاکھوں اور کروڑوں مسلمان جن کی حب الوطنی دوسرے ہم وطنوں کی نظر میں کھٹکتی ہے اس حدیث سے دست بردار ہوسکتے ہیں کاش ہندوستان کے مسلمانوں کی وطن دوستی کی یہ ٹھوس بنیاد یہاں کے دوسرے لوگوں پر واضح ہوسکتی۔ اور وہ یہ سمجھ سکتے جس طرح امیر خسرو نے چھ سو سال پیشتر اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے خاک ہند سے پیار کیا تھا اسی طرح چھ سو سال کی مدت گذر جانے کے بعد اب بھی خاک ہند سے پیار کرنے والے شیدائے اسلام یہاں موجود ہیں اور غالباً خاک ہند کو آنکھ سے لگانے والے اور ہندوستان کو اپنے لہو سے لالہ زار کرنے والے کروڑوں فدایانِ اسلام مستقبل میں بھی باقی رہیں گے اور ان کی وطن پروری کو پر لگانے والے امیر خسرو کے وارثین میر و غالب حسرت و اقبال جیسے ائمۂ فکر و فن جنم لیتے رہیں گے اس طرح کے یقین و اذعان ہماری ذہنی بیماری کے بہت سے عوارض کو زائل کرسکتے ہیں۔

مفتون کوٹوی :-

امیر خسرو

مجموعۂ علم عقل و عشق

امیر خسرو کے علم وفضل کا اعتراف سات سوسال سے اب تک برابر ہوتا رہا۔ اُن کے عہد میں بھی اور اُنکے بعد بھی لوگوں نے مختلف الفاظ میں انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ سلطان شہید حاکم ملتان نے شیخ سعدی رح کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تو انھوں نے اپنی ضعیفی کی وجہ سے انکار فرما دیا اور کہا کہ ہندوستان میں خسرو کافی ہیں۔ مجموعۂ تذکار کے الفاظ یہ ہیں :-

"آوردہ اند کہ قاآن ملک عادلاً واجلاً التماس قدم شیخ سعدی از شیراز نمودہ وسیلہ حسین شرقی و عموش عکرہ را با تحف گرامی و خرج کامی نزد شیخ در شیراز فرستاد۔ اما آں حضرت عذر ضعف پیری درمیان نہادہ وسفائن غزل را ہر دو مرۂ بہ خط مبارک نوشتہ بر سولاں سپرد و فرمود کہ در ہند خسرو بس است"۔

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں :-

"شیخ بہ عذر پیری بنا مد۔ اما بہ تربیت امیر خسرو سلطان را وصیت فرمود، سفارش او فوق الحد نوشتہ۔

اُن کے ہمعصر مورخ ضیاء الدین برنی نے اِن کی تعریف و توصیف کو بدرجۂ کمال پہونچا دیا ہے :

"درعصر علائی شعرائے بود ند کہ بعد از ایشان بلکہ پیش از ایشان چشم روزگار مثل ایشاں ندیدہ است۔ لا سیما کہ امیر خسرو کہ خسرو شاعران سلف وخلف بودہ است۔ ودر اختراع معانی و کثرت تصنیفات وکشف رموز غریب نظیر نداشت واگر استادان نظم ونثر دریک دو فن بے ہمتا بودند، امیر خسرو در جمیع فنون ممتاز و مستغنی بود۔ ہم چناں در منونے کہ در جمیع فن ہائے شاعری بسر آمدہ واستاد باشد۔ در سلف نبود ودر خلف تا قیامت پیدا آید یا نیاید۔ امیر خسرو کہ در نظم و نثر پارسی کتب خانۂ تصنیف کردہ است ودا د سخن وری دادہ است۔"

علامہ شبلی نعمانی، شعر العجم میں یوں اظہار حقیقت فرماتے ہیں :-

" فردوسی۔ سعدی۔ انوری۔ حافظ۔ عرفی۔ نظیری۔ بے شبہہ اقلیم سخن کے جم وکے ہیں لیکن ان کی

حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھی۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکے۔ انوری۔ مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکے۔ حافظ۔ عرفی۔ نظیری۔ غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکے، لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل۔ مثنوی۔ قصیدہ رباعی سب داخل ہیں اور چھوٹے چھوٹے خطہائے سخن یعنی تضمین، مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار ہی نہیں"۔

حیات امیر خسرو کی تقریظ میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے یہ الفاظ سپرد قلم کئے ہیں:۔

اس سرزمین پر حضرت امیر خسرو جیسا با ادق، ذی کمال و جامع صفات شخص اب تک پیدا نہیں ہوا۔ وہ فارسی کے نہایت بلند پایہ شاعر ہیں۔ استاد غزل سعدی مانے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ ہو سکتا ہے تو وہ حضرت امیر خسرو ہیں۔ ان کے کلام کی فصاحت، روانی اور خاص کر سوز و گداز جس میں تصوف کی چاشنی بھی شامل ہے۔ اپنا جواب نہیں رکھتی۔ یوں تو سب اہل زبان کو اپنی اپنی زبان کا غرّہ رہتا ہے لیکن اہل ایران اس معاملہ میں خاص طور پر ممتاز ہیں وہ کسی غیر ایرانی کلام خاطر میں نہیں لاتے لیکن حضرت امیر خسرو کے سامنے انھیں بھی جھکنا پڑا، فارسی میں ان کا عروج و کمال ایرانیوں کے مقابلہ میں کسی معجزے سے کم نہیں"۔

یہ اور اسی قسم کے بہت سے اقتباسات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جو امیر خسرو کے علم و فضل پر روشنی ڈالتے ہیں، وہ شعر گوئی کا مادّہ شکم مادر سے لے کر آئے تھے۔ اور ابھی ان کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے کہ ان کی زبان سے بے اختیار شعر نکلتے تھے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے دیباچہ غرۃ الکمال کے حوالہ سے درج کیا ہے

"دراں صغر سن کہ دندان می افتاد
سخن می گفتم و گوہر از دہانم می ریخت"

امیر صاحب کو ۹۲ یا ۹۹ تصانیف کا مصنف بتایا جاتا ہے، اور چار لاکھ یا پانچ لاکھ کے درمیان ان کی ابیات بتائی جاتی ہیں۔ اس پر علامہ شبلی نے ایک غلط فہمی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قدیم زمانہ میں سطر کو بیت کہتے تھے، اس بنا پر ان کی مجموعی تصانیف ۴ - ۵ لاکھ سطروں پر مشتمل ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی ہو تو بھی ان کی بسیار گوئی اور بسیار نویسی کے ثبوت کے لئے بہت کافی ہے۔

ان کا ہندی کلام کمتر دستیاب ہے لیکن جو کچھ ہے اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اُن کے ہم عصر شعراء نے اُس وقت زبان ہندوی کی طرف قطعاً توجہ نہیں کی تھی۔ امیر خسرو نے اپنی اس زبان ہندوی کو نکھارنے سنوارنے کی ایسی کوشش کی کہ اس بنیاد پر اُن کے اکثر تذکرہ نویس، انھیں اردو زبان کا بانی و موجد قرار دیتے ہیں۔ ان کی چوالیس پینتالیس تصانیف کا پتہ تو اہل تحقیق کو چل گیا ہے "خالق باری" کے متعلق بحث چل رہی ہے کہ اسے ضیاء الدین خسرو کی تصنیف مانا جائے یا امیر خسرو کی ـــ افضل الفوائد اور راحت المحبین بھی ابھی زیر بحث ہیں لیکن بقیہ کتابیں جو نثر و نظم پر مشتمل ہیں۔ وہی ان کے عالم متبحر ہونے کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ نثر میں بھی انھیں بدرجہ اولیٰ دستگاہ حاصل ہے۔ اور نظم میں تو مثنوی۔ قصیدہ و غزل کے ساتھ ساتھ عام اصناف سخن ان کے زیر قلم ہیں۔ وسیع النظر ایسے کہ ہندوستان کے مختلف چرند پرند۔ پھل پھول اور موسم و ماحول کو بڑی جزرسی سے

بیان کرتے ہیں۔ معلومات کا دریا جوش پر آتا ہے تو مقامی زبان میں گیتوں، دوسخنوں، مکرینوں اور پہیلیوں کی بھرمار کر دیتے ہیں۔ یہاں کے ماحول کے جذبات و احساسات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، اسی لئے وہ چاروں طرف "آناً فاناً" میں پھیل جاتی ہیں اور ان کے لئے قبولیت و شہرت کے گلدستے تحفے میں لاتی ہیں۔ اور یہی عوامی پسندیدگی ان کے علمی وقار و معیار کو عروج و کمال پر پہونچانے میں مدد کرتی ہے ـــــ امیر خسرو کی عقل و دانائی اور ہوشمندی و تدبر کی داد اس سے بڑھ کر کیا دی جاسکتی ہے کہ وہ غیاث الدین بلبن سے لے کر غیاث الدین تغلق تک درباروں سے وابستہ رہے اور اس دوران انقلاب کی وہ آندھیاں چلیں کہ حکومتیں بنی بھی اور بگڑیں بھی۔ مختلف حکمراں تخت نشین ہوئے لیکن یہ ہر دورِ حکومت میں مقتدر و معزز ہی رہے، ہر بادشاہ وقت نے انھیں معتبر و معتمد سمجھا۔ اور یہ اپنے وقت کے ایسے یوسف بنے رہے کہ دو جہان بھی ان کی قیمت کے سامنے ہیچ رہے ؎

یوسف عہدی، اگر خسرو بود قیمت گرت
ور دہم ملک دو عالم رائیگاں بستاننت

ان کے درک و شعور اور فہم و عقل کا کمال ان کی موشگافی اور جدت پسندی میں ہے۔ اختراع و ایجاد بھی اسی ضمن میں ہے۔ مثنوی نُہ سپہر لکھتے ہیں تو اس کے نو باب متعین کرتے ہیں۔ ہر باب، ایک ستارے سے متعلق۔ جدت طرازی یہ کہ عام مثنویاں ایک ہی بحر میں لکھی جاتی ہیں۔ یہ ہر باب کے لئے جداگانہ بحر منتخب کرتے ہیں۔ پھر درمیان میں غزل بھی دیتے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی تعریف میں جابجا رطب اللسان ہیں۔ جدت یہ ہے کہ اسے دیگر ممالک پر دس حجتوں کے ساتھ فضیلت دیتے ہیں، ہندوستان کو سات دلیلوں سے جنت ارضی ثابت کرتے ہیں۔ صنائع بدائع میں بھی اپنی ایجادوں کا کمال جتاتے ہیں۔ اعجاز خسروی کی سی ضخیم کتاب لکھ کر نثر نگاری اور جدت پسندی میں اپنا جھنڈا گاڑ دیتے ہیں۔ اشعار کے مجموعوں میں سن تصنیف کے ساتھ یہ بھی نشان دہی کر دیتے ہیں کہ اس میں اتنے اشعار ہیں۔ ان جدتوں کے علاوہ غزل گوئی میں بھی جدتیں کرتے ہیں۔ ایک غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ساقی بیا کہ موسم عیش است میم درے
مے خور کہ لالہ گوں شود از بادہ رے وخے
رخ برفروز و زلف مسلسل مزن گرہ
تا نشکند جمال تو بازار میم وہے
مہ را ز روئے خوب تو نسبت کجا کنم
اے روئیت آفتاب و لبت شیر کا دبرے
شکر شد از خجالت لعل تو آب دار
برگرد میم وہے چو کشیدی تو خے وطے

اس غیر مردف غزل کے قافیے دیکھئے۔ ہر مصرع کے آخری حرفوں سے جو لفظ بنتا ہے اُسے اگلے مصرع کا اولین لفظ رکھا ہے۔ صنائع و بدائع کی ایجادوں کے سلسلے میں علامہ شبلی کا کہنا ہے کہ بہت سی صنعتیں وہ ہیں جو عربی میں موجود تھیں لیکن فارسی میں ان کا ادا کرنا اسلئے مشکل تھا کہ فارسی زبان کی کم وسعتی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی، مثلاً صنعت منقوط یعنی عبارت میں ایسے الفاظ لانا جن کا ایک ایک حرف نقطہ دار ہو، امیر خسرو نے اس قسم کی صنائع میں صفحے کے صفحے لکھے ہیں بعض فارسی میں تھیں لیکن ایک آدھ سطر سے زیادہ کوئی شخص نہ لکھ سکا، امیر خسرو

سے ورق کے ورق لکھے۔ بعض صنائع میں انھوں نے تصرفات کئے اور بعض بالکل انھیں کی ایجاد ہیں۔

ان کی دانشورانہ موشگافیوں میں علم موسیقی کی وہ ایجادیں بھی ہیں جو صرف انھیں سے مختص ہیں قول۔ ترانہ۔ خیال۔ نقش نگار۔ بسیط۔ تلانہ۔ سوہلہ امیر صاحب کی ایجاد ہیں۔ اور ایسے تصرفات تو بہت ہیں جو انھوں نے ایرانی اور ہندی راگوں میں کئے قوال امیر خسرو کو اپنا ابوالآبا اسلئے خیال کرتے ہیں کہ قوالی انھیں کی ایجاد ہے قوالی میں غزل کی چاشنی، موسیقی کی دلدوزی اور روحانیت کی جگر سوزی چاہیئے۔ امیر خسرو ان تینوں کیفیات سے بہرہ مند تھے۔ قوال کی ڈھولک، کو بھی انھیں کی ایجاد کہا جاتا ہے اسی طرح ستار اور طبلہ کو بھی انھیں کی ایجادوں میں شامل کیا جاتا ہے۔

امیر خسرو کو خداوند تعالےٰ نے خیال شاعر و ذہن حکیم دیا تھا۔ مجموعۂ علم و عقل و عشق بنایا تھا علم و عقل کی کرشمہ کاریاں اور فسوں پردازیاں عشق و محبت کے جذبے دو آتشہ و سہ آتشہ ہو جاتی تھیں، کوئی فن، خون جگر کے بغیر پختگی و آراستگی تک نہیں پہونچتا۔ امیر صاحب نے اپنے ہر شعبۂ حیات میں دانشورانہ رکھ رکھاؤ اور عقلمندانہ سلیقہ و احتیاط سے کام لیا۔ جس طرح انھوں نے امیر داری اور دربار داری کرتے ہوئے انقلاب کی آندھیوں سے خود کو محفوظ رکھا اور ہر آنے والے بادشاہ کی نظر میں وہی معتمدانہ و معتبرانہ وقار حاصل کر لیا۔ اسی طرح یہ بھی ہمارے لئے حیرت اور ان کے لئے عقل و عظمت کا مقام ہے کہ وہ شاہی دربار کے جھمیلوں اور منقبت و امارت کی دلکشیوں کے باوجود فقیری و درویشی کو اس انداز سے نبھائے ہوئے ہیں کہ حضرت محبوب الٰہی خدا سے اپنی بخشش ان کے سوز و گداز کے طفیل چاہتے ہیں۔ من قبلہ راست کرم بر سمت کجکلاہے کے تحت فنا فی الشیخ ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم قدس کے علاوہ اس دنیا کی کسی آرائش و زیبائش سے انھیں واسطہ ہی نہیں، یہ باہمہ و بے ہمہ زندگی کی بڑی اعلیٰ مثال ہے۔ اور جب تک علم و عقل کا مددگار عشق و محبت کا جذبہ نہ ہو یہ رفعت و عظمت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ویسے یہ جذبہ انھیں فطری و ازلی ہی عطا ہوا تھا، جس کا اظہار ہر اس وابستگی سے ہوتا ہے جو ذرا بھی ان سے متعلق رہی ہو۔ باپ کا غم ہو، یا بھائی کی موت کا سانحہ، اپنے بیٹے کی دائمی جدائی ہو یا اپنے وطن کا عارضی فراق۔ وہ جدائی کے لمحات اور فرقت کے صدمات برداشت نہیں کر سکتے تھے باپ کی موت پر کہتے ہیں ؎

سیف از سرم برفت و دلم بس دو نیم ماند
دریائے من روان شد و دُرمن یتیم ماند

اپنے بیٹے کی موت کا پُر درد مرثیہ اس طرح شروع کرتے ہیں ؎

یارب ایں شب چہ شب آمد کہ دل من گم شد
چشم تاریک مرا دیدۂ روشن گم شد

اپنے مرشد کے فراق کو وہ چھ ماہ سے زیادہ برداشت نہیں کر سکے۔ ماں سے بچھڑ کر جب وہ ملتے ہیں تو عین شباب کے عالم میں بچوں کی طرح اس کے سینے سے چمٹ جاتے ہیں۔ یہ انسیّت و محبت کا جذبہ، اُن کی وطن شیفتگی کی صورت میں جب ظاہر ہوتا ہے تو وہ یہاں کی ہر چیز کی مدح نگاری کرتے ہیں۔ یہاں کے برگ تنبول یعنی پان اور پان خوری کی طرف متوجہ ہوئے ہیں تو اس کی حمایت و وکالت میں ایک خوشگوار ماحول پیدا کر دیا ہے یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ؎

شناسد آں کہ مرد زندگانی است
کہ ذوق برگ حنائی ذوق جانی است

قرآن السعدین ہو یا نُہ سپہر، یہ مثنویاں اپنے موضوعات چاہے کچھ اور رکھتی ہوں لیکن یہ ہیں کہ حب الوطنی کے تحت، کوئی نہ کوئی پہلو نکال کر ہندوستان کی تعریفیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ وہ وجوہات ہیں جن کے باعث یہ ہندوستان کو دیگر ممالک پر ترجیح دیتے ہیں ؎

آں است یکے، کیں از دَورِ زمن
ہست مرا مولد و ماوی و وطن
دیں ز رسولاں آمدہ کاے زہ دیں
حب وطن ہست ز ایماں بہ یقیں
دوم آں، کیں زمیں از قطب زماں
ہست جدا حج ز ہمہ ملک جہاں

اب ہندوستان کی وہ دس خوبیاں ملاحظہ ہوں جن کے باعث یہ یکتائے روزگار ہے :۔ (۱) یہاں علم کی اتنی فراوانی ہے کہ اندازہ سے فزوں ہے۔ (۲) ہندوستانی دوسری زبانیں بہ آسانی سیکھ سکتے ہیں۔ (۳) ہندوستان میں دنیا کے لوگ اکتساب علم و ہنر کے لئے آتے ہیں۔ (۴) ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ علم ہندسہ، ریاضی اور صفر کا موجد ہے (۵) کلیلہ و دمنہ جیسی لاجواب کتاب ہندوستان کے حکمائے نے تحریر کی جس کا جواب دنیا میں کہیں نہیں (۶) شطرنج جیسا کھیل ہندوستان میں ایجاد ہوا جس کا خاصّہ یہ ہے کہ سینے سے رنج و غم دور کر دیتا ہے (۷) ہندسہ۔ دمنہ۔ و شطرنج سے تمام دنیا نے فائدہ حاصل کیا۔ (۸) یہاں کا سرود ایسا لاجواب ہے کہ غیر ملکی اسے برسوں تک بھی سیکھ نہیں پاتے۔ خود ہندوستانیوں کے لئے سوز دل و آتش جاں کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ (۹) ہندی نغمہ کی تاثیر سے انسان تو انسان حیوان تک مسحور ہو جاتے ہیں۔ (۱۰) خسرو جیسا سخنور و سحر گر ہندوستان میں پیدا ہوا ہے۔

ہندوستان کو جنت نشاں یا جنت ارضی بتانے میں انھوں نے سات دلیلیں پیش کی ہیں :۔

(۱) آدم علیہ السلام اپنی نافرمانی کی وجہ سے جنت الفردوس سے نکالے گئے تو قدرت نے انھیں ہندوستان میں بھیجا جہاں انھیں ویسا ہی امن و سکون ملا ؎

ہند چو از خلد نشاں بود درو
زامر خدایش قدم آسود درو
ورنہ بداں تازگی از جائے دگر
آمدی از رنج فنا وی ضرر

دوسری اور تیسری دلیل یہ ہے کہ جنت الفردوس کے جانور طاؤس اور سانپ کا مسکن بھی ہندوستان ہے، ــــ چوتھی دلیل یہ ہے کہ حضرت آدم دوسری جگہ جنت کی نعمتوں سے محروم ہو گئے۔ صرف ہندوستان ہی میں جنت کی نعمتیں انھیں ملیں ؎

گر نہ بہشت است ہمہ ہند چرا
در حدش آں باز نیفتا درو

(۵) ہندوستان تمام سال گلپوشش رہتا ہے ـ (۶) تمام دنیا کی نعمتیں یہاں جمع ہیں۔ (۷) مسلمان تمام دنیا کو زندان سمجھتے ہیں لیکن ہندوستان کو وہ خلد بریں گردانتے ہیں۔

اس جنت ارضی کی آب و ہوا تمام دنیا سے بہتر ہونے کی بھی دس دلیلیں ہیں۔ (۱) ہندوستان کی سردی

سے کسی کو نقصان نہیں پہونچتا۔ (۲) خراسان کی تری سے، ہندوستان کی گرمی بہتر ہے۔ خراسان کی سردی سے رگِ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ (۳) ہندوستان کی سردی جان لیوا نہیں ہوتی۔ یہاں کا دہقان ایک چادر میں رات بسر کرلیتا ہے۔ اور ؎

برلبِ جو ز آبِ خنک برہناں
تحمل کنند آخر شب غوطہ زناں

چوتھی، پانچویں اور چھٹی حجت یہ ہے کہ سال بھر یہاں پھولوں کی بہار رہتی ہے۔ یہاں ایسے پھول ہوتے ہیں جو مرجھا جانے پر بھی خوشبو دیتے رہتے ہیں۔ ساتویں حجت میں ہندوستان کے میوے بتائے ہیں۔ امرود۔ انگور۔ خربزہ۔ آم۔ الائچی۔ کافور۔ لونگ وغیرہ آٹھوں حجت یہ کہ ہندوستان کے میوے دوسری جگہ نہیں ہوتے۔ وہاں کے میوے یہاں ہو جاتے ہیں۔ کیلا اور پان نویں اور دسویں حجت میں ہیں۔

یہ استدلال، شاعرانہ استدلال ہے۔ جس سے اختلاف کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ لیکن ان کی حب الوطنی کی شدت و عظمت سے انکار نہیں ہوسکتا۔ انکی وطن سے محبت، عشق تک پہونچی ہوئی ہے۔ وہ یہاں کے جانوروں چرندوں اور پرندوں سے بھی محبت کرتے ہیں اور یہاں کے باغات و عمارات سے بھی۔ دہلی سے انھیں بے پناہ عشق ہے۔ یہاں کا حصار۔ قلعہ۔ باغ۔ حوض۔ یہاں کے انسان سبھی کا ذکر بڑی خوبی سے کرتے ہیں ؎

مردم او جملہ فرشتہ سرشت
خوشدل و خوشخوے چو اہلِ بہشت

چوں ز سخن بگزری آہنگ و ساز
نغمہ مرغانِ بریشم نواز
وز ہنرِ نیزہ و پیکان و تیر
ہو کہ در آید بہ نظر بے نظیر

کاغذ کی تعریف کرتے ہیں ؎

کاغذ شامی نسب و صبح دام
آنکہ شد آرایشِ صبحش و شام
حرف بحرف از قلم آرد سخن
لیک بہ پیچد ہمہ بر خویشتن

کشتی کے متعلق فرماتے ہیں ؎

ساختہ از حکمت کار آگہاں
خانۂ گردندہ بہ گرد جہاں
نادرۂ حکم خدائے حکیم
خانہ رواں، خانگیانش مقیم

عشق و محبت کا جذبہ، سوز و گداز کی گرمی پاکر، دو آتشہ و سہ آتشہ بن جاتا ہے، فارسی و اردو غزل میں یہ عناصر لوازمات میں سے ہیں۔ چنانچہ امیر خسرو کی غزل اس آگ سے دہکی ہوئی ہے۔ وہ اپنے آخری دیوان کے لئے فرماتے ہیں کہ اس کی غزلیں آگ کے مانند ہیں چونکہ آگ کا وصف حرارت ہے جو نرم و نازک چیزوں میں اس طرح جاگزیں ہوتی ہے جیسے روئی میں آگ اور سخت دلوں کو کسی قدر نرم کر دیتی ہے اور اگر کوئی ایسا دل ہے جسمیں عشق کا گذر نہیں تو یہ اس کو سراسر جلا ڈالتی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ سلگتی ہوئی غزلیں کرۂ زمین کو سراسر آتش زیر پا کر دینگی۔ طوالت کے خوف سے آپ کو اس آنچ کے احساس کے

لئے صرف کچھ ہی اشعار پیش کئے جاسکیں گے ؎

غمام می کشد لے دل، سخن صبر بگوے
او چرا گوئی ازاں کار کہ نتوانی کرد؟

گل چہ داند کہ درد بلبل چیست
او ہمیں کار رنگ و بو داند

من چو کنم کہ روئے اگر خوشش ہمی کند
ایں چشم روسیہ کہ بروئے تو خو گرفت

سینہ ز زخم ناخنم چاک شدہ است و پُر ز خوں
رگ چوں نمود از دروں، رشتۂ چاک من نگر

دل پارہ نیارم دوخت، ہرچند
رگ جاں رشتۂ تدبیر سازم

عالم تمام پُر ز شہیدانِ فتنہ گشت
ترک مرا خدنگ بلا در کماں ہنوز

جان ز تن بردی و در جانی ہنوز
دردہا دادی و درمانی ہنوز

امیر خسرو کے علم کو عقل کی موشگافیوں اور جدت طرازیوں نے اونچے منصب پر پہونچا دیا ہے۔ عشق کی آنچ نے علم و عقل کو وہ جلا بخشی ہے جس کی روشنی تا قیام قیامت رہے گی۔ یہ عشق ہی کا جذبہ ہے کہ چاہے وہ آقا و مرشد کی طرف رخ کرے، چاہے مادر عزیز کی طرف۔ یا مادر وطن کی طرف، علم و عقل کو ساتھ لے کر وہ فسوں گریاں و کرشمہ سازیاں کرتا ہے کہ اسکے شاہکار ارباب بصیرت سے خراج تحسین وصول کر لیتے ہیں۔ عالم قدس سے انھیں خلعت دوام عطا ہوتا ہے۔ امیر خسرو کے علم و عقل و عشق کے یہ مظاہر ان کی شخصیت، ان کے کلام اور ان کی حیات میں جا بجا ملتے ہیں۔ اور ہر مقام پر یہی کہنا پڑتا ہے :-

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ڈاکٹر ایس، ایم۔ کاظم ہاشمی۔ پٹنہ۔

طوطیٔ ہند ابوالحسن امیر خسروؒ

جب سے دنیا قائم ہے کیسی کیسی ہستیاں آئیں اور آکر چلی گئیں۔ تہذیب و تمدن کی تاریخ کے سینے میں جب بھی جہاں تک گردیکھئے۔ ایسے بے شمار نام مل جائینگے جنکے نام کسی نہ کسی نوعیت سے تاریخ کے سینے میں روشن و منور ہیں۔ کسی کا نام فاتح کی حیثیت سے جگمگاتا نظر آتا ہے تو کسی کا جود وسخا کی بنا پر، کوئی سچائی وصداقت کی وجہ سے چمکا تو کوئی علم و ہنر کی وجہ سے، لیکن غور سے دیکھئے پر ایسے نام خال خال ہی نظر آئینگے جن کے نام تاریخ کے صفحوں کے بدلے انسانی دلوں پر نقش ہیں اور جنھیں عالم مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔ ایسے خوش قسمت بہت ہی کم صدیوں پر پیدا ہوتے ہیں۔ امیر خسروؒ ان خوش قسمت لوگوں میں ضرور ہیں جنھیں عالمگیر شہرت اور ابدی ناموری حاصل ہوئی۔ امیر خسروؒ کے زندگی کے تین پہلو ہیں۔ امیری، شاعری اور ولایت، خسروؒ نے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا، جنمیں سے سات کے دربار سے منسلک رہے اور وہ بھی محبوب و مقبول بنکر لیکن خسروؒ کی شاعری اور ولایت ہی نے انھیں زندہ جاوید بنا دیا۔ دنیا جب تک قائم رہے گی اُنکا نام ہر خاص و عام کی زبان پر اور انکی عزت ہر طبقے کے لوگوں کے دلوں میں رہے گی۔

شاعری :-

امیر خسروؒ جس وقت پیدا ہوئے اُن کے والد امیر سیف الدین اُن کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے جو اُن کے مکان کے قریب ہی رہا کرتے تھے۔ جیسے میر خورد سیر الاولیا میں اس طرح بیان کرتے ہیں "پدر امیر خسرو امیر خسرو را در جامہ پیچیدہ پیش یک دیوانہ برد، دیوانہ فرمود آوردی کسے را کہ دو قدم از خاقانی پیش خواہد بود[1]" آٹھ برس انھیں اپنے فضل و کمال سے آراستہ باپ کی صحبت نصیب رہی اس کے بعد اُن کا سایہ اُن کے سر سے جاتا رہا۔ لیکن شاعری کی کونپلیں اُسی وقت سے اُنکے ذہن و دماغ سے پھوٹنے لگ گئی تھیں۔ اپنے والد کی شہادت پر اُنھوں نے جو بیت موزوں کیا تھا اسی سے انکے ذہن و فراست کا ثبوت ملتا ہے ؎

سیفے کہ ز سرم گزشت و دل من دو نیم ماند
دریائے مارواں شد و دُر یتیم ماند

---

[1] سیر الاولیار میر خورد ص۳۰۱

خسروؒ جس وقت مکتب میں بٹھائے گئے اُنکی حالت اُس مجنوں سے کم نہ تھی جو سبق کے بجائے لیلیٰ لیلیٰ لکھا اور رٹا کرتا تھا۔ مدرسہ میں اُنکے استاد مولانا سعدالدین انہیں خط کی تاکید کرتے اور دُرّے لگاتے۔ ادھر خسروؒ کا ذہن زلف و کاکل کی پر پیچ گلیوں کا چکر لگاتا اور شعر موزوں کرتا نظر آتا۔ اُنکی شاعری قدرتی اور پیدائشی تھی وراثت سے اگر حصّہ ملتا تو یہ نوک قلم کے بجائے تلوار سے کسی مہم پر صفیں اُلٹتے ہوئے نظر آتے۔ خسروؒ کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے کہ اُن کی زبان سے بے اختیار شعر نکلنے لگے تھے جس کا اعتراف غرۃ الکمال کے دیباچہ میں وہ خود کرتے ہیں:۔ "دراں صغر سن کہ دندان مے افتاد سخن می گفتم وگوہر از دہانم میریخت[۱]" خسرو کے اس بیان سے صاف پتہ لگتا ہے کہ انکے اندر شاعری کا غیر معمولی شوق ابتدا ہی سے تھا۔ ان کے اندر جو بھی علمی استعداد پیدا ہوئی وہ نہ تو دماغ سوزی اور کتب بینی کی پیداوار ہے اور نہ کسی مدرسے یا درسگاہ کی دین ہے۔ بلکہ یہ خالص ان کی فطری ذہانت کی پیداوار ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ چھ سو سال سے آج تک ہندوستان میں اس پایہ کا جامع کمالات پیدا نہیں ہوا۔ ہندوستان ہی کیا ایسی خوبیوں کا مالک ایران و روم کی سرزمین نے بھی بہت کم ہی پیدا کئے۔ انوری۔ خاقانی۔ اور ظہیر قصائد کے میدان میں ضرور آگے ہیں۔ لیکن غزل کے میدان میں آکر وہ رک جاتے ہیں۔ فردوسی کے ذہن و دماغ کی رفتار میدان رزم میں ضرور بے لگام بھاگتی ہے لیکن اس میدان سے باہر اُن کے قدم بھی رکتے نظر آتے ہیں مولانا نظامی کی دنیا مثنوی ہے اس کے باہر اُنھیں کچھ دکھائی نہیں پڑتا۔ سعدی غزل اور اخلاقی مضامین کے استاد ضرور ہیں لیکن دوسرے میدان میں خاموش تماشائی نظر آتے ہیں۔ حافظ۔ نظیری اور عرفی غزل کے مرد میدان ہیں لیکن غزل کے دائرے سے یہ اپنا قدم باہر نہیں نکال سکتے۔ لیکن اس کے برعکس خسروؒ کی جہانگیری میں غزل، قصیدہ، مثنوی اور رباعی سب داخل ہے۔ اُن کا کمال ہر شعبے میں یکساں ہے غزل میں شعرائے متقدمین اور شعرائے عہد سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر مثنوی کے میدان میں مولانا نظامی کے دوش بدوش نظر آتے ہیں تو قصیدہ کے میدان میں بھی اُن کا قدم خاقانی سے پیچھے نظر نہیں آتا۔ محمد سلطان خاں شہید کی شہادت پر دو پُر درد قصیدے شاہزادے کے مرثیے میں لکھے تھے، جسے غیاث الدین بلبن کے دربار میں جب پڑھا تو تمام دربار میں سناٹا چھا گیا۔ "مہینوں دہلی کے لوگ ان مرثیوں کو رات دن پڑھتے اور اپنے عزیزوں کی یاد میں جو اس لڑائی میں شہید ہوئے تھے روتے تھے[۲]" سولہ سال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے خسروؔ نے میدان شعر و شاعری میں اچھی خاصی مہارت پیدا کرلی اور اُن کے اشعار اسقدر مقبول عوام و خواص ہوئے جو کسی شاعر کو اس کم عمری میں نصیب نہ ہوئے۔ گویّے محفلوں میں اُن کے اشعار گاتے جسے سن کر بڑے بوڑھے وجد کرتے تھے جس وقت اُن کی والدہ اور چھوٹے بھائی حسام الدین قتلغ دونوں کا انتقال ہوگیا تو وہ بہت مایوس اور دل برداشتہ ہوئے اس صدمۂ جانکاہ کا ذکر اُنھوں نے اپنی مثنوی لیلیٰ مجنوں میں بہت ہی دردناک الفاظ میں ادا کیا ہے جن کے اشعار میں سادگی اور بے ساختگی بھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

[۱] دیباچہ غرۃ الکمال

[۲] فرشتہ

[illegible] ہم [illegible] افتاد
فریاد کہ نا تمردہ افتاد
[illegible] چوں را
یک [illegible] خرقے را
[illegible] بر خاک راست
گر خاک بسر کنم چہ باک ست
اے [illegible] کجا [illegible]
[illegible] چہ [illegible] نشانی آخر؟
قطع [illegible] مرا زحق تبارک
[illegible] چونام خود مبارک
[illegible] دنیا [illegible] تو
چوں [illegible] در آن غار
رفتی تو از [illegible] زدم رفت
[illegible] از [illegible] زدم رفت

غزل جس کی طرف خسرو کا رجحان کم گیا اُسی نے [illegible] شہرت پر پہونچایا آج بھی اُن غزلوں کے [illegible] سن کر اہل دل [illegible] طرح سر دھنتے نظر آتے ہیں۔ [illegible] سے پہلے قوال اگر معرفت کی محفلوں میں انکی غزلیں [illegible] تو عوام دوستوں کی [illegible] غزلوں میں صفائی، [illegible] سوز و گداز کوٹ کوٹ [illegible] "سوز و گداز کے [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ آگ سے [illegible] تزک جہانگیری میں ہے کہ ایک [illegible] تھی۔ مولانا علی احمد

نشائی کیف و سرور سے جھوم رہے تھے جس وقت سیدی شاہ قوال نے امیر خسروؒ کی یہ بیت پڑھی ؎

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

مولانا کو ایسا وجد آیا اور ایسے بے خود و بیہوش ہوئے کہ پھر دوبارہ ہوش نہ آسکا ان کا سارا کلام عاشقانہ اور تصوف کے رنگ میں شرابور نظر آتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اہلِ ایران کسی غیر ایرانی کے کلام کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ لیکن خسرو کے سامنے انھیں بھی سر خم کرنا پڑا۔ سعدی جنھیں استادِ غزل مانا جاتا ہے اُن کو بھی خسرو کی تعریف کرنی پڑی۔ نقی محمد خاں خوجوی تقریظ۔ حیاتِ خسرو میں فرماتے ہیں :۔

"خسرو فارسی کے نہایت بلند پایہ شاعر ہیں۔ استادِ غزل سعدی مانے جاتے ہیں لیکن اگر کسی کو اُن کی ہمسری کا دعویٰ ہوسکتا ہے تو وہ حضرت امیر خسرو ہیں۔ اہل ایران کسی غیر ایرانی کے کلام کو خاطر میں نہیں لاتے لیکن امیر خسرو کے سامنے انھیں بھی جھکنا پڑا۔[۱]"

اُنھوں نے کسی بھی پہلو کو قطعی نظر انداز نہیں کیا ہندوستان اور اُس کی حسین عورتوں کی تعریف میں قلم اٹھایا تو مصر، روم، قندھار، ختن اور تمام حسینانِ عالم کے حسن کو ھیچ ثابت کر دیا۔ میوے کی خوبیاں گنوانے لگے تو یہاں کے پھلوں کو ساری دنیا سے بہتر دکھایا۔ اسکے علاوہ یہاں کے کپڑے، آب و ہوا، پھولوں کی بہار اور اُسکی قسمیں تک گنوائی ہیں۔ خسرو نے جس صنف کی طرف رُخ کیا اُسی میں ایک نیا رنگ بھر دیا :۔

---

[۱] تقریظ حیاتِ خسرو۔ نقی محمد خاں خوجوی ص۳

" سلاطین کے دربار سے وابستہ ہوئے تو تاج و تخت سے ان کو اتنا قلبی لگاؤ پیدا ہوگیا کہ جابر سے جابر سلطان بھی ان کا معترف اور مداح رہا۔ شعر و شاعری کی شاہراہ پر گامزن ہوئے تو اپنی غزلوں اور مثنویوں میں مختلف انداز سے اضطراب عشق، قرار عشق، اضطرار عشق اور سکون عشق کی رنگا رنگی کو بیان کرکے فارسی شاعری کے زندہ جاوید شاعر بن گئے۔ پھر ساز و نغمہ کی طرف مائل ہوئے تو ان کی ہر لے اور زیر و بم میں ان کے عشق پنہاں کے سوز دروں کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اور جب ان کی نگاہ وطن کی طرف اٹھتی ہے تو اس کی ہر چیز ان کو رنگین اور حسین نظر آتی ہے اس کے ہر ذرہ کو دیوتا سمجھ کر اس کے پجاری بن گئے۔[1] "

خسرو اپنی مقبول شاعری کی وجہ سے طوطی ہند کہلائے جانے لگے، اس کے علاوہ ان کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کی یادگار کو شعر کی لڑیوں میں پرو دیا ہے۔ انکی شاعری ان کے وقت کی تاریخ کی آئینہ دار ہے اس کے علاوہ انھوں نے فارسی شاعری کو ہندوستانی رنگ میں رنگ کر ایک بالکل نئی شکل دیدی ہے۔ اور دو تہذیب کی مختلف دھاراؤں کو ایک میں سمو کر ایک گنگا جمنی سنگم پیش کر دیا ہے۔

فارسی شعراء نے اپنی شاعری میں استعارہ کنایہ کیساتھ دقیق اور بھاری بھر کم الفاظ کے زیور سے شاعری کو سجا کر دیا ہے۔ امیر خسرو سالک راہ طریقت تھے اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مقرب و محبوب، تصوف انکی زندگی کا جزو تھا۔ لیکن ان کی غزلوں میں مسائل تصوف کا انعکاس بہت کم ہے اور تصوف کے اصطلاحات تو تقریباً نایاب ہیں انھوں نے خود بھی کہا ہے کہ کلام شعرا کے انداز پہ ہونا چاہیے صوفیوں اور واعظوں کے طریقہ پر نہیں۔ انکی شاعری عام لوگوں کی زندگی سے بالکل نزدیک تھی۔ انھوں نے عوامی زبان میں سادگی کے پیرایہ میں شاعری کی ہے اسی لئے وہ آج بھی اسی طرح مقبول ہیں جتنا اس سے قبل تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود عوام میں جو مقبولیت انھیں حاصل ہوئی وہ انکی فارسی شاعری کی وجہ سے نہیں " یہ مقبولیت تو طبقہ خاص یا فارسی داں تک ہی محدود رہی جیسے گیت، پہیلیاں، مکرنیاں امثل اور دوہے وغیرہ بھی شامل ہیں، اور دوسرا سبب ان کی مقبولیت کا یہ ہے کہ وہ حضرت نظام الدین اولیاء کے محبوب اور خاص الخاص شاگرد تھے۔

گیت، پہیلیاں، مکرنیاں وغیرہ کے چند نمونے پیش کرتا ہوں۔ گیت تو ہزاروں ہیں، گانے والوں نے آج گا یا کل بھولے مگر خسرو کے گیتوں کو چھ سو سال گزر گئے لیکن انکے گیت آج بھی صدا بہار پھول کی طرح شگفتہ ہیں اور رہیں گے ایک لڑکی سسرال میں ہے۔ برسات کا موسم آگیا ہے وہ جھولتی ہے اور ماں کی یاد میں اس طرح گاتی ہے ؎

اماں میرے باوا کو بھیجو جی ..... کہ ساون آیا
بیٹی تیرا باوا تو بڈھا جی ..... کہ ساون آیا
اماں میرے بھائی کو بھیجو جی ..... کہ ساون آیا

اسی طرح ان کی [illegible] ان سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ [illegible] کی پہیلی ہے ؎

بیسیوں کا سر کاٹ لیا [illegible]

اسی طرح [illegible]

---

[1] ہندوستان خسرو کی نظر میں۔ سید صباح الدین ص ۳۲

اِدھر کو آوے اُدھر کو جاوے ہر ہر پیڑے کاٹ وہ کھاوے
ٹھہرے جبھی تم وہ ناری خسروؔ کہے اسی کو آری

یہی حال مکرنیاں کا ہے ؎

آنکھ چلاوے بھوں مٹکاوے ناچ کود کے کھیل دکھاوے
من آوے سے آوے اندر اے سکھی ساجن ؟ نا سکھی بندر

دوسخنے ؎

گوشت کیوں نہ کھایا۔ ڈوم کیوں نہ گایا گلا نہ تھا
جوتہ کیوں نہ پہنا۔ سنبوسہ کیوں نہ کھایا تلا نہ تھا

امثل :-

خسروؔ کی حاضر جوابی اور ذہانت کا ایک بہترین نمونہ پیش کرتا ہوں۔ چار پنہاریاں ایک کنوئیں پر پانی بھر رہی تھیں۔ خسروؔ اُدھر سے گذر رہے تھے۔ پیاس کا سخت غلبہ تھا اُنھوں نے وہاں جا کر پانی مانگا اُن میں سے ایک خسروؔ کو پہچانتی تھی۔ اُس نے آہستہ سے اوروں کو بھی بتادیا کہ یہی خسروؔ ہے جس کے گیت ہم لوگ گاتے ہیں اور پہیلیاں مکرنیاں اور امثل وغیرہ سنتے ہیں۔ سبھوں نے دریافت کیا "تو خسروؔ ہے"؟ — انھوں نے کہا ہاں اس پر ایک نے کھیر دوسری نے چرخے تیسری نے ڈھول اور چوتھی نے کتے کا نام لیا اور بضد ہوگئیں کہ جب تک کوئی بات اس پر نہیں کہتا پانی نہیں پلا سکتی۔ انھوں نے چاروں کی طرف مخاطب ہو کر کہا ؎

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا ۔ لا پانی لا

خسروؔ نے عوام کے دل کو جیتا اور اُسی کی بات اُسی کی زبان میں ادا کی۔

اُن کی مقبولیت کا دوسرا سبب اُنکی ولایت ہے۔

حضرت امیر خسروؔ اور سلطان المشائخ نظام الدین اولیا۔

باپ کا تو بچپن ہی میں انتقال ہوچکا تھا۔ جب ماں اور چھوٹے بھائی نے بھی ان کا ساتھ چھوڑا تو مایوسیوں کی بھیڑ میں دنیا تاریک نظر آنے لگی۔ تصوف کا خمیر تو موجود ہی تھا اُس میں اور جلا ہوا۔ دہلی میں حضرت نظام الدین اولیا رشد و ہدایت کی شمع روشن کئے ہوئے تھے۔ حضرت امیر خسرو بھی پروانے کی طرح کھنچتے ہوئے وہاں حاضر ہوئے۔ "حضرت نظام الدین اولیا نے چشم بصیرت سے اُن کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ پیشانی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے گلشنِ ولایت سے تجھے نفع پہونچے گا"[1] امیر خسروؔ فوراً بیعت سے مشرف ہو کر زمرہ مریدانِ خاص میں شامل ہوئے اور فرمایا ؎

کالبد سوختہ بر جان رسید
مردہ بسر چشمۂ حیوان رسید
کارشناس از نظر دوربین
شد کہ دل تیرہ من نور بین

امیر خسروؔ عبادت و ریاضت کی بھٹی میں اسقدر تپے کہ نظام الدین اولیاؒ کی توجہ خاص اُن کی طرف ہوگئی اور پھر جو لگاؤ حضرت شیخ المشائخ کو ان سے ہوا کسی سے نہ ہوسکا۔ اُنکے کلام میں جو شیرینی آئی اُس کے بارے میں ایک یہ روایت ہے کہ حضرت کی مدح میں اُنھوں نے ایک نظم کہی تھی وہ بیحد خوش ہوئے اور اسی خوشی میں انھوں نے فرمایا بول خسروؔ کیا چاہتا ہے اور پھر اُن پر جو عنایت ہوئی اس کا ذکر میر خورد سیر الاولیا میں اس طرح کرتے ہیں :-

" روزے در مدح سلطان المشائخ پیش سلطان المشائخ شعرے گذرانید فرمان شد کہ چہ می خواہی، چوں ہوس سخن در نظم داشت شیرینی سخن خواست فرمان شد

[1] حیات خسرو۔ سعید احمد مارہروی صـ۱۰

کہ آں خاص ملک کہ زیر کیسٹ است بیار و بر سر خود نثار کن
وقت یے ہم از ابا بجز۔ امیر بجہان کرد لاجرم شیرینیٔ سخن او
شرق و غرب عالم گرفت و فخر شعرائے سلف و خلف گشت[1]"

ہندوستان اور اس کے باہر ان کی شاعری سے لوگ قبل ہی آشنا ہوچکے تھے لیکن ان کے کلام میں وہ شیرینی و لطافت اس کے قبل بہت کم تھی۔ یہ بیعت کے بعد ہی آئی۔ بیعت کے بعد وہ اپنا زیادہ وقت حضرت ہی کی خدمت میں گذارتے اور ہر ممکن تعظیم و تکریم سے پیش آتے۔ اس کی تائید خود خسرو کی تحریر سے ہوجاتی ہے —— افضل الفوائد میں وہ خود فرماتے ہیں کہ :۔

"یہ سب خیالات جو میرے دماغ میں آتے ہیں آپ ہی کی برکت سے ہیں[2]"

ایک طرف حضرت نظام الدین اولیاؒ کو خسروؒ سے ایک خاص دلی لگاؤ ہوگیا تھا۔ تو دوسری طرف خسرو کو بھی ایک لمحہ اُن کے بغیر چین نہ تھا۔ بادشاہوں کے قصیدے تو وہ دل پر جبر کر کے لکھتے تھے کیونکہ دربار سے منسلک تھے اور وہی ذریعہ معاش تھا، لیکن یہاں جو بھی کرتے عقیدت و نیازمندی سے کرتے۔ اور اس کا اظہار وہ اپنے اشعار کے ذریعہ بھی کرتے تھے۔ چنانچہ نہ سپہر میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

من از وے لعاب دہن یافتم
کزیں گونہ آب سخن یافتم
دو قطرہ کہ زاں در دوات افگنم
بظلمت دو آب حیات افگنم

حضرت نظام الدین اولیا انھیں صرف شفقت و محبت ہی کی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ بلکہ ان کی قدر و منزلت بھی کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے خود فرمایا کہ میں سب سے یہاں تک کہ خود سے بھی تنگ آجاتا ہوں لیکن خسروؒ سے نہیں۔ اسی کو میر خورد سیر الاولیاء میں اسطرح بیان کرتے ہیں کہ :۔ "من از ہمہ تنگ آیم و از تو تنگ نیایم و دلم بار گفت از ہمہ کس تنگ آیم تا حدے کہ از خود تنگ آیم و از تو تنگ نیایم[1]"

امیر خسروؒ حضرت ہی سے معروض کا ایک ذریعہ تھے۔ اُن کی گوناگوں صفات کا قدر دان حضرت سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی نے بھی ایک بار سفارش حضرت امیر خسروؒ سے کرائی تھی۔ خلیق احمد صاحب لکھتے ہیں کہ :۔

"ابتدائے حال میں امیر خسروؒ کے ذریعہ درخواست کی تھی کہ ان کو کسی تنہائی کے مقام پر رہ کر عبادت کرنے کی اجازت دیدی جائے[2]"

مولانا برہان الدین کی سفارش حضرت امیر خسروؒ ہی نے کی تھی اور آخر نظام الدین اولیا کو انھیں معاف کرنا ہی پڑا۔ حضرت نے امیر خسروؒ کو صرف ترک اللہ کا لقب ہی نہیں دیا بلکہ خسروؒ کی تعریف میں ایک رباعی بھی کہی ہے ؎

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست
ملکیست کہ ملک سخن آں خسرو راست
آں خسرو ماست ناصر خسرو نیست
زیرا کہ خدائے ناصر خسرو ماست

امیر خسرو اپنے پیر کی اتنی عزت کرتے تھے کہ ایک فقیر سے حضرت کی کفش مبارک پانچ لاکھ روپیہ دیکر خریدی اور سر پر رکھ کر حضرت کے پاس حاضر ہوئے حضرت کی صحبت نے انھیں

۱۔ سیر الاولیا صفحہ ۳۰۱ ۲۔ افضل الفوائد صفحہ ۱۰۵

۱۔ سیر الاولیا صفحہ ۳۰۲ ۲۔ تاریخ مشائخ چشت۔ خلیق احمد نظامی ۱۸۱

سراپا عشق بنادیا۔ جب صوفی نے عشقِ الٰہی کی آگ اُنکے سینے میں ایسی فروزاں ہوئی کہ خود حضرت نظام الدینؒ کہا کرتے تھے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ کیا لائے تو کہوں گا اس ترک اللہ کا سوزِ سینہ۔

حضرت امیر خسروؒ غیاث الدین بلبن کیساتھ لکھنوتی گئے ہوئے تھے وہیں شیخ کے وصال کی خبر ملی۔ یہ خبر پاکر کپڑے تار تار کردیے۔ منھ پر کالک مل لی۔ اور روتے پیٹتے بیتابانہ خانقاہ کیطرف روانہ ہوئے جب دروازہ پر پہونچے تو روتے ہوئے یہ شعر پڑھا ؎

ایں مکانیست کہ منزلگہ جاناں بودہ است
راہ آمد شد آں سرو خراماں بودہ است

جب مزار مبارک کے روبرو پہونچے تو یہ دوہا پڑھا ؎

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چوندیس

اور پھر بیہوش ہوکر گر گئے۔ جب ہوش آیا کُل مال و اسباب فقراء و مساکین کو دیدیا۔ دنیا سے کنارہ کش ہوگئے اور فرمایا، میں اب زیادہ دن زندہ نہ رہوں گا۔ حضرت نظام الدین اولیا نے بھی فرمایا تھا کہ خسرو میرے بعد زندہ نہ رہے گا اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ میرے صاحبِ اسرار خسرو کو میرے پہلو میں دفن کرنا۔

اور آخر وہی ہوا بھی۔ چھ ماہ کے بعد ہی ۱۳۲۴ء کو خسروؒ اس دارِ فانی سے رخصت پاکر اپنے پیر و مرشد کے پائنتی دفن ہوئے۔ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"ہندوستان میں امیر خسرو کی شہرت اُنکے فارسی کلام کی بدولت رہی تو ضرور ہے لیکن ایک محدود طبقے میں۔ حالانکہ عوام کے حلقے میں جو شہرت اور مقبولیت انھیں حاصل ہے وہ یا تو اس حیثیت سے ہے کہ وہ حضرت نظام الدین اولیا کے خاص الخاص اور محبوب شاگرد تھے اور یا اسی ہندی کلام کی وجہ سے۔" اور یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری اور ولایت دونوں نے مل کر خسرو کے نام کو صرف روشن ہی نہیں کیا بلکہ ہر خاص و عام کے دل پر منقش کردیا۔

آج بھی جب بھی کوئی آستانہ نظام الدین اولیا پر حاضری دینا چاہتا ہے تو پہلے عقیدت مندی اور ارادت کے پھول امیر خسرو کے مزار پر چڑھاتا ہے اور اُنھیں کے توسط سے دعائیں مانگتا ہے۔ آج بھی ہزاروں عقیدت مند روزانہ حاضری دیتے ہیں۔

کتنی نامور ہستیاں آئیں لیکن آج صرف اُن کا نام تاریخ کے صفحوں میں بند ہوکر رہ گیا ہے۔ لیکن امیر خسرو کا نام صرف تاریخ کے صفحوں میں نہیں۔ بلکہ ہر فرد و بشر کے دلوں میں گھر کر گیا ہے۔ مزار مبارک پر آج بھی وہی رونق اور چہل پہل نظر آتی ہے، آج بھی عقیدت مندوں کا وہی ہجوم لہریں مارتا رہتا ہے جو آج سے چھ سو سال قبل رہا کرتا ہوگا۔ دنیا جب تک قائم رہے گی خسروؒ کا نام باقی رہے گا۔ اور گلاب کے سرخ پھولوں کی بارش اُن کے مزارِ مبارک پر ہوتی رہے گی۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے عرس کی ابتدا ہر سال خسروؒ کے اسی دوہے سے ہوا کرتی ہے ؎

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئے چوندیس

راملتین :-

امیر خسرو متنازعہ فیہ بیانات کی روشنی میں

ارسطو جیسا انسائیکلو پیڈیائی نابغہ بھی صدیوں گمنامی کے پردے میں چھپا رہا۔ مگر امیر خسرو کی شخصیت "ہزاروں سال اپنے دیدہ ور کی منتظر نرگس" کے کلیہ سے مستثنیٰ تھی۔ ایسی خوش نصیبی کے حامی فرد کی مثال تاریخ شاذ و نادر ہی فراہم کرتی ہے۔ بادشاہوں نے ان کی قدردانی کی۔ اہل علم نے مدح سرائی کی، عوام نے انھیں دل میں بسا لیا۔ "حدیث بتاں برزبان ہنوز" کا لانے والا شاعر دربار ہی میں نہیں، بلکہ پگڈنڈیوں اور پن گھٹوں پر بہت مقبول و محبوب تھا۔ علی عباس حسینی نے اس کی عکاسی اپنے ڈرامہ "راہ کارومان" میں اس طرح کی ہے :-

وقت — ۴ بجے سہ پہر

مقام — پٹیالی سے دہلی جانے والی راہ میں ایک گاؤں کے باہر ایک پختہ کنواں۔

کنویں پر چار عورتیں پانی بھر رہی ہیں۔ سب جوان اور شوخ ہیں۔ آپس میں چہلیں کر رہی ہیں۔ امیر خسرو درویشوں والے گیرو ے لباس میں کنویں پر پہونچتے ہیں انھیں کنویں کی طرف آتے دیکھ کر جلدی جلدی اپنے گھڑے سروں پر رکھ کر اور بغلوں میں دبا کر گاؤں کی طرف چلنے کا قصد کرتی ہے۔

امیر خسرو :- (ہاتھ کے اشارے سے انھیں روک کر) اے سرو قامتو! کچھ اپنے اپنے حسن کی خیرات تو دیتی جاؤ۔

ایک :- راستے سے ہٹو!- باتیں نہ بناؤ سائیں۔

دوسری :- خیرات لینا ہے تو گھر پر آؤ، ہم کنویں پر کیا دے سکتے ہیں؟

امیر خسرو :- ہاں، یہیں اے ماہ پارو! (سب کچھ شرمائی شرمائی ہنستی ہیں) — بس دو چلو پانی -

تیسری :- (سب سے زیادہ شوخ) ہم پانی بھی مفت نہیں دیتے ہیں۔

امیر خسرو :- تو جو دام مانگو حاضر کروں،

وہی شوخ :- تو چاروں ایک ایک لفظ کہیں گے انھیں ملا کر کوئی ایسی بات کہہ دو کہ ہمیں ہنسی آجائے۔

امیر خسرو :- منظور، بولو

ایک :- کھیر

دوسری :- چرخا

تیسری :- ڈھول ۔

چوتھی :- کتا ۔

امیر خسرو :- (چٹکی بجاکر) تو، لو سنو ،

کھیر پکائی جتن سے چرخا دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

(جلدی سے اکڑوں بیٹھ کر ہاتھوں کا پیالہ بنا کر)

لا پانی، اب تو لا ،

(سب ہنس کر امیر کے ہاتھ پر پانی ڈالتی ہیں۔ وہ ہاتھ دھوتے اور وضو کرتے ہیں۔ عورتیں اس افراط سے آخر میں پانی گراتی ہیں کہ امیر کا کرتہ بھیگ جاتا ہے)۔

امیر خسروؒ (مصنوعی غصہ سے) یہ کیا کیا شریرو !

علی عباس حسینی کے ڈرامہ کے مذکورہ بالا اقتباس سے امیر خسروؒ کی عظمت ان کی پہلو دار شخصیت کے ساتھ واضح طور پر اجاگر ہوتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ عوام نے ان کا "قومی ہیرو" کی طرح احترام کیا۔ مگر یہ حیرت کا مقام ہے کہ اتنی مقبول ترین شخصیت کے متعلق متضاد اور متنازعہ فیہ بیانات پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ ان سے ان کی شخصیت ماند نہیں پڑتی بلکہ اور زیادہ دلکش ہو جاتی ہے یہ بھی عظمت کی ایک نشانی ہے۔

امیر خسرو پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے کالیداس کی طرح ان کی جائے پیدائش صیغۂ راز میں نہیں۔ لیکن یہ بات معنی خیز ہے کہ رام بابو سکسینہ جیسے جید عالم اور محقق نے اپنی کتاب "ہسٹری آف اردو لٹریچر" میں انکی جائے پیدائش کا ذکر نہیں کیا۔ اور صرف ضلع اور ریاست کے بیان پر اکتفا کیا یوں تو مرزا احمد عسکری نے اس کتاب کا ترجمہ کرتے ہوئے فٹ نوٹ میں مقام پیدائش پٹیالی بتایا ہے مگر اس کی وضاحت نہیں کی۔ بہر کیف میں اس نکتہ کو متنازعہ فیہ نہیں گردانتا ہوں۔ مگر یہ ایک اہل علم کی خاموشی ہے۔ جو آسانی سے نظر انداز نہیں کی جا سکتی ہے۔

اب آیئے۔ ایک اہم مسئلہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں (جس کے بغیر اردو ادب کی تاریخ کی کوئی کتاب مرتب نہیں ہو سکتی ہے) امیر خسروؒ کو اردو کا پہلا شاعر تسلیم کیا ہے۔ رام بابو سکسینہ نے پہلا شاعر بتایا ہے۔ مگر اردو زبان اور شاعری سے متعلق حالیہ مقالوں کے مطالعہ سے نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ قلی قطب شاہ اردو کا پہلا شاعر ہے۔ اس طرح ہمارے ذہن میں کنفیوژن پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ بات بالکل سیدھی ہے۔ امیر خسروؒ اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کا کوئی دیوان نہیں اور قلی قطب شاہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ قلی قطب شاہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کے "صاحب دیوان" ہونے کی طرف اشارہ کر دیا جائے تو غلط فہمی کا امکان نہیں۔ مگر الجھن کی ایک یہی وجہ نہیں بلکہ اور بھی ہے محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں اردو کو پنجابی سے مشتق ثابت کرنے کی دھن میں امیر خسروؒ کے متعدد اشعار اور پہیلیوں کو معرض شک میں ڈال دیا۔ چنانچہ یہ تاثر عام ہو گیا کہ امیر خسروؒ کے پہلے شاعر ہونے کی حیثیت مشکوک ہے۔ حالانکہ محمود شیرانی کے سارے دلائل اس حقیقت کے سامنے بے اثر ہو جاتے ہیں کہ امیر خسروؒ کے اشعار ہم تک سینہ بہ سینہ پہونچے ہیں۔ اور مختلف ادوار میں لوگوں نے اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق ان کے الفاظ میں رد و بدل کئے ہیں علم لسانیات کی ورق گردانی کرنے سے دیگر زبانوں میں بھی اس طرح کے تحریف کے نمونے مل جاتے ہیں۔ شیرانی کی باتیں پراگندگی پھیلانے کا باعث تو ہو سکتی ہیں۔ مگر اس حقیقت کو نہیں مٹا سکتی ہیں کہ خسروؒ اردو کے پہلے شاعر تھے۔

میر امن "باغ و بہار" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :-

"قصہ چہار درویش کا ابتدا میں امیر خسروؒ نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ زری زری بخش جو ان کے پیر تھے ان کی طبیعت ماندہ ہوئی — تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے یہ قصہ ہمیشہ کہتے۔"

قصہ چہار درویش کا مصنف امیر خسروؒ کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ مگر ایک عظیم المرتبت صوفی کے ہاں اس کا کہا جانا، دعوت غور و فکر دیتا ہے۔ یہ عام معلومات کی بات ہے کہ تصوف تزکیۂ نفس اور ترکِ دنیا کا درس دیتا ہے" باغ و بہار "یا "قصہ چہار درویش" میں مافوق الفطرت باتیں اور عشق و محبت کی داستانیں ہیں۔ لہٰذا یہ ایک نزاعی مسئلہ ہے۔

صفدر آہ اپنے مقالہ "امیر خسروؒ کی مادری زبان" میں رقمطراز ہیں :-

"خسروؒ کے نانا، ان کی والدہ اور سارا ننہال شائستہ ترین ہندی بولتا تھا۔ جو شیر مادر کے ساتھ خسروؒ کے حصہ میں آئی تھی۔"

آگے چل کر خسروؒ کے دو گیت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

"بالکل مسلمان کے گھر کی کھڑی بولی ہے۔ ان کے الفاظ آج بھی اردو گیتوں میں آتے ہیں، اور خسروؒ کے زمانے میں رائج تھے۔"

صفدر آہ کے اس بیان کو آسانی سے قبول نہیں کیا جا سکتا ہے۔ خسروؒ کے زمانے میں کھڑی بولی جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، زیر تشکیل تھی، لہٰذا ان کی زبان کا تعین آسان نہیں ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں لکھتے ہیں "یقیناً امیر خسروؒ ابوالفضل کی زبان لاہوری ہوگی۔"

ڈاکٹر مسعود کا فقرہ احتمالیہ ہے۔ مگر ان کے خیال کو ڈاکٹر سُنیتی کمار چٹرجی کے اس بیان سے تقویت ملتی ہے :-

JHUS WE HAVE A POPULAR LINGVA FRAMCA DEVELOPED OUT OF THE DIALECT OF WES-TER HINDI WITH A CERTAIN AMOUNT OF FUREUCES FROM EARLY PUNGABI IN 13TH CENTURY.

امیر خسروؒ کا زمانہ تیرھویں صدی کا تھا اور ڈاکٹر چٹرجی نے اسی صدی کی زبان کا جائزہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ مسعود حسین کی بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ مگر اس کے بارے میں آخری فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا ہے۔

امیر خسروؒ سے متعلق مذکورہ نزاعی بیانات تحقیق کے دروازے وا کرتے ہیں۔ اور اس طرح امیر خسروؒ اور دیگر متعلقہ امور کے بارے میں نئے اور دلچسپ مواد کی دریافت کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ یہ جینیس کی نشانی ہے کہ اس کی تلاش میں لوگ سارے زمانے کو پا لیتے ہیں مگر ان تک رسائی ممکن نہیں۔ امیر خسروؒ بلاشبہ جینیس تھے۔

ہندی میں بھکتی کال کے شاعرِ اوّلین

حضرت امیر خسرو دہلوی

ڈاکٹر محمد شکیل احمد صدیقی۔ ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، ساہتیہ رتن۔ لکچرر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی

تیرھویں [redacted] عیسوی کے اوائل میں ہندوستان میں مسلمانوں کی مکمل طور پر حکومت ہو جانے سے یہاں کی سیاسی سماجی اور مذہبی زندگی کافی متاثر ہوئی باہر سے صوفیائے کرام کی آمد جو پہلے سے جاری تھی وہ اب اور زیادہ بڑھ گئی۔ یہ ملک چونکہ ابتدا ہی سے تصوف و روحانیت کا مرکز رہا ہے اس لئے یہاں کے قدیم باشندے مذاق تصوف سے آشنا تھے چنانچہ اُنھوں نے صوفیائے کرام کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان صوفیہ کو اپنے تبلیغی مشن میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی باہر سے آنیوالے صوفیہ نے تصوف اور روحانیت کی کچھ ایسی تخم ریزی کی کہ یہاں کی سرزمین سے بھی بڑے بڑے صوفیہؒ اٹھنے لگے جنھوں نے منجملہ دیگر شعبہ ہائے زندگی کے یہاں کی مقامی شاعری اور ادب کو کافی متاثر کیا چنانچہ ہندی شاعری میں سوا تین سو سال کا پورا ایک طویل عہد (۱۳۱۹ء تا ۱۶۴۳ء) بھکت کال کے نام سے مشہور ہے ہندوستان میں بھکتی تحریک بڑی حد تک مسلمان صوفیہ کی رہین منت ہے کیونکہ بھکتی تحریک کی اہم رکن مثلاً راما نند، نامدیو، کبیر داس اور گرو نانک وغیرہم مسلمان صوفیہ سے متاثر تھے جس کا ایک کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ ان لوگوں کی تعلیمات خدا کی وحدانیت بت پرستی کی مخالفت، چھوت چھات سے بیزاری اور اونچ نیچ کی مذمت پر مبنی ہیں جس کی تبلیغ ان نامور ہستیوں سے قبل ہی یہاں مسلمان صوفیہ کر رہے تھے مزید برآں ان ہستیوں کا مسلمان صوفیوں سے فیض حاصل کرنا بھی ثابت ہے کبیر کو ایک بزرگ شیخ تقی سے فیض حاصل ہوا تھا۔ گرو نانک کی بابا فرید گنج شکر سے بے پناہ عقیدت اور اس زمانہ کے ایک بزرگ شیخ ابراہیم کی خدمت میں دو بار حاضری بہت مشہور ہے نامدیو کے متعلق بھی یہ مشہور ہے کہ ایک بار بھگوان ایک مسلمان فقیر کے روپ میں اُن پر ظاہر ہوئے تھے[1] غالباً اُن کی ملاقات کسی مسلمان صوفی سے ہوئی ہوگی جسے عقیدتمندی اور مذہبی

[1] ہندی ساہتیہ کا اتہاس از رامچندر شکل ص۹۳

بیات نے بھگوان کا روپ دے دیا۔

ہندی شعر و ادب کی تاریخوں میں بھگت کال کا سب سے پہلا نمائندہ شاعر کبیر داس کو مانا گیا ہے جن کا زمانہ ۱۴۴۰ء تا ۱۵۱۸ء ہے جو بھگت کال کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد وجود میں آئے۔ کبیر داس کو بھگت کال کا پہلا شاعر تسلیم کرنے میں ایک قباحت یہ ہے کہ اس سے ہندی شاعری کے تسلسل کی کڑیاں منقطع ہو جاتی ہیں۔ ہندی ادب کے مورخین نے شاید اس طرف توجہ نہیں کی۔ میری ناقص رائے میں بھگت کال کے سب سے پہلے شاعر حضرت امیر خسرو دہلوی (۱۲۵۳ تا ۱۳۲۵ء) ہیں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ حضرت امیر خسرو دہلوی فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی کے بھی نامور شاعر تھے جس کی تصدیق تذکرہ نگاروں کے بیانات کے علاوہ خود امیر خسرو کی تحریر سے بھی ہوتی ہے دیوان غرۃ الکمال کے دیباچہ میں امیر موصوف نے صاف طور پر لکھا ہے کہ انھوں نے ہندی میں شاعری کی تھی لیکن چونکہ ان کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہ تھی اس لیے انھوں نے اپنے کلام کو کبھی جمع نہیں کیا بلکہ دوستوں میں تقسیم کر دیا تھا[1] اوحدی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ امیر کا ہندی کلام فارسی سے بہت زیادہ تھا جو تباہ و برباد ہو گیا اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کلام کی کثرت کے بارے میں تذکرہ نگار نے مبالغہ سے کام لیا ہے تب بھی یہ بات مصدقہ ہے کہ امیر ہندی کے بھی قادر الکلام شاعر تھے امیر کا ہندی زبان کا شاعر ہونا اس لیے تعجب خیز نہیں کہ امیر کی ماں ہندی نژاد تھیں چنانچہ ہندی اُن کی مادری زبان قرار

پاتی ہے امیر کو ہندوستان سے والہانہ محبت تھی وہ ہندوستان کو دنیا کے تمام ملکوں پر فوقیت دیتے ہیں بلکہ یہاں تک لکھ دیا کہ کشور ہند گویا زمین پر بہشت ہے

ع کشور ہند است بہشتے بزمیں

یہاں کے پھول، یہاں کے پھل، یہاں کے موسم، یہاں کے لباس یہاں کے حسن غرضکہ ہر ہر چیز کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور دنیا بھر میں سب سے بہتر بتایا ہے ان چیزوں کے بیان میں اُن کے قلم پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اُنھیں جب یہاں کی ہر چیز عزیز ہے تو پھر یہاں کی زبان سے کیوں کر محبت نہ ہوتی وہ ہندی زبان کو عربی کے علاوہ تمام زبانوں پر ترجیح دیتے ہیں اور اسے کس طرح فارسی سے کم نہیں بتاتے ہیں[2]

غلط کردم گر از دانش زنی دم
نہ لفظ ہندی ست از پارسی کم
بجز تازی کہ میر ہر زبان است
کہ بر جملہ زبانہا کامران ست
دگر غالب زبانہا در رے و روم
کم از ہندی ست شد ز اندیشہ معلوم

وہ کہتے ہیں کہ عربی زبان کی طرح ہندی صرف و نحو کے قواعد و اصول منضبط ہیں۔

ع گر آئین عرب نحوست و گر صرف
ازان آئین دریں کم نیست یک حرف
کسے کیں ہر سہ دکان راست صراف
شناسد کیں نہ تخلیط ست و نے لاف[3]

---

[1] امیر خسرو از ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۴۲

[1] مثنوی دولرانی خضر خاں ص ۴۶-۴۲ [2] ایضاً ص ۴۲

اُن کے نزدیک ہندی زبان معانی اور خیالات کے اعتبار سے بھی دوسری زبانوں سے کسی طرح کم نہیں۔

ع دگر پرسی ہیا لتش از معانی
دران نیز از دگرھا کم ندانی[۱]

کسی زبان کے بارے میں رطب اللسان شخص وہی ہو سکتا ہے جو اس کی باریکیوں سے پوری طرف واقف ہو امیر موصوف کے بیان سے اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ وہ یہاں کی سب ہی زبانوں سے واقف تھے۔

ع من بہ زبانہائے کساں بیشترے
کردہ ام از طبع شناساگرزے

اس کے بعد کہتے ہیں

ع دانم و دریافتہ و گفتہ ہم
جستہ در روشن شدہ زان بیش و کم

یعنی ان میں سے کچھ کو جانتا ہوں کچھ سے یوں ہی آگاہ ہوں اور کچھ میں شاعری کرتا ہوں اور ان میں سے اکثر و بیشتر سے مجھے روشنی اور دانش حاصل ہوئی ہے۔

ہندی کلام سے قطع نظر اُنھوں نے فارسی کلام میں جگہ جگہ ہندی الفاظ اور جملے بہت سلیقے اور خوبی سے استعمال کئے ہیں انھوں نے فارسی اور ہندی زبان کو ملا کر بھی شعر کہے ہیں لیکن یہ کلام چونکہ اقتضائے زمانہ کے مطابق اُن کی نگاہوں میں بے وقعت تھا اس لئے اسے فارسی دواوین میں جگہ نہ دی کہیں کہیں نمونہ کے طور پر چند اشعار خصوصاً رباعی کی شکل میں شامل کر دیئے ہیں مثلاً غرۃ الکمال کے دیباچہ میں مندرجہ ذیل شعر لکھا ہے جو فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کا ہو سکتا ہے۔

ع آرے آرے ہمہ بہاری آرے
مارے مارے برہ کہ مارے آرے

ایک رباعی یوں ہے۔

ع رفتم بہ تماشائے کنار سے جوے
دیدم بلب آب زن ہندوے
گفتم صنما بہائے زلفت چہ بود
فریاد برآورد کہ دُر دُر موے

امیر نے اپنے ہندی کلام کو نہ تو خود جمع کیا ہے اور نہ اُن کے بعد کسی اور نے اسطرف توجہ کی اُن کا تھوڑا سا کلام بعض شوقینوں کی بیاضوں کی بدولت یا زبانی روایتوں کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں علی گڈھ سے خسرو کے چند رسائل کا ایک مجموعہ "جواہر خسروی" کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں تمام تر چیزیں تھیں جو خسرو کے کلام کا جز سمجھی جاتی ہیں۔ یہ مجموعہ مولانا رشید احمد چریا کوٹی کی زیرادارت تیار کیا گیا تھا اور ان لوگوں نے اس پر بہت عالمانہ تنقید اور تبصرہ بھی کیا ہے اسی زمانہ میں بنارس سے ایک ہندی کتاب خسرو کی ہندی کوتیا کے نام سے شائع ہوئی۔ امیر کے نام سے شائع ہونے والے ہندی کلام میں خالق باری چیستان جن میں بوجھ اور بن بوجھ پہیلیاں کہہ مکرنیاں دوسخنے، انمیلیاں یا ڈھکوسلا وغیرہ ہیں ایک غزل ہے جس کا ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی کا ہے چند ہندی کے دوہے اور کچھ گیت بھی ہیں۔

مندرجہ بالا کلام میں کچھ کلام ایسا ہے جو امیر کا نتیجہ فکر نہیں بلکہ اُن کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے کچھ ایسا

۱؎ ایضاً ص [illegible]

ـہ تصدیق کر لیا گیا ہے لیکن ڈاکٹر وحید مرزا صاحب
ـکے ہندی کلام اس وقت امیر خسرو کی طرف
ـکیا جاتا ہے اس کا یہ حصہ ضرور قابل اعتماد ہے
ـہ دوہے جو "امیر خسرو" میں دیے ہوئے ہیں۔

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیو کو دوؤ بھئے اک رنگ
گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے رین بھئی چودیس

آخری دوہے کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں
ـنے پیر کے وصال کے بعد جب ان کے مزار پر حاضری
ـا وقت اسے موزوں کیا تھا اور اسے پڑھ کر بیہوش
ـر پڑے تھے۔

امیر کے ہندی کلام میں سے بعض چیزوں کو بڑی شہرت
ـہوئی خصوصاً وہ نظم جس میں امیر نے الوہیت کے انداز
ـان کے اس دنیا سے رخصت ہونے کا خاکہ پیش کیا
ـں کو عموماً شادی میں دلہن کی رخصتی پر گایا جاتا ہے
ـا پہلا بول ہے۔

کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے

ـب الہی کی شان میں وہ نظم جس کو قوال آج بھی مزار
ـں کے عرس میں گاتے ہیں اور جسے رنگ کہا جاتا ہے
ـہ ہے۔

ـرنگ ہے ماہا رنگ ہے ایسا پیر پایا نظام الدین اولیا
ـاجیاروں میں تو ایسا رنگ اور نہیں دیکھوں ری
ـیں بدیس ڈھونڈھ پھری ہوں تورا رنگ من بھایوں ری
نظام الدین اولیا آج رنگ ہے

ہندی اور فارسی کو ملا کر کلام موزوں کرنے کی امیر کی کوشش بڑی قابل تحسین ہے ان کا یہ گنگا جمنی کلام ہی صحیح معنوں میں اردو کی داغ بیل ڈالنے کا موجب بنا اسی لئے انھیں اردو کا سب سے پہلا شاعر کہا جاتا ہے اس قسم کی ایک غزل ریختہ کے نام سے تذکروں میں ملتی ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

ز حال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں
بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

امیر خسرو موسیقی کے بھی زبردست ماہر تھے اور انھوں نے اس فن لطیف میں بھی کافی جدتوں سے کام لیکر فارسی اور ہندی موسیقی کو ملا دیا ہے ڈاکٹر عبدالحق کی رائے میں غالباً یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ہندی میں بھی نظمیں اور دوہے لکھے[1]

غرضیکہ اس بات کے پایۂ تحقیق کو پہونچ جانے کے بعد کہ امیر خسرو ہندی کے بھی شاعر تھے انھیں بھگتی کال کا شاعر نہ ماننا حقیقت سے صریحی انحراف ہوگا چوں کہ ان سے پہلے کوئی دوسرا شاعر ابھی تک ایسا نہیں ملا جس نے ہندی میں صوفیانہ

---

[1] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص

شاعری کی ہو اس لئے امیر موصوف کو بھکت کال کا پہلا شاعر ماننا پڑے گا امیرؒ کا جو بھی تھوڑا سا ہندی کلام دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گیا اور جسے محققین نے انھیں کا تسلیم کیا ہے۔ جس کی چند مثالیں اوپر درج کی گئیں وہ سب تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے یہ بھی امیرؒ کے ہندی زبان کے صوفی شاعر ہونے کی برہان قاطع ہے۔

امیر خسروؒ نے ہندی میں صوفیانہ شاعری کا نغمہ کچھ اس انداز سے چھیڑا کہ اُن کے بعد شعراء کی بربط فکر نے بھی راگ الاپنا شروع کر دیئے اور صوفیانہ شاعری کا خاصا بیش بہا خزانہ ہندی زبان میں اکٹھا ہو گیا۔ امیر کے بعد ہندی زبان میں صوفیانہ شاعری کرنے والے مسلمان شعراء میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی المتخلص بہ الکھ داس شمس العشاق شاہ میراجی، شاہ برہان الدین جانم شاہ امین الدین اعلیٰ، قاضی محمود دریائی بیرپلوری، شاہ علی محمد جیو گام دھنی، شاہ خوب محمد چشتی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں یہ سب بھگتی کال کے شعرائے اعظم کبیر داس سور داس اور تلسی داس کے پیشرو ہیں۔

امیر خسروؒ نے نرگنتر شاخ کے بھکت شعراء کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ سگنتر شاخ کے شعراء نے بھی اُن سے بالواسطہ اثر قبول کیا ہے جس کی نشاندہی کے لئے علیحدہ ایک تفصیلی مضمون کی ضرورت ہے۔

امیر خسرو

رئیس امروہوی (کراچی)

ترانۂ روح دو جہاں ہیں نوائے جاں ہیں امیر خسرو
حیاتِ خود نغمہ خواں ہے جن کی وہ نغمہ خواں ہیں امیر خسرو

"سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں"
"اندھیری رتیاں" نہ کیوں ہوں جس روشن کہ ضوفشاں ہیں امیر خسرو

وہ ہندی الاصل فارسی گو، وہ برج بھاشا، وہ کہہ مکرنی
مگر جو کہہ کر کبھی نہ مکری وہی زباں ہیں امیر خسرو

وہ شاعر و عارفِ قلندر، وہ خسروی شان، وہ فقیری
نہ کیوں ہوں جانِ جہاں کہ آخر جہانِ جاں ہیں امیر خسرو

نظامِ دینِ نظامِ دنیا کا ان پہ فیضان ہے کہ اب تک
نظامِ عالم ہے پیر و کہنہ مگر جواں ہیں امیر خسرو

جمالِ اجمیر و حسنِ دہلی کہ جس پہ ہندوستاں ہے نازاں
اُسی جمالِ ابد نما کے قصیدہ خواں ہیں امیر خسرو

رئیسؔ ان کا دوامِ عظمت نہ کیوں ہو پھر عظمتِ دوامی
"دوام" خود ترجمہ ہے جس کا وہ ترجماں ہیں امیر خسرو

امیر خسرو — ایک بلند پایہ مؤرخ

جمیل مہدی ایڈیٹر عزائم

امیر خسرو دہلوی بیک وقت بہت سی خوبیوں کے مالک تھے، وہ ایک عظیم شاعر تھے جنھیں شاعری کی تمام اصناف یعنی غزل قصیدہ اور مثنوی پر یکساں عبور تھا۔ وہ ایک بہت بڑے موسیقار تھے جنھوں نے ہندوستانی موسیقی کی ترقی میں ایک تاریخی کردار ادا کیا۔ وہ ایک تجربہ کار سپاہی تدبر و سیاست سے باخبر ایک درباری ایک صوفی منش انسان تھے اور سب سے بڑھ کر وہ ایک بلند پایہ مؤرخ بھی تھے۔ لیکن افسوس سوانح نگاروں نے امیر خسرو کی علمی، ادبی شاعرانہ خوبیوں پر بہت کچھ لکھ ڈالا ہے مگر بہ حیثیت مورخ ان پر کم روشنی ڈالی ہے۔ حال ہی میں امیر خسرو کی ساتسو سالہ برسی منانے کے دوران بھی یہ پہلو زیادہ زیر بحث نہیں آیا۔

بہر حال امیر خسرو کو بہ حیثیت مؤرخ زیر بحث لانے کے لیے ہمیں ان کی پانچ تاریخی مثنویوں یعنی قرآن السعدین، مفتاح الفتوح، عشقیہ یا دولرانی، خضر خاں، نہ سپہر اور تغلق نامہ اور ایک کتاب نثر میں جو خزائن فتوح یا تاریخی علائی کے نام سے مشہور ہے، کا گہرا مطالعہ درکار ہوگا۔

قرآن السعدین جس کے لفظی معنی ہیں دو بہترین ستاروں کا ملاپ، سب سے پہلی طویل تاریخی مثنوی ہے۔ معز الدین کیقباد کے کہنے پر ۱۲۸۹ء میں لکھی گئی۔ اس کا مرکزی خیال باپ بیٹے یعنی معز الدین کیقباد اور بغرا خاں، حاکم بنگال کے اودھ کے علاقہ میں دریائے سرجو (؟) کے کنارے تاریخی ملاقات ہے۔ پس منظر یہ ہے کہ غیاث الدین بلبن (۱۲۸۷-۱۲۶۶ء) کے بعد معز الدین کیقباد دہلی کا سلطان بنا نوجوان تھا۔ جوانی کی مستی اور پھر نشہ اقتدار نتیجہ رقص و سرود کی محفلیں عیش و عشرت اور مملاق ساز خیں سلطنت دہلی کا قلعہ بن گئیں۔ بغرا خاں جس نے بلبن کے بعد بنگلہ کی حکمرانی پر ہی اکتفا کر لیا تھا، دہلی میں اس صورتحال سے خوش نہیں تھا۔ اسے دہلی میں اپنے خاندان کی تباہی صاف نظر آرہی تھی، وہ اپنے بیٹے کو راہ راست پر

لانے اور سلطنت دہلی کو متوقع خطرات سے بچانے کیلئے بنگال سے اپنے لشکر کے ساتھ چلا۔ دہلی کے کیقباد بھی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ روانہ ہوا اور دونوں کی ملاقات دریائے سرجو کے کنارے پر ہوئی۔ یہ ایک تاریخی واقعہ تھا اور اس واقعہ کو امیر خسرو نے کیقباد کے حکم پر مثنوی کی صورت میں قلمبند کیا۔

مثنوی کا آغاز خدا کی حمد اور رسول پاک کی نعت سے ہوتا ہے کل شعر تقریباً چار ہزار ہیں اور اٹھارہ غزلیں ہیں انداز بیان سادہ اور دلچسپ ہے تاریخی مواد کافی ملتا ہے دہلی اور کیلوکھری کا تفصیلی ذکر ہے۔ منگولوں کے متعلق کافی باتیں لکھی گئی ہیں منگولوں کے ہندوستان پر حملے اس دور کا خاصہ ہیں۔ امیر خسرو کو منگولوں کے ہاتھوں قید ہونا پڑا منگولوں کے جسمانی خواص، ان کی عادات اور ان کی سزاؤں کے طریقے ایسی سب چیزوں کو امیر خسرو نے قریب سے مشاہدہ کیا۔ اب ان چیزوں کو وہ زیر بحث مثنوی میں بیان کرتے ہیں۔ لہذا اس سلسلہ کی تمام باتیں مستند تسلیم کی جائیں گی۔ مزید برآں تاریخی ملاقات کے وقت دونوں طرف کے فوجی کیمپ کا حال دربار کی شان و شوکت تحائف کا تبادلہ، ناچنے والیوں کا ذکر یہ سب باتیں کافی مواد بہم پہونچاتی ہیں اور اس دور کے سیاسی، فوجی اور تہذیبی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ تقریباً تمام تاریخی واقعات جو اس مثنوی میں بیان کئے گئے ہیں۔ ہم عصر تاریخوں میں بعینہٖ موجود ہیں۔ ہاں البتہ جہاں تک باپ بیٹے کی ملاقات کے محرکات کا تعلق ہے: امیر خسرو اپنے ہمعصر مورخ ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی سے اختلاف کرتے ہیں۔ ضیاء الدین برنی کا کہنا ہے کہ بغرا خاں نیک ارادے سے یعنی کیقباد کو سمجھانے کے لیے دہلی کی طرف روانہ ہوا تھا جب کہ امیر خسرو کہتے ہیں کہ بغرا خاں کے ارادے نیک نہ تھے۔ دوسرے امیر خسرو کے بیانات شعر کی زبان میں ہیں لہذا شاعرانہ مبالغہ آرائی سے پاک نہیں ہو سکتے لیکن بہ حیثیت مثنوی قرآن السعدین نہایت ہی تاریخی اہمیت کی حامل ہے بقول اے۔ بی۔ کوہ ویل " اگرچہ مثنوی مبالغہ آرائی سے مبرا نہیں ہے لیکن واقعات صحت کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے دنیا میں بہت کم تاریخی نظمیں ایسی ہوں گی جن کی اس قدر تاریخی واقعات سے مطابقت ہو جس طرح کہ مثنوی قرآن السعدین کی۔ ہم جب اس کا مقابلہ تاریخ فرشتے سے کرتے ہیں تو ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ دونوں کے بیان میں کس قدر مطابقت ہے۔

مفتاح الفتوح امیر خسرو کی دوسری تاریخی مثنوی ہے۔ یہ ۱۲۹۱ء میں لکھی گئی تھی ابتدا میں یہ خسرو کے تیسرے دیوان غرۃ الکمال کا حصہ تھی، لیکن اب اس کی حیثیت علحدہ کتاب کی ہے۔ اسمیں سلطان جلال الدین کی چار فتوحات جو اس نے ۱۲۹۱ء میں راجپوتانہ اور اجین کے راجاؤں کیخلاف لڑ کر حاصل کی تھیں، کا ذکر ہے تاریخی واقعات کو نہایت صحت کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

عشقیہ اور دولرانی خضر خاں، امیر خسرو کی ایک اور تاریخی مثنوی ہے۔ خضر خاں علاؤالدین خلجی کا بڑا لڑکا تھا جو ملتان کا گورنر بھی رہ چکا تھا۔ اسے گجرات کے راجہ کرن کی لڑکی دولرانی سے عشق ہو گیا تھا۔ عشق سے شادی ہونے تک تمام واقعات مثنوی کی صورت میں قلمبند کرنے کیلئے امیر خسرو کو حکم ملا۔ لہذا خسرو نے یہ مثنوی ۱۳۱۶ء میں مکمل کی بعض نقادوں کو یہ اعتراض رہا کہ یہ مثنوی کسی حقیقی تاریخی واقعہ پر مبنی نہیں

بلکہ بعض لوگوں کا خیال ہے یہ محض یادگار اور ایک فرضی کہانی تھی ہے لیکن موجودہ تاریخی تحقیق نے اس شک کو رفع کر دیا اور یہ مثنوی حقیقی تاریخی واقعات پر مبنی ہے۔

اگرچہ مثنوی کا مرکزی خیال خضر خاں اور دولرانی کی محبت کی داستان ہے لیکن ضمنی طور پر بہت سے تاریخی واقعات بھی بیان ہوئے ہیں۔ شہاب الدین غوری کا قتل، رضیہ سلطانہ، غیاث الدین بلبن وغیرہ کے تاریخی حالات ملتے ہیں۔ علاؤالدین خلجی کے قتل کا کوئی ذکر نہیں لیکن اس کی تخت نشینی کا حال درج ہے۔ اسی طرح علاؤالدین خلجی کی منگولوں کے ہاتھوں تکالیف کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ اس کے باوجود مثنوی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ سماجی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ چیز ایسی ہے جو ہم عصروں کی تاریخ میں ناپید ہے۔

نہ سپہر امیر خسرو کی ایک اور مشہور و معروف مثنوی ہے قطب الدین مبارک خلجی (۱۳۱۶ء-۱۳۲۰ء) کے دور سے متعلق ہے یہ نو حصوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی حصوں میں مبارک خلجی کی تخت نشینی، دیوگیر اور وارنگل کی فتوحات کا ذکر ہے علاؤالدین خلجی کی عمارت کا ذکر بھی ہے۔ علائی دور کی جامع مسجد دہلی کی تعریف میں بھی باتیں کی گئی ہیں تیسرے حصے میں ہندوستان، اس کی آب و ہوا، حیوانات، علم و ادب اور باشندوں کے متعلق باتیں درج ہیں سنسکرت پر خاص تنقید کی گئی ہے۔ دریائے نربدا کی گہرائی اور اس کے تیز بہاؤ کا ذکر ہے یہ سب ایسے امور ہیں جو تاریخ نویسی کے موجودہ نظریے کے مطابق ہیں موجودہ نظریہ تاریخ یہ ہے کہ تاریخ کو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو زیر بحث لاتی ہے بہرحال خزائن الفتوح کی طرح اس مثنوی میں سماجی پہلوؤں پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

امیر خسرو کے ہندوستان، اس کی آب و ہوا اور حیوانات کا ذکر کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ "متعصب" تھے۔ جیسا کہ بعض مورخین ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں وہ ہندوستان سے اس لیے پیار کرتے تھے کہ ہندوستان اسلام کا گہوارہ بن گیا تھا۔ "قومیت" کا کوئی تصور اس وقت موجود نہیں تھا بہرحال امیر خسرو ہندوستان کے بارے میں مثنوی میں لکھتے ہیں۔

خوشا ہندوستان رونق دیں
شریعت را کمال عز و تمکیں

ز علم و با عمل دہلی بخارا
ز شاہاں گشتہ اسلام آشکارا

تغلق نامہ امیر خسرو کی آخری تاریخی مثنوی ہے جو غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰-۱۳۲۵ء) کے کہنے پر ۱۳۲۵ء میں لکھی گئی ہے اگرچہ یہ مثنوی بہت مختصر دور سے متعلق ہے لیکن اس میں سلطنت دہلی کی تاریخ کے عظیم سانحوں کا ذکر ہے جس کو پوری تفصیلات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ علائی خاندان کا ڈرامائی خاتمہ، خسرو خاں کی زیادتیاں، قطب الدین خلجی کا افسوسناک قتل، پھر قبیلے کے دوسرے واقعات اور پھر غیاث الدین تغلق کا دہلی میں فاتحانہ داخلہ اور دوسری تفصیلات بیان کی گئی ہیں اگرچہ ان واقعات کو ضیاء الدین برنی اور ابن بطوطہ نے بھی بیان کیا ہے لیکن انھوں نے واقعات اور تاریخیں بیان کرنے میں گڑبڑ کی ہے۔ تغلق نامہ کی مدد سے تاریخ کی گم گشتہ کڑیوں کو دریافت کیا جا سکتا ہے تاریخ سلطنت دہلی کے طلبہ کیلئے

یہ مثنوی نہایت اہم ہے۔

خزائن الفتوح یا تاریخ علائی امیر خسرو نے نثر میں لکھی ہے۔ یہ زیادہ تر علاءالدین خلجی کی شمالی اور جنوبی ہندوستان کی فتوحات پر بحث کرتی ہے۔ جنوبی ہندوستان کی فتوحات کا ذکر تفصیل سے ہے امیر خسرو جنوبی دکن کی فتوحات میں سے تھے اس لیے عینی شاہد کی حیثیت سے جنگی امور اور فتوحات کے متعلق تمام تفصیلات مستند خیال کی جاتی ہیں جنکو کا اس کتاب میں بھی ذکر ہے لیکن علاؤالدین خلجی کی ان کے ہاتھوں ہزیمت کا ذکر گول کر گئے ہیں جس سے امیر خسرو کی تاریخی دیانت مشکوک ہو جاتی ہے یہ کتاب سرکاری دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس میں بھی وہی نقائص ہیں۔ جو ایک سرکاری دستاویز میں ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود خزائن الفتوح تاریخی مواد کا انمول خزانہ ہے پُر وقار عجیب کے الفاظ میں تفصیلات پوری صحت کے ساتھ بیان کی گئی ہیں

امیر خسرو کی پانچویں تاریخی مثنوی اور خزائن الفتوح کے اس سرسری مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر خسرو نے تاریخ کے طلبہ کے لئے نہایت قیمتی تاریخی مواد بہم پہنچایا ہے اس مواد کے مطالعہ سے اس دور کے سیاسی اقتصادی اور سماجی اور فوجی حالات اور معاملات پر روشنی پڑتی ہے لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر پی۔ ہارڈی امیر خسرو کو مورخ تسلیم کرنے سے انکاری ہے اس کا کہنا ہے کہ امیر خسرو بنیادی طور پر شاعر تھا اس لیے اس نے صرف شاعری کی ہے اور تاریخ نہیں لکھی۔

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایسا معیار نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہم کسی شاعر کو مورخ تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ بہرحال اس چیز پر غور ہونا چاہیے کہ مورخ ہوتا کیا ہے؟

شاید "تاریخ" کی تعریف (توضیح) آسان ہے لیکن الفاظ کی وضاحت کرنا آسان نہیں۔ اگر دور سلطنت کے تمام سوانح نگار اور تاریخ نگار وغیرہ تمام مورخ ہیں تو امیر خسرو مورخ کیوں نہیں ہیں؟ اس چیز کا خیال نہیں ہونا چاہیے کہ جو کچھ انھوں نے تاریخی واقعات کے متعلق لکھا ہے، پوری محنت کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور دوسری چیز جو امیر خسرو کو اپنے ہمعصر مورخین سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اکثر واقعات کے عینی شاہد ہیں انھوں نے تقریباً آٹھ بادشاہوں کا دور دیکھا ہے۔ وہ دہلی دربار سے منسلک رہے امیروں شہزادوں اور بادشاہوں کی صحبت میں رہے۔ اس عرصہ میں بڑے بڑے انقلاب آئے۔ بڑی بڑی فتوحات حاصل کی گئیں انتظامی، اقتصادی اور فوجی اصلاحات ہوئیں منگولوں کے مسلسل حملے ہوئے اور ان حملوں کی تاریخ ہندوستان پر گہرے نتائج مرتب ہوئے۔ ان انقلابی حالات اور واقعات کے مابین امیر خسرو نے پرورش پائی، جوان ہوئے، بڑھاپے کو پہونچے اور سب کچھ ان کے سامنے ہوا۔ ادھر امیر خسرو ان سب حالات کے عینی شاہد ہیں بلکہ اکثر واقعات میں خود حصہ لیا۔ خاصکر علاؤالدین خلجی کی دکن کی مہمات میں وہ بہ نفس نفیس شامل تھے ان واقعات کے متعلق امیر خسرو سے اور کون بہتر جانتا ہوگا۔ مختصر یہ کہ باوجود اس کے کہ امیر خسرو کی زبان شاعرانہ ہے اور انھوں نے مبالغہ آرائی کی ہے یا بعض واقعات کو قصداً چھپایا ہے، یا واقعات بیان کرتے ہوئے حوالے نہیں دیئے پھر بھی ان کی مورخانہ حیثیت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

امیر خسرو بلند پایہ شاعر بھی ہیں اور مورخ بھی حسن عسکری کے الفاظ میں "ہمدردانہ جائزہ لیتے ہوئے ہمیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ امیر خسرو ایک مورخ تھے آپ کا کام نہایت تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ تاریخی ادب میں انھوں نے جو اضافے کئے ہیں نظرانداز نہیں کئے جا سکتے۔

ناظر عاشق ہرگانوی

ہندوستانی تہذیب کی تشکیل میں — امیر خسرو کا حصہ

محترم ! سلام مسنون !!

"فروغ اردو" کے امیر خسرو نمبر کے لیے ایک مضمون ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ اُمید ہے پسند فرمائیں گے !
ادھر فروغ اردو نہیں آتا ہے۔ آپ مجھے پرچہ بھجوایئے ، میں آپ کے لیے بھی ہرا بر لکھوں گا۔

رسید سے نوازیں

خادم :- مناظر عاشق ہرگانوی

جب ہم ہندوستان کی تہذیب کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ طرح طرح کے اختلاف کے باوجود اہل ہند کے خیال ، احساس اور زندگی میں ایک گہری وحدت موجود ہے جو ترقی کے دور میں زیادہ اور تنزل کے دور میں کم ہوتی رہتی ہے۔

امیر خسرو ۶۵۳ھ میں بہ مقام پٹیالی پیدا ہوئے اور ۱۸ شوال ۷۲۵ھ کو بہتّر سال کی عمر پا کر دہلی میں فوت ہوئے۔ اُنھوں نے گیارہ بادشاہوں یعنی غیاث الدین بلبن معزالدین کیقباد ، کیومرث الملقب بہ شمس الدین ، جلال الدین فیروز شاہ خلجی ، رکن الدین ابراہیم شاہ ، علاؤ الدین خلجی شہاب الدین ، قطب الدین مبارک شاہ ، ناصر الدین ، خسرو خاں ، غیاث الدین تغلق شاہ اور محمد تغلق کا زمانہ دیکھا تھا۔ مختلف درباروں کی گوناگوں دل آویزاں شاہوں کے سانحات وفات ، تخت نشینوں کے جشن ، صلح و جنگ ، فتح و شکست ، عزل و نصب ، عروج و زوال ، سفر و حضر ، امن و فساد ، عیش و نشاط ، بخشش و کرم ، بذل و سخا ۔ ملک گیریاں اور ملک داریاں دیکھیں۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے خاص مریدوں اور عقیدتمندوں میں رہے اور اپنی شان و امارت کی وجہ سے امیر کہلائے۔

اس طرح خسرو نے شاہی محلوں ، بزرگوں کی خانقاہوں

اور صوفیوں کے جھونپڑوں میں گھوم پھر کر زندگی کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور اپنے وسیع تجربے کو قلمبند کر کے ہندوستانی تہذیب کی تشکیل میں زبردست حصہ لیا۔ انھوں نے ہندوستان کی محبت، رواداری، وسیع المشربی، فراخدلی کشادہ ذہن اور تہذیبی یکجہتی کی تبلیغ و تشکیل اپنی تصانیف اور اپنے طرز عمل سے کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج اتنی مدت گذر جانے کے بعد بھی خسرو کے گیت، ان کی موسیقی، ان کے اشعار، ان کی قوالی ہماری تہذیب کا قابل فخر ورثہ ہے

تہذیبی وحدت کی ایک بڑی علامت مشترک زبان سمجھی جاتی ہے خسرو نسل کے لحاظ سے ترک تھے پیدائش کے لحاظ سے ہندوستانی تھے لیکن زبان کے لحاظ سے جتنا ذوق ان کو عربی فارسی اور ترکی زبانوں سے تھا اتنا ہی وطن کی زبان برج بھاشا سے تھا یہ ان کا ہی کارنامہ تھا کہ پہیلیاں، دوسخنے، کہ مکرنیاں، دوہا اور اشعار میں بھاشا اور فارسی کو ملا کر شیر وشکر کیا ہے

لودھ پھٹکری مردا سنگ   ہلدی زیرہ ایک ایک سنگ

اُونچی اٹریا پلنگ بچھایا   میں سوئی میرے سر پہ آیا

کھل گئیں انکھیاں بھئی آنند   اے سکھی ساجن نا سکھی چند

گوشت کیوں نہ کھایا، ڈوم کیوں نہ گایا ...... گلا نہ تھا
جوتا کیوں نہ پہنا، سموسہ کیوں نہ کھایا ...... تلا نہ تھا
سوداگر را چہ می باید، بوچے کو کیا چاہیے .... دوکان
قوت روح چیست، پیارے کو کیا چاہیے ...... صدا

ی گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
ی سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

خسرو نے اپنی تصانیف میں اپنی مادری زبان کو ہندوی کہا ہے لیکن اپنے عہد کی ہندوستانی زبانوں کی فہرست ان الفاظ میں پیش کی ہے ۔

سندھی و لاہوری و کشمیری و کبر
دھور سمندری، تلنگی و گجر
معبری و گوری و بنگال و اودھ
دہلی و پیرامنش اندر ہمہ حد
این ہمہ ہندویست کہ ایام کہن
عامہ بکار است بہر گونہ سخن

ان بارہ زبانوں کا ذکر کرتے ہوئے خسرو نے ان سب کو ہندوی بتایا ہے۔ بارھویں زبان "دہلوی ہندوی" وہی کھڑی بولی ہے جو اس وقت خاص طور پر دہلی کے مسلمان اور عام طور پر دہلی والے بولتے تھے اور جس کو عوام سے قریب کرنے کیلئے خسرو نے طرح طرح کے اختراع کئے ویسے بھی خسرو کا عہد شمالی ہند کی لسانی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے مسلمانوں کے آنے کے بعد دربار دہلی کے چاروں طرف خصوصیت کے ساتھ اور دہلی شہر اور نواح دہلی میں عام طور پر ایک بڑی خوش آہنگ زبان پیدا ہو گئی تھی۔ اور اس ہم آہنگی میں امیر خسرو کی سعی کو زیادہ دخل ہے۔ اس کے علاوہ پہلی بار خسرو نے فارسی میں ہندوستان اور ہندوستانیوں کے فضائل کا ذکر تفصیل سے کیا ہے جس سے ہندوستان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے اور ہندوستانی اشیاء کو جاننے میں کامیابی ہوتی ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی تشکیل میں یہ

شاہکار نامہ خسرو کے تیسرے کا ہے۔

ہندوستانیوں کی فضیلت علمی پر خسرو نے دس دلیلیں قائم کی ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں :

یہاں تمام دنیا سے زیادہ علم نے وسعت حاصل کی...

ہندوستان کا آدمی دنیا کی تمام زبانیں سیکھ سکتا ہے لیکن کسی اور ملک کا آدمی ہندوی نہیں بول سکتا۔

یہاں دُنیا کے ہر حصہ کے لوگ علم کی تحصیل کیلئے آئے لیکن کوئی ہندوستانی تحصیل علم کے لئے ہند سے باہر نہیں گیا۔

علم حساب میں "صفر" ہندوستان کی ایجاد ہے جسے آسا برہمن نے ایجاد کیا۔

کلیلہ ودمنہ جس کا ترجمہ فارسی، ترکی، عربی وغیرہ زبانوں میں ہوا، ہندوستان کی تصنیف ہے۔

شطرنج ہندوستان کی ایجاد ہے۔

موسیقی کی جو ترقی ہندوستان میں ہوئی اور کہیں نہیں ہوئی۔

اور دسویں دلیل میں کہتے ہیں ؎

حجت دہ آنکہ چو خسرو بہ سخن
سحر گرے نیست بہ چرخ کہن

ہندوستانی جانوروں اور پرندوں کی تعریف میں "طوطی" کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

طوطی اندیں جاست یکے جانورے
ہمچو دگر جانوراں نے شمرے
ہیں سخنش بز صفت آدمیان
ہرچہ شنیدست بگوید بہ بیان

فاتحہ و اخلاص و دعا درد ہنش
با من و تو ہمچوں من و تو سخنش

طوطے کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس ملک کے طوطے آدمی کی طرح بولتے ہیں۔ یہاں کے شارک (مینا) عجم و عرب میں نہیں پائے جاتے۔ اور یہ بھی آدمی کی طرح بول سکتے ہیں کوا مستقبل کی خبر دیتا ہے۔ گوریا اپنی جنبش پرواز اور آواز وغیرہ میں عجیب و غریب ہے۔ طاؤس میں دلہن جیسی رعنائی ہے۔ طاؤس کے جوڑے جفتی نہیں کرتے بلکہ مادہ نر کی آنکھوں سے آنسو پی لیتی ہے، جس سے وہ انڈے دینے لگتی ہے۔ بگلے تھوڑی سی تربیت کے بعد عجیب و غریب کرتب دکھانے لگتے ہیں۔ گھوڑے تال اور سُر کے ساتھ ٹاپ مارتے ہیں۔ اور یہاں کے ہاتھی بظاہر حیوان ہیں لیکن عمل میں انسان ہیں۔

ہندوستانی کپڑے کی تعریف میں خسرو نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ بغرا خاں جب اودھ آکر اپنے بیٹے کیقباد سے ملا تو دیگر اشیا کے ساتھ اسے تحفے میں کپڑا بھی ملا۔ وہ کپڑے اتنے باریک تھے کہ پہننے پر جسم نظر آتا تھا۔ اور بعض کو لپٹنے پر انگلیوں کے ناخن میں آجاتے تھے اور کھولنے پر تھان بن جاتا تھا۔

جامۂ ہندی کہ ندا نند نام
کز تنکی تن بنماید تمام

ماندہ بہ پیچیدہ بناخن نہاں
باز کشائیش بپوشد جہاں

ہندوستانی کپڑے میں دیوگیر نامی کپڑے کی تعریف میں کہتے ہیں کہ اس کی خوبی یہ ہے کہ یہ آفتاب، ماہتاب یا سایہ

معلوم ہوتا ہے ؎

مگو دامنِ خوبانِ پری کیش
کہ لطفِ دیدہ گیرد از کتاں بیش

ز لطفِ آں جامہ گوئی آفتاب است
دیا خود سایۂ یا ماہتاب است

پان کی تعریف میں کہتے ہیں ۔

خراسانی کہ ہندی گیردش گول
نمے باشد بہ نزدش برگِ تنبول

شناسد آنکہ مردِ زندگانی است
کہ ذوقِ برگِ خالی ذوقِ جانی است

خربزہ کو بہشت کے تمام پھلوں سے اعلیٰ بتایا ہے اس میں قند جیسی مٹھاس ہوتی ہے ؎

خربزہ گوئی کہ بصحرا ؤ گشت
گوے ابود از ثمراتِ بہشت

ساختہ در آب کما نش مکیں
چاشنی در آب کما نش ببیں

رنگ ز مشش سبز کماں آبگوں
زہ ز برونِ بستہ کماں از دروں

آم کو انجیر پر ترجیح دیتے ہیں ؎

دگر کس سوئے خود گردد جہت گیر
نہمدکم نغزکِ ما وا از انجیر

سیہ گو بند و ہند ہم چنیں است
سوادِ اعظمِ عالم ہمیں است

ہندوستانی پھولوں میں سوسن، سمن، بنفشہ، کبود، بیلا، گل زریں، گل سرخ، ریحان، گل کوزہ، گل لالہ، گل سفید، سپرغم، صدبرگ، نسترن، دونا، یاسمین، کرنا، نیلوفر، ڈھاک، چمپا، جوہی، کیوڑا، سیولی، گلاب، مولسری وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں بنفشہ، نسترن اور یاسمین تو ایران سے لائے گئے۔ بقیہ تمام پھول ہندوستانی ہیں بیلا کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی پیشانی بڑی کشادہ ہوتی ہے اور ایک پھول میں سات پھول ہوتے ہیں ؎

ازیں سو بیل پیشانی کشادہ
بیک گل ہفت گل برہم نہادہ

ہندوستان کی عورتوں کے حسن کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں کی عورتیں مصر، روم، قندھار، سمرقند، خطا، ختن، خلخ اور تمام حسینانِ عالم پر اپنے حسن کی صفات میں فائق ہیں۔ یغمار اور خلخ کا حسن بھی ہندوستان کے حسن کے برابر نہیں۔

خسرو ہندوستان کی آب و ہوا کو خراسان اور دوسرے ممالک کی آب و ہوا سے بہتر بتاتے ہیں اور دس اسباب پیش کرتے ہیں :

یہاں کی سردی نقصان دہ نہیں ہے۔
یہاں گرمی خراسان کی سردی سے بہتر ہے۔
سرد ہوا کے خوف سے یہاں کے غریب عوام کو سردی کے زیادہ سامان کی ضرورت نہیں ہوتی۔
سال بھر تک یہاں گل و مل کی بہار رہتی ہے۔
یہاں کے پھول گل بابونہ کی طرح خوش رنگ ہوتے ہیں
یہاں کے پھول سوکھ جانے پر بھی خوشبو دیتے ہیں۔

اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ؎

ہفتمش آں کاں طرف از میوہ تر
نیست چو امرود و چو انگور دگر

می کند پاتنگ اپھا ہر دو کری
نغزک و موزی و بناتی بمری

میوہ دگر کم نگری کز محلش
لاچی و کافور و قرنفل بدلش

یہاں آم، کیلا، الائچی، کافور اور لونگ جیسی چیزیں ہوتی ہیں۔

خراسان کے بہت سے میوے اس ملک میں پائے جاتے ہیں، اس کے برخلاف یہاں کے میوے خراسان میں نہیں ہوتے۔

یہاں کے نادر تحفے پان اور کیلا ہیں۔ پان جیسا دنیا میں دوسرا کوئی میوہ نہیں۔

جنت نعیم آنکہ دریں کشور خوش
ہست دو تحفہ کہ بود نادرہ وش

میوۂ بے خستہ کہ نبود بجہاں
برگ کہ چوں میوہ خورد مہماں

موز بہاں میوۂ بے خستہ نگر
برگ ز تنبول نگر نائب خور

علوم و فنون کے ذکر میں خسرو کہتے ہیں کہ یہاں منطق بھی ہے اور نجوم بھی اور علم کلام بھی البتہ ہندوستانی فقہ سے واقف نہیں ہیں لیکن وہ طبیعات، ریاضیات، منطق اور ہیئت کے ماہر ہیں۔ مابعد الطبیعاتی علم میں ہندوؤں نے سیدھا راستہ ترک کر دیا ہے لیکن مسلمانوں کے علاوہ دوسری قومیں بھی اس علم سے نابلد ہیں حالانکہ وہ ہمارے مذہب کی پیروی نہیں کرتے ہیں تاہم ان کے بہت سے عقائد ہم سے مشابہ ہیں۔

وآنکہ دریں عرصۂ پوشیدہ دروں
دانش و معنی است ز اندازہ بروں

گرچہ بہ حکمت سخن از روم شدہ
فلسفہ ز آنجا ہمہ معلوم شدہ

لیک نہ ہند است ازاں مایۂ تہی
ہست درو یکیک از اندیشہ بہی

منطق و تنجیم و کلا ست درو
ہرچہ کہ جز فقہ تمام است درو

فقہ چو شد جا نکزۂ دین ھدا
تا ید ازیں طائفہ زاں گونہ ندا

علم دگر ہرچہ ز معقول سخن
بیشترے ہست بر آئین کہن

وآنچہ طبعی و ریاضیت ہمہ
ہیات مستقبل و ماضیت ہمہ

ہندوستان کے لوگوں کی ایک اور خصوصیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں کے مردوں کو زندہ کیا جاتا ہے اور سانپ کے کاٹے ہوئے مردوں کو چھ مہینے کے بعد یہاں کے لوگ زندہ کر سکتے ہیں یہاں کے جوگی حبس دم کی مشق کر کے سو بلکہ دو سو سال تک زندہ رکھ سکتے ہیں۔ یہاں ایک آدمی کی روح دوسرے میں منتقل کی جا سکتی ہے اور یہاں ابر میں بارش روکی جا سکتی ہے۔

یہاں کے ہندو مرد اور عورت کی وفاداری کے بارے میں کہتے ہیں کہ ہندو اپنی وفاداری میں تلوار اور آگ سے کھیل سکتا ہے اور ہندو عورت اپنے شوہر کی محبت

اور وفاداری میں اس کی چتا میں جل کر بھسم ہو جاتی ہے ایک ہندو مرد اپنے دیوتا اور آقا کے لیئے بھی اپنی جان بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔

غرض خسرو اپنے ملک، اس کے کلچر، اس کی زبان اس کے عوام اور اس کے موسموں کا، بے پناہ محبت سے ذکر کرتے ہیں جس سے ہندوستان کی ثقافت اور تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔

تہذیب کی تشکیل میں اپنے کلام کے علاوہ خسرو نے اور کئی ذریعہ سے حصہ لیا ہے موسیقی کو انھوں نے عام فہم بنایا اور اس میں کئی طرح کے تجربہ کئے۔ ان کے ایجاد کردہ راگ درج ذیل ہیں۔

مجیر: غار اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے

سازگری: پوربی، گورا، گنگلی اور ایک فارسی راگ

ایمن: ہنڈول اور نیریز

عشاق: سارنگ، بسنت اور نوا۔

موافق: توڑی و مالری۔ دوگاہ و حسینی

غنم: پوربی میں تغیر کر دیا ہے۔

زیلف: کھٹ راگ میں شہ ناز کو ملایا ہے

فرغانہ: گنگلی اور گورا۔

سرپردہ: سارنگ، بلاول اور راست کو ترکیب دیا ہے

باخرو: رسیکار میں ایک فارسی راگ ملا دیا ہے۔

فردوست: کانہڑا، گوری، پوربی اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے۔

شیام: کلیات اور ایک فارسی راگ۔

صنم: کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی تہذیب و معاشرت اور علوم و فنون کی نشر و اشاعت نیز تشکیل میں امیر خسرو کا بہت بڑا حصہ ہے۔

سحر سعیدی :-

طوطیٔ شیریں سخن

حضرت امیر خسرو

اُردو زبان کا سب سے پہلا شاعر امیر خسرو کو تسلیم
کیا گیا ہے اور یہ بھی مشہور ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اُردو
میں شعر کہا اور سب سے پہلے اُردو الفاظ ادبی اغراض سے
استعمال کئے۔ اُردو کی سب سے پہلی غزل
"زحالِ مسکیں مکن تغافل"
بھی اُنھیں کے نام سے منسوب ہے اور قطعی مستند ہے۔ اسکی
ترکیب کچھ اس طرح ہے کہ اس کا ایک مصرعہ فارسی اور ایک
اُردو میں
ہے۔ بحر فارسی ہے۔ اس غزل کے بیشتر اشعار ایسے ہیں جن
میں خالص ہندی الفاظ باندھے گئے ہیں ایسے ہندی الفاظ
بھی ہیں جو بمشکل اُردو کہے جا سکتے ہیں۔ غزل ملاحظہ ہو

زحالِ مسکیں مکن تغافل، دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
جو شمع سوزاں، چو ذرّہ حیراں، ہمیشہ گریاں، بعشقِ آں مہ
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف، روزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل بصد فریبم ببرد چشمش قرار و تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے، پیارے پی کو ہماری بتیاں
بحقِ روزِ وصالِ دلبر، کہ داد مارا فریب خسرو
ذرا اے راکھوں ہمیشہ ساجن جو کہنے پاؤں دو بول بتیاں

حضرت امیر خسرو ایک جامع کمالات شخصیت کے حامل تھے
ہندوستان کی تہذیبی اور تمدنی یک جہتی کی تاریخ میں نمایاں
حیثیت رکھتے ہیں۔ جہاں وہ اس دور کی صحیح نمائندگی کرتے
ہیں وہاں ہندوستان کی تاریخ پر اُن کا گہرا اثر نظر آتا ہے
اس ملک کی سرزمین سے اُس کو اسلئے بھی جذباتی لگاؤ تھا
کہ وہ اسی مقدس سرزمین پر پیدا ہوئے تھے اور اسی وجہ سے
ہندوستانیت، معنوی اور ظاہری دونوں لحاظ سے اُن
کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اپنے ہندوستانی ہونے

پر اُن کو فخر و ناز تھا۔ ہندوستانی افکار جو خسروؔ کے کلام میں ہیں وہ کسی اور کے پاس نہیں۔ پچھلے ایک ہزار سال میں ایسا صاحبِ ذوق، ذی کمال و جامع الصّفات ہستی ہمارے ملک کی سرزمین پر پیدا نہیں ہوئی۔ ہم آج جو زبان بولتے ہیں دراصل وہ خسروؔ ہی کی زبان ہے۔ اُن کی ہندی شاعری ہمارے قومی ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہے اور اب تک ہماری زبانوں پر چڑھا اور زندگی میں رچا بسا ہے۔ امیر خسرو فارسی زبان کے نہایت بلند پایہ شاعر ہیں۔ اُنکی فارسی تصانیف دنیا میں انمول سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔ اُن کے کلام کی فصاحت روانی اور خاص کر سوز و گداز جس میں تصوّف کی چاشنی بھی شامل ہے، اپنا جواب نہیں رکھتی۔ انھوں نے اپنے فارسی کلام میں ہندی الفاظ بلا تکلف استعمال کئے ہیں مثلاً ؎

گر مرا شود بڑا و ستارہ شود بڑی
با خوانِ نعمت تو کند کے برابری

وہ تنہا ہندوستانی شاعر ہیں جن کی فارسی شاعری کو نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران و توران میں فارسی ادب کی تاریخ میں ایک اہم مقام دیا جاتا ہے۔ خود اہلِ ایران کی نظر میں اُن کی زبان سعدؔی و حافظؔ کے ہم پلّہ ہے اور خود سعدؔی۔ حافظؔ اور جامؔی اُنکی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ اُن کی ہمہ گیر و ہمہ رنگ شخصیت قوسِ قزح سے بھی زیادہ حسین ہے۔ وہ بحیثیت صاحبِ روحانیت صوفیائے کرام کی صفِ اوّل میں شمار ہوتے ہیں ؎

امیر خسروؔ ۶۵۳ھ مطابق ۱۲۵۳ء میں پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد امیر سیف الدین محمود ترکوں کے لاچین قبیلے کے سردار تھے۔ چنگیزی فتنوں کے زمانے میں یہ اپنے وطن کش (ماوراء النہر) سے ہندوستان آئے اور اتر پردیش کے ایک قدیم قصبہ پٹیالی میں جو گنگا کے کنارے ہے، آباد ہوگئے۔ قصبہ پٹیالی دہلی سے بہت قریب ہے اس وقت شمس الدین التمش دہلی کا بادشاہ تھا۔ اُس نے امیر سیف الدین کو ایک معزز فوجی عہدہ دیا اور یہ اپنی بہتر کارکردگی کی بدولت ترقی پاتے گئے اور اس عروج پر پہونچے کہ اُس زمانے کے بادشاہ گر اور امیر اور رُکنِ سلطنت عماد الملک کی لڑکی سے اُن کی شادی ہوگئی۔

امیر خسروؔ کا پورا نام ابوالحسن یمین الدین تھا۔ خسروؔ تخلص اور امیر اُن کا خطاب تھا۔ اُن کے دو اور بھائی بھی تھے جن کے نام تاریخ میں اسلئے محفوظ ہیں کہ وہ امیر خسروؔ کے بھائی تھے۔ خسروؔ بچپن ہی سے نہایت ذہین اور جدّت پسند واقع ہوئے تھے۔ اُن کے والد نے اُن کی تعلیم کا بہتر سے بہتر انتظام کیا۔ ساتھ ہی سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاؒ دہلوی کا مرید بھی کروا دیا۔

اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور معیاری تربیت نے طبیعت میں جو جوہر تھے اُن کو جلا دی اور آگے چل کر خسروِ شیریں سخن ہوئے جن پر اُن کے ملک ہندوستان ہی کو نہیں بلکہ عام انسانیت کو ناز ہے۔ امیر خسروؔ اپنی والدہ سے ایسی محبت کرتے تھے کہ بچوں کی طرح اُن سے چمٹ کر ملتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ماں کا سینہ بہشت ہے جس میں دو نہریں دودھ کی بہتی ہیں۔ آپکی والدہ نے ۶۹۸ھ میں انتقال کیا۔ باوجود اڑتالیس سال عمر ہونے کے والدہ کو اس طرح یاد کرتے تھے جیسے کوئی دودھ پیتا بچہ ماں کے لئے بلکتا ہے۔

خسروؔ ابھی آٹھ سال کے تھے کہ اُن کے والد کسی لڑائی میں کام آ گئے۔ اس سانحہ نے اُن کے ذہن کو کافی

متاثر کیا اور وہ اپنی والدہ کے ساتھ اُنکے میکے دہلی چلے آئے اور وہاں اُن کے کثرت پان کھانے والے، سانولے سلونے نانا عماد الملک کے پاس رہنے لگے۔ وہ اپنے نانا کے بڑے چہیتے تھے۔ اُنکی تعلیم و تربیت نانا ہی کے زیرنگرانی ہوئی۔ بعض روایات کے بموجب عماد الملک کے یہاں کچھ روز حضرت نظام الدین اولیاؒ کا قیام بھی رہا تھا اور اس طرح خسروؔ کو بچپن ہی سے اس برگزیدہ شخصیت سے استفادہ کا موقع ملا۔ اسی لئے اس شخصیت نے انکو نہ صرف اپنی جانب متوجہ کیا بلکہ اُن پر بے پناہ اثرانداز بھی ہوئی۔ عماد الملک کا گھرانا اُس زمانہ میں ہندوستانی تہذیب و معاشرت کا معیاری نمونہ تھا جس پر خسروؔ نے بجا فخر کیا ہے۔ ایسے مہذب ترین ماحول میں خسروؔ کی پرورش اور تعلیم و تربیت ہوئی۔ اُن کی زبان دہلی کی شائستہ ترین زبان تھی۔

۶۷۳ھ مطابق ۱۲۷۳ء میں عماد الملک نے (۱۱۳) سال کی عمر میں انتقال کیا جبکہ خسروؔ کی عمر بیس سال تھی۔ نانا کے انتقال کے بعد اُنھیں فکرِ معاش دامنگیر ہوئی۔ چونکہ اُن کا معیارِ زندگی بہت بلند تھا اور اس معیار کو برقرار رکھنے کے لئے اُنھیں معقول آمدنی کی ضرورت تھی۔ خسروؔ چونکہ عالم بھی تھے، شاعر بھی، حاضر جواب بھی تھے اور بذلہ سنج بھی، اسلئے اُنھیں ملازمت ملنے میں دقت نہ ہوئی۔ اُس وقت غیاث الدین بلبن دہلی کا بادشاہ تھا جو نہایت خشک مزاج تھا۔ بلبن کا بھتیجہ کشلو خاں عرف ملک چھجو نے جو خسروؔ کا بیحد مداح تھا، اُنھیں اپنا مصاحبِ خاص بنا لیا لیکن یہ سلسلہ دو سال سے زیادہ نہ چل سکا اسکے بعد وہ سلطان بلبن کے چھوٹے لڑکے بغرا خاں کے دربار میں ملازم ہوئے۔ یہ ملازمت بھی تین سال تک رہی۔ اس زمانے میں ایک مہم کے سلسلے میں خسروؔ نے بغرا خاں کے ساتھ مشرقی ہندوستان کی بھی سیر کی۔

خسروؔ کی تیسری ملازمت سلطان غیاث الدین بلبن کے بڑے لڑکے سلطان محمدؔ حاکم ملتان کے دربار میں ہوئی۔ ملتان کے دربار میں خسروؔ کے علاوہ ایک اور مشہور شاعر حسن سنجری دہلوی بھی تھے جو تقریباً امیر خسروؔ کے ہم عصر تھے۔ غزلگوئی میں خصوصاً کمال رکھتے تھے اور اس مناسبت سے انھیں سعدیٔ ہند بھی کہا جاتا تھا۔ بعض کا تو یہ خیال ہے کہ وہ خسروؔ سے بھی بازی لے گئے تھے۔ حسنؔ کو خسروؔ سے بہت عقیدت تھی اور اپنے کلام کے متعلق خسروؔ کی رائے کی بہت قدر کرتے تھے۔ خسروؔ کی یہ ملازمت پانچ سال تک جاری رہی۔ سلطان ہمیشہ خسروؔ کو اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا۔ چنانچہ ۶۸۳ھ مطابق ۱۲۸۵ء میں جب سلطان محمدؔ مغلوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تو خسروؔ بھی اُس کے ہمراہ تھے۔ مغلوں نے دوسرے قیدیوں کے ساتھ خسروؔ کو بھی گرفتار کر لیا لیکن خوش قسمتی سے اُنھیں بھاگنے کا موقع مل گیا اور وہ جنگلوں کے راستے کی مصیبتیں جھیلتے ہوئے دہلی واپس آئے۔ خسروؔ نے چوتھی ملازمت خان امیر علی حاکم اودھ کے دربار میں کی اور دو سال کے بعد اپنی والدہ کے حکم سے یہ ملازمت بھی ترک کر دی اور دہلی واپس آ گئے۔ اس وقت بغرا خاں کے لڑکے معز الدین کیقباد کی بادشاہت تھی۔ خسروؔ اُسکے درباری شاعر رہے یہ اُنکی پانچویں ملازمت تھی۔ کیقباد نے خسروؔ کو "ملک الشعرا" کا خطاب دیا۔ اسکے بعد سلطان جلال الدین خلجی کے درباری شاعر بنے۔ جلال الدین خلجی خود شاعر بھی تھا۔ اور اہلِ علم کا قدردان بھی۔ کیقباد کے زمانے سے وہ امیر خسروؔ کی ذہانت

کا مدّاح تھا اُس نے خسروؔ کو "ملک الشعرا" کے ساتھ امیر کا خطاب بھی دیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ پیدائشی امیر تھے۔ اُن کی یہ چھٹی ملازمت تقریباً چھ سال تک رہی۔ ساتویں ملازمت سلطان علاؤالدین خلجی کے دربار کی تھی۔ جو بیس سال (۶۹۵ھ سے ۷۱۵ھ) تک رہی۔ سلطان کے ساتھ مہموں پر جا کر خسروؔ نے جنوبی ہند اور دوسرے مقامات بھی دیکھے۔ اُن کی آٹھویں ملازمت سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے دربار میں ہوئی اور چھ سال تک جاری رہی۔ نویں ملازمت غازی محمد تغلق کے دربار میں تھی اور دو برس رہی۔ دسویں ملازمت ۷۲۳ھ / ۱۳۲۳ء میں محمد تغلق کے دربار میں ہوئی۔ اس طرح امیر خسروؔ نے سلطان غیاث الدین بلبن (خاندان غلامان) سے سلطان محمد تغلق تک گیارہ سلاطینِ دہلی کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کے درباری شاعر اور مصاحب خاص رہے۔ انھوں نے اپنی ہر ملازمت میں احترام و عزت پائی اور انعام و اکرام سے سرفراز ہوئے۔ شاہ بلبن آپ کے کلام کا بیحد دلدادہ اور قدردان تھا۔

حضرت امیر خسروؔ دہلوی اُردو کے سب سے پہلے شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ موجد اور مخترع بھی تھے۔ وہ پیدائش ہی سے علمی و ادبی ذوق لیکر آئے تھے۔ فارسی، عربی، ترکی، اور سنسکرت کے بہت بڑے عالم اور شاعر تھے۔ ہندی شاعری میں بھی اُن کا جواب نہیں۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں بحیثیت شاعر دہلی کی ادبی محفلوں میں چھا گئے۔ اُنکی خوش کلامی کے ساتھ خوش الحانی کی بھی دھوم مچی ہوئی تھی۔ جس محفل میں کلام سناتے اہلِ محفل سر دھنتے اور محفل میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی۔ غزل نہایت شیریں کہتے تھے ؎

خسروِ سرمست اندر ساغرِ معنی بریخت
شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

اپنی شاعری ہی کی مناسبت سے وہ "طوطیٔ ہند" کے لقب سے مشہورِ زمانہ ہوئے۔ حافظ شیرازی نے پہلی بار "طوطیانِ ہند" لکھ کر امیر خسروؔ کے لئے یہ لقب مخصوص کر دیا۔ چنانچہ ملّا شہاب یغمائی نے اُن کی تاریخ وفات بھی اِسی لفظ سے تلامذے سے نکالی اور کندہ کرا دی ؎

شد "عدیم المثل" یک تاریخ او
۷۲۵ھ
دیگرے شد "طوطیٔ شکّر مقال"
۷۲۵ھ

امیر خسروؔ کے زمانے تک اُردو میں پختگی نہیں آئی تھی لیکن روانی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ آئندہ ترقیوں کی داغ بیل اسی زمانے میں پڑ گئی تھی۔ سادگی و پرکاری، بیخودی و ہوشیاری، خسروؔ کے کلام کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے فارسی بحور اُردو میں استعمال کیں۔ امیر خسروؔ کی فارسی شاعری کا جو احترام اور وقار ہے ان کی ہندی شاعری اس سے کسی طرح کم نہیں۔ انھوں نے غنائیہ شاعری میں بڑی وسعت پیدا کی۔ ٹھیٹھ ہندی الفاظ سنسکرت بحور میں باندھے اُنکے دوہے، دوسخنے، چٹکلے، انملیاں، کہہ مکرنیاں اور گیت اتنے مقبول ہوئے کہ ہر شخص اُن کو شوق سے پڑھتا، سنتا اور بولتا ہے۔ اُن کی مادری زبان ہندوی تھی جس پر انھیں فخر تھا ؎

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم چو آب
شکّرِ مصری ندارم کز عرب گویم سخن

یہ ہندوی دہلی کی وہی کھڑی بولی ہے جو اس وقت خاص

طور پر دہلی کے مسلمان اور عام طور پر دہلی والے بولتے تھے جس کو آج اردو، ہندی یا ہندوستانی کہا جاتا ہے۔ یہ زبان انھیں فارسی سے زیادہ عزیز تھی۔ خسروؔ اس وقت کی پنجابی، سندھی اور اس کے علاوہ ہندوستان کی کئی صوبائی زبانوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور ان میں شعر بھی کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے تمام مروجہ علوم و فنون پر قدرت حاصل کر لی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سو کے قریب کتابوں کے مصنف تھے۔ اپنی ہر تصنیف میں کچھ نہ کچھ مرشد کی تعریف ضرور کی ہے۔

امیر خسروؔ ان خوش قسمت لوگوں میں تھے جو حضرت نظام الدینؒ سے روحانی فیض یاب ہوئے۔ خسروؔ کے اپنے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۶۷۱ھ میں باقاعدہ مرید ہوئے۔ مرشد سے امیر خسروؔ کی عقیدت عشق کے درجہ تک پہونچ گئی تھی سے

آں دم کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بہ یک نگاہے

اسی محبت کے باعث ہر وقت ساتھ رہا کرتے تھے۔ امیر خسروؔ پر پیر و مرشد کی تربیت کا ایسا اثر تھا کہ برسوں صائم الدہر رہے۔ اور عشق الٰہی کی ایسی سوزش تھی کہ سینے پر دل کے پاس سے کپڑا ایسا ہو جاتا تھا گویا جل گیا ہو۔ خسروؔ کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا تھا وہ خسروؔ کے ہر شعبۂ حیات پر چھائے ہوئے تھے۔ اُن کے مرشد اُن کے سوزِ قلب کی قسم کھایا کرتے تھے اور اُن سے اس درجہ محبت رکھتے تھے کہ اُن کا قول تھا "قیامت میں اگر خدا مجھ سے پوچھے کہ تو دنیا سے میرے لئے کیا ہدیہ لایا ہے تو میں خسروؔ کو پیش کر دوں گا۔" جب وہ دعا مانگتے تو خسروؔ کی طرف اشارہ کر کے فرماتے "الٰہی بسوزِ سینۂ ایں ترک مرا بہ بخش۔"

ادھر امیر خسروؔ اپنے مرشد کے اس درجہ عقیدت مند تھے کہ انھوں نے ایک لاکھ سکۂ رائج الوقت دے کر اپنے مرشد کے نعلین خرید لئے تھے جس پر حضرت نے فرمایا کہ خسروؔ نے میرے نعلین بہت سستے داموں خرید لئے۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے امیر خسروؔ کو ترک اللہ کا خطاب دیا تھا اور اسی لقب سے پکارا کرتے تھے۔

امیر خسروؔ کے کلام میں جو شیرینی پائی جاتی ہے وہ اُن کے مرشد کے فیض و مودت کا اثر تھا۔ "جس[1] وقت امیر خسروؔ نے اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی نظم جو انھوں نے خواجہ صاحب کی مدح میں لکھی تھی، سنائی تو آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ کیا صلہ چاہتا ہے خسروؔ نے عرض کیا دعا فرمایئے کہ میرے کلام میں شیرینی پیدا ہو جائے۔ فرمایا کہ ہماری چارپائی کے نیچے شکر رکھی ہے اس کو لا کر اپنے سر پر سے نثار کر اور تھوڑی سی اس میں سے کھالے۔ امیر خسروؔ نے ایسا ہی کیا اور شیرینیٔ کلام کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ بعد میں افسوس کیا کہ میں نے اس سے بہتر چیز کی دعا کے واسطے کیوں نہ خواہش کی۔"

نفحات الانس میں مولانا جامیؒ نے لکھا ہے کہ ایک دن حضرت نظام الدین اولیاء کے اشارے سے امیر خسروؔ نے خواجہ خضرؑ سے لعابِ دہن کی خواہش کی۔ حضرت خضرؑ نے فرمایا یہ دولت تو شیخ سعدیؒ کی قسمت میں تھی جو اُن کو مل گئی۔ امیر خسروؔ نہایت شکستہ دل ہو کر اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام حال بیان کیا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے اپنا لعابِ دہن اُن کے منہ پر ڈالا۔ اسی کی برکت تھی۔ جو خسروؔ کے کلام میں اس قدر شیرینی پائی جاتی ہے۔ اور اُن کی علمی قابلیت کا دنیا کو

---

[1] "حیات امیر خسرو" ص ۹۹

اعتراف ہے۔ یہ حضرت نظام الدین اولیاء ہی کا فیض تھا کہ امیر خسرو باوجود شاہی اعزاز و منصب کے جو اُن کو حاصل تھے، آخرت کو دنیا پر ترجیح دے کر اس درجہ پر پہونچ گئے تھے کہ جس کی بابت وہ خود فرماتے ہیں ؎

خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمد شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم

حضرت امیر خسرو کی خوش الحانی اور شیریں سخنی نے اُن کے ہمعصر بزرگ شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر سے بھی دادِ تحسین حاصل کی تھی۔ ایک مرتبہ امیر خسرو کی غزل سُن کر شاہ صاحب ایسے خوش ہوئے کہ انھوں نے خسرو کی تعریف کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھے:۔

ونیم خسرواں ہر ہے فیل دشتر است
خسروکے کہ حلقۂ تجدید برسر است
عقل کل است علم الدنی تبار خان
ایں عقل وعلم جسم ورسم ہم محقر است

اشعار سن کر امیر خسرو پر رقت طاری ہوگئی اور آبدیدہ ہوگئے شاہ صاحب نے فرمایا خسرو کچھ سمجھا بھی؟ خسرو نے کہا اسی لئے تو روتا ہوں کہ کچھ نہیں سمجھا۔

خواجہ نظام الدین اولیاء کو امیر خسرو سے اس درجہ محبت تھی کہ آپ نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ خسرو میرے مزار کے قریب نہ آنے پائیں ورنہ بیتاب ہوکر میرا جسم باہر آجائے گا چنانچہ امیر خسرو مرشد کے مزار سے دور ہی بیٹھے رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آج بھی یہ دستور ہے کہ زائرین پہلے حضرت امیر خسرو کے مزار پر فاتحہ پڑھتے ہیں اسکے بعد خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر جاتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی محبت کا یہ بھی عالم تھا کہ آپ نے ایکمرتبہ فرمایا تھا کہ اگر شریعت میں اجازت ہوتی تو میں یہ وصیت کرتا کہ امیر خسرو کو میری قبر میں دفن کیا جائے۔ اسکے بعد یہ وصیت فرمائی تھی کہ خسرو کی قبر میرے پہلو میں ہونی چاہیئے۔

بالآخر ۱۷ ربیع الثانی ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء کو شام کے وقت سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ آپکی عمر اُس وقت (۹۰) سال تھی۔ خسرو اس وقت بنگال میں تھے یکایک مرشد کی یاد نے آپ کو بے چین کردیا اور آپ نے دہلی کا رخ کیا۔ دہلی پہونچ کر جب آپ کو مرشد کے وصال کا علم ہوا تو آپ نے سر کو ٹکرا کر چیخ ماری اور کہا کہ "سبحان اللہ آفتاب درزمیں و خسرو زندہ" یہ کہہ کر کپڑے پھاڑ ڈالے اور مرشد کی قبر پر جاکر خوب روئے۔ خاک پر لوٹے اور بیہوش ہوگئے۔ اپنا سب کچھ راہِ خدا میں لٹا دیا۔ اور تارک الدنیا ہوکر مرشد کی قبر پر جاروب کشی کرنے لگے۔ انھوں نے مرشد کی قبر دیکھ کر یہ دوہا کہا تھا ؎

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چودیس

آج بھی نظام الدین اولیاءؒ کے عرس کی رسومات کا آغاز اسی ہندی دوہے سے ہوتا ہے۔ مرشد کے فراق کے صدمہ میں اُن کے چھ ماہ بعد بعہد شاہ بلبن شہر دہلی میں جمنا کے کنارے ۱۸ رشوال ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء میں حضرت امیر خسرو بھی راہی ملک عدم ہوئے۔ اُن کا مزار خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی پائینتی بنایا گیا۔ بابر کے عہد میں مہدی خواجہ نامی ایک امیر جو بابر کا داماد بھی تھا، اُس نے خسرو کی مزار پر جالی دار دیواریں پتھر کی بنوائیں جو اب تک موجود ہیں اور بابر نے اشعار تاریخ کندہ کرائے۔ عہد جہانگیر میں طاہر بیگ نامی کسی امیر نے اُس پر عمارت وگنبد سنگ مرمر کا بنوایا۔

امیر خسروؔ کی شخصیت جہاں گوناگوں اوصاف کی حامل تھی وہاں اُن کو فنِ موسیقی میں بھی غیر معمولی کمال حاصل تھا۔ ماہرِ موسیقی کی حیثیت سے اپنی زندگی ہی میں بیحد مقبول ہوئے اور اسی وجہ سے اُن کو نائک کا خطاب بھی دیا گیا تھا جو اس زمانہ میں اس فن کا سب سے بڑا خطاب سمجھا جاتا تھا جس کسی نائک سے آپ کا مقابلہ ہوتا غالب رہتے۔ آپ اکثر اپنے مرشد کو بموجب طریق چشتیہ گا بجا کر خوش کیا کرتے تھے۔ سلطان علاء الدین شاہِ دہلی کے زمانے میں جب نائک گوپال نے دربار شاہی میں آکر اپنا جوہرِ موسیقی دکھایا اور تمام درباری گویّوں پر فوقیت حاصل کر لی تو بادشاہ کا فرمان ہوا کہ جو کوئی اس کا مقابلہ کرکے کامیاب رہے گا اس کو معقول انعام دیا جائے گا۔ حضرت امیر خسروؔ نے ایک چیز ترانہ میں سُنائی جس کو گوپال سُن کر متحیر ہوا اور تعریف کی۔ حاضرین دربار بھی بہت مسرور ہوئے۔

امیر خسروؔ بہت بڑے صوفی اور محبِّ وطن تھے۔ صرف حبِ وطن اور قومی یکجہتی کی خاطر انھوں نے پہلی دفعہ ہندوستانی اور ایرانی موسیقی کو ملا کر ایک ایسا کارنامہ انجام دیا کہ سات سو سال گذر جانے کے باوجود آج بھی اُن کی ہستی تمام اقوام کے لئے صد احترام ہے۔ آپ نہایت ہی صاحبِ جمال و باکمال تھے۔ عام خیال ہے کہ اُنھوں نے اس سلسلے میں چوبیس راگ راگنیاں ایجاد کیں۔ بہار کے موسم میں بسنت کا میلہ جو دہلی میں ہوتا ہے وہ بھی درحقیقت اُنھیں سے نکلا ہے۔ قوّالی بھی امیر خسروؒ ہی کی اختراع ہے۔ امیر خسروؔ کے ایجاد کردہ راگوں میں صنم، غزل، قوال، ترانہ، نقش و نگار، خیال، دھرپد، ایمن، عشّاق، موافق، زلیف، فرغانہ، سرپردہ، باخرز، صنم، زنگولہ اور غارا مشہور ترین راگ ہیں۔

خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی شان میں خسروؔ نے جو نظم کہی تھی ایسی مقبول ہوئی کہ آج بھی قوّال ان کی مزار پر یہ نظم گاتے ہیں اِس گانے کو رنگ کہتے ہیں جس کے ابتدائی بول ہیں ؎

آج رنگ ہے اے ماں رنگ ہے
اپنیو پیر پایو نجام الدین اولیاؒ

امیر خسروؔ کے زمانے میں ہندوستانی موسیقی پربندھ، چھند وضع کے گانوں تک محدود تھی جو سنسکرت اور برج بھاشا میں گائے جاتے تھے۔ امیر خسروؔ نے سب سے پہلے عجمی موسیقی کے انداز پر ترانہ، قول، نقش و نگار گُل گانے ایجاد کئے۔ اسلام نے موسیقی کو حرام قرار دیا ہے۔ اسکے باوجود ہر زمانے میں صوفیوں کا ایک گروہ ایسا بھی رہا جو تصوّفانہ غزلیں گا کر رُوحانی سُرور حاصل کیا کرتا ہے۔ شمس الدین التمش کے دربار میں موسیقی کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ اُن کا بڑا بیٹا فیروز شاہ بھی موسیقی کا بڑا دلدادہ تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے ایک ہی سال میں اپنی سلطنت اس شوق پر قربان کر دی۔ شاہ بلبن کے دَور میں بھی موسیقی مقبول رہی۔ یہی زمانہ امیر خسروؔ کا زمانہ تھا۔ اسکے پچاس برس بعد ۶۸۶ھ میں جبکہ معز الدین کیقباد تخت نشین ہوا، موسیقی اپنے پورے عروج پر تھی اور تمام ہندوستان سے گانے والے اور گانے والیاں سمٹ کر دہلی میں جمع ہوگئی تھیں علاء الدین خلجی کے زمانے میں بھی موسیقی کا کچھ سلسلہ جاری رہا۔ الغرض اُس زمانے میں دکن اور خصوصاً دولت آباد فنِ موسیقی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جس زمانے میں ملک کافور نے تسخیر دکن کے لئے کوچ کیا تو خسروؔ بھی اُسکے ساتھ دکن آئے اور دیوگیر شہر (موجودہ دولت آباد) کو بچشم خود دیکھا۔ بقول خسروؔ "یہ شہر اپنی تازگی اور لطافت میں قصرِ شدّاد سے بھی بازی لے گیا تھا۔ یہاں تک کہ مصر نے اسکی شہرت سُن کر اپنا جامہ اُتار کر

دریائے نیل میں ڈالدیا تھا اور بغداد دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اس کی ہوا جنت کی تھی جس کی خوشبو سے تمام پھول معطر ہوتے تھے۔ ہر بازار ایک باغ معلوم ہوتا تھا۔ ہر قسم کے تھان کے تھان جو ہندوستان میں بہار سے لیکر خراسان تک کہیں نہ مل سکتے تھے، ان دوکانوں میں موجود تھے۔" امیر خسروؒ نے یہاں کے پھولوں اور پھلوں کی بھی خوب تعریف کی ہے اور یہاں کی موسیقی کی تعریف میں تو یہاں تک کہدیا تھا کہ "یہاں کے نغمہ سے مردہ بھی زندہ ہوسکتے تھے۔"

امیر خسروؒ نے بحر، اوزان اور تال سم کے قواعد مقرر کئے۔ ہندی تالوں میں ساڑھے بارہ تالیں بتلائی جاتی تھیں لیکن امیر خسروؒ نے چوبیس بحروں میں تالیں ایجاد کیں۔ اُنکی ایجادات میں ایک ایجاد جو عام طور پر مشہور ہے وہ یہ کہ انھوں نے پکھاوج کی بجائے ڈھولک اور طبلہ ایجاد کیا اور اُن کے بجانے کے قواعد مقرر کرکے سترہ تالیں قایم کیں جنمیں فارسی کے قواعد کو بھی ملحوظ رکھا۔ امیر خسروؒ نے ترانہ بزبان فارسی ایجاد کیا۔ اُنھوں نے بین کی بجائے ستار ایجاد کیا۔ ستار کا اصلی نام سہ تار اور سرود کا سہ رود ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ ان دونوں سازوں میں پہلے صرف تین تار تھے اور تین تانت تھے۔ امیر خسروؒ نے اس میں ایک آہنی تار اور دو برنجی لگاکر نصف تونبہ سے بین کی مشابہ بنا دیا۔ اُن کے دلمیں درد، سوز اور گداز حد درجہ تھا جو اُن کی شاعری اور موسیقی دونوں میں یکساں طور پر نظر آتا ہے۔ ستار پر اُن کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست
از کجا می آید ایں آواز دوست

امیر خسروؒ کا تعلق چونکہ شاہی دربار سے تھا اسلئے ایرانی طرز کی موسیقی سے بخوبی واقف تھے لیکن وہ ہندوستانی موسیقی سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔ اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں لکھتے ہیں۔ "ہندوستانی موسیقی ایک آگ ہے جو قلب اور رُوح دونوں کو جلاتی ہے اور دوسرے تمام ممالک سے بہتر ہے۔" وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ "ہندوستانی موسیقی نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں کو بھی مسحور کر دیتی ہے۔"

کہتے ہیں نابغہ کی یہی پہچان ہے کہ لوگ اُسے پوری طرح سمجھے بغیر اُس کا لوہا مانیں۔ حضرت امیر خسروؒ کی شخصیت ایسی ہی پہلودار اور ہمہ جہت ہے جس کی مقبولیت کا راز اب تک کوئی بھی پوری طرح سمجھ نہیں پایا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ بیک وقت شاعر بھی تھے، سپاہی بھی، دنیادار بھی تھے اور ولی کامل بھی، ادیب بھی تھے اور عالم بھی، عاشق بھی تھے اور ماہر موسیقی بھی، مورخ بھی تھے اور صوفی بھی۔ شائد اسی لئے اُنھیں ہندوستان کا پہلا نابغہ[1] (GENIUS) قرار دیا گیا ہے۔

امیر خسروؒ کی تصانیف ہمارے تاریخی ورثہ کا بہترین سرمایہ ہیں اور ہماری تہذیب کی بہترین آئینہ دار ہیں۔ اُنکی شخصیت ہمارے لئے ہر طرح قابل فخر و قابلِ صد احترام ہے۔ اُن کا نام آج بھی آفتاب کی طرح روشن ہے۔ ایک مورخ کی حیثیت سے انھوں نے اپنی تصانیف میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تفسیر و تعبیر بیان کی ہے۔ ہندوستانی تہذیب و معاشرہ کے ایسے نمونے پیش کئے ہیں جن سے اُن کی ذہنی اُفق کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ہندوستان کے ہر گوشے میں پہونچے

---

[1] ہندوستان میں اب تک تین شخصیتیں ایسی گذری ہیں جن کو نابغہ قرار دیا گیا ہے۔ پہلے امیر خسرو دوسرے ابوالفضل (وزیر اعظم اکبر بادشاہ) اور تیسرے مولانا ابوالکلام آزاد۔

یہاں کے پہاڑ، دریا، صحرا، موسم، پھل، پھول، جانور، زبانیں اور رسم و رواج ہر چیز کا بغور مشاہدہ کیا۔ انسانی زندگی کا اس قدر وسیع تجزیہ جو اُن کی تصانیف میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے، شاید ہی آج تک کسی نے کیا ہو۔

امیر خسرو کا تاریخی نقطۂ نظر صرف دربار تک ہی محدود نہیں تھا۔ عوام کی زندگی بھی اُن کی دلچسپیوں کا مرکز رہی۔ یہ صحیح ہے کہ اُنھوں نے بیشتر کتابیں سلاطین کی تعریف و توصیف میں لکھیں لیکن ساتھ ہی عوامی زندگی کی تصویر کشی بھی اُن کی فکر و احساسات کی آئینہ دار رہے۔ اُن کی ہر تصنیف ایک علٰحدہ ذہنی اور جذباتی کیفیت کا نتیجہ ہے تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر امیر خسرو کی تصانیف کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) پانچ دیوان ہیں جن کی بنیادی نوعیت ادبی ہے۔

۱۔ تحفۃ الصغر ۲۔ وسط الحیوٰۃ ۔
۳۔ غرّۃ الکمال ۴۔ بقیہ نقیہ
۵۔ نہایت الکمال۔

(۲) خمسہ جن میں جگہ جگہ ہندوستانی تہذیب و معاشرت سے متعلق بہت ہی دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

(۳) مثنویاں جن کا موضوع تاریخی ہے اور اس زمانے کے مختلف سیاسی، تہذیبی، و تمدنی تاریخ کا نہایت اہم اور قابلِ قدر ذخیرہ ہے۔

۱۔ قرآن السعدین ۲۔ مفتاح الفتوح
۳۔ تغلق نامہ ۴۔ خزائن الفتوح
۵۔ نُہ سپہر وغیرہ

(۴) "اعجازِ خسروی" نثر میں ایسی ضخیم کتاب لکھی کہ ٫ باشمی ہے۔ اس کتاب کو اُنھوں نے (۷۰) سال کی عمر میں مکمل کیا تھا۔ اس میں زبان و محاورہ اور ادب و بلاغت کے جو لطائف و نوادر پیدا کئے ہیں۔ وہ خاص پڑھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں اس دَور کے علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی تاریخ کا بھی مختلف زاویوں سے جائزہ لیا گیا ہے۔

(۵) "خالق باری" یہ خسرو کا تعلیم لغات کا سب سے عظیم کارنامہ ہے۔ یہ کتاب اُن کی مقبول ترین تصنیف ہے جس کے مطلع کے ابتدائی الفاظ ہی دو لفظ "خالق" اور "باری" ہیں اب تک یہ ایک درسی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ ترویج زبان میں جو کام اس کتاب نے کیا ہے اس کا جواب نہیں ملتا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اُردو کا سب سے قدیم اور پہلا لغت ہے۔

امیر خسرو کی زندگی ہمیشہ فقیرانہ رہی۔ باوجود "امیر" خطاب پانے کے وہ عوام کے آدمی تھے۔ وہ اپنے ملک ہندوستان سے بے انتہا محبت رکھتے تھے۔ اپنی مشہور مثنوی "نُہ سپہر" جو اُنھوں نے (۶۵) برس کی عمر میں قطب الدین مبارک شاہ کے نام پر لکھی ہے اس میں نو باب ہیں اور ہر باب جُداگانہ بحر میں ہے۔ اسی مناسبت سے اُنھوں نے اس کا نام "نُہ سپہر" رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مثنوی پر مبارک شاہ نے خسرو کو ہاتھی کے ہم وزن سونا دیا تھا۔ اس مثنوی میں "کشورِ ہند" سے متعلق ایک باب ہندوستان کی تعریف میں ہے اس میں اُنھوں نے دس اہم وجوہات بیان کیں جن کی بنا پر ہندوستان دنیا کے سارے ملکوں سے برتر و بہتر ہے۔ خسرو سچے وطن پرست اور ہندوستان کے عاشق تھے۔ افسوس کہ اُن کی ہندی شاعری جس میں تقریباً تین لاکھ اشعار تھے، کسی کتاب میں محفوظ نہیں رہی۔ فارسی شاعری اور دوسری تصانیف میں سے بھی صرف بیس اکیس کتابیں مختلف ملکی و غیر ملکی کتب خانوں میں باقی رہ گئی ہیں جو نایاب ہیں۔ یہی حال اُن کی موسیقارانہ ایجادات

واختراعات کا ہوا۔ خود خسروؔ کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے موسیقی کے تین دفتر لکھے تھے جو تلف ہوگئے۔

امیر خسروؔ کو اردو زبان کا باوا آدم کہا جاتا ہے اُن کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ وہ اُن جذبات و انفرادی تاثرات کو پیش کرتے ہیں جن میں حُسن "خوشبو" دل آویزی، نغمہ، سوز اور گداز سبھی کچھ موجود ہوتا ہے۔ لفظی و معنوی خوبیوں کی بنا پر خسروؔ کی غزلوں کی جلد شہرت ہوگئی تھی۔ خود خسروؔ غزل گوئی کو کوئی خاص اہمیت نہ دیتے تھے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج خسروؔ کی عام شہرت کا دار و مدار زیادہ تر اُن کی غزلوں ہی کی وجہ سے ہے اور اہلِ دل آج بھی اُن کا کلام سُن کر اس طرح سر دُھنتے ہیں جیسے کہ اُن کے زمانے میں۔ غزل میں امیر خسروؔ نے اپنے لئے ایک نیا مسلک، ایک انوکھی روش اور ایک جدید اسلوب اختیار کیا جس کی کچھ جھلک حافظؔ میں بھی موجود ہے اور جس کا عکس خسروؔ کے بعد کے شعراء جامیؔ، نظیریؔ اور غالبؔ کی غزلوں میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

امیر خسروؔ کا کلام عام طور پر محفلِ سماع میں رنگ جماتا ہے اور دلوں میں جوش و جذبہ پیدا کرتا ہے۔ تاریخوں میں اس قسم کے واقعات بھی ملتے ہیں کہ محفل میں خسروؔ کا کلام سُن کر جوش و جذبہ کی تاب نہ لاکر بعض نے تو جان سے ہاتھ دھو لیا۔ جہانگیر کے "تزک جہانگیری" میں لکھا ہے کہ اس کے عہد میں ایک مشہور مُہر کن ملّا علی احمد نے قوال سے خسروؔ کی غزل کا یہ شعر سُنا اور جان پرواز کر گئی ؎

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم برطرف کج کلاہے

نذرِ خسروؔ

گوپی ناتھ امنؔ

کوئی پیتا مے ریا جامۂ احرام میں آئے
محمدؐ کی گلی یا کوچۂ گھنشیام میں آئے
خدا شاہد ہے سر جھکتا ہے اہلِ دل کے قدموں پر
مئے صافی سے مطلب ہے کسی بھی جام میں آئے

نیاز آگیں جبیں لے کر جو بزمِ ناز میں آئے
نہ کیوں پھر وہ شمارِ اہلِ سوز و ساز میں آئے
تصوّف کی نگاہیں تو اُسے پہچان ہی لیں گی
کسی بھی بھیس میں آئے کسی انداز میں آئے

مبارک اس کا جینا جو تری سرکار میں آئے
صفائے قلب لیکر صدق سے دربار میں آئے
نگاہِ اہلِ عالم میں جو عزّت ہو تو کیا عزّت
وہ قسمت کا دھنی ہے جو نگاہِ یار میں آئے

مقام اُن کا بھی اونچا ہے جو تیری راہ میں آئے
و اُن کی بات ہی کیا جو تری درگاہ میں آئے
عبادت اور سجدوں کی بھی عزّت دل میں ہے لیکن
عبادت وہ عبادت ہے مزہ جب آہ میں آئے

طوطئ ہند اور ترانۂ ہند

خسرو کی شعری تخلیق ہو کہ نثری تصنیف جہاں بھی نگاہ ڈالئے ہند کی خوشبو ملے گی مگر ہم یہاں صرف ان خاص منظومات کی نشاندہی کریں گے جہاں جہاں امیر نے ٹھہر ٹھہر کے ہند کی نغمہ سرائی کی ہے اور عموماً پڑھے ہیں۔ خسرو پر آئندہ کام کرنے والوں کے لئے بھی یہ جدول کارآمد ہوگی اور خسرو کے چاہنے والوں کے لئے مسرت انگیز یادداشت بھی۔ (ادارہ قومی راج)

۱۔ نہ سپہر ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء بعمر ۶۴ سال

(الف) مجمل۔ سپہر اول: دیوگیری کی بغاوت اور بادشاہ کی لشکر کشی

سپہر دوم:۔ عمارات دہلی، جنگ تلنگانہ و ورنگل عظمت دہلی۔

سپہر سوم:۔ وصف ہند، فضیلت ہند بر اقالیم عالم، ہند کے جنت ہونے کی دلیل، پھول، پرندے، جانور، علوم مذہبی، ہند کی زبانیں، سنسکرت کی برتری، واقعہ شکست ہرپال۔

سپہر پنجم: ہندوستان کے جاڑے کی تعریف

سپہر ہفتم: موسم بہار، نوروز، موسیقی ہند و رقاصہ۔

سپہر ہشتم: بازی و چوگان

سپہر نہم: عظمت شعرائے ہند۔

(ب) مفصل (مرتبہ ڈاکٹر وحید مرزا):

ہندوستان	ص ۱۴۸ - ۱۴۹
حب الہند	ص ۱۴۸ - ۱۴۹
کشور ہند است بہ زمیں	ص ۱۵۱ - ۱۵۷
خوبی آب و ہوا	ص ۱۵۸ - ۱۶۱
علوم ہند	ص ۱۶۱ - ۱۶۳
تصویر وحدانیت ہنود	ص ۱۶۴
حقیقت ہندوان دیگراں	ص ۱۶۴ - ۱۶۶
اسباب فضیلت ہند	ص ۱۶۶ - ۱۷۲
رباہائے ہند	ص ۱۷۸ - ۱۸۱
سنسکرت برتر ز دری	ص ۱۸۱

جانوران و مرغہائے ہند:۔

(۱) طوطی (۲) شارک (مینا) (۳) زاغ (۴) کنجشک۔

(۵) مرغ پرا زرمز ہنر (۶) طاؤس (مور)۔ (۷) طرنگی طاؤس۔

۸۔ بگلہ ۹۔ مرغک سقا۔ ۱۰۔ دیگر ص ۱۸۱ - ۱۹۱

فسوں گری ہند	ص ۱۹۱ - ۱۹۴
جذبہ وفا زنان و مردان ہند	ص ۱۹۴
تلقین اوصاف حکمران ہند	ص ۱۹۵
تلقین اوصاف لشکریان ہند	ص ۲۵۶
تلقین اوصاف باشندگان ہند	ص ۶۵ - ۲۶۳

دیوگیر ص ۵۰ - ۵۱

میوہ ہائے دیوگیر نہایۃ الکمال ص ۵۱ - ۵۲

دیوگیر کی تعریف اور اس کے کپڑوں کی تعریف نہایۃ الکمال

موسیقی "

سیف ہندی وغیرہ تغلق نامہ

قران السعدین

۶۸۸ھ ۱۲۸۹ء بعمر ۳۵ سال (مطبوعہ علی گڑھ)

برائے سلطان معز الدین کیقباد

ذکر حضرت دہلی ص ۲۸ - ۲۹ قلعہ و حصار دہلی ص ۲۹

بعہد جلال الدین فیروز خلجی

علاء الدین محمد خلجی

ڈاکٹر خلیل اللہ خاں
لکچرر گورنمنٹ پالی ٹکنیک لکھنؤ

امیر خسرو کی رنگا رنگ شخصیت

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چہوں دیس

امیر خسرو۔ ایک زبردست شاعر۔ ایک بلند مرتبہ نثر نگار۔ ایک عظیم الشان صوفی۔ ایک ہردلعزیز درباری۔ ایک بڑے موسیقی داں۔ عظیم مفکر۔ سبک ہندی کے نقاش اول۔ فارسی نظم و نثر کے ایک اسکول کے بانی۔ ایک وطن پرست ہندوستانی۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ۔ صاحب سیف و قلم اور ہمارے آسمانِ ادب کے روشن و تابناک ستارے ہیں۔

● آج دنیا کو زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے خسرو کے حیات بخش پیام کی ضرورت ہے۔ خسرو نے عالمِ انسانیت کو رواداری۔ مساوات۔ تہذیبی ہم آہنگی۔ اور بھائی چارے کا پیغام دیا۔ ان کی تصانیف میں علم و دانش اور ادبی شاہکاروں کے خزانے ہیں۔

مادرِ ہند کے قابلِ فخر و مایۂ ناز فرزند۔ امیر الشعراء

ابوالحسن یمین الدین خسرو بہ معروف بہ امیر خسرو تیرھویں صدی ۱۲۵۳ء میں مقام موہن پور پٹیالی (جواب خسرو نگر ہوگیا ہے) ضلع ایٹہ (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیف الدین ترکوں کے لاچین قبیلے سے تھے۔ اور چنگیز خاں کی درندگی سے دل برداشتہ ہوکر چلے آئے تھے۔ کم عمری ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اور نانا نے پرورش کی۔ خسرو کو بچپن ہی سے کچھ ایسی تعلیم ملی کہ وہ بہترین طالب علم ہوگئے اور کم عمری ہی میں شعر کہنے لگے۔

خسرو نے گیارہ سلاطین کا زمانہ دیکھا۔ لیکن ان کی عملی قابلیت، دانشمندی و ذہانت، اور سب سے بڑھ کر ان کی پارسائی و پاکیزگی تھی کہ ہر سلطان نے انھیں عزت و احترام کے قابل سمجھا۔ وہ سیاست سے بالکل دور تھے۔ انکی ذات میں سپہ گری اور شاعری کا ایک انوکھا امتزاج ہے۔ وہ بے لوث انسان، یکتائے روزگار، روحانیت کے علمبردار تھے۔ ان کی ہمہ گیر اور دلکش شخصیت نے ایک عالم کو شیدائی بنا لیا تھا۔ امیر

غریب، شاہ وگدا، رند و پارسا، ہندو مسلمان، سب انکے فدائی تھے۔ ان کے سرمدی نغمے اور میٹھے بول لوگوں کے دلوں میں کیف وسرور پیدا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری معرفت و تصوّف کا گنجینہ ہے۔ انکے ہندی بول، بھائی چارگی کا آئینہ دار ہیں۔ آج صدیاں گزر گئیں۔ لیکن ان کے کلام میں وہی دلکشی وتازگی باقی ہے۔

امیر خسرؔو کو ہندوستان کے فارسی گو شعراء میں سب سے بڑا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ ان کی فارسی شاعری کسی صفِ اول کے ایرانی شاعر سے کم مایہ نہیں۔ حاؔفظ اور عرؔفی جیسی بلند پایہ شخصیتوں نے خسرؔو کی قابلیت کا اعتراف کیا ہے اور انکو طوطیٔ ہند، بلبلِ ہند وشیریں مقال۔ جیسے خطابات سے نوازا ہے۔

خسرؔو نے ننانوے[99] کتابیں اور چار پانچ لاکھ کے درمیان اشعار منسوب کئے جاتے ہیں۔ اور اسی قدر ہندی کلام کا پتہ چلتا ہے لیکن بہت سا کلام نایاب ہے۔ ان کی غزلیں سوز و گداز اور والہانہ محبت کا پیکر ہیں۔ اور ان کی مثنویاں فطرت نگاری اور منظر کشی کا مظہر ہیں۔ ان کے قصیدے معنی خیز اور نازک خیالی کے مرقعے ہیں۔ خسرؔو نے چونکہ بادشاہوں کے دربار میں رہ کر شاعری کی اسلئے ان کی شاعری میں اکثر و بیشتر وقائع نگاری بھی ملتی ہے۔ خسرؔو بنیادی طور پر ہندوستانی ہیں لیکن ان کا کلام دنیا کے وسیع خطہ میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کو روس، افغانستان اور ایران میں بھی بڑی مقبولیت حاصل ہے۔

خسرؔو کا ملک پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے سماجی تعلقات بڑھانے کے لئے سنسکرت بھاشا، عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے آسان لغات کے اختلاط سے زبان اُردو کی بنیاد ڈالی جو آج ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ وہ اُردو زبان کے نقاشِ اول ہیں۔

رکھی تھی خشتِ اول خوب قصرِ نظمِ اُردو کی
مبارک ہاتھ سے اے خسرؔوِ شیریں زباں تو نے

حضرت خسرؔو کی میٹھی اور سلونی زبان اُردو میں فارسی اور ہندی کی آمیزش عجیب لذت پیدا کرتی ہے۔ ایسا ہی ایک نمونہ پیشِ خدمت ہے ؎

خوار شدم زار شدم لُٹ گیا
در غمِ ہجراں تو کمر ٹوٹ ہے
یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من
بے گنہم ساتھ عجب روٹھ ہے
روئے تو رونقِ شکنِ آفتاب
سروبہ پیشِ قدِ تو بوٹھ ہے
گاہ ز خسرؔو تو نہ گفتہ کہ بیٹھ
وہ چہ کند بھاگ مرا پھوٹ ہے

خسرؔو کے عہد کی بولی کھڑی بولی ہے۔ یہ کھڑی بولی عام ہندوی بولیوں سے مختلف ہے۔ ہندوستان میں آنیوالے مسلمانوں نے اسی بولی کو اپنایا اور مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر اسے معراجِ کمال پر پہونچایا۔ خسرؔو نے اس زبان میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ جیسے ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل دُرائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے دل نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

یہ غزل ریختہ کی رنگ میں ہے لیکن اس کے لفظ لفظ میں سوز موجود ہے۔

خسرؔو کی ہندی زبان سے وابستگی اور ہندی اُردو

کی ملاوٹ ہمیشہ سراہی جاتی رہے گی۔ انھوں نے ہندی نہ صرف سیکھی بلکہ اس میں مہارت بھی حاصل کی۔ سنسکرت کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ زبان عربی کے علاوہ تمام زبانوں پر فضیلت رکھتی ہے۔ عربی زبان کی طرح اس میں کسی اور زبان کی آمیزش نہیں۔ وہ سنسکرت کے صرف و نحو کو عربی کی طرح بتاتے ہیں۔

خسرو ایک عوامی شاعر ہیں۔ ان کے سیدھے سادے گیت ان کی پہیلیاں، ان کی مکرنیاں، ان کے ڈھکوسلے ہندوستان کے گھر گھر میں سب کی زبان پر ہیں۔

دوہا ہندی کا سب سے مقبول چھند ہے۔ خسرو نے اپنے عہد کی عوامی بولی میں کچھ دوہے بھی کہے ہیں۔ ایک دوہا تو وہ ہے جو انھوں نے اپنے مرشد خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی قبر دیکھ کر کہا تھا ؎

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چہوں دلیس

آج تک ہر سال خواجہ نظام الدینؒ کے عرس کا افتتاح اسی دوہے سے ہوتا ہے۔

خسرو ہندوستانی عورتوں کے گیتوں سے بھی متاثر ہوئے اور خود ان کے جذبات کا اظہار اپنے ہندی گیتوں میں کیا ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر جو گیت اور بابل گائے جاتے ہیں ان میں سے بہت کچھ خسرو سے منسوب ہیں۔ خسرو کا ایک گیت پیش خدمت ہے ؎

اماں میرے بابا کو بھیجو جی　کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بابا تو بڈھاری　کہ ساون آیا
اماں میرے بھیا کو بھیجو جی　کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری　کہ ساون آیا　وغیرہ

خسرو نے بہت سی پہیلیاں عجیب و غریب انداز سے کہی ہیں جن میں فارسی کے نمک نے ہندی کے ذائقہ میں ایک لطف پیدا کر دیا ہے۔ چند پیش خدمت ہیں :۔

(۱) فارسی بولی آئی نا　ترکی بولی پائی نا
ہندی بولی آرسی آئے　منھ دیکھو جو اسے بتائے　(آئینہ)

(۲) بیسوں کا سر کاٹ لیا　نہ مارا نہ خون کیا　(ناخن)

(۳) ایک کہانی میں کہوں سن لے میرے پوت
بن پنکھوں وہ اڑ گیا باندھ گلے سوت　(پتنگ)

ایسی ہی درجنوں پہیلیاں عوام کی زبان پر ہیں جو خسرو سے منسوب ہیں۔

خسرو کی مکرنیاں بہت مشہور ہیں۔ یہ مکرنیاں دو جوان سکھیوں کے رومانی مکالمے سے بنتی ہیں جنھیں غیر ٹکسالی لفظوں سے زیادہ حسین ہوتے ہیں۔ جیسے

سگری رین مورے سنگ جاگا
بھور بھئی تو بچھڑن لاگا
واکے بچھڑت پھاٹت جیا
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی دیا

خسرو قوالی کے موجد کہے جاتے ہیں۔ غزل گو تھے موسیقی کے ماہر بھی تھے اور صاحب دل بھی تھے۔ اس لئے قوالی کی ایجاد کے لئے فطرتاً وہی موزوں تھے۔ خسرو عظیم موسیقی داں تھے۔ موسیقی کی طرف ان کی طبیعت فطرتاً راغب تھی۔ وہ ہندوستانی موسیقی سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ انھوں نے ہندی راگ اور ایرانی راگ ملا کر ۲۴ راگ راگنیاں ایجاد کیں جن میں قول۔ قوالی۔ ترانہ و خیال وغیرہ ہیں۔ پہلے ستار میں چار تار ہوا کرتے تھے مگر خسرو نے اس میں تین تار اور بڑھائے اور اس کا نام ستار

پڑھ کر خسرو کی طرف منسوب ہوگیا۔

خسرو کی جہانگیری میں غزل۔ مثنوی۔ قصیدہ۔ رباعی سب کچھ داخل ہے۔

خسرو نے غزل میں سعدی۔ مثنوی میں نظامی۔ قصائد میں رضی الدین نیشاپوری اور کمال اصفہانی کی اور مواعظ اور حکمت کے بیان میں حکیم سنائی اور خاقانی کی پیروی کی ہے۔ ان کے کلام میں سعدی کی چاشنی اور حافظ کی حلاوت موجود ہے۔

۶۰۰ سال گذر جانے کے بعد بھی خسرو کی غزلیں، اجتماع اور قوالی کی محفلوں میں سب سے زیادہ رائج اور مقبول ہیں۔ خسرو کی غزلوں کی جاذبیت اور دلکشی کا راز ان کا سوز و گداز اور تصوف ہے۔ تصوف کی چاشنی ان کو اپنے پیر مرشد خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے ملی۔

خسرو نے فارسی غزلوں کی زلفوں کو خوب سنوارا ہے۔ ان کی غزل میں سوز و ساز دونوں کی ہم آہنگی موجود ہے ان کا عشق اسی عالم آب و گل کا ہے۔ اس لئے تغزل بھی ہے ان کی فارسی غزلوں میں مصوری کے نقوش بھی پائے جاتے ہیں۔ خسرو کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ یاس و حرماں نصیبی کا کبھی شکار نہیں ہوئے۔ جہاں تک زبان کی شیرینی اور حلاوت کا تعلق ہے اس کو محبوب الٰہی کی دین کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

ایشیائی شاعری پر یہ عام الزام ہے کہ شعراء خاص خاص چیزوں پر نظمیں نہیں لکھتے۔ خسرو نے کاغذ۔ قلم۔ کشتی صراحی۔ جام۔ میوؤں اور پھلوں وغیرہ پر طویل نظمیں لکھی ہیں۔ قرآن السعدین میں اس قسم کا کلام ملتا ہے۔

جس طرح وہ عربی۔ فارسی۔ سنسکرت۔ ترکی اور ہندوی زبانوں کے پرستار تھے اسی طرح انھوں نے غزل۔ مثنوی۔ قصیدہ۔ رباعی۔ قطعہ۔ سب ہی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔

خسرو کو ہندوستان سے والہانہ محبت تھی۔ وہ ہندوستان کو تمام دنیا سے افضل سمجھتے تھے۔ خسرو مذاہب میں اتحاد چاہتے تھے اور غریب و بے کس لوگوں کی زبان و فریاد کے مترجم تھے۔ وہ سب ہی مذاہب کے عقائد کا احترام کرتے تھے۔ وہ اجودھیا میں دو سال تک رہے اور انھوں نے اہل ہنود کے عقائد کا عمیق مطالعہ کیا۔

خسرو نے ہندوستان کے علوم و ارباب علم کی بہت تعریف کی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ روم سے فلسفہ ضرور پھیلا۔ لیکن یہاں بھی علوم کی کمی نہیں۔ یہاں منطق ہے، نجوم، طبعیات اور ریاضیات وغیرہ بھی اس سے ہندوستان کے اس وقت کے معیار زندگی کی صحیح نشان دہی ہوتی ہے۔

خسرو نے اپنی مثنوی قرآن السعدین میں دہلی کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کے دین و انصاف کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہ عدن کی جنت ہے۔ اپنی صفات اور خصوصیات کے لحاظ سے باغ ارم ہے۔

خسرو نے اپنی تصانیف میں بہت سی ہندوستانی عمارتوں کی تعریف کی ہے خاص طور سے قلعہ جھائیں (نزد رنتھمبور) کی تعریف میں بہت کچھ لکھا ہے۔

خسرو کے نام سے پانچ دیوان منسوب ہیں تحفۃ الصغر وسط الحیات۔ غرۃ الکمال۔ بقیہ نقیہ اور نہایت الکمال۔ لیکن سب سے اہم غرۃ الکمال ہے۔ ان دیوانوں میں بیشتر غزلیں ہیں۔

خسرو نے مبارک شاہ کے عہد اور فتوحات پر مثنوی

...بر، لکھی جو بہت مشہور ہے۔ اس مثنوی میں ہندوستان
...ت تعریف کی گئی ہے اور اسے دوسرے ممالک پر برتری
...تی ہے۔

کمالات ظاہری سے مزین ہونے کے بعد خسرو کو
...ات باطنی کا شوق دامن گیر ہوا تو وہ حضرت نظام الدین
...یاؒ کے مریدوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ رفتہ رفتہ عقیدت
...ق میں بدل گئی اور محبوبؒ الٰہی کو یہ کہنا پڑا کہ "امیر خسروؒ
...ے بعد زندہ نہ رہے گا" خسرو۔ محبوب الٰہی کی وفات
...ھ ماہ بعد بنگال سے واپس ہوئے اور سیدھے مزار کی
...رت کے لئے گئے بیہوش ہو کر گر گئے اور پھر وہ کبھی نہ
...ٹھ سکے۔

بے شک امیر خسرو فارسی ادب کے عظیم شاعر ہیں لیکن
...ے عوامی شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ گزشتہ (۶۰۰)
...سو سال میں ہندوستان میں ایسی ہمہ گیر شخصیت نہیں گزری
...۔ فردوسی۔ سعدی۔ انوری۔ حافظ۔ عرفی اور نظیری۔
...شبہ فارسی شاعری کے بیش بہا رتن ہیں لیکن ہر ایک
...صنف سخن محدود ہے۔ ہم خسرو کی لامحدود ذہانت اور
...ناگوں شخصیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ وہ
...صرف غزل بلکہ مثنوی۔ قصیدہ۔ رباعی۔ اور دیگر اصنافِ
سخن کی راہوں سے کامیاب و کامران گزرے ہیں۔

خسرو عربی۔ فارسی۔ سنسکرت و ہندوی کے ذہین
اسکالر ہیں۔ عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقی کے
ماہر بھی ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں کامیاب نظر آتے
ہیں جس کا راز ان کا پاکیزہ عمل اور ان کی اہلیت و قابلیت
تھی۔

خسرو ہم کو باہمی اتحاد، رواداری۔ اور یکجہتی
کا پیام دیتے ہیں۔ اس طوطیٔ ہند کے نغمات و تعلیمات
آج بھی ہمارے دلوں میں حب وطن کے جذبات بیدار
کر رہے ہیں۔ اور تا ابد کرتے رہیں گے۔

وصی احمد سندیلوی :۔

خسرو بانی اردو

اُردو ایک لشکری زبان ہے۔ مختلف زبانوں کے میل ملاپ سے اس کا وجود ہوا۔ یہ مختلف زبانیں کون تھیں؟ اس کے سمجھنے کے لئے یہاں کی تاریخ اور معاشرت پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ زمانہ قدیم میں یہاں دراوڑوں کا دور دورہ تھا ان کی کوئی تہذیب تھی اور نہ تمدن۔ پتھروں سے شکار کرنا اور جانوروں کی طرح کھوہوں میں رہنا ان کا کام تھا۔ بعد ازاں سن عیسوی سے پہلے یہاں آریوں کی آمد شروع ہوئی۔ دھیرے دھیرے انکے جتھے کافی تعداد میں آئے۔ اور شمال و مغرب میں بستے گئے۔ سندھ، پنجاب، دہلی، اودھ یہ سب ان کے علاقے تھے۔ دراوڑوں کی نسبت یہ لوگ شائستہ مہذب پڑھے لکھے اور صنعت و حرفت میں طاق تھے۔ انکی ایک تہذیب اور زبان تھی۔ انھوں نے اپنی شجاعت اور بہادری سے دراوڑوں کو پسِ پشت ڈال کر یہاں کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ذات پات کی تفریق اسی دور کی دین ہے۔ برہمنوں کا عروج اور ان کی اجارہ داری اسی دور میں قائم ہوئی۔ ویدک دھرم اور ویدک زبان ان ہی کے ساتھ ہند میں داخل ہوئی۔ ان سے پہلے یہاں کے دھرم کے متعلق کچھ پتہ نہیں چلتا۔ زبانیں البتہ الگ الگ گروہوں میں بولی جاتی تھیں۔ جغرافیائی اور لسانی اعتبار سے ہند کا صوتی نظام ہمیشہ درہم برہم رہا ہے۔ اسی تقسیم کے لحاظ سے یہاں کی قومیں بھی مختلف رہی ہیں۔ کول۔ بھیم۔ سنتھال۔ دراوڑ وغیرہ قوموں کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح ان کی بولیاں بھی جداگانہ تھیں۔ آریوں کے اور ان قدیم باشندوں کے آپس میں میل جول اور تعلقات سے ان سب کے رسم و رواج اور بول چال پر اثر پڑا۔ مگر ذہنیت اور دقیانوسی خیالات کے آریوں نے اپنے دھرم اور زبان کو پاک و پوتر بنانے کے لئے اس کو محدود کرنا شروع کیا۔ برہمنوں کی اِس تنگ نظری سے ملک میں بدھ اور جین مذہب کو فروغ ہوا۔ ان مذہب کے بانیوں اور پیروکاروں نے یہاں کی مقامی زبانوں میں جو اپ بھرنش یعنی عوام کی بولیاں تھیں، اپنے مذہب کا پرچار کیا۔ دھیرے دھیرے ویدک زبان ایک مردہ زبان ہوتی چلی گئی۔ سنسکرت بھی محدود ہوتے ہوتے صرف پوجا پاٹ کی زبان بن کر رہ گئی۔ دہلی کو جس کو زمانہ قدیم ہی سے مرکزیت کا شرف حاصل رہا اور جہاں بھانت بھانت کا آدمی بستا ہے۔ تہذیب

ولندن ادر بول چال کے بننے اور بگڑنے میں کافی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ساتھ ہی اس کے گرد کا نواحی علاقہ مثلاً سندھ، راجستھان، پنجاب اور آگرہ وغیرہ ہمیشہ مرکزی اور تہذیبی علاقے رہے ہیں۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں کی مشہور علاقائی زبانیں شورسینی۔ ماگدھی۔ پیشاچی اور مہاراشٹری تھیں جو سندھ سے لیکر بہار اور مہاراشٹر کے علاقوں تک مروّج تھیں، انکے علاوہ مقامی اور بھی بولیاں پالی، قنوجی برج اوی وغیرہ۔ بولی اور لکھی جاتی تھیں۔ لیکن جیسے جیسے ملک میں آمد ورفت کے وسائل بڑھ رہے تھے اور لوگوں میں وسیع النظری پیدا ہو رہی تھی۔ ویسے ہی ویسے زبانیں بھی بگڑ بگڑ کر ایک نیا روپ اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ سرکاری اور مذہبی زبانیں تو اپنی جگہ پر کسی قدر برقرار تھیں مگر بول چال اور رسم ورواج کی بولیوں میں فرق آتا جا رہا تھا۔ وسط ہند میں اپ بھرنش نے بھی اپنا چولا بدل کر مغربی ہندی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

ایسے میں مسلمانوں کے قدم بھی ہند میں آئے اور فاتحانہ انداز میں آئے۔ انکے لشکروں میں عربی۔ ترکی، ایرانی، تورانی، قوموں کے لوگ شامل تھے جنکی زبانیں اور بولیاں بھی الگ الگ تھیں۔ یہ سب لوگ جب آپسمیں اُٹھتے بیٹھتے تھے تو سب ملی جلی زبانوں میں اپنے مفہوم ادا کرتے تھے۔ مسلمانوں نے تبلیغ دین کا سلسلہ جب شروع کیا تو ان کو یہاں کی بولیوں سے ناواقفیت کی بنا پر سخت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مولویوں اور صوفیوں نے اپنے مذہب کو فروغ دینے کے لئے یہاں کی مقامی زبانوں کو سیکھنا اور انہیں ہمکلام ہونے میں دسترس حاصل کرنی شروع کی۔ مسلمانوں کا مذہب سیدھا سادا اور ظاہری رسم ورواج سے بالکل پاک و صاف تھا۔ نہ ذات پات کی تفریق اور نہ اونچ نیچ کا کوئی جھگڑا۔ ہر شخص برابر یہاں کے عوام جو مذہبی اصولوں سے نابلد اور اور پنڈتوں ہی کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ آپس میں بھید و بھاؤ۔ اور اونچ نیچ سے تنگ و عاجز تھے اسلام کو اپنے مفید مطلب سمجھ کر دھڑا دھڑ اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ محمود غزنوی کے دور تک مسلمان اگرچہ یہاں کافی بس چکے تھے لیکن ان کی کوئی مستقل حکومت، یہاں قائم نہ ہو پائی تھی۔ محمد غوری اور شہاب الدین غوری نے اس کی بنیاد ڈالی اور غلام خاندان نے بڑے کروفر سے سارے ملک پر اپنا تسلط قائم کیا۔ حکمراں قوم کی حیثیت سے ملک کی سرکاری زبان فارسی قرار پائی۔ عربی اور مقامی زبانیں بھی نیم سرکاری زبانوں کی حیثیت سے مروج رہیں۔ حکومت میں بارسوخ ہونے کے لئے یہاں کے لوگوں نے ان کی زبانیں سیکھیں لیکن صوفیوں نے تبلیغ اسلام کے لئے جس بھائی چارگی اور محبت کا اظہار یہاں کے عوام سے کیا اس سے یہاں کے عوام انکے بہت قریب آئے۔ ان صوفیوں میں شیخ علی ہجویری سب سے پہلے بزرگ ملتے ہیں جنھوں نے اپنے کردار اور معاملہ بندی سے اپنے قرب وجوار (لاہور) کے بہت سے غیر مسلموں کو اپنا معتقد بنایا۔ بعد ازاں خواجہ معین الدین اجمیری نے لاکھوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے دہلی کو اپنا مستقر بنایا اور تبلیغ اسلام کا کام جس زور وشور سے کیا آج بھی دہلی کا گوشہ گوشہ ان کی کرامات سے روشن ہے۔ بابا فریدالدین گنج شکرؒ نے اجودھن کو اپنی قیام گاہ کے لئے منتخب کیا اور وہاں سے فیض کا جو چشمہ جاری کیا آج بھی رواں دواں ہے۔ بابا فریدؒ کے زمانہ میں اسی ملی جلی ہندوی زبان نے اپنے بال و پر نکالنے شروع کر دیے۔ بابا فریدؒ کا ایک شعر ملاحظہ ہو ۔

عشق کا رموز نیارا ہے
جز مدد پیر کی نہ چارا ہے

ایک غزل کے کچھ شعر بھی بابا فرید گنج شکر سے منسوب ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

وقت سحر وقت مناجات ہے
خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بہ گوید ترا
خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے

کھڑی بولی کے الفاظ مسلمانوں کی زبان میں خاصے مقبول ہو چکے تھے۔

مذہبی تاریخی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان صوفیائے کرام کی بارگاہوں اور خانقاہوں میں کثرت سے ہندو سادھو اور جوگی اپنے شکوکات کو رفع کرنے کے لئے حاضر ہا کرتے تھے اور ان کی روحانی تعلیمات سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔

امیر خسروؒ سے تقریباً ڈیڑھ دو سو سال پہلے لاہور کے مسعود سعد سلمان کا نام کتابوں میں ملتا ہے جنھوں نے یہاں کی ہندوی زبان (کھڑی بولی) میں اپنا دیوان مرتب کیا تھا لیکن امتدادِ زمانہ نے اس کا نام و نشان تک باقی نہ رکھا۔ چند بردائی کی راج راسو جو پرتھوی راج کے دربار کا شاعر تھا بھی ایک ایسی ہی زبان کی تصنیف ہے جس میں عربی فارسی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں لیکن اب اس میں اسقدر الحاق پایا جاتا ہے کہ نقادانِ سخن نے اس کو مغلوں کے دَور کا نسخہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس میں مغلوں کے دَورِ حکومت کے بہت سے ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کا رواج اس زمانے میں نہ تھا۔ شیخ نظام الدین اولیا کی خانقاہ میں ہندو اور مسلمانوں کا اژدہام کثرت سے رہا کرتا تھا۔ ہندو جو مسلمانوں کو شروع میں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ ان صوفیائے کرام کی بزرگی، کرامات، اخلاق اور رہن سہن سے کچھ ایسے متاثر ہوئے کہ پھر ان کی آمد و رفت ان بزرگوں کے پاس بکثرت ہونے لگی۔ اور ان کو ایک دوسرے کو پرکھنے اور سمجھنے کا خاصا موقع ملا۔ ایک شام کو حضرت نظام الدینؒ اپنی خانقاہ کی چھت پر چہل قدمی کر رہے تھے دریائے جمنا میں ہندو اشنان کر رہے تھے اور کنارے پوجا پاٹ میں مشغول تھے۔ کسی نے خواجہ کی توجہ ادھر مبذول کرائی تو خواجہ صاحب کی زبان سے برجستہ یہ الفاظ نکلے:۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اس سے یہ اندازہ ہوا کہ ان صوفیائے کرام میں دوسروں کے مذہب کو نفرت و حقارت سے دیکھنا جائز نہ تھا یہی وہ کشش تھی جو ہندوؤں کو مسلمانوں سے اتنا قریب لائی جب سے مسلمانوں نے ہمچنیں دیگرے نیست کا مقولہ اپنا لیا ہے وہ اپنی حاصل کردہ عظمت کو بھی کھوئے جا رہے ہیں۔

امیر خسروؒ کی زندگی پر شیخ نظام الدین اولیاؒ کی روحانی تعلیمات کا اتنا اثر تھا کہ وہ فنا فی نظام الدین ہو کر رہ گئے تھے کوئی دوئی نہ تھی۔ ایک جان دو قالب تھے۔ ان کی پوری زندگی ہندو دوستی اور رواداری پر مبنی ملتی ہے۔

اُردو زبان اسی رواداری کا نتیجہ ہے ایک طرف اگر اس کا رسم الخط عربی فارسی جیسا ہے تو دوسری طرف اس کا لسان و بیان ہندی جیسا۔ اس کی آبیاری میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک کار ہیں۔ یہ کسی فرد واحد کی زبان نہیں ہے بلکہ عوام کی زبان ہے۔ سادھو۔ سنتوں، فقیروں، اور صوفیوں نے اس کو جلا بخشی ہے۔ امیر خسروؒ کے دَور تک اس زبان میں کافی نکھار پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن خسروؒ نے اس زبان میں اپنے کلام کو

قلمبند کرکے اس کو زندہ جاوید کیا۔

امیر خسرؒو کی پیدائش التمش کے دورِ حکومت میں بمقام پٹیالی ہوئی جو یو۔ پی کے ضلع ایٹہ میں واقع ہے۔ آپ کے والد امیر سیف الدین ترکی تھے۔ ماوراء النہر ان کا آبائی وطن تھا۔ آپ لاچین قبیلے کے سردار تھے۔ چنگیزی فتنوں نے جب وہاں سر اٹھایا اور آپ کی زندگی وہاں دوبھر ہوئی تو آپ نے ہندوستان کا رخ کیا۔ شاہ التمش کے دربار میں آپ کو ایک موزوں فوجی عہدہ پر مامور کیا گیا۔ اپنی لیاقت، فراست اور شجاعت سے کچھ ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیے جن سے بادشاہ کی نظر میں آپ کی وقعت خاصی بڑھ گئی۔ پٹیالی کا رئیس عماد الملک جو اپنے وقت کا بہت بڑا ذی اقتدار صاحب جود وسخا تھا اور حکومت کا معتمد امیر کی خداداد صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اپنی دختر نیک اختر کو انکی زوجیت میں دیدیا۔ ان کے بطن سے امیر خسرؒو کی پیدائش ۱۲۵۳ء میں ہوئی۔ والدین نے نام ابوالحسن رکھا لیکن مشہور امیر خسرؒو کے نام سے ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ جب خسرؒو پیدا ہوئے تو اس وقت ان کے والدین کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر ایک بزرگ کے پاس لے گئے۔ انھوں نے بچہ کو دیکھ کر کہا کہ یہ بڑا ہو کر آسمانِ تصوف کا آفتاب اور ہر فن میں باکمال ہوگا۔ خاقانی سے سبقت لے جائے گا۔ جب چار برس کے ہوئے تو باپ اپنے ساتھ دہلی لے گئے۔ امیر سیف الدین کو خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے گہری عقیدت تھی اور وہ ان کی خدمت میں اکثر و بیشتر حاضر ہوتے رہتے تھے۔ ان کے ساتھ خسرؒو بھی یقینی طور پر جاتے آتے رہے ہوں گے جبکہ دربار میں وہ باپ کے ساتھ اکثر جایا کرتے تھے۔ ابھی سات سال کے تھے کہ مزاج میں صوفیانہ رنگ نکھرنے لگا تھا۔ نو برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ نانا نے پرورش کی اور تعلیم و تربیت کا معقول بندوبست کیا۔ دس سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ ذہانت و ذکاوت کا یہ عالم تھا کہ شاہان سخن کے تمام دواوین نظر سے گذر چکے تھے زبان و بیان پر قادر الکلامی اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ ایک مرتبہ استاد قاضی اسدالدین اپنی ہمراہی میں خواجہ عزیزالدین کے گھر لے گئے اور ان سے خسرؒو کی شاعرانہ شگفتگی کا تذکرہ کیا۔ خواجہ صاحب اِدھر اُدھر کی باتوں اور خسرؒو کی شعری ذوق اور معلومات سے بہت متاثر ہوئے اور ساتھ ہی ان کی قادر الکلامی کا امتحان لینے کے لئے چار ایسے متفرق لفظ جن کا آپس میں کوئی ربط نہ تھا ایک رباعی میں پرونے کے لئے کہا۔ وہ لفظ ہیں مو، بیضہ، تیر، خربزہ۔

خسرؒو نے برجستہ یہ رباعی کہی ؎

ہر موی کہ در دو زلف آں صنم است

صد بیضہ عنبریں براں موی صنم است

چوں تیر مداں راست دلش را ز میرا

چوں خربزہ دندانش میان شکم است

رباعی سن کر خواجہ نے ان کی بڑی تعریف کی اور دل کھول کر داد دی۔ بارہ سال کی عمر میں مختلف قسم کی شاعری کی بنیادیں ان کے دماغ میں مستحکم ہو گئیں۔ فارسی اس زمانے میں سرکاری زبان تھی۔ مسلمان شعراء اور ادباء اسی زبان میں اپنے تاثرات قلمبند کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ لیکن خسرؒو نے فارسی اور ہندوی دونوں میں اسقدر اشعار قلمبند کئے ہیں جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے یہاں خواہ وہ ہندوستان کا ہو یا ایران و توران کا بہت کم ملتی ہے۔ خسرؒو اگرچہ ہند کی پیداوار تھے لیکن ان کی مماثلت ایران و توران کے کسی شاعر نے ابتک نہیں کی۔ خسرؒو نے شاعری کے تمام اصنافِ سخن میں اسقدر

اپنے گھوڑے دوڑا دیے ہیں کہ ان کو اقلیم سخن کا بادشاہ منتخب کیا گیا ہے۔ ان کی تصانیف ننّو تک بتائی جاتی ہیں۔ فارسی کے تاریخ و سیر، لطافت و ظرافت، صنائع و بدائع اتنی کثرت سے ہیں کہ جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی ہے۔ نثر نگاری میں بھی خسروؒ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ نثر میں بھی ان کی تصنیفات ملتی ہیں۔

اُردو میں ان کی پہیلیاں۔ مکرنیاں۔ دوہے۔ گیت، غزل۔ رباعی وغیرہ اس کثرت سے ہیں کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آیا خسرو فارسی کے شاعر تھے یا اُردو کھڑی بولی کے۔ علم موسیقی میں انھوں نے جو راگ اور راگنیاں ایجاد کیں آج تک دوسرا کوئی ان کا ہمسر نہیں ہوا۔ لوگ ان کے اشعار کو سڑکوں اور محفلوں میں گاتے ہیں۔ طرح طرح کی دھنیں، قوالیاں اور ستار وغیرہ۔ ان ہی کی ایجاد کردہ ہیں۔ ہندوستان سے ان کو اسقدر محبت تھی کہ وہ اسکے مقابلے میں ایران و توران کی کسی چیز کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ریختہ میں اپنے احساسات اور محسوسات کو قلمبند کرکے ہندیوں کے دلوں میں جو عظمت ان کو ملی ہے کسی کو نہیں ملی۔ انکے سوچ بچار کا طریقہ ہندوستانی تھا۔ ہندوستان میں ساون کے مہینہ میں لڑکیاں بالعموم اپنے میکے چلی جاتی ہیں۔ خسروؒ ان کی زبان میں اس طرح ملہار گاتے ہیں ؎

اماں میرے بابا کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی ترا بابا تو بوڑھا ری کہ ساون آیا
اماں میرے بھیا کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری کہ ساون آیا
اماں میرے ماموں کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری کہ ساون آیا

ان کی غزل کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو۔ نسوانی خیالات کو ہندوی زبان میں کس طرح سموئے ہیں۔ غزل میں کتنا سوز ہے ان کے دلی جذبات کا پتہ دیتا ہے ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے دل نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ہمیشہ گریاں بعشق آں ماہ
نہ نیند نیناں نہ انگ چینا نہ آپ ہی آوے نہ بھیجے پتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل بصد فریبم نہ برد چشمش قرار و تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد ما را فریب خسروؔ
درآئے راکھوں سمیت ساجن جو کہتے پاؤں دو بول بتیاں

فی البدیہہ :-

خسروؒ کو زبان و بیان پر خاص قدرت حاصل تھی۔ ایک روز گھومتے پھرتے شہر سے باہر نکل گئے۔ پیاس لگی دیکھا ایک کنویں پر کچھ عورتیں پانی بھر رہی ہیں۔ اُن سے پانی مانگا۔ جب اُن عورتوں کو یہ معلوم ہوا کہ یہ امیر خسروؒ ہیں تو ایک چنچل اور شوخ عورت نے طفنن طبع کے طور پر چار بے جوڑ لفظ کہہ کر شعر کہنے کو کہا۔ کھیر۔ چرخا۔ کتا۔ ڈھول
خسروؒ نے فوراً یہ شعر کہا ؎

کھیر پکائی جتن سے چرخا دیا جلا
کتا آیا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا

یہ کہہ کر کہا کہ لا پانی پلا۔ مضامین تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے سامنے پرا باندھے کھڑے ہیں۔ خسروؒ کی پہیلیاں اور مکرنیاں بھی بہت مشہور ہیں۔ بطور نمونہ کچھ اقتباسات پیش ہیں۔

آئینہ کی پہیلی اور ان کی معنیٰ آفرینی ملاحظہ ہو ؎

فارسی بولی آئی نا   ترکی بولی پائی نا
ہندی بولی آرسی آئے   کہے خسروؔ کوئی بتلاوے

پتنگ کی پہیلی بھی خوب ہے :-

ایک کہانی میں کہوں سن لے میرے پوت
بن پنکھوں وہ اڑ گیا باندھ گلے میں سوت

آگ کی پہیلی :-

جا گھر لال بلتیا جائے   تا کے گھر میں ڈُند مچائے
لاکھوں من پانی پی جائے   دھڑا دھڑ کا سب گھر کا کھائے

آری کی پہیلی :-

ادھر کو آئے ادھر کو جاوے   ہر ہر پھیرے کاٹ وہ کھاوے
ٹھہرے جس دم وہ پیاری   خسروؔ کہے اسی کو آری

نقارے کی پہیلی :-

نر ناری کی جوڑی بیٹھی   جب بولے تب لاگے میٹھی
ایک نہائے اک تا بن ہارا   چل خسروؔ کر کوچ نقارہ

مکرنیاں بھی ملاحظہ ہوں۔ یہ رومانی مکالمے ہیں۔

سگرے رین موے سنگ جاگا   بھور بھئی تو بچھڑن لاگا
واکے بچھڑن پھاٹت جیا   اے سکھی ساجن نا سکھی دیا
سرب سلونا سب گن ٹیکا   وا بن سب یگ لاگے پھیکا
واکے سر پر ہووے کون   اے سکھی ساجن نا سکھی نون
وہ آوے تب شادی ہووے   اس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگے واکے بول   اے سکھی ساجن نا سکھی ڈھول

دوسری مکرنی :-

بن کے رے وہ ترچھے ٹکڑے   دیکھ سکھی مورے پیچھے پڑے
اُن بن میرا کون حوال   اے سکھی ساجن نا سکھی بال

دوسخنے بھی ملاحظہ ہوں :-

گوشت کیوں نہ کھایا۔ گانا کیوں نہ گایا۔ گلا نہ تھا
جوتا کیوں نہ پہنا۔ سنبوسہ کیوں نہ کھایا۔ تلا نہ تھا
انار کیوں نہ کھایا۔ وزیر کیوں نہ رکھا۔ دانا نہ تھا

خسروؔ کو حضرت نظام الدین اولیا سے گہری عقیدت تھی وہ ان کے مرید بھی تھے۔ ان کا عشق مجاز سے حقیقت کو پہونچ چکا تھا۔ خواجہ صاحب بھی ان کو اس قدر چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ جب روز حشر میں خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تم دنیا سے کیا لائے تو میں خسروؔ کو پیش کر دوں گا۔ خسروؔ ہولی پر اپنے مرشد سے اس طرح اظہار عشق کرتے ہیں ؎

کپڑے رنگے سے کچھ نہ ہوت ہے
یا رنگ منے تن کو ڈبو یا ری یا ری

گدّن سے متاثر ہو کر :-

گوئی کہ تو در حسن و لطافت چو مہی
آں دیگ دہی بر سر تو چیز مہی
از ہر دو لبت قند شکر می ریزد
ہر گاہ بگوئی کہ دہی لیہو دہی

دوست کی بے اعتنائی پر :-

خوار شدم زار شدم لٹ گیا
در غمِ ہجران تو کمر ٹوٹ ہے

یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من
بے گنہم ساتھ عجب روٹھ رہے
روئے تو رونق شکن آفتاب
سرو بہ پیش قد تو بوٹھ رہے
گاہ زخسرو تو نہ گفتہ کہ بیٹھ
دیچہ کند بھاگ مرا پھوٹ رہے

خسروؒ کی پیدائش کے وقت ایک بزرگ نے یہ کہا تھا کہ یہ لڑکا ہر فن میں آفتاب بن کر شہرت حاصل کرے گا ـــ پیشینگوئی صحیح ثابت ہوئی۔ شاعری، موسیقی، عشق، تصوف، شجاعت۔ غرضیکہ ہر فن میں اپنا ثانی نہیں چھوڑا جس طرف قدم بڑھے اس فن اور صنف کو آسمان تک پہونچا یا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے ان کو عشق صادق تھا اور خدائی یہ دین تھی جو حضرت خواجہ کے وسیلہ سے ان کو حاصل ہوئی۔ ان کے کلام میں جو شیرینی ملتی ہے ان کی ہی برکت سے پائی جاتی ہے اُردو میں ان کی خالقِ باری بہت زیادہ مشہور ہے افسوس ہے کہ آج لوگوں نے اس میں تحریف کر کے اسکی ہمہ گیر شہرت کو داغدار کر دیا ہے اور بہت سے نقادانِ سخن اسکو خسروؒ کی تصنیف گرداننے میں تکلف کر رہے ہیں۔

خسروؒ اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اُردو الفاظ کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے چونکہ اس زمانے میں فارسی ہی سرکاری اور پڑھے لکھے لوگوں کی زبان تھی اسلئے ہر ایک فارسی میں ہی کہنے میں فخر محسوس کرتا تھا لیکن خسروؒ نے اپنا اُردو یا ہندوری زبان میں کلام پیش کر کے ہندوستان کی جو عظمت بڑھائی ہے اور گری پڑی زبان کو جو بڑھاوا دیا ہے اس نے خسروؒ کو ہندیوں میں ہر دلعزیز کر دیا ہے۔ آج اگر ہمت و جرأت سے خسروؒ اس ریختہ کو اپنی زبان نہ بناتے تو شائد اُردو کو یہ مقام نہ ملتا ـــ

انھوں نے جس زبان کی بنیاد رکھی ہے ایسا ممکن نہیں کہ وہ امتداد زمانہ سے فنا ہو سکے۔

خسروؒ کی شاعری میں مثنویاں، قصائد، خمسے، غزلیں، رباعیاں سب ہی کچھ ہے لیکن ان کی غزلوں میں جو سوز و گداز ہے اس نے ان کو امر کر دیا ہے ان کی غزلیں آج بھی سماع کی محفلوں میں بڑے زور و شور سے پڑھی جاتی ہیں۔ ہندوری زبان سے ان کی شیفتگی، ان کے نانا عماد الملک کی وجہ سے تھی جو ہندوستانی تھے اور ان کی طرزِ معاشرت بھی ہندوستانی۔ نانا کی وفات پر جب خسروؒ کو درباروں سے منسلک ہونا پڑا۔ تو ان کو بعض مہموں پر بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار مغلوں کی قید میں بھی پڑ گئے لیکن قدرتِ خدا سے جلد ہی نجات مل گئی۔ زندگی کے آخری ایام میں ان کو شاہی لشکر کے ساتھ بنگالے کی ایک مہم پر جانا پڑا، وہاں سے جب واپس آئے تو ان کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی وفات کی خبر ملی۔ اس وحشتناک خبر نے ان کو دیوانہ بنا دیا۔ جیسے ہی قبر کی زیارت کو پہونچے۔ فی البدیہہ یہ دوہا پڑھا جو اُردو کلام کا آخری دوہا ہے اس کے بعد بے ہوش ہو کر گر گئے، اور ملک عدم کو سدھار گئے۔

خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا ؎

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چوندیس

انتخاب خمسۂ خسرو (پنج گنج)

۱۔ مطلع الانوار

جواب سلام میں بخل کرنے والا پتھر سے بھی گیا گذرا ہے ؎

کوہ کہ سنگ است و سخن کم کند — گر تو سلامش کنی او ہم کند

آنکہ نگوید بہ سلامت جواب — سنگ بیا زدی بطریق صواب

باپ اور بیٹے کی محبت میں آسمان و زمین کا فرق ہے کہاں یہ کہاں وہ !

خواجہ مبادا کہ بہ پیر از پسر — بندۂ فرزند شود بہر خور

دہ پسر از یک پدر آسودہ گشت — یک پدر از دہ پسر افتد بہ دشت

ہمعصر نما ئشی علماء سے خطاب کرتے ہوئے ان کا مذاق اُڑاتے ہیں ؎

نیست چو دستار تُرا مایہ ہیچ — بر کہ بر پیچی سر از ایں پیچ پیچ

اہل نگردد بعمامہ سفیہ[۱] — خر نشود از جُلِ دیبا[۲] فقیہہ

اُمراء مُردے ہیں۔ اُن کے آگے جھکنا اسی طرح ناجائز و ناروا ہے جیسے نمازِ جنازہ میں سجدہ کرنا ؎

وای کرتا چند چو افسردگاں — سجدہ کنی بر دَرِ ایں مردگاں

آں کہ گذاری بہ جنازہ نماز — سجدہ ندانی کہ ندارد جواز

۱ بے وقوف   ۲ ریشمی جھول اور چادر

علم نجوم سے امیری و اقعیت۔ ستارہ زمین سے کئی گنا بڑا ہوتا ہے ؎

ہر یک از انجم کہ بہ چشمت کم است — در محل خویش یکے عالم است

آں کہ سُہا[۱] را نگری ذرّہ وار — ہست بمقدار زمیں ہژدہ بار

عطا و بخشش وہ بہتر ہے جو موقع و محل کے مطابق کی جائے ؎

گرچہ عطا در ہمہ جا دلکش است — ہرچہ بہنجار بود آں خوش است

میل جول دوستی سے عقل و تجربہ بڑھتا ہے ؎

باکہ و مہ صحبت از انساں گزیں — گر تو خرد مند شو و ہم نشیں

سیرت کی خوبی کا معیار اعلیٰ خاندان ہی نہیں ہے ؎

نیست ہمہ نسل کریماں عزیز — تخمِ خیار[۲] است پسے تلخ نیز

ہر شخص اپنی غرض و مطلب سے تمہارا طرفدار و بہی خواہ ہے بے غرض کوئی نہیں :

خلق دعا گو ز پے فائدہ است — جائے لایلٰف[۳] پئے زائدہ است

۲۔ شیریں و خسرو

صحبت ایمان کا معیار محبت ہے۔ کوئی نہ ملے تو گھر کی بلی

۱ ایک ننھا ستارہ   ۲ ککڑی، کھیرا

۳ سورۂ لایلٰف قریش جو نظرِ بد سے بچاؤ کے لئے کھانے پر پڑھتے ہیں۔

سے محبت کرو۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے دل کو پتھر سے کچل ڈالو کیونکہ وہ مر چکا ہے ؎

دلت بر گو ہر ای گوہر با نسبت — نشانِ صحتِ ایماں ہمانست
دلت را گر بہ برد دگرنہ بر دست — بر و پیش سگ انداز ش کہ مردست

مالِ دنیا سے استغنا در کھو اور در بدری سے پرہیز کرو۔ بے پروائی کے ساتھ منکسر المزاج رہو کر اگر بے مانگے مل جائے تو اسے نہ لوٹا و ؎

ز صاحب بیش در دنیا مجو چیز — دگر نا جستہ یابی، رو مکن نیز
چو گر دد ابر دولت بر تو در بار — فروتن باش ہم چو شاخ پر بار

در توصیفِ عشق :

چو قمری را دہی بے جفت پرواز — ز لبتاں در قفس غیبت کند باز
قبای عشق شو گر خود مجاز یست — کہ دولت را درو پوشیدہ راز یست

مثنوی کا ابتدائیہ :

(یہ میری دوسری مثنوی ہے۔ بشرطِ حیات تین اور کہوں گا۔ ماہ رجب ۶۹۸ھ میں یہ ختم ہوئی اور اس کے کل اشعار کی تعداد ۲۶۵۰ ہے)۔

نخست از پردۂ ایں صبح نشو رم — نمود از مطلع الانوار نورم
پس از کلکم چکید ایں شربت نو — کہ نامش کردہ ام شیریں و خسرو
بقارا گر تہی ناید خزینہ — سہ گنج دیگر افشانم ز سینہ
در آغاز رجب فرخ شد ایں فال — ز ہجرت شش صد و ہشت و نود سال
دگر پرسی کہ بیتش را عدد چیست!
چہار الف و چہار است و صد و بست

۳۔ مجنوں و لیلیٰ

لیلیٰ کا خط مجنوں کے نام جس میں دردِ عشق کو یوں سمویا گیا ہے ؎

آں سینۂ بی فراغ چونست — زندانیٔ بی چراغ چوں است

رو لے دہم سر و من بر اہش — خاشاک بچیں ز تکیہ گاہش
در دِ تو رفیق جانِ من باد — ہم خوابۂ خاکدانِ من باد

امیر کہتے ہیں کہ میرا میدان غزل تھا، اپنے شیوۂ خاص سے ہٹ کر اس میں قدم رکھا ؎

از شیوۂ خود رمیدہ گشتم — تسلیم بہاں جہاں جرید ہ گشتم

مرحومہ ماں کا وہ نوحہ جو بہت مشہور ہے۔ ایک شعر ؎

اے مادر من کجائی آخر — روی از چہ نمی نمائی آخر

اپنے فرزند کو نصیحت کہ تم میری طرح عمر شعر و افسانہ گوئی میں نہ بتانا، کیونکہ معیاری شاعری سخت دشوار ہے ؎

چو من نشوی کہ ہر زمانے — سازم بدروغ داستانے
حرفے کہ از و دل کشاید — از بہر قلمی بروں نیاید

پیٹ کے لئے عجیب شعبدہ باز کیا کیا کرتے ہیں۔ اپنا جسم کاٹ ڈالتے ہیں، خود کو زخمی کرتے ہیں ؎

در شعبدہ مرد خنجر آشام — از پہلوی خویش می خورد شام
نادانست کہ نیست باخرد خویش — بازو زپی شکم کند ریش

خاتمہ مثنوی :-

میری پر گوئی کے باوجود یہ تازہ مضامین ہیں۔ دل صاحب انصاف سے انصاف طلب ہے ؎

با چنداں شغل خاطر آشوب — چندیں بر نو دہم زیک چوب
انصاف من ار تو ندہی اے دوست — خود نافہ کند حکایت پوست
زاں کس کہ نگہ کند بہ تمکیں — انصاف طلب کند ز تحسیں

۴۔ آئینہ سکندری

شاعرانہ تعلّی اور اپنی فکر و تلاش کی وسعت و گہرائی کا بیان ؎

دلم چوں بگوہر کسی خاص گشت — بدریای اندیشہ غواص گشت
بہر غوطہ چنداں بروں ریخت دُر — کہ دریا تہی گشت و آفاق پُر

اہل ہنر اس عہد میں بھی روزی کی تنگی سے بہرہ یاب گویا یہ سلسلہ جاری ہے ؎

(ا)یں مثل شہرۂ عالم است   کہ ہر کس ہنر بیش، روزی کم است

(ا)فلاطون بہ سکندر :-

دنیا کی اونچ نیچ اور نفسی نفسی کا عالم، کسی کا ضرر دوسرے کے لئے نفع ؎

رنج در حاصل چون برد   گر از ہیچ او دیگری برخورد
خورد در خواب نان و کباب   یکی را نیا مد خود از فاقہ خواب

سخن کی مدح و ثنا :- جو چپ رہے وہ مردہ، جو بولے زندہ :-

(سخن) می گو ہر آدمی   گرامی ترین جوہر آدمی
(سخ)ن گر نہ جان است بنگر بہوش   چرا مردہ یابی سراپا خموش

ہم کو عبث بدنام کیا (جبر و قدر) :-

(ر)ی چو را ہم تو دادی نخست   ز من ہر چہ خیزد تقدیر است

(ل)وگ تحسین یا نفرین سے کیوں بہت زیادہ متاثر (ہو) جاتے ہیں امیر کو حیرت ہے :

(ب)یشی و کمی نیست در مغز و پوست   ز نفرین بدخواہ و تحسین دوست
(ن)دانم چرا مردم سنگ دل   ازیں شاد گردند وزاں تنگ دل

قوم فرنگ اور جزیرۂ قبرص کے بحری قزاقوں کا ذکر:-

(ج)زیرہ کہ خوانند قبرص بنام   شد ایں قوم بے عاقبت را مقام

ملک شام کے سوداگر آرمینیا کی طرف جاتے ہوئے :-

(ب)ر شامیم بازرگانی سہ چار   بارمینیا ی کشید یم بار

۴۔ ہشت بہشت

حمد

اے کشایندۂ خزانۂ جود   نقشِ پیوندِ کارگاہِ وجود
بودنی را ہمیشہ بود از تو   بود نابود را وجود از تو

(تو جود و سخا کے خزانے کا کھولنے والا، کارگاہِ وجود کو جوڑنے والا، وجود و عدم تیرے ہی دم سے ہے کہ تو ابدی و ازلی ہے)۔

نعت

روشنائی دہِ چراغِ یقیں   نور بخشِ شمعِ باز پسیں
نور او کز سپہر صد چند است   مہ شگاف و سپہر پیوند است
انبیا پیش آں خجستہ چراغ   طفلِ گہوارہ در مقامِ بلاغ

آنحضرتؐ یقین کے دیے کو روشنی بخشنے والے اگلوں کے لئے نور اور بعد والوں کے لئے شمع ہیں۔ سو آسمانوں سے آپ کا نور ہے۔ چاند تو اس کا شگاف ہے اور آسمان پیوند کا ٹکڑا۔ ان کے آگے انبیاء کی مثال بالغ اور طفلِ گہوارہ کی ہے۔

مدح شاہ

گرد چوں بخشش خاصگاں ہمہ چیز   داد بخش گناہ گاراں نیز
ناوک پیکانش در مقامِ ہنر   بردہ داغ کلف ز روئے قمر
فتح برخاکِ پائے او زدہ فرق   فتنہ در آبِ تیغِ او شدہ غرق

(اگر وہ اچھوں کو صلہ و بخشش سے نوازتا ہے تو گنہگاروں کو انعامات بھی دیتا ہے۔ اگر وہ تیراندازی کا کمال دکھانے پر آجائے تو چاند کے داغ کو چھیل کر صاف کر دے۔ فتح اسکے پاؤں پڑی رہتی ہے اور اسکی تلوار کے جوہر میں ہر فتنہ غرق ہو جاتا ہے۔

سلمان عباسی :-

کلامِ خسرو میں قومی یک جہتی

در چار حد گوی تو افتادہ بینی بندہ را
تن یکطرف، جاں یکطرف، سر یکطرف، پا یکطرف

امیر خسرو دہلوی کی شخصیت اور ان کے منظوم و منثور شاہکاروں کا اگر بنظر غائر مشاہدہ اور مطالعہ کیا جائے تو محامد و محاسن کی اتنی بڑی تعداد بر آمد ہوگی جس کا شمار کرنا اگر غیر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہوگا۔ انکی ساری زندگی ایک معجزہ اور کرشمہ تھی۔ وہ جامع الحیثیات تھے ان کے فنی کمالات کے زندۂ جاوید ہونے کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ جیسا جیسا زمانہ گذرتا جارہا ہے، خسرو اور ان کے کلام کی قدر و قیمت بڑھتی جارہی ہے۔ خسرو بیک وقت مرد صوفی، شاعر، ادیب، مصنف، مورخ، موسیقار، داستان گو۔ قصہ نویس۔ سپاہی۔ مصاحب اور بہت سی دیگر خصوصیات کے حامل تھے وہ نہ صرف مذکورہ بالا حیثیات کے مالک ہی تھے بلکہ ان کو تمام شعبہ جات پر عبور، دسترس اور قدرتِ کاملہ حاصل تھی۔ خسرو کی نظم و نثر کے نمونے دیکھنے کے بعد ان کی ذہانت، ذکاوت اور قابلیت کا قائل اور معترف ہو جانا پڑتا ہے۔ انھوں نے مثنویات، قصائد، غزلیات اور دوسرے اصناف سخن کے علاوہ نثری تخلیقات کے لئے جن موضوعات کا انتخاب کیا حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ ان کا کلام صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے لاثانی اور لافانی ہے۔

کلامِ خسرو اپنی گوناگوں خصوصیات اور محاسن کے لئے تاریخ شعر فارسی میں ایک نمایاں، منفرد اور ممتاز مقام رکھتا ہے۔ خسرو کو فارسی اور ہندوی زبانوں کی مشترکہ شاعری کا موجد اور باوا آدم تسلیم کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں پرورش اور پرداخت پانے والے فارسی شاعری کے ایک خاص طرز "سبک ہندی" کے تاجدار اول کے طور پر بھی ان کی عظمت اور اہمیت اپنی جگہ پر مسلّم اور برقرار ہے ان کے کلام کے رنگ و آہنگ موضوعات و عنوانات اور لفظی و معنوی حسن و قبح کے بیان یا انکو تنقید کی کسوٹی پر جانچنے اور پرکھنے کے بجائے زیر نظر سطور میں صرف

اس امر کا جائزہ لینا مقصود ہے کہ خسروؔ کے کلام میں وطن دوستی اور قومی یکجہتی کے عناصر کس حد تک موجود ہیں، جن کی وجہ سے انھیں ہندوستانی شعرا میں پہلا "قومی اور عوامی شاعر" ہونے کا شرف امتیاز بھی حاصل ہے۔

خسروؔ کے منظوم و منثور شاہکاروں کو دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے بے انتہا عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ اپنے وطن سے ان کی محبت اور بھائی چارے کا اظہار دکھاوے کے لئے نہیں بلکہ شعوری طور پر صحیح معنوں میں انکے دل میں موجود تھا۔ از منہ قدیم سے ہندوستان میں تقریباً ہر شخص وطن کو اپنی جائے پیدائش یا اپنے قریہ، گاؤں، موضع، شہر وغیرہ کے معنی میں استعمال کرتا آیا ہے۔ لیکن خسروؔ نے لفظ وطن کے معنی اور مفہوم کو وسعت اور ہمہ گیری بخشی، وہ سارے ہندوستان کو اپنا وطن شمار کرتے ہیں۔ اور یہاں کے عوام و خواص، شہر و بازار، دریا پہاڑ، پھل پھول۔ درخت پودے، کھیت کھلیان، جنگلات اور باغات، غرضکہ حسن قدرت کے تمام مظاہر سے شیفتگی اور دیوانگی کی حد تک محبت کرتے ہیں ان کے نزدیک خاک وطن کا ہر ذرہ کیمیا سے بہتر ہے۔ خسروؔ کے فکر و فن کی یہی سب سے بڑی انفرادیت اور خصوصیت ہے جسکے سبب انھوں نے ہندوستان کے پہلے "قومی اور عوامی شاعر" کی حیثیت سے سند قبولیت اور اپنے ہمعصروں نیز متاخرین میں امتیاز خاص حاصل کیا۔ خسروؒ کی نظم و نثر میں جابجا ایسے عناوین اور مضامین موجود ہیں جن کی مدد سے ساتویں صدی ہجری کے ہندوستان میں مختلف قوموں، فرقوں اور گروہوں کے درمیان رشتہ یکجہتی کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی کوششوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ انکی تحریروں میں یکجہتی کے سلسلہ میں جو بیانات ملتے ہیں ان میں عوام کے تمام فرقوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور رسوم و رواج کی باہمی پابندیوں کو قبول کرنے کی تمام فریقین سے پرزور اور مدلل سفارش کی گئی ہے خسروؔ کے فنی شاہکاروں میں ایسی لاتعداد مثالیں موجود ہیں جن میں سرزمین وطن کی عظمت اور خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے وطن، یہاں کے عوام، مناظر قدرت، رسوم و رواج، اور درو دیوار سے اپنی محبت کا اظہار اتنے مؤثر پیرایہ میں کیا ہے کہ دوسروں کے دلوں میں بھی حب وطن اور باہمی اتفاق کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔

کلام خسروؒ میں دوسرے شعراء کے کلام کی بہ نسبت قومی یکجہتی اور وطن پرستی کے جذبات و خیالات پر مشتمل جتنے اشعار، نظم۔ اور اشارے ملتے ہیں وہ اپنی حقیقت کو ہر ایک سے تسلیم کروا لینے کے لئے کافی ہیں۔ لیکن اگر اس امر پر غور کیا جائے کہ خسروؔ کے کلام میں ان عناصر کی بہتات اور وافر نمایندگی شعوری یا غیر شعوری طور پر آخر کیوں موجود ہے؟ تو چند نکات ایسے بھی زیر نظر آئیں گے جو شاعر کی مذکورہ شاعرانہ حیثیت اور شخصیت کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

• مختلف النوع مکتب ہائے فکر و نظر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو کسی ایک مرکز خیال پر مجتمع کرنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ ان کی زبانوں اور تہذیبوں کے درمیان فاصلے کی جو خلیج ہو اولاً اُسے پُر کیا جائے۔ خسروؔ نے وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ہندوستان میں ایک ایسی زبان کو رواج دیا جو فارسی اور ہندوستانی زبانوں کے درمیان ایک رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مشترکہ زبان کو خود خسروؔ نے "ہندوی" کا نام دیا۔ ہندوی زبان میں ان کا کلام بے انتہا مقبول ہوا اور ہندوستان کے ہر فرقہ

اور ہر طبقے کے لوگوں کے لئے یکساں طور پر قابل قبول نیز ذہنی طور پران کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں مددگار ثابت ہوا۔ فارسی اور ہندوستانی کی آمیزش سے انھوں نے جو کلام تخلیق کیا ہے وہ آج بھی اپنی ادبی اہمیت اور افادیت کے لئے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ خواجہ امیر خسرو نے خود بھی اپنی ایجاد کردہ ہندوی زبان پر فخر کا اظہار کیا ہے ؎

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

ذیل میں ان کی ایک "ہندوی غزل" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خوار شدم زار شدم لٹ گیا
در غمِ ہجراں تو کمر ٹوٹ ہے
یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من
بے گنہم ساتھ عجب روٹھا ہے
روئے تو رونق شکن آفتاب
سرو بہ پیشِ قد تو بوٹا ہے
گاہ نہ خسرو تو نہ گفتہ کہ بیٹھ
وہ چہ کند بھاگ مرا پھوٹ ہے

خسرو کی مندرجہ ذیل غزل بھی شائد اسی مناسبت سے اُردو کی پہلی غزل کہی گئی ہے کہ اس میں فارسی اور ہندوستانی زبان کے اختلاط سے ایک نئی زبان ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ غزل کے چند اشعار دیکھنے سے یہ اندازہ ہوگا کہ شاعر موصوف کی یہ غزل ہندی کا ایک ایسا نادر نمونہ ہے جس نے اس طرزِ سخن کو سخن سنجوں اور سخن فہموں سے ایک باقاعدہ زبان کی حیثیت سے تسلیم کروانے میں نمایاں اور منفرد رول ادا کیا ہے۔ اور یہی زبان بعد میں حوادث روزگار سے باہم دست وگریباں ہوتی ہوئی اُردو زبان کے نام سے مشہور ہوئی مذکورہ غزل کے چند شعر منقول ہیں ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل، دُرائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف وروزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل، دو چشم جادو، بصد فریبم، ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں، چو ذرہ حیراں، ز مہر آں ماہ گشتم آخر
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں
بحق روزِ وصالِ دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت منکے درائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

کلام خسرو میں خالص ہندوستانی طرز فکر کے علاوہ ایک ایسی موہنی اور عام فہم زبان بھی ملتی ہے جو انکی ہندوستان گیر شہرت اور مقبولیت کی شاہد اور ضامن ہے اسی زبان کی بدولت خسرو نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں قومی اور عوامی شاعر کی حیثیت سے شہرت اور انفرادیت حاصل کی، اور اسی زبان کے سہارے ہندوستانی عوام کو اپنا گرویدہ بنانے میں درجہ کمال حاصل کیا۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں مذکور ہے خسرو کو اپنے وطن ہندوستان کے ذرّے ذرّے سے بے پناہ محبت اور عقیدت ہے وہ اپنی تخلیقات میں جابجا یہاں کے قدرتی اور فطرتی حسن اور مناظر کا ذکر کرتے ہیں۔ عام زندگی میں روزمرہ پیش آنے والے معمولی معمولی واقعات کو انھوں نے جس طرح موضوع بحث بنایا ہے۔ وہ انھیں کا خاصہ ہے۔ ذیل میں خسرو کے ایک قطعہ کو نقل کیا جا رہا ہے جسمیں انھوں نے

اپنے وطن کی ایک دہی بیچنے والی عورت کو تخلیق کا موضوع بنایا ہے ؎

گجری کہ تو در حسن و لطافت چو مہی
آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی
از ہر دو لبت قند شکر می ریزد
ہر گاہ بگوی کہ "دہی لیہو دہی"

شاید اسی لئے ہر چیز کے حسن و قبح پر ان کی نظر رہتی تھی وہ حسن کے شیدائی اور متوالے تھے۔ انھیں حسن و جمال کی جھلک جہاں کہیں نظر آجائے اس پر فریفتہ ہو جائیں اپنی حسن پرستی کو انتہائے کمال پر پہونچانے میں انکی فکر کے علاوہ سلاست زبان اور اسلوب نگارش کو بھی بڑا دخل ہے۔ ذیل کے شعر میں وہ خود اپنے حسن کی طرف مائل نظر آتے ہیں ؎

نے گلم، نے بلبلم، نے شمع، نے پروانہ ام
عاشقِ حسنِ خودم بر حسن خود دیوانہ ام

جس طرح خسرو اپنے حسن پر فریفتہ ہیں دوسروں کے حسن پر بھی ان کی نظر اتنی ہی صحیح پڑتی ہے۔ دراصل دوسروں کے حسن سے قطع نظر کر کے جب کوئی شخص اپنی ذات میں محدود ہو جائے تبھی اسے اپنی ہستی میں حقیقی حسن کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ورنہ دنیا کی ہر چیز اس کی نظر میں حسین و جمیل ہونے کے باوجود بے کشش اور غیر جاذب نظر ہوتی ہے۔ خسرو کی حسن پرستی کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے حسن سے قطع نظر کر کے ایک معمولی سنار کے لڑکے کے حسن کا ذکر کرتے ہوئے فخر و انبساط محسوس کرتے ہیں۔ ذیل کا قطعہ مذکورہ امر کا شاہد ہے اور خسرو کی زبان ہندوی کے نمونے کے طور پر بھی اسے پیش کیا جا سکتا ہے۔ عام فہم اور عوامی زبان کے استعمال پر انھیں واقعی مہارت تامہ حاصل ہے قطعہ دیکھئے ؎

زرگر پسری چو ماہ پارا   کچھ گڑھئے سنوارئے، پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست   پھر کچھ نہ گڑھا نہ کچھ سنوارا

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے خسرو کے مزاج اور کلام میں حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے عناصر وافر مقدار میں موجود ہیں لیکن انھوں نے شعوری طور پر ان کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ ان کے کلام اور افکار کا ایک بڑا حصہ مذکورہ بالا عناصر پر ہی مشتمل ہے۔ ان کے افکار و خیالات میں قومی یکجہتی کے عناصر یقیناً اس جذباتی ہم آہنگی کی وجہ سے منصۂ شہود پر آئے ہوں گے۔ جو انھیں لشکر کی زندگی اور مسلسل گیارہ مختلف المزاج حکمرانوں کے درباروں سے وابستگی کے بعد نصیب ہوئی تھی۔ کسی بھی لشکر اور دربار کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہاں موجود ہونے والے لوگ کسی خاص طرز یا نہج کے تحت زندگی گزار رہے ہوں۔ ہر دو جگہیں ایسی خصوصیات کی حامل ہیں جہاں ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر قوم کے افراد و اشخاص ایک دوسرے کے دکھ درد، آرام و آسائش اور تکالیف و مصائب کے وقت آپس میں ہمدرد اور ہمنوا بن جانا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ لشکر کی بے ترتیب زندگی اور درباروں کی حد سے زیادہ مصنوعی تہذیب والی زندگی۔ تقریباً دونوں یکساں حیثیت کی حامل ہیں۔ خسرو اپنے مختلف ہم وطنوں کے ساتھ سلاطین ہند کی افواج میں بھی شامل رہے اور کئی جنگوں میں براہ راست حصہ بھی لیا۔ نیز ہر طبقہ، فرقہ اور ذات کے لوگوں کے ساتھ رہتے بستے آخر ان کا مزاج قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا ترجمان اور آئینہ دار بن کر رہ گیا۔ گیارہ درباروں میں مختلف عہدوں اور منصبوں پر فائز رہنے کے بعد ان کے مذکورہ بالا نصب العین کو تقویت، جلا اور بقا حاصل ہوئی۔

اپنے قومی افکار و خیالات کی مقبولیت کی بنا ہی پر وہ خود کو اپنے وطن کا جزو سمجھنے لگے تھے اور وطن عزیز کی ہر چیز سے ان کی دلچسپی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اپنے عمیق مشاہدے اور فکر و تخیل کے سہارے انھوں نے آسان زبان میں جس "ہندوستانیت" کا اظہار کیا ہے۔ وہ بالکل غیر شعوری ہونے کے باوجود عام ہندوستانیوں کو دعوت فکر و عمل دیتی ہے گو کہ خسرو ہندو تصور الوہیت کے ہرگز قائل نہ تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے ایک ایسے نکتہ پر توجہ مرکوز کی ہے جس سے وحدانیت و ابدیت کی تبلیغ ہوتی ہے۔ خود سوزی اسلام میں قطعی جائز نہیں ہے لیکن ہندوستان کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں ایک ہندوستانی عورت کے "ستی" ہو جانے کا انھوں نے بڑے اچھے انداز میں جائزہ کیا ہے۔ ذیل کا شعر ملاحظہ ہو ۔

چوں زنِ ہندو کسی در عاشقی دیوانہ نیست
سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست

اس طرح وہ مثنوی "ہشت بہشت" میں اپنے ہمسفر عازمین حج کو سبق دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے ایک ہم وطن ہندو برہمن کے جذبات اور خیالات کی قدر کریں جو عقیدت و ارادت میں اپنے سینے کے بل "پرکرما" کرتا ہوا "سومنات" کے مندر تک پہونچتا ہے۔

خسرو کے دل میں وطن دوستی کا جذبہ موجزن تھا انھوں نے دلّی میں اپنی عمر عزیز کے چھیاسٹھ (۶۶) سال گذارے وہ دلّی کے چپے چپے سے عشق حقیقی رکھتے تھے اور اپنے کلام میں بھی جابجا دلّی کی تعریف کرتے تھے۔ وہ اسے ہندوستان کے دوسرے شہروں پر فوقیت دیتے تھے، اسکا اظہار انھوں نے اپنی مختلف نظموں میں بھی کیا ہے۔ مجموعہ "غرۃ الکمال" کے دیباچہ میں انھوں نے دلّی کو "حضرت الاسلام" "قبلہ شاہ ہفت اقلیم" اور "جنت الفردوس" کے نام سے یاد کیا ہے۔ انھوں نے اپنی مشہور تصنیف "خزائن الفتوح" میں شہر کے خوبصورت ذخیرہ آب "حوض شمسی" کا ذکر بڑی وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔ یہ حوض سلطانی بھی کہلاتا ہے اور شہر کی خوبصورتی بڑھانے کے لئے سلطان التمش نے (۶۲۷ھ) مطابق ۱۲۲۹ء) میں یہ حوض تعمیر کرایا تھا، جہاں سے شہر کے لوگوں کو ٹھنڈا اور میٹھا پانی میسر ہوتا تھا خسرو کی ایک اور تصنیف "اعجاز" میں "اودھ" (اجودھیا) کے باغات، اشجار، پھل، پھول۔ اسکے باشندوں کے اخلاق و آداب وغیرہ کے خصائل بیان کئے گئے ہیں یہاں انھوں نے اپنے مربی اور ممدوح سلطان کیقباد کی مصاحبت میں کچھ دن گزارے تھے اور اچھا تاثر حاصل کیا تھا جسے اپنی تصنیف میں پیش کر دیا ہے۔

"قران السعدین" جو کہ مثنوی در صفت دہلی کے نام سے بھی موسوم ہے، میں خسرو نے بنگال کی نفیس، باریک ململ اور یہاں کے نازک بدن لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کا جسم اس کپڑے کے اندر سے جھلملا کرتا ہے۔ اس زمانے میں بعض پارچہ جات تو اتنے خاص اور اہم ہوتے تھے کہ ایک انگوٹھی کے حجم سے پورا تھان گذر جاتا تھا۔ مذکورہ مثنوی میں خسرو نے جابجا دہلی کی عظمت اور خوبیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ خسرو نے شہر دیوگیر (دولت آباد) اس کے کپڑے اور موسیقاروں کی تعریف و ستائش کرتے ہوئے اپنے مجموعہ "نہایت الکمال" میں الفاظ و معانی کو اپنی آخری حد پر پہونچا دیا ہے۔

امیر خسرو کا شاہکار ان کی مثنوی "دول رانی اور خضر خاں" بھی ہے جو از اول تا آخر ہندوستانی ماحول اور

فضائی ڈرامائیہ اور پُر درد ہے یہ مثنوی ـــــ "عشقیہ"، "آغاز عشق" اور "منشور شاہی" کے ناموں سے بھی مقبول ہے۔ گجرات کے راجہ کرن دیو کی نازک اندام و پری پیکر بیٹی دول رانی اور علاء الدین خلجی کے بیٹے خضر خاں کے عشق کی داستان کے طور پر خسرو نے تخلیق کی تھی یہ طربیہ اور المیہ شاعری کے بہترین نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں سوز و گداز، جوش و خروش اور جادو بیانی اپنے پورے عروج شباب پر ہے۔ مذکورہ مثنوی میں دو محبت بھرے دلوں کی جان سوز واردات قلبی اور مہجور عاشقوں کی ایسی المیہ کہانی ہے جس میں تجسس، تحیر، فنی محاسن اور زبان و بیان کی رنگارنگی سے نئی جان ڈالی گئی ہے۔

مذکورہ مثنوی کے علاوہ "مثنوی نہ سپہر" خسرو کی ان نمایاں اور منفرد تصانیف میں شمار ہوتی ہے جو ہندوستان کے ماحول، تہذیب و تمدن اور یہاں کی زبان کے اعتبار سے بھی اور ادبی و فنی حیثیت سے بھی ایک ممتاز مقام کی حامل ہے۔ مثنوی نہ سپہر میں نو باب مختلف عناوین کی تعریف و توصیف میں لکھے گئے ہیں اور ہر باب میں علیحدہ علیحدہ بحروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن زیر نظر مثنوی کا تیسرا باب صرف ہندوستان کی سرزمین یہاں کے عوام اور تہذیب و تمدن نیز مناظر قدرت کے متعلق ہے وہ ہندوستان کو تمام دنیا کے مقامات سے اعلیٰ گردانتے تھے اور یہاں کے انسان، رسم و رواج، مذہب، طور طریق، زبان، لباس، عمارات، باغات چمن، میوے، پھل پھول، پرندے، دریا، پہاڑ، جانور، میدان، سبزہ زار اور دوسری تمام چیزوں کے مداح اور توصیف گزار تھے۔

انھوں نے مذکورہ مثنوی میں ہندوستان کی اہمیت اور عظمت کو اجاگر کیا ہے اور اس کی فوقیت کو برقرار رکھنے کے لئے کئی دلائل پیش کئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہندوستان میں جملہ علوم و فنون نے دوسرے ممالک کی بہ نسبت زیادہ ترقی کے مدارج طے کر لئے ہیں۔ یہاں مختلف خطوں سے تحصیل علوم کے لئے لوگ آتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ دنیا کی ہر زبان پر عبور حاصل کر لینے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں اس ملک نے دوسرے ممالک کو دیکھتے ہوئے فن موسیقی میں سب سے زیادہ ترقی کی۔ شطرنج (بازی) اور صفر (ہندسہ) کی ایجاد بھی ہندوستان ہی میں ہوئی۔ وید جیسی مقدس اور قابل قدر تصنیف بھی یہیں کا خاصہ ہے جو مذہب، سیاست، معاشرت اور موسیقی کا ایک گنج گرانمایہ ہے سرزمین ہند ہی پر "پنچ تنتر" کی تکمیل عمل میں آئی ـــــ (جس کا فارسی، عربی، اور ترکی وغیرہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے)۔ اور ہندوستان کی مدح و ستائش کرنے کی سب سے آخری اور اہم شرط انھوں نے یہ بتائی ہے کہ یہاں کی سرزمین پر خسرو جیسا شیریں بیان اور سحر طراز شاعر پیدا ہوا۔

واقعی شیریں بیان اور سحر طراز شاعر مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں، پھر خسرو جیسی صاحب فن اور جامع کمالات شخصیات جو علم و ادب، شعر و فن اور غنا و موسیقی کے علاوہ دیگر مروجہ علوم و فنون پر سند کی حیثیت رکھتی ہو، کہیں صدیوں بعد ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ جو صدیوں تک اپنے علم و فن کی روشنی سے دنیا کو منور اور روشن رکھتی ہیں۔ اور جن کی ذات سے دنیائے ادب میں پرانے چراغوں سے نئے چراغوں کے جلنے کا سلسلہ روز ازل سے آج تک جاری ہے۔

خسرو کی شخصیت ہمہ جہت اور ہمہ گیر تھی وہ ایک جامع الحیثیات شخصیت کے مالک تھے ان کا فن لازوال اور لافانی قدروں کا ایک حسین مرقع ہے۔ خسرو کے کلام کا ایک بڑا

حصہ، حب وطن، باہمی اتحاد، قومی یک جہتی، اور جذباتی ہم آہنگی کے موضوعات سے متعلق ہے جس کی چند منتخب مثالیں گذشتہ سطور میں درج کی جا چکی ہیں۔ ان کے وطن دوستی کے موضوعات پر مشتمل اشعار کی تعداد چونکہ خاطر خواہ اور تسلی بخش ہے اس لئے زیر نظر کلام کی روشنی میں ان کی اس قسم کی شعوری یا غیر شعوری کوششوں کی بڑی اہمیت ہے، جنکے ذریعہ انھوں نے ادب کو عوامی اتحاد اور قومی یکجہتی کے فروغ کا وسیلہ بنایا۔

خسرو کے ہمعصر اور متاخرین دونوں ان کی عظمت، اہمیت اور انفرادیت کے قائل اور معترف ہیں۔

عرفی شیرازی نے خسرو کو طوطیٔ ہند کے لقب سے یاد کیا ہے اور ان کی شیریں زبانی نیز جادو بیانی کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ہندوستانی شعراء کے سرخیل کے درجہ سے نوازا ہے ؎

بر روح خسرو ایں پارسی شکر دادم
کہ کام طوطیٔ ہندوستان بود شیریں

رباعی خسرو

وصف شرف تو بیش از ادراک آمد
سبق ادبت نعبدُ ایاک آمد
توقیع تو کز صحیفۂ پاک آمد
لولاک لما خلقت الافلاک آمد

ترجمہ خضر برنی

تیری توصیف کو عقل و خرد سے بھی سوا پایا
ادب سے تیرے درس بندگی کو ہم نے اپنایا
کتاب آسمانی میں یہی نکتہ نظر آیا
تمھاری ذات کے باعث ہوا افلاک کا سایا

(خضر برنی)

رئیس احمد نعمانی ،

خسرو کے کلام میں صنائع و بدائع کا استعمال

صنائع صنعت کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ہنر، پیشہ، کاریگری وغیرہ۔

بدائع جمع ہے بدیع کی جس کے معنی ہیں عجیب و غریب شے، نئی پیدا شدہ چیز، ایسے انداز پر کیا ہوا کام یا ایسے طریقے سے تیار کی ہوئی چیز جس کی پہلے سے مثال موجود نہ رہی ہو۔

علمائے بلاغت اپنی اصطلاح میں صنائع و بدائع سے الفاظ و معانی کی وہ خاص رعایتیں مراد لیتے ہیں جن سے بقول ان کے کلام کی معنی خیزی اور لطافت دوبالا ہوتی ہے اور اس کی ظاہری و معنوی خوبیوں میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔

فارسی شاعری (بلکہ نثر نگاری بھی) کئی صدیوں تک ایسے ارباب علم و فضل کا بازیچۂ ذہن و قلم رہی ہے جو صنائع و بدائع کے مطلق استعمال ہی کو معراج شعر و ادب سمجھتے تھے لیکن شعر و ادب کا رشتہ جوں جوں صحیح شعور اور تہذیب فکر سے مستحکم ہوتا گیا یہ بات واضح ہو گئی کہ اگر کلام فصیح و بلیغ ہے تو صنائع و بدائع کا سلیقہ مندانہ استعمال بعض اوقات اس کی خوبی میں کچھ اضافہ یقیناً کر سکتا ہے، مگر اس کو لازمۂ کلام کا درجہ کسی قیمت پر نہیں دیا جا سکتا۔

صنائع و بدائع کے استعمال کا جواز

ایران کے نامور صاحب قلم اور فارسی شعر و ادب کے مسلّم ناقد اور محقق استاد بدیع الزماں فروزانفر نے اپنی گرانقدر کتاب "سخن و سخنوران" میں اسدی طوسی، عبدالواسع جبلی اور رشید الدین وطواط کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے، جہاں جہاں صنائع و بدائع کا ذکر کیا ہے اس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ صنائع و بدائع کے استعمال سے کلام کی معنوی زیبائی، فصاحت اور حقیقی حسن غارت ہو کر کلام بے تاثیر ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی تو بالکل ہی دائرہ بلاغت سے خارج ہو جاتا ہے۔[۱] ......

اسی طرح علامہ شبلی نعمانی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب شعر العجم میں صنائع و بدائع کے استعمال کو "کوہ کندن اور

۱۔ کتاب مذکور کے صفحات ۳۰۹، ۳۲۴ اور ۳۴۰ ملاحظہ ہوں

کاہ برآوردن" بتایا ہے[1]۔

برخلاف اس کے بعض فاضلوں نے صنائع وبدائع کے دقائق سے سرزمین شاعری میں حدائق سحر کی چمن بندی کی کوشش کی ہے[2]۔

میرے نزدیک انصاف کی بات یہ ہے کہ نہ تو رشید و طواط[3] کے خیال کے مطابق صنائع وبدائع کا فیضان دقائق شعر میں حدائق سحر کی روشیدگی کا سبب بنتا ہے اور نہ شبلی کی رائے کے موافق اس کو یک قلم کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا مصداق قرار دیا جا سکتا ہے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ جس طرح قدرتی حسن کے لئے مصنوعی زیور شرط نہیں مگر متناسب آرائش کبھی کبھی حسن کی دلکشی اور دلفریبی میں بلا شبہ اضافہ کر دیتی ہے اسی طرح صنائع وبدائع لازم کلام میں شامل نہ ہوتے ہوئے بھی اگر فنکارانہ چابکدستی سے استعمال ہوں تو کبھی کبھی کلام میں دو آتشہ کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں اور یہ ان کے ایک حد تک استعمال کے جواز کی دلیل بننے کے لئے کافی ہے۔

خسرو سے پہلے صنائع وبدائع کا استعمال

فارسی ادبیات کی باضابطہ تاریخ تیسری صدی ہجری کے نصف (یعنی خسرو سے ساڑھے تین چار سو سال قبل) سے مرتب کی جا سکتی ہے[1]۔ اس طویل مدت میں فارسی زبان میں صدہا شاعر پیدا ہوئے جن میں سے ہر ایک کے کلام میں صنائع وبدائع کے استعمال کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اور کم و بیش بیس[2] شاعر تو ان میں سے ایسے ہیں جن کے کلام میں معتدبہ نمونے ان کے استعمال کے موجود ہیں اور پانچ شاعر تو اس خصوص میں نہایت ہی ممتاز نظر آتے ہیں۔ اسدی طوسی۔ امیر معزی، عبدالواسع جبلی، رشید وطواط، قطران تبریزی۔ اور خاقانی شیروانی، ..... اسدی، جبلی اور وطواط کے متعلق استاد فروزان فر کے محولہ بالا بیانات شاہد ہیں کہ ان کا کلام حسن تاثیر سے عاری ہے۔ معزی نے زیادہ تر صنعت لف ونشر (یا کہیں کہیں صنعت سیاقۃ الاعداد بھی) استعمال کی ہے۔ خاقانی کو صرف لزوم مالا یلزم میں دستگاہ حاصل ہے۔ ہاں ایک قطران ہے جس کے بارے میں فروزانفر جیسے اساتذہ ادب کی رائے یہ ہے کہ اکثر صنائع وبدائع کو ایسے خوبصورت انداز میں کلام میں جاگزیں کیا ہے کہ پڑھنے والے کو پہلی نظر میں ان تکلفات کا احساس نہیں ہوتا[3]۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایرانیوں کے پاس ان کی پوری فارسی شاعری کی تاریخ میں صرف ایک شاعر ہے جو خسرو کے اقتضا کی

---

[1] ملاحظہ ہو جلد دوم ص ۱۲۲ ذکر امیر خسرو۔ [2] رشید الدین وطواط کی کتاب "حدائق السحر فی دقائق الشعر" کی طرف اشارہ ہے۔

[3] رشید الدین وطواط اپنے زمانہ کا بہت بڑا استاد شعر و ادب تھا اور بقول صاحب رسائل البلغا علامہ زمخشری جیسے یگانۂ روزگار فاضل پر ادبی مسائل کے سلسلے میں ایسے اعتراض کیا کرتا تھا۔ کہ علامہ جواب دینے کی بجائے ان کو صحیح تسلیم کرتے تھے (رسائل البلغاء ص ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، مطبوعہ مصر۔

[4] بمطابق حوالہ سخن و سخنوران ص ۳۲۴

---

[1] شعر با ستان حصہ دوم ص ۵ مولفہ ڈاکٹر نواد حسن

[2] خسروی سرخسی، کسائی مروزی، فردوسی، اسد طوسی، عنصری، ناصر خسرو، مسعود سعد، امیر معزی، عبدالواسع جبلی، رشید وطواط، عمعق بخارائی، ادیب صابر، حکیم سنائی، انوری ابیوردی، قطران تبریزی، اثیر اخسیکتی، جمال اصفہانی، مجیر بیلقانی، خاقانی شروانی، نظامی گنجوی وغیرہ۔

[3] سخن و سخنوران ص ۴۹۴

صلاحیت رکھتا ہے۔ افسوس قطران کا دیوان اس وقت میری دسترس سے باہر ہے۔ ورنہ موازنہ اور خسرو کی خسروی کی دلیلیں ذکر کرنا لطف سے خالی نہ ہوتا۔

خسرو کی قلمرو سخن میں

اوپر کے بیان سے واضح ہے کہ صنائع و بدائع کو خوبی و لطافت کے ساتھ استعمال کرنے کے باب میں فارسی شاعری کی گذشتہ تاریخ خسرو کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہے؟ خسرو کے بعد بھی آج تک صرف ایک قاآنی ہے جس نے امیر معزی اور عبدالواسع جبلی وغیرہ کی تقلید میں صنعت تسمیع اور لف نشر وغیرہ کا اہتمام کیا ہے درہیں۔ لیکن ہمارے خسرو کی طبع کا سکہ صنائع و بدائع کی مملکت میں بھی ہر طرف چلتا ہے اور جس طرح بعض دوسرے خصائص میں انکی برتری مسلّم ہے اسی طرح صنائع و بدائع کے استعمال میں انکی ذہانت و فطانت اور انفرادیت کا ثبوت ہیں وہ اشعار جن میں خسرو نے اقسام اور تعداد دہرا اعتبار سے ان کا استعمال بکثرت کیا ہے مگر اکثر و بیشتر حسن معنوی اور تاثیر کلام اس سے متاثر نہیں ہوئی ہے۔

خسرو کی طبع بلند اور ذہن رسا نے صنائع و بدائع سے جو رنگا رنگ نگارخانہ سجایا ہے اس کی سرتاسر سیر کے لئے کئی سال اور اس سیر کی روداد قلمبند کرنے کے لئے کئی سو صفحات درکار ہیں۔ اس مختصر مضمون میں صرف کہیں کہیں سے خسرو کے اس چمن صد رنگ کے بعض مناظر کی طرف آپکی توجہ کو منعطف کراؤں گا۔ خسرو نے مندرجہ بالا صنعتیں بہت کثرت سے استعمال کی ہیں:-

(۱) تجنیس یا جناس:- کلام میں ایسے دو لفظ لانے کو کہتے ہیں جو تلفظ یا تحریر میں یکساں ہوں اور معنی میں مختلف، اس کی متعدد شکلیں ہیں جن کے الگ الگ نام ہیں اور ہر ایک کی مثالیں خسرو کے کلام میں کثرت سے موجود ہیں۔ متفرق مقامات سے دیوان خسرو کے مطالعہ کے دوران جو مثالیں مجھے ملیں ان میں سے چند یہ ہیں ؎

کشادی چشم خواب آلودہ را باز
در فتنہ بعالم کردہ ای باز
من از آں گہے کہ دیدم بہ دو چشم خوابناکت
بہ دو چشم خوابناکت کہ اگر شبے بخفتم

ان شعروں کے نشان زدہ الفاظ تلفظ اور املا میں یکساں ہیں صرف معنی مختلف ہیں اور اس کو تجنیس تام کہتے ہیں ؎

بہ رخ خاک درت رُفتیم ورَفتیم
دعائے دولتت گفتیم ورَفتیم

رُفتیم ورَفتیم میں معنی کے ساتھ حرفوں کی حرکات بھی مختلف ہیں۔ اس کو تجنیس ناقص یا تجنیس محرّف کہتے ہیں ؎

نفسے بروں نہ دادم کہ حدیث دل نہ گفتم
سخنے نہ گفتم از تو کہ وز دیدہ درنہ سفتم
ہرگز ز دور چرخ وفائے نہ یافتم
واز گلشن مراد صفائے نہ یافتم

نشان بردہ الفاظ میں حرف طرف (کنارے کا حرف) مختلف ہے اس کو تجنیس مطرّف کہتے ہیں ؎

وقت گل مست نوش کن بادہ چوں گلاب را
بلبلِ نغمہ ساز کن بلبلۂ شراب را

ایک جنس کے دو لفظوں میں سے ایک حرف زائد ہے، اس

کو تجنیس زائد کہتے ہیں ؎

اے شدہ ماہ منادیدۂ بدخوئے مرا
دیدہ ای ہیچ گہ آں ماہ جفاجوئے مرا

جو اور خو کا املا یکساں ہے صرف نقطوں میں فرق ہے اس کو تجنیس خطی کہتے ہیں ؎

زہے بریختہ برلالہ مشک سارا را
شکستہ رونق خورشید گوہر آرا را

ہمجنس الفاظ اگر پہلو بہ پہلو آئیں جس طرح اس شعر میں ہیں تو اس کو تجنیس مکرر یا تجنیس مزدوج کہتے ہیں خسرو کی یہ پوری غزل اس صنعت میں ہے ؎

بلب آمدہ است جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

جانم اور مانم میں ایک حرف مختلف ہے اور ج اور م بعید المخرج ہیں اس کو تجنیس لاحق کہتے ہیں ؎

شکر بترازدے وزارت برکش
شو ہمرہ بلبل بلب ہر مہوش

اس شعر کے تمام الفاظ کے حروف الٹ دیے جائیں تو پھر یہی شعر بنجائے گا اس کو تجنیس قلب مستوی کہتے ہیں۔

(۲) رد العجز علی الصدر[۱]:۔

کبھی اشتقاقاً اور کبھی بطور شبہ اشتقاق شعر کے آخر میں وہی لفظ لایا جاتا ہے اس صنعت میں کبھی بعینہ جو شروع میں یا درمیان میں کہیں آیا ہو۔ خسرو کے کلام میں اس کی کچھ شگفتہ مثالیں دیکھئے ؎

رفت از قلم حکم کہ در عشق رود جاں
القصہ جہاں رفت کہ اندر قلمش رفت

جاں سپہر ساختہ ام ناوک مژگان ترا
تا ہمہ خلق بدانند کہ من جان سپر

خسرو است و شب و افسانۂ یار دہزار
اندکے گریہ و پس بر سر افسانہ رو

شد اشک من حمائل گردوں ز دست تو
دستم بگردن تو حمائل نمی شو

خسرو آواز خوب دارد دوست
کیست کو نیست عاشق آوا

صورت گر زیبائے چیں رو صورت آں مہ ببیں
یا صورتے کش ایں چنیں یا ترک کن صورت

آب حیاتی و نشوی آشنائے من
تا چشمہائے من نشود آشنائے آ

یہ "آب" کی ردیف والی غزل مطلع کے علاوہ پوری اس صنعت میں ہے اور بعض اشعار میں ایک سے زائد صنعتیں بھی ہیں۔

(۳) صنعت سوال وجواب :۔

ایک ہی مصرع شعر میں سوال ہوتا ہے جواب بھی ؎

گفتم کہ ترا آخر دل خانہ نمی باید؟
گفتا کہ پئے گنجم ویرانہ نمی باید

یہ پوری غزل اسی صنعت میں ہے اس کے علاوہ بہت سی غزلوں میں یہ صنعت استعمال کی ہے۔

---

۱ علم عروض کی اصطلاح میں شعر کے پہلے مصرع کے پہلے جزو کو صدر اور آخری جزو کو عروض کہتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے مصرع کے پہلے جزو کو ابتدا اور آخری جزو کو عجز یا ضرب کہتے ہیں لیکن فن بدیع میں دوسرے مصرعے کے جزو آخر کے علاوہ شعر کے تمام اجزا پر صدر کا اطلاق ہوتا ہے۔

(۴) سیاقۃ الاعداد:- اس صنعت میں بالترتیب یا بے ترتیب اعداد (گنتیوں) کا استعمال ہوتا ہے ؎

ز دست مژدہ مقصود می رسد لیکن
ازاں ہزار یکے برقرار نیست چہ شود

مبیں کہ تہ فلک عالم است ہژدہ ہزار
کہ نیست یک اثر از صد ہزار آثار است

اے گشتہ ز ناز کم بجاں یک، دو، سہ، چار، پنج و شش
گشتہ چو بندہ ہر زماں یک، دو، سہ، چار، پنج و شش

پوری غزل اس صنعت میں ہے۔

(۵) صنعت ایہام:- کلام میں ایسا لفظ لاتے ہیں جس کے معروف و غیر معروف دو معنی ہوتے ہیں۔ اگر دونوں معنی موقع پر فٹ ہو جائیں تو یہ مطلق ایہام کہلاتا ہے ؎

سر ہلیے زدی سر من ہم زن از طفیل
از سر بداج دہ روش کار خویش را

اگر رائے تو ایں باشد کہ من دائم جفا بینم
جفائے جملہ عالم را کشم جاناں برائے تو

نشان زدہ الفاظ کے دو معنی ہیں اور یہاں دونوں برابر مراد لیے جا سکتے ہیں۔ اور اگر لفظ کے معروف و غیر معروف دو معنی ہوں مگر قائل نے صرف غیر معروف معنی مراد لئے ہوں تو اس کو ایہام تناسب کہتے ہیں ؎

شب سیاہ مرا نیست روشنی ہر چند
کہ شام تا بہ سحر چون چراغ می سوزم

بیا بہ باغ عزتہ خوشت لالہ چوں، دانی؟
ز تیغ کوہ بریدست روزگار او را

"سوزم" اور "تیغ" سے معنی غیر معروف مراد لئے گئے ہیں۔

(۶) صنعت استدلال:- اس صنعت میں ہر بات دلیل کے ساتھ کہی جاتی ہے ؎

اے دوست زگریہ ہم بماندم
کاندر تن مردہ خوں ضیا شد

گشت اعمیٰ چو خط سبز ترا دید رقیب
چشم افعی خط زمرد نگرد کور شود

دونوں شعروں کے ایک مصرع میں دعویٰ ہے اور دوسرے میں اس کی دلیل ہے اسی طرح خسرو کا وہ قصیدہ جس کا مطلع یہ ہے ؎

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش درد سر است
ہر کہ قانع شد بخشک و تر شہ بحر و بر است

یہ پورا قصیدہ اس صنعت میں ہے۔ ہر شعر میں ایک دعویٰ کیا ہے اور ساتھ ہی اس کی دلیل موجود ہے۔

(۷) صنعت اعنات:- اس کو لزوم مالا یلزم بھی کہتے ہیں، اس میں شاعر بعض ایسی قیدیں لازم کر لیتا ہے جو غیر ضروری ہوتی ہیں۔ متفرق اشعار کے علاوہ خسرو نے ایک پورا قصیدہ اس صنعت میں لکھا ہے، جس میں یہ التزام کیا ہے کہ ہر شعر میں لفظ سپس، مگس، پیل، اور لکلک ضرور آئے۔ اس کا نمونہ یہ ہے ؎

پیل تن شاہی دا ز اقبال بلندت دور نیست
کز سپس گرد و پلنگ افگن مگس لکلک شکار

(۸) صنعت طباق:- اس کو صنعت اضداد، تضاد، مطابقت، تطبیق اور تقابل الضدین

بھی کہتے ہیں۔ یہ صنعت خسرو نے خاص طور پر بکثرت استعمال کی ہے اور حسن ادا میں اکثر فرق نہیں آنے دیا ہے۔ اس میں دو ایسی باتیں جمع کی جاتی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوتی ہیں ؎

بے روئے تو نوش می شود نیش
وز دست تو نیش می شود نوش

خرد سالے بمن کند بیداد
اے بزرگان شہر داد دہید

یا مرادان بچمن نازکناں می رفتی
سر دیک پائے سادہ ملب جوئے بماند

دل شد ز دست و بر مژہ از خوں نشاں بماند
جاں رفت و یار گشتہ بر جائے آں بماند

نیست لذت عشق را بعد از وصال
عشقبازاں را جدائی خوشتر است

یہ اشعار طباق ایجابی کی مثال ہیں متعدد پوری پوری غزلیں خسرو کے دیوان میں اس صنعت میں موجود ہیں مثلاً یہ دو غزلیں جن کے مطلع ہیں ؎

تن پیر گشت و آرزوے دل جواں ہنوز
دل خوں شد و حدیث بتاں بر زباں ہنوز

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز
درد ہا دادی و درمانی ہنوز

طباق کی ایک شکل طباق سلبی کہلاتی ہے، اس میں ایک مصدر کے دو مشتقات لئے جاتے ہیں جن میں ایک مثبت اور دوسرا منفی ہوتا ہے ؎

بر من عاشقم ور بپرسد آں ماہ
ہمہ چیزش بگویند ایں نگویند

مرا گفتی نہیں در من بگل چیں
بگل نسبت مکن روے حیا را

ایک مشہور قسم طباق کی وہ ہے جس میں مختلف ا
یکجا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کو تدبیج یا طباق الالوان
ہیں ؎

سرخ رو خواستی کردن بلقابت مارا
دیدہ آں زلف سیاہت ہمہ تن زرد شدیم

اربعہ عناصر کا یکجا ذکر بھی طباق کی ایک قسم ہے جسکو عنصری کہا جا سکتا ہے اس کی بھی ایک مثال خسرو سے سنتے چلئے ؎

اے باد برقع برفگن آں روئے آتشناک را
وے دیدہ گر صفرا کنم آبے بزن ایں خاک را

اب تک بیان کی جانیوالی صنعتیں وہ تھیں جو خسرو نے
کے ساتھ اپنے کلام میں استعمال کی ہیں، اب خسرو کے کلا
نسبتاً کم استعمال میں آنے والی صنعتوں کی مثالیں پیش
جاتی ہیں۔

(۹) صنعت اشتقاق:- ایسے دو یا زائد الفاظ کا جمع کئے جاتے ہیں جو ایک مادے سے مشتق ہوتے ہیں ؎

دل خسرو شکستی، آہ! اگر من
کنم آگاہ شاہ بت شکن را

شدہ اشک من حمائل گردن ز دست تو
دستم بگردن تو حمائل نمی شو

ز باد چند ز ید آدمی بیچارہ
کہ من ز بیم نسیم تو گر صبا یا

ایک ہی مادے سے مشتق معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقتاً ان کا
ماخذ جدا جدا ہوتا ہے ؎

چوں روز و شب دو دیدہ خورد خوں سزد اگر
سازد تنگ دو چشم جگر خوار خویش را

(۱۱) صنعت تکرار:- ایک ہی لفظ ایک ہی معنی کے لئے دو یا زائد مرتبہ دہرایا جاتا ہے۔

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کند با خلق و عالم کار نیست

در گوش او فسانہ ما رفتہ رفتہ رفت
رسوائیم ببیں کہ کجا رفتہ رفتہ رفت

(۱۲) صنعت سجع:- اس کی ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ دونوں مصرعوں کے تمام الفاظ وزن[1] اور آخری حرف کے اعتبار سے برابر ہوں، اس کو سجع مرصّع کہتے ہیں ؎

مفلسی از پادشاہی خوشتر است
مفسدی از پارسائی خوشتر است

زعشقت بیقرارم بارہ گویم
زہجرت شرمسارم بارہ گویم

دوسری شکل اس صنعت کی یہ ہوتی ہے کہ دونوں مصرعوں کے آخری الفاظ کا حرف آخر یکساں ہوتا ہے اور دونوں لفظوں کا وزن ایک ہوتا ہے اس کو سجع مطرّف کہتے ہیں ؎

با زیر قع بر رخ چو ماہ بر بستی نقاب
گوئیا در زیر ابرے رخت ناگہ آفتاب

سجع کی ایک اور قسم یہ ہے کہ دونوں لفظوں کا وزن ایک ہوتا ہے مگر حروف مختلف ہوتے ہیں اس کو سجع متوازن کہتے ہیں ؎

ہمچو غنچہ تہ بتہ خوں شد دل من اے طبیب
شربتے خرما از آں لب گر ہمی خواہی صواب

پردہ بدرید کس ایں راز نخواہد پوشید
غنچہ بشگافت سرش باز نخواہد پیوست

(۱۳) صنعت تلمیح:- کلام میں مخصوص یا مشہور واقعہ یا کتب متداولہ میں مذکور کسی خاص مضمون کی طرف اشارہ کرنے والے الفاظ لائے جاتے ہیں ؎

یوسف چو گزر کرد ببازار جہاں کش
ہر مایہ کہ داداشت بیفدہ در مشق رفت

بتان آزری از بتکدہ بروں جستند
چو لالہ زار بدشت آتش خلیل کشید

آنکہ صوفیاں را بر خود شعار کردہ
"یا ایّھا المزمّل" کردہ علم قبا را

(۱۴) مراعات النظیر:- اس کو صنعت تناسب، توفیق، تلفیق، ورائتلاف بھی کہتے ہیں، اس میں باہم مناسبت رکھنے والی چیزوں کا یکجا ذکر ہوتا ہے ؎

پیش قاضیٔ فلک ہر چہ کند دعوی حسن
تا خطت بینّہ خویش اقامت نکند

چوں در شکار بر سر آہو گذر کنی
حشمت لبس است دست بہ تیر و کماں مبر

اے طبیب از من بروکیں درد عشق
بہ نخواہد شد بدارو ئے کہ ہست

---

(۱) وزن کا ذکر اس مضمون میں جہاں جہاں آیا ہے سب جگہ "وزن عروضی" مراد ہے "وزن صرفی" نہیں۔

(۱۵) تنسیق الصفات :- اس صنعت میں ایک ہی موصوف کی متعدد نیک یا بد صفات یکجا ذکر کی جاتی ہیں ؎

گفتم بنظارۂ جمالش
حیران و خموش و مست و بیہوش

کجا خیزد چو تو سروے جوان و نازک و نوبر
شکر گفتار و شیریں کار و گل رخسار و مہ پیکر

(۱۶) صنعت مشاکلہ :- اس صنعت میں صرف لطفِ زبان اور رعایت لفظی کی خاطر کسی لفظ کو ایک بار اصلی معنی میں استعمال کرکے دوبارہ اس سے غیر اصلی معنی مراد لئے جاتے ہیں ؎

آب رواں کجا رسد اندر سرشک من
خواہی ببیں ز آب رواں ماجرائے آب

دوسرے مصرع میں آب بطور مشاکلہ واقع ہوا ہے۔

(۱۷) صنعت استدراک :- اس کو صنعت رجوع بھی کہتے ہیں، اس میں پہلے ایک بات کہہ کر پھر اس کی تردید کی جاتی ہے یا اس کے کسی جز کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے ؎

گر بگویت خاک گردم نیست غم، لیکن غم است
کز سر کویت نخواہد برد باد این خاک را

اگرچہ از تو دلے خستہ و غمیں دارم
بدیں خوشم کہ بتے چوں تو نازنیں دارم

توانم از ہمہ خوباں نظر بگردانم
محال نیست کز آں خوش بسر بگردانم

(۱۸) صنعت مبالغہ :- اس سے مراد ہے کسی بات کو اس طرح بڑھا چڑھا کر کہنا کہ سننے والا تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول جائے کہ اس سے زیادہ بھی اس خوبی یا خرابی کو بڑھا کر بیان کیا جاسکتا ہے ؎

دہنت را نفس نمی بیند
کمرت ہست و کس نمی بیند

گریہ را مپسند ہر دم تا بکے
پیش چشم از گریہ جیحون و فرات

مرا بگوئی، کجائی، من اینکم، لیکن
ز بس ضعیفم و در چشم کس نمی آیم

(۱۹) تجاہل عارفانہ: جان بوجھ کر اس طرح بات کہنا کہ سننے والا کہنے والے کو کچھ دیر کے لئے جاہل سمجھ لے ؎

این توئی یا بخواب می بینم
یا بشب آفتاب می بینم

تو کنی جور بر دل خسرو
من چو بیگانگاں نظارہ کنم

بریدن دلم این بود کہ توام نبرد
کنوں بدام کہ جویم بریدۂ خود را

مرکب ناز کردہ زیں، دادہ بغمزہ تیغ کیں
ساختہ آمدہ چنیں باز برائے کیستی

(۲۰) صنعت عکس: اس کو تبدیل بھی کہتے ہیں اس سے مراد اجزائے کلام کو الٹ پلٹ کر بیان کرنا ہوتا ہے ؎

خوش خرامی کہ ناز فرمائی
ناز فرما کہ خوش خرام استی

تو در تنعم و نازی زما کے اندیشی
کہ ناز ما بہ نیاز و نیاز تست نیاز

(۲۱) القول بالموجب : اس میں کسی کے کلام کا مفہوم متکلم کی منشا کے خلاف لیا جاتا ہے ؎

گفتا کہ بامی دہی دل ؟ گفتم بپیئے تو جاں دہم من
گفتا کرنی روی از ینجا ؟ گفتم کہ زخویش می روم من

(۲۲) **حسن تعلیل:** اس صنعت میں کسی بات کی ایسی وجہ بیان کی جاتی ہے، جو فی الحقیقت اس کی وجہ نہیں ہوتی ؎

بخانۂ تو ہمہ روز بامداد بود
کہ آفتاب نیاز دشدن بلند آنجا
چہ کرد پیش رخت گل کہ گلفروش اورا
بدست خود لگو بستہ ریسماں انداخت

(۲۳) **صنعت تعجب:** کسی خوبی یا بدی کو اظہار تعجب کے انداز میں بیان کیا جاتا ہے ؎

جفائے ساقی ما را خبر کہ بیروں رفت
کہ کس زمجلس ما ہوشیار می نہ رود

(۲۴) **لف و نشر:** اس صنعت میں پہلے چند چیزیں ذکر کی جاتی ہیں پھر انکے مناسبات لائے جاتے ہیں، اگر اس میں ترتیب کا لحاظ رکھا جائے، لف و نشر مرتب کہلاتی ہے اور اگر ترتیب کا لحاظ نہ ہو تو لف و نشر غیر مرتب کہتے ہیں۔ خسرو کے کلام سے دونوں کی مثالیں یہ ہیں ؎

سزد رضوان[۱] و حور[۲] و آفتاب[۳] و زہرہ[۴] در بزمت
نشاط[۱] آغاز و ساحت زیب[۲] و نقل[۳] آرا و غنیا[۴] گر
زعکس عارض[۱] و زلف[۲] و بنا گوش[۳] و دو چشم[۴] تو
دمد[۱] لالہ، چمد[۲] سنبل، فتد[۳] نرگس بمد[۴] عنبر

(۲۵) **صنعت التفات:** اس میں ایک ہی شخص کا غائب، حاضر، متکلم کی مختلف ضمیروں یا صیغوں میں ذکر ہوتا ہے ؎

خسرو طلب وصل تو می کرد کہ ہجرت
زیں جائے حوالت بسرائے دگرم کرد
در ہوس مردم، لیک تہ پائے او
گر نکشد او زننگ، ما بتوانیم مرد
ترکی جور بہ دل خسرو
من چو بیگانگاں نظارہ کنم

(۲۶) **صنعت ادماج:** اس میں پورے شعر یا مصرع یا فقرے کے دو مفہوم ہوتے ہیں اور شاعر کا مقصود بالعموم غیر معروف مفہوم سے ہوتا ہے ؎

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہان من

یہاں تک جتنی صنعتوں کی مثالیں خسرو کے کلام سے پیش کی گئی ہیں وہ صنعتیں سب کی سب فن بدیع کی کتب متداولہ میں موجود ہیں، لیکن کچھ صنعتیں بقول شبلی خاص خسرو کی ایجاد ہیں[۱]۔ بطور نمونہ ان میں سے بھی دو ایک کا ذکر کیا جاتا ہے :-

(۲۷) **صنعت دورویہ:** اس سے مراد ایسے الفاظ کا استعمال ہے جن کے اگر صرف لفظوں میں ادل بدل کر دی جائے تو دو مختلف زبانوں میں پڑھا جا سکے خسرو کا یہ شعر اس کی مثال ہے ؎

رسیدی بدیدی مرادی بجانے
زمانے بباشی بیاری بشانی

اس کے الفاظ کے نقطوں میں رد و بدل کر دی جائے تو یہی شعر عربی بن جائے گا ؎

---

۱ شعر العجم جلد دوم ص۱۳۵

مرشیدی ندیدی مرادی نجا لی
رمانی دیا ہمیں، تباہی نسا ئی

(۲۸) ترجمۃ اللفظ :- اس صنعت میں ایک لفظ کے بعد ہی ایسا کوئی لفظ لایا جاتا ہے جو دوسری زبان میں پہلے لفظ کا ترجمہ ہوتا ہے ؎

سودائے رخ تو کشت مارا

فارسی "کشت" کا اردو ترجمہ "مارا" ہوتا ہے۔

(۲۹) موقوف الآخر : اس میں ایک مصرع کا قافیہ دوسرے مصرع کے آغاز کا محتاج رہتا ہے مثلاً خسروؔ کی یہ رباعی

درحسن ترا کسے نماند إلاّ
خورشید کہ ہر صبح بروں آید تا
خدمت کند و پائے تو بوسد اما
بینی تو ببوئے او چو پا بوسد تا

یہاں تک جتنے اشعار خسروؔ کے نقل کئے گئے ہیں ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جن میں ایک ہی صنعت ہے۔ ذیل میں کچھ ایسے اشعار پیش کرتا ہوں جن میں خسروؔ نے بیک وقت کئی کئی صنعتیں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ برتی ہیں :۔

(۱) جان من از آرام شد آرام جان من کجا
ہجرم نشان فتنہ شد فتنہ نشان من کجا (*)

(*) تین صنعتیں ہیں : تجنیس، عکس۔ اور ایہام

(۲) شکل دلبر دن کہ تو داری نباشد دلبرے را
خواب بند بہلئے چشمت کم بود جادو گرے را (م)

(م) تین صنعتیں ہیں : اشتقاق۔ ایہام اور مراعات النظیر

(۳) شد اشک من حائل گردوں ز دست تو
دستم بگردن تو حائل نہ می شود (س)

(س) تین صنعتیں ہیں : تجنیس۔ اشتقاق اور رد العجز علی الصدر

(۴) عاشقاں را بگہ رفتن و باز آمدنش
دل ز جا می رود و باز بجا می آید (ںں)

(ںں) تین صنعتیں ہیں : اشتقاق، طباق اور لف و نشر مرتب

(۵) در عشق چناں گشتم تا چیز کہ گر خواہد
زلفت بسر یک مو در شانہ کند مارا (●)

● تین صنعتیں ہیں :۔ مبالغہ، ایہام اور التفات

(۶) بصد ہزار دلش عاشقاں خریدارند
بہائے یوسف اگر ہفدہ قلب بیش نبود (ط)

(ط) چار صنعتیں ہیں : تلمیح، سیاقۃ الاعداد، ایہام تناسب اور مشاکلہ بالمعنی۔

(۷) نادیدنی چہ دید کہ نادید دیدہ دید
نارفتنی چہ بہ سر یار فتہ رفتہ رفت (ص)

(ص) چار صنعتیں ہیں : طباق۔ اشتقاق۔ تجنیس مستوفی اور تکرار

خسروؔ کے اس اعتذار کے باوجود ان کا جو کلام صنائع و بدائع پر مشتمل ہے وہ مٹی کی طرح سرد خشک، کثیف اور کمزور ہے[۱]۔ یہ سو سوا سو اشعار جنکو میں نے خسروؔ کے کلام سے صنائع و بدائع کی مثالوں میں پیش کیا ہے اور جو سرسری بالاستیعاب نہیں بلکہ کلام خسروؔ کے صرف جزوی مطالعے کا حاصل ہیں اس رائے کی تصدیق و تائید کے لئے کافی ہیں کہ خسروؔ " بصنائع و بدائع و لطف طرق در اطوار نظم گستری، منتخب زمانہ، است[۲]"

آخر میں خسروؔ کی ایک مکمل غزل جو گوناگوں صنائع و

---

[۱] خسرو کا خود نوشتہ دیباچہ مشمولہ دیوان کامل امیر خسرو مرتبہ استاد محترم ڈاکٹر نورالحسن صاحب مدظلہ

[۲] نتائج الافکار صفحہ ۲۱۲ بحوالہ مقدمہ دیوان کامل امیر خسرو مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن صاحب مدظلہ

راج بہادر گوڑ

امیر خسرو دہلوی

امیر خسرو جو صوفی، مغنی، باکمال شاعر اور فاضلانہ صلاحیت رکھنے والے موسیقار تھے اور جنھیں اپنے ملک سے بے پناہ محبت تھی۔ مشرقی اتر پردیش کے ضلع ایٹہ کے موضع پٹیالی میں پیدا ہوئے۔

امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین محمود ترک قبیلہ لاچین سے تعلق رکھتے تھے، تیرھویں صدی میں چنگیز خاں کے زمانہ میں ترک وطن کر کے ہندوستان آگئے تھے۔ ان دنوں دہلی میں شمس الدین التمش کی ملازمت اختیار کرلی۔ انھوں نے ایک ہندوستانی رئیس عماد الملک کی بیٹی سے شادی کی۔ انہی کے بطن سے ابو الحسن یمین الدین پیدا ہوئے جو بعد میں امیر خسرو کے نام سے مشہور ہوئے۔

امیر خسرو کو اپنی ماں پر بہت فخر تھا چنانچہ انھوں نے کہا ہے ع

زنسلِ عارض اسود منسم

انھیں اپنے ہندوستانی النسل ہونے پر بھی اتنا فخر تھا کہ انھوں نے کہا ہے ؎

ترک ہندستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری نہ دارم کہ عرب گویم سخن!

جو لوگ یہ طنز کرتے تھے کہ ہندوستانیوں کا رنگ گہرا نہیں ہے انھیں خسرو نے ان الفاظ میں جواب دیا ہے ؎

ہند را اے مدعی طعنہ بہ تاریکی مزن
زآنکہ اندر ظلمت آب حیواں مدغم است

اور یہ کہ ؎

کشور ہندست بہشتے بہ زمیں   حب وطن است ز ایماں بہ یقیں

امیر خسرو کو اپنے ملک سے ایسی زبردست اور اتنی گہری محبت تھی۔

انھوں نے اپنی ایک مشہور نظم میں جس میں انھوں نے گجرات کی راج کماری دیول رانی اور خضر خاں کے رومانس کی کہانی بیان کی ہے بڑے خوبصورت انداز میں اپنے ملک کی تعریف کی ہے اس کے خوشگوار موسموں، انسانوں کی طرح بات کرنے والے اس کے پرندوں (طوطی) ہندوستان کی حسین دستکاریوں، اس کی مالا مال اور ترقی یافتہ زبانوں، اس کے فخر

دہلی اور اس کے بے شمار باغات اور عمارتوں۔ ہندوستانی عوام کی رنگا رنگی۔ ابو دھیا دیوگری (ہمارا شٹر کا شہر دولت آباد) اور ملتان اور لکھنؤ کی بے مثل دلکشی اور ہندوستان کی عورتوں کے بارے میں کہ مصر، روم، سمرقند، قندھار اور بلخ کی عورتوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ ان کی نفاست اور لباس اور ہندوستان کی سحر آفریں موسیقی کے بارے میں خسرو نے بڑے خوبصورت شعر کہے ہیں۔

ایک اور خوبصورت مثنوی "نہ سپہر" میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کیلئے کہ ہندوستان کو اور دوسرے ملکوں پر فضیلت حاصل ہے۔

حسب ذیل دس دلائل پیش کی ہیں۔

۱۔ علم نے ساری دُنیا سے یہاں وسعت حاصل کی ہے
۲۔ ہندوستانی دنیا کی تمام زبانیں سیکھ سکتے ہیں۔ اور اور غیر ہندوی انہیں کمال حاصل نہیں کر سکتا۔
۳۔ ساری دنیا سے لوگ حصول علم کے لیے ہندوستان آئے عرب اسکالر ابو معشر دس برس تک ہندوستان میں تحصیل علم کرتا رہا۔
۴۔ علم حساب میں صفر ہندوستان نے ایجاد کیا جس نے اس علم میں غیر معمولی امکانات پیدا کرائے
۵۔ کلیلہ و دمنہ جس کا عربی فارسی اور ترکی میں ترجمہ کیا گیا ہندوستان کی تصنیف پنچ تنتر ہے۔
۶۔ شطرنج ہندوستان کی ایجاد ہے۔
۷۔ موسیقی کی جو ترقی ہندوستان میں ہوئی کہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔
۸۔ وید جیسی کتابیں جو مذہب، موسیقی، سیاست و معاشرت پر بیش حاصل معلومات کا خزانہ ہیں یہیں کی تصنیف
۹۔ ہندوستانی جانور، جیسے خاص طور پر پرندے اور نہیں ملتے مثلاً طاؤس (مور) عدیم المثال ہے
۱۰۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خسرو جیسا شیریں مقال یہیں پیدا ہوا۔

ایسی ہے وہ بے پناہ محبت جو خسرو کو اپنے ملک سے اس میں شک نہیں کہ خسرو فارسی کے عظیم شاعر حتیٰ کہ مرزا غالب نے بھی جو مشکل ہی سے کسی شاعر کو تسلیم کرتے تھے خسرو کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔

خسرو نے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کی ملازمت کی۔ ان کا کلام قابل بھروسہ کا ماخذ ہے۔ ان کی شخصیت کئی پہلوؤں کی مالک تھی وہ نثر نگار، مورخ، موسیقار، نغمہ نگار، درباری، ماہر لسانیات اور فرہنگ نویس سب کچھ تھے۔

ان کے فارسی کلام میں (اپنے نانا عماد الملک دوبہ کی موت پر مرثیہ میں) اور ثنا قانی اور انوری اور ردوسرو کمال اصفہانی کا رنگ اور انداز بیان ملتا ہے۔

انھیں حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے متعلق اپنی نعت پر بڑا ناز تھا چنانچہ کہتے تھے "اگر حادثات زمانہ سے سارا کلام تلف ہو جائے اور صرف یہ ایک مثنوی بچ جائے تو بھی میں پریشان نہیں ہوں گا۔ کیوں کہ جو کوئی بھی اسے پڑھے گا شاعری کی دُنیا میں میری عظمت کا قائل ہو جائے

ان کی بعض نظمیں ظہیر فاریابی کے رنگ میں ہیں نظامی گنجوی کے رزمیوں، مخزن الاسرار، خسرو شیریں لیلیٰ مجنوں، سکندر نامہ، اور ہفت پیکر کے جواب میں خسرو

مطبع ۔۔۔ شیریں خسرو مجنوں لیلیٰ، آئینہ سکندری اور
ہشت بہشت لکھے۔
لیکن جو سب سے زیادہ اہم بات ہے یہ ہے کہ امیر خسرو
نے کھڑی بولی کی بنیاد رکھی جو آج کی ہندی اور اردو زبانوں
کا سرچشمہ ہے۔

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو نین پیو کو دونو بھئے یک رنگ

اُنھوں نے اپنے پیر و مرشد نظام الدین اولیاءؒ کے
وصال پر جو مشہور دوہا لکھا تھا یہ ہے۔

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چودیس

کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ امیر خسرو ایک کنویں کے پاس
سے گزر رہے تھے، جہاں چار دوشیزائیں پانی بھر رہی تھیں
خسرو کو پیاس لگی تھی اور وہ پانی بھر رہی تھیں۔ خسرو کو پیاس
لگی تھی اور وہ پانی پینا چاہتے تھے لڑکیوں نے اُنھیں پہچان
لیا اور اُن سے فرمائش کی کہ چار ایک دوسرے سے کوئی تعلق
نہ رکھنے والے الفاظ کھیر، چرخہ، کتا اور ڈھول پر مشتمل ایک
دوہا کہیں اور خسرو نے فوراً ہی یہ کہہ کر انکی فرمائش پوری کر دی۔

کھیر پکائی جتن سے اور چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا
اور پانی پلا

خسرو فارسی اور ہندی الفاظ پر مشتمل ملی جلی زبان میں غزل
لکھنے کے لیے شہرت رکھتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

امیر خسرو گجرات میں تھے، وہاں ایک خوبرو لڑکا ملا جس
پر انھوں نے دوہا لکھا۔ زبان پر گجراتی کا اثر ملاحظہ ہو۔

ہندو بچہ بنگر کہ عجب حسن دھرے چھے
ہنگامِ سخن گفتن مکھ پھول جھڑے چھے
گفتم بیا بر لب تو بوسہ بگیرم
گفتا کہ ارے رام دھرم نشٹ کرے چھے

خسرو نے مثنوی "خالق باری" حلوائی کی دوکان کرنے والی
ایک بوڑھی عورت کی اس درخواست پر لکھی تھی کہ وہ اس کے
لڑکے کو فارسی پڑھائیں۔ خسرو نے کہا ہے ؎

بیا برادر، آؤ رے بھائی . بنشیں مادر، بیٹھ ری مائی

اس میں فارسی فقرہ اور اس کا ہم معنی فقرہ سادہ اور آسان زبان
میں شعر کی صورت میں ادا کیا گیا ہے۔

خسرو نے بے شمار پہیلیاں، دوسخنے، کہہ مکرنیاں اور
انملیاں بچوں کے لیے آسان کھڑی بولی میں میں کہی ہیں۔

ہرا روپ ہے بیچ وہ پات مکھ میں دھرے دکھاوے جات
تین وستو سے ادھک پیار جانو ہے سب سے نرنار
ہر ایک سبھا کا راکھے مان
چترائی کی تھا تھ پہچان

یہ سب پان کیلئے کہا ہے اور آئینہ کے لیے کہا ہے۔

ہاتھ میں لیجئے دیکھا کیجئے

ایسی بے شمار پہیلیاں ملتی ہیں۔
امیر خسرو اپنی طرز یہ کہاوتوں کے لیے بھی شہرت رکھتے
ہیں۔ مثلاً

لوہار سے زیادہ مہربان چکی کے بیل سے زیادہ دوڑنے
سوئے ہوئے خرگوش سے زیادہ بیدار

خسرو نے کھڑی بولی میں جو بسنت اور ساون کیلئے لکھے ہیں اور
ان کا مشہور گیت بابل جو دُلہن کے اپنے ماں باپ کے گھر سے

رخصت ہونے سے متعلق ہے، آج بھی خاص طور پر شمالی ہند میں گائے جاتے ہیں۔

خسرو کی عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت بھی جب وہ شاہی درباروں میں آمد و رفت رکھتے تھے اور منصب دار کے عہدے پر فائز تھے اور ملک الشعرا کا اعزاز حاصل تھا انھوں نے بادشاہوں کی تابعداری کبھی قبول نہیں کی۔ خسرو کا جو زمانہ تھا ایسے دہلی کے حالات جیسا گرونانک نے کہا ہے ایسے تھے کہ ان میں تلواریں اور سر تن سے کٹ کر گر جاتے تھے راتوں رات خاندانوں کا صفایا ہو جاتا تھا۔

لیکن خسرو نے ہمیشہ اپنا سر اونچا رکھا انھوں نے بادشاہوں کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی جرأت سے کہا تھا۔

نحست از مملکت ہر پائے خواہی
بنا بر عدل دارد پادشاہی

انھوں نے بادشاہ وقت کو خبردار کرتے ہوئے کہا تھا ؎

درچہ کس نیست دشمن تن تو غفلت تو بس است دشمن تو

حضرت نظام الدین اولیاء سے وابستگی ان کے لیے ہمت، حوصلہ اور جوش ولولہ کا سرچشمہ تھا۔ انکی شاعری سے تصوّف سے متعلق اپنے پیر و مرشد کی تعلیمات کی جھلک ملتی ہے حضرت نظام الدین اولیاء کی تعلیمات اور امیر خسرو کا کلام تصوف کا مرہون ہے یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت نظام الدینؒ اولیاء سے شاہان وقت کے دلوں میں نفرت تھی اور انھیں اقتدار کا حریف تصور کرتے تھے لیکن لوگ حضرت نظام الدینؒ اولیاء کے پاس جوق در جوق جاتے تھے اور بادشاہ دیکھتا رہ جاتا تھا۔ شاہان وقت کی آرزو یہ تھی کہ حضرت نظام الدین اولیاء ان کے حلقہ بگوش بن جائیں یا پھر دہلی چھوڑ کر چلے جائیں لیکن نظام الدین اولیاء کو ان میں سے کوئی بھی بات منظور نہیں تھی انھوں نے بادشاہ وقت کے غیظ و غضب کی پرواہ نہیں کی اور بادشاہ کے جاہ و جلال اور شان و شوکت کے باوجود علوم کو حضرت نظام الدین اولیاء کے پاس جوق در جوق آتے ہوئے دیکھ کر امیر خسرو نے کہا کہ ؎

اے باد صبح گاہی کا فاق می نوردی
گر دیدہ نشان رہ جائے کہ غم نہ باشد

امیر خسرو کی شاعری بے پناہ انسان دوستی سے بھرپور ہے مذہبی منافرت کیا ہوتی ہے وہ نہیں جانتے تھے۔ ظلمت پسندی ان کیلئے اجنبی چیز تھی۔ وہ محبت کے غزل خواں اور ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر تھے انھوں نے تہذیبی امتزاج پیدا کرنے اور ہندوستانی تہذیب تخلیق کرانے کے لیے انتھک کام کیا چنانچہ آنجہانی ڈاکٹر تارا چند نے کہا ہے۔

"ایک نئی زندگی کی تلاش کی کوشش ایک نئی تہذیب کو ظہور میں لائی جو ٹھیٹھ ہندو ہے اور نہ خالص مسلمان"

ایک مشہور اسکالر وحید الدین سلیم نے اس کو ہندوستانی تہذیب کا نام دیا ہے۔

خسرو نے کہا ہے ؎

کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست
خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

ہندوستانی موسیقی کو خسرو کی دین بے مثل اور لازوال ہے۔ انھوں نے ہندوستانی اور ایرانی راگوں کے امتزاج سے

(باقی مضمون صفحہ ۳۲۴ پر دیکھیے)

خلیل باندہ پوری

امیر خسروؒ

دنیا کے بڑے بڑے صوفی، ولی، سادھو اور رشی منی سبھوں نے انسانیت نوازی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں اُن میں سے ایک امیر خسروؒ بھی تھے۔ عظیم شاعر، صوفی اور ماہر موسیقار حضرت امیر خسرو بھی تمام عمر دکھ درد بانٹنے کی کوشش کرتے رہے کیونکہ انسانیت نوازی ہی اُن کا مذہب تھا۔ اُس عظیم شخصیت کی پیدائش ۶۵۲ھ میں یو۔پی کے ضلع ایٹہ میں ہوئی تھی لیکن بچپن جمنا کے کنارے دہلی کی گلیوں میں گزرا۔

قرآن کہتا ہے :۔ "دنیا کا ہر انسان خدا کا کنبہ ہے" حضرت امیر خسروؒ بھی خدا کے کنبوں کی پریشانیاں دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے کیونکہ اُن کی شخصیت ڈھلی ہوئی چاندنی تھی اور بکھری ہوئی کرن تھی۔ اس انسانیت نواز ہستی کو تمام قومیں دل و جان سے چاہتی تھیں اور میرے خیال میں آج کے اس مشینی دور میں بھی جہاں کھانے کو اناج کم اور پینے کو دھواں زیادہ ملتا ہے۔ سب سے بہترین، سب سے منفرد اور سب سے حسین مذہب انسانیت ہے اور میرا سینہ فخر سے تن جاتا ہے جب یہ سوچتا ہوں کہ مرتے دم تک انسانیت نوازی کا گُن گاتا رہوں گا اور میرے قلم کی نوک بھی یہی چیختی رہے گی کہ انسانیت نوازی ہی سب سے بہترین مشغلہ اور سب سے بہترین عبادت ہے اور دنیا کی سب سے بہترین کتاب محبت، تڑپ اور ہمدردی ہے۔

ابھی حال ہی میں امیر خسروؒ کی یادگار منائی گئی ۔ جس میں ہمارے ایک سکھ بھائی نے بڑے پیارے بھرے لہجے میں تقریر کی تھی :۔ "امیر خسروؒ پر صرف آپ ہی کا نہیں کچھ میرا بھی حق ہے"۔ انھوں نے سچ ہی تو کہا تھا سورج، چاند ستارے، پانی اور ہوا سب کے لئے ہوتے ہیں ان کی کوئی ذات نہیں ہوتی ہے۔ کوئی برادری نہیں ہوتی ہے اور کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے وہ سب کے لئے برابر ہیں اور ان کے لئے سب برابر ہے۔ امیر خسروؒ ایک بہتا ہوا جھرنا تھے جن سے انسانیت نے ہمیشہ طمانیت قلبی اور سکون ذہنی محسوس کیا۔ مسلمان اور ہندوؤں کے راگ میں امتزاج پیدا کرنے والوں میں امیر خسروؒ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ موسیقاروں

کی دنیا میں وہ ایک نائک تھے۔ موسیقی میں پہلا خطاب پنڈت ہے دوسرا گنی تیسرا گندھرپ، چوتھا گائک اور پانچواں اور آخری نائک ہے۔ ان کی روح میں درد سوز و گداز، وجد تڑپ اور چاشنی بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیا نے انھیں مفتاح السمٰع کہا تھا۔ امیر خسروؒ کا تعلق شاہی دربار سے تھا ایرانی موسیقی میں وہ ماہر تھے لیکن انھیں ہندوستانی موسیقی سے والہانہ لگاؤ تھا اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں لکھتے ہیں:

"ہندوستانی موسیقی ایک آگ ہے جو قلب و روح دونوں کو جلاتی ہے۔ اور دوسرے تمام ممالک سے بہتر ہے۔ ہندوستانی موسیقی صرف آدمیوں کو نہیں بلکہ جانوروں کو بھی مسحور کر دیتی ہے۔ ہرن کو اس کے ذریعہ مسحور کر کے شکار کیا جاتا ہے۔"

ان کے زمانے میں خاص خاص ساز رباب قانون چنگ شہنائی طنبور بالک شہنائی تبیرۂ ہندی ڈہل دھلک تھے اور فنکاروں میں امیر کنجتک محمد شاہ مرغک اور محمود جوزہ تھے امیر خسرو نے ہندی اور ایرانی راگوں کو ملایا۔ سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں نائک کا خطاب گوپال کو ملا تھا جس کے سنگھاسن کو اس کے دو ہزار شاگرد کندھوں پر اٹھائے تھے وہ کبھی زمین پر پاؤں نہیں رکھتا تھا۔ امیر خسرو تخت کی آڑ میں چھپ کر سنا کرتے تھے۔ ایک بار دربار میں دونوں کا مقابلہ ہوا اور امیر خسرو نے ایرانی راگ " قول : کو دربار میں اس طرح گایا کہ گوپال مبہوت رہ گیا اور اس نے اپنی شکست کا اعتراف کیا —— اور انھوں نے کہا کہ " یہ چوری ہے لیکن اس پہ میرا بھی اختیار نہیں " یہ واقعہ مراۃ الخیال۔

اور "راگ درپن" میں لکھا ہوا ہے۔ عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامے میں لکھا ہے کہ " ہندوستان میں امیر خسروؒ سے پہلے گیت چھند دھرو پد اور استت گائے جاتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ " خیال " حسین شاہ شرقی کی ایجاد ہے لیکن اس میں صداقت نہیں ہے بلکہ امیر خسروؒ کی ایجاد ہے کیونکہ مسلمان دھرو پد کے تقدس اور اس کی کلاسیکی اہمیت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ ڈاکٹر سمن مٹا لگر کا بیان ہے کہ " قوالی کے جبلت بولوں اور جزئیات سے "خیال" نے جنم لیا اور قوالی امیر خسروؒ کی ایجاد ہے لیکن اسے سب سے زیادہ ترقی دینے والا محمد شاہ رنگیلے کے دربار کا ماہر نعمت خاں سدا رنگ تھا دھرو پد بیٹ اور خیال سینہ کا گانا ہوتا ہے۔ دھرو پد کے تال میں سختی اور کرختگی ہے اور خیال میں نہیں اس کے دو آجزا ہیں استھائی اور انترا استھائی دھیمے سروں میں گایا جاتا ہے اور انترا اونچے سروں میں گایا جاتا ہے۔ اس کے بول محدود ہیں اس لئے شاعری کے ہر صنف کا بوجھ بھی اٹھانے سے بالکل قاصر ہے۔ پھر بھی ہجر وصال عشق کی پسپائی، پائل کی غمازی اور سکھیوں کی چھیڑ چھاڑ سے عجیب سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ شادی بیاہ اور بابل کے گیت بھی امیر خسروؒ کی طرف سے نسبت دی جاتی ہے۔ جیسے۔

"کاہے کو بیاہی بدیس رے سکھی بابل مورے"

آبِ حیات میں محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :- " ہندوستان میں خاص طور سے یو۔ پی اور بہار صوبوں میں جھولا ڈال کر سکھیاں جھولتی ہیں اور امیر خسرو کے یہ گیت گاتی ہیں۔

"آجہوں نہ آوے سوالی ہو، اے ہو جو پیا آون کہہ گئے

آون آون کہہ گئے ہو آئے نہ بارہ ماس

اے ہو جو پیا آ دن کہہ گئے "

اور یہ راگ میں نے ان ہی کی رکھی ہوئی ہے۔

دھرما ناتھ پنڈت لکھتے ہیں " امیر خسروؒ بھی اور ہندی راگوں کے ماہر تھے لیکن اس فن پر لکھی ہوئی ان کی تین تا بیں ضائع ہو گئیں "۔

امیر خسروؒ نے ستار کی ایجاد کی مردنگ کو ڈھولک میں تبدیل کیا ایرانی تنبورے کی بجائے بہا کی ایجاد کی۔ اس زمانے کے سادات موسیقاروں نے بھی انکی شاگردی قبول کی تھی۔ امیر خسروؒ نے بارہ راگ ایجاد کئے۔ راگ انگلہ ر۔ راگ غنم راگ باخرد راگ سرپردہ۔ راگ زغانہ راگ زیلف راگ موافق راگ عشاق راگ این راگ سازگری اور راگ مجیر۔ ہندوستانی موسیقاروں نے بھی اپنی فلموں میں ان کے راگ بجائے ہیں۔ الیس این ترپاٹھی فلم ہریش چندر تارامتی میں جھنجھوٹی راگ پر ایک دُھن بنائی تھی جس کے بول تھے۔

بدلی بدلی ہے چاند میرا یہ جادو ہے تیرے نین کا

اس گیت کو محمد رفیع اور لتا منگیشکر نے گایا تھا۔ جھنجھوٹی راگ شام کی شفق اور میلاہٹ سے مل کر بنا ہے

حضرت امیر خسروؒ موسیقار کے علاوہ ہندی اور فارسی کے عظیم شاعر تھے۔ برج بھاشا بھی ان کی ایجاد تھی، وہی برج بھاشا جو اردو اور ہندی کی ماں ہے۔ اور اردو ہندی ماں جائی بہنیں ہیں لیکن اب دونوں کے لب ولہجہ خدوخال اور مزاج اتنے بدل چکے ہیں کہ دونوں کی شخصیت بالکل ایک دوسرے سے الگ ہو کر رہ گئی ہے

مولانا محمد حسین آزاد، آب حیات میں لکھتے ہیں کہ:

" امیر خسروؒ نے کہ جن کی طبیعت میں اختراع میں اعلیٰ درجہ صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی ملک سخن میں برج بھاشا کی ترکیب سے ایک طلسم خانہ انشا پردازی کا کھولا۔ بہت سی پہیلیاں عجیب و غریب لطافتوں سے ادا کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے۔ فارسی کے نمک سے ہندی کے ذائقے میں کیا لطف پیدا کیا ہے۔ مکرنی انمل دو سخنے وغیرہ خاص ان کی آئینہ جوہر ہیں :-

سید ابوالعلا حکیم ناطق لکھنوی نے امیر خسروؒ کو شاید یکتا یوں کا مصنف بتایا ہے۔ ان کی پہیلیوں میں بھی بڑی تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے جیسے

" سر کٹے تو امن رہے پیر کٹے تو پیا را
امیر خسروؒ یوں کہے کہ رنگ ہے اُس کا کالا "

جی ہاں یہ جامن ہے۔ علامہ شبلی فرماتے ہیں :-

" امیر خسروؒ کی طبیعت میں عشق و محبت کا مادہ ازلی تھا وہ سرتاپا عشق تھے اور یہ بجلی ان کی رگ رگ میں کوندتی پھرتی تھی "۔

اپنے عالم شباب میں وہ بچوں کی طرح ماں سے لپٹ جاتے تھے۔ ماں کی جدائی انھیں کبھی گوارا نہیں تھی انھوں نے ماں کی محبت میں اودھ کی شاندار نوکری ترک کر دی تھی — تاتاریوں نے انھیں ایک بار گرفتار کر لیا تھا۔ جیل میں انھوں نے جو مرثیے لکھے ہیں سراپا سوز و گداز ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ کے یہ چہیتے مرید تھے وہ انھیں لفظ ترک کہہ کر مخاطب کرتے تھے ان کا درویشی نام محمد کاسہ لیس تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ فرمایا کرتے " اگر قبر میں دو لاشوں کو دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی ہی قبر میں ان کو دفنا دیتا اور

فرماتے "قیامت کے روز اللہ پوچھے گا کیا لائے ہو تو میں کہوں گا امیر خسروؒ کا سوزِ سینہ"

"الٰہی بسوزِ سینۂ ایں ترک مرا ببخش"

کبھی کبھی سرشاری کی کیفیات میں امیر خسروؒ فرمایا کرتے۔

"من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی"

حضرت نظام الدین اولیاؒ فرماتے

تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری"

حضرت نظام الدین اولیاؒ کے وفات کے بعد آپ پاگل ہوگئے تھے وہ کہتے۔ "لوگو یہ نہ سمجھنا کہ میں محبوب الٰہیؒ کے لئے روتا ہوں میں تو خود اپنے لئے روتا ہوں میں اب زیادہ دن نہ جی سکوں گا"

ہوا بھی یہی ٹھیک چھ ماہ بعد اپنا یہ دوہا کہتے ۱۸ شوال ۷۲۵ھ کو اس دنیا سے کوچ کر گئے ۔

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چوندیس

(میرا محبوب سیج پر سوتا ہے اور مکھڑے پر گیسو بکھرے پڑے ہیں چل خسرو! تو بھی اپنے گھر چل چاروں طرف شام ہوگئی)۔

ویسے تو موسیقاروں میں عمر خیام۔ استاد عبدالکریم خاں اور شاہ شرقی کا بھی نام آتا ہے لیکن امیر خسرو بہترین شہد تھے جن میں مٹھاس اور شیرینی کے خزانے چھپے ہوئے تھے۔

بقیہ مضمون صفحہ ۲۸۸

بدائع پر مشتمل ہے لکھ کر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں؛

غزل

زہے مزدہ ازاں زلف و عارض و رخ خوب
یکے سواد و دوم نقطہ و سوم مکتوب
سواد و نقطہ و مکتوب اوست بر دل من
یکے بلا و دوم فتنہ و سوم آشوب
بلا و فتنہ و آشوب او بود مارا
یکے مراد دوم مونس و سوم مطلوب
مراد و مونس و مطلوب ہر سہ شد از من
یکے جدا دوم غالب و سوم مغلوب
جدا و غالب و مغلوب ہر سہ باز آمد
یکے غلام و دوم دولت و سوم مرکوب
غلام و دولت و مرکوب باسہ چیز خوش است
یکے حضور و دوم شادی و سوم محبوب
حضور شادی و محبوب من بود خسرو
یکے شراب و دوم ساقی و سوم محبوب

[illegible]
محمد [illegible] (آنرز)
لیکچرار شعبۂ [illegible] اسلامیہ کالج بریلی

امیر خسروؒ - قومی یکجہتی کا ترجمان

ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کوئی حال کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ بہت قدیم ہے اور اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ تاہم یہ ایک ایسا نازک توازن ہے جو برقرار رکھنے سے ہی برقرار رہ سکتا ہے اور جو ذرا سی افراط و تفریط سے متزلزل ہو جاتا ہے۔ خیر و شر کی متوازی طاقتوں کی طرح فرقہ واریت اور یگانگت کی متوازی تحریکیں بھی ہمیشہ سے کارفرما رہی ہیں۔ تحریک کا لفظ بظاہر ایک غیر مخصوص اجتماعی عمل کا تصور سامنے لاتا ہے۔ لیکن اگر ذرا تجزیہ سے کام لیا جائے تو ہر تحریک چند مفکر اور با اثر افراد سے شروع ہوتی ہے اور بڑھتے بڑھتے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

امیر خسرو کا شمار ان اہل فکر اور با اثر افراد میں ہوتا ہے جنہوں نے قومی یکجہتی، تمدنی یگانگت اور تہذیبی [illegible] اور توانائی بخشی اور جو اپنے یقین و عمل سے [illegible] ہم آہنگی [illegible] اور تہذیبی اخوت کی ایک علامت بن گئے جو کہ ہندوستانی تہذیب کا طرۂ امتیاز ہے۔

امیر خسرو کی رنگا رنگ شخصیت میں گوناگوں خصوصیات جمع ہو کر یک جہت ہو گئی تھیں۔ وہ ایک عظیم صوفی، شاعر اور موسیقار تھے۔ وہ شعر و ادب، موسیقی، علم نجوم، تاریخ نویسی اور فن سپہ گری سبھی میں اونچا مقام رکھتے تھے وہ ایک عظیم المرتبت درباری، ایک عالی مقام خانقاہ نشین، فارسی زبان کے ایک فصیح و بلیغ شاعر، اردو کے موجد، ہندی کے محسن، مسلمانوں کے خیر طلب اور ہندوؤں کے بہی خواہ تھے۔ درباری شاعری کے نقطۂ ارتقا اور لوک گیتوں کا نقطۂ آغاز بھی تھے، امیر و غریب، رند و پارسا، ہر طبقہ اور ہر مذہب کے ماننے والے ان کے پرستار تھے۔

ابوالحسن یمین الدین امیر خسرو کی پیدائش ۱۲۵۲ء میں اترپردیش کے ضلع ایٹہ کے مومن پور عرف پٹیالی نام کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ خسرو کے والد امیر سیف الدین محمود

شمسی ترکوں کے مشہور قبیلے " لاچین " سے تعلق رکھتے تھے جو تاتاریوں کی یورش سے بچ کر ہندوستان میں پناہ ڈھونڈھتے چلے آئے تھے۔ اور یہاں آکر سلطان شمس الدین التمش کے دربار سے وابستہ ہو گئے تھے۔ خسرو غیر معمولی حد تک ذہین تھے جس کی وجہ سے بیس برس کی عمر ہی میں عربی، فارسی، سنسکرت اور ترکی وغیرہ متداول علوم وفنون میں مہارت تامہ بہم پہونچائی تھی۔ ان کے علاوہ ہندوستان جنت نشان کی علاقائی زبانوں یعنی پنجابی، مراٹھی، گجراتی اور برج بھاشا میں بھی غیر معمولی کمال حاصل کیا۔ خسرو نے اپنی پچاس سال کی درباری زندگی میں سلطان غیاث الدین بلبن سے لیکر غیاث الدین تغلق تک گیارہ حکمرانوں کا زمانہ دیکھا اور تقریباً پانچ بادشاہوں کے درباروں میں بلند عہدوں پر فائز رہے سلطان جلال الدین خلجی نے خسرو کو " امیر الاجیس " کا خطاب دیا اور تب سے خسرو امیر خسرو کہلانے لگے۔

امیر خسرو شاعری سے فطری لگاؤ رکھتے تھے۔ اپنے پہلے دیوان "تحفۃ الصغر" میں رقمطراز ہیں کہ میں نے ساتسال کی عمر سے ہی شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ اپنے زمانے کے ایک عالم خواجہ اعز الدین کے مشورہ پر ابتدا میں " سلطانی " تخلص اختیار کیا چنانچہ ابتدائی کلام میں " سلطانی " تخلص ملتا ہے اور باقی کلام میں خسرو۔

امیر خسرو نے اپنے علمی کمالات کو متعدد تصنیفات وتخلیقات میں پیش کیا لیکن ان سب کی قطعی تعداد ابھی تک غیر متعین ہے۔ تحقیق کرنے والے ان کی تصنیفات کو چھیالیس سے لیکر بانوے تک گناتے ہیں۔ اس سے بھی کم کرنے پر ان کے ادبی کارنامے اکیس جلدوں تک ضرور پہونچتے ہیں۔ جن میں نظم ونثر دونوں شامل ہیں۔ نظم میں پانچ دیوان۔ نو مثنویاں اور غزلیات کے متعدد مجموعے ہیں اور نثر میں بھی تین اہم تصانیف ہیں:

(۱) اعجاز خسروی (۲) خزائن الفتوح (۳) افضل الفوائد

ان کے دیوان پانچ ہیں :-

(۱) تحفۃ الصغر۔ اسمیں سولہ سال سے انیس سال تک کا کلام ہے ـــــ (۲) وسط الحیات۔ اس میں بیس سال کی عمر سے چوبیس اور تیس سال کی عمر سے تینتیس سال تک کی عمر کا کلام شامل ہے ـــــ (۳) غرۃ الکمال۔ اس میں چونتیس سال سے لیکر پینتالیس سال تک کی عمر کا کلام شامل ہے ـــــ (۴) بقیہ نقیہ۔ اس میں زیادہ تر ضعیف العمری کا کلام ہے ـــــ (۵) نہایت الکمال۔ یہ پانچواں دیوان خسرو کے آخری ایام کا مجموعہ ہے اور اب یہ نادر ہے۔

جو تصانیف امیر خسرو کے نام سے موسوم ہیں ان میں سے کچھ پر یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ نہ جانے ان کی ہی ہیں یا کسی اور کی۔ اس قسم کے شبہ کو سمجھنے کے لئے ڈاکٹر وحید مرزا کی امیر خسرو پر تصانیف دیکھنی چاہئیں جن میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ (۱) چہار درویش (۲) انشائے خسروی (۳) قصیدہ امیر خسرو مشتمل بر داستان وشاہنامہ۔ یہ امیر خسرو کی تصانیف نہیں ہیں۔ (دی لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو۔ از ڈاکٹر وحید مرزا)

فارسی کے ساتھ ساتھ امیر خسرو ہندی کے بھی ایک زبردست شاعر تھے۔ کچھ تحقیق کرنے والوں مثلاً جناب صفدر آہ کے بیان کے مطابق اگر جنید بر دانی کا زمانہ امیر خسرو کے بعد کا مانا جائے تو کھڑی بولی کی ہندی

شاعری کے باوا آدم بھی امیر خسرو ہی ثابت ہوتے ہیں۔ خسرو کو اپنے وطن سے بے انتہا لگاؤ تھا۔ انھوں نے ہندوستان میں پیدا ہو کر ہندوی کو نہ صرف سیکھا بلکہ اسمیں بے حد مہارت پیدا کی۔ وہ فخر کے ساتھ خود کو ہندوستانی ترک سمجھتے تھے۔ انھوں نے خود اپنے آپ کو "طوطیٔ ہند" بھی کہا ہے کیونکہ وہ ہر سوال کا میٹھی ہندی میں جواب دے سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی وطنی محبت میں یہاں کے بچوں کی تفریح طبع کے لئے بہت سی پہیلیاں۔ مکرنیاں۔ دوسخنے۔ دو ہے۔ انگھ کا نسخہ۔ بسنت۔ ساون کا گیت۔ ڈھکوسلے۔ لڑکیوں کی رخصتی کا گیت۔ وغیرہ ہندی میں لکھے۔ ان سب کو ڈاکٹر شجاعت علی صاحب سندیلوی نے اپنی نہایت مفید اور جامع کتاب "امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری" میں جمع کر دیا ہے ان کے ساون کے گیت مولوی محمد حسین آزاد نے مع مطلب و معنی نقل کیا ہے۔ اس گیت میں سسرال میں گئی ہوئی نئی بیاہی لڑکی برسات کی رت میں جھولا جھولتے ہوئے اپنی ماں کی یاد میں یہ گیت گاتی ہے ؎

اماں میرے باوا کو بھیجو جی — کہ ساون آیا
(یعنی مجھے آ کر لیجائیے)

بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری — کہ ساون آیا
وغیرہ وغیرہ (یعنی وہ کیونکر آ سکتا ہے)

خسرو نے ہندوستانی عوام سے تعلقات بہتر بنانے کے لئے ایک فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت اور برج بھاشا کے آسان آسان الفاظ کے میل ملاپ سے ایک عام بول چال کی زبان کی بنیاد ڈالی جو آج ہر جگہ سمجھی اور بولی جاتی ہے فارسی، ہندی اور دوسرے قسم کے نرم و نازک اور سبک الفاظ کے امتزاج نے اس زبان میں ایک عجیب لذت پیدا کر دی ہے جس کا نعم البدل ممکن نہیں۔ اس حسین امتزاج کی مثالیں ان کے دوسخنوں میں ملتی ہیں جن میں ایک حصہ تو ہندوستانی کا ہے اور دوسرا حصہ فارسی کا ہے جو اسوقت کے حالات کے مطابق سرکاری زبان تھی۔ ایک مثال درج ذیل ہے ؎

خوار شدم زار شدم لٹ گیا
در غمِ ہجرانِ تو کمر ٹوٹ ہے
یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من
بے گنہم ساتھ عجب روٹھا ہے
وغیرہ وغیرہ.....

اسی دوسخنی زبان میں امیر خسرو کی وہ شہرۂ آفاق غزل ہے جسے اردو غزل کی عظیم الشان روایت کا نقشِ اول کہا جاتا ہے اور جس کا مطلع یہ ہے ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل — درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے دل — نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں....

"خالق باری" کو انھیں کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد فارسی جاننے والوں کو ہندی سے واقف کرانا تھا۔ خسرو کی ہندی شاعری پر بھی یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ یہ واقعی ان کی ہے بھی یا نہیں۔ شبہ کرنے والوں میں پنجاب کے مشہور محقق پروفیسر محمود شیرانی ہیں لیکن ڈاکٹر صفدر آہ نے دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خسرو کے نام سے جو ہندی شاعری ہے وہ خسرو ہی کی ہے اور خالق باری بھی انھیں کی تصنیف ہے۔

اتنا تو پوری طرح ثابت ہے کہ امیر خسرو نے ہندی میں بھی شاعری کی ہے البتہ مخطوطات کی عدم موجودگی میں یہ قطعی طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ منسوب کلام میں سے کسقدر

خسرو کا اپنا کلام ہے اور کسقدر لحاقی ہے۔

امیر خسرو ہندوستان کے عظیم ترین وطنی شاعر ہیں۔ سیاست کی ضرورت اور مصلحت کے زمانے سے قبل تیرھویں صدی کا یہ طوطئ ہند اتنا شدید محب وطن تھا جسے ہندوستان کے ذرے ذرے، پھل، پھول، جانور اور چرند پرند تک سے والہانہ محبت تھی۔ ڈاکٹر تاراچند نے اپنے مقالے "امیر خسرو اور ہندوستان" میں خسرو کی حب الوطنی کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے خسرو کو ایک عظیم اور سچا محب وطن ثابت کیا ہے اور کہا ہے کہ آج تک کسی ایک شخص نے ہندوستان کی اتنی زیادہ خصوصیات بیان نہیں کیں، جتنی کہ خسرو نے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے امیر خسرو کی وطن پرستی پر ایک طویل مقالہ "ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں" لکھا ہے جس میں خسرو کی حب الوطنی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے خسرو کو بحیثیت ایک عوامی شاعر کے ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے:-

خسرو کے عوامی زبان میں لکھے ہوئے گیت اپنی شہرت میں لاجواب ہیں کہ چھ سو برس سے کر آج تک مقبول اور ہر دلعزیز ہیں اور بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے ابھی عوام میں گائے جاتے ہیں۔

ڈسکوری آف انڈیا صفحہ ۲۵۷-۵۸

امیر خسرو ایک عظیم موسیقار بھی تھے۔ وہ ایک مثالی محب وطن کی طرح ہندوستانی موسیقی کے دلدادہ تھے اور اس فن میں انھوں نے اسقدر کمال حاصل کرلیا تھا کہ نائیک گوپال جیسے چوٹی کے موسیقار انکی استادی کالوہا مانتے تھے۔ اس میدان میں بھی خسرو نے اختلاط و امتزاج کے فلسفہ کی بنیاد پر ایک ایک جدت اور مجتہد موسیقی کا آغاز کیا۔ اور بعض ایرانی، ترکی اور ہندوستانی باجوں کے سُروں کو ملا کر نئے نئے ساز ایجاد کئے۔ موسیقی میں ستار ڈھولک۔ طبلہ تک۔ اور راگنی خیال کی ایجاد انھیں سے منسوب ہے۔ قوالی کا بھی انھیں کو موجد کہا جاتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں قطعی ثبوت نہ ہونے کے سبب بعض گوشوں سے اسکے خلاف آواز بھی اٹھائی گئی ہے۔ مثلاً رسالہ فنون لاہور شمارہ ۵ اکتوبر، نومبر ۱۹۶۶ء میں جناب رشید ملک نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قوالی اور ستار امیر خسرو سے پہلے کی چیزیں ہیں۔ اس پر بھی ہندوستانی موسیقی سے خسرو کی شیفتگی اور اس فن پر انکے احسانات ناقابل فراموش ہیں۔

مختصر یہ کہ امیر خسرو ہندوستان کی مخلوط متحد اور رنگا رنگ تہذیب کے اعلیٰ ترین معمار تھے۔ انھوں نے اس قومی یکجہتی۔ اس اتحاد، اس اتفاق، اس مشترکہ تہذیب اور اس صلح کل کے فلسفہ کی بنیاد ڈالی، جس کو آگے چل کر اکبر اعظم۔ مہاتما گاندھی۔ مولانا آزاد۔ پنڈت نہرو اور اب ہمارے سامنے ملک کی ہر دلعزیز وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے تکمیل تک پہونچایا۔ ضرورت ہے کہ انسانیت۔ رواداری۔ مساوات۔ ہم آہنگی اور بھائی چارے کے اس زندہ و پائندہ پیغام کو ہم اپنے یقین و عمل میں جگہ دیں اور ہندوستان میں میل ملاپ کی شمعوں کو فروزاں کریں۔

شبیر احمد خان غوری ایم اے ایل ایل بی
سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اُتر پردیش

امیر خسروؒ

علمی زندگی کا ایک پہلو جو نظروں سے اوجھل رہا ہے

امیر خسروؒ کی جامع کمالات ہستی تاریخ ہند کی اُن نادرۂ روزگار شخصیتوں میں سے ہے جن کے بارے میں اقبال کہتے ہیں ؎

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

اور اُن سے پہلے انوری نے کہا تھا ؎

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن
قرنہا باید کہ تا یک کودکے از لطف طبع
عالمے گویا شود یا فاضلے صاحب سخن
دورہا باید کہ تا یک مرد صاحبدل شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

شاعری موسیقی اور سوز تصوف کے علاوہ جن کے شہکاروں نے انھیں زندہ جاوید بنا دیا ہے، وہ وقت کے علوم متداولہ میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے اور ان علوم متداولہ میں وہ علم بھی تھے جنھیں معاشرے میں بنظر تعظیم و احترام دیکھا جاتا تھا جیسے عربیت و فقہ وغیرہما اور وہ بھی تھے جنھیں معتوب و مبغوض سمجھا جاتا تھا یعنی فلسفہ و حکمت۔

مگر امیر علیہ الرحمہ کی شاعرانہ عبقریت کے آگے اُنکے دیگر کمالات علمیہ ماند پڑ کر رہ گئے ہیں اور انکے بڑے سے بڑے عقیدتمند کا دھیان بھی ادھر نہیں جاتا کہ وہ علوم حکمیہ کے بھی دانائے راز ہونگے۔ مثلاً وہ اپنے استاد شہاب مہمرہؒ[1] کی تعریف میں

---

[1] شہاب مہمرہ کی فلسفیانہ حذاقت کے بارے میں رضا قلی خاں ہدایت "مجمع الفصحا" میں لکھتے ہیں:۔ "شہاب الدین ملتانی و بدایونی؟ از حکما و فضلا و شعرا مقرر و مشہور و معروف زمان خود محسوب می شود۔ گویند در زمان سلطان رکن الدین فیروز شاہ ... سوم مرتبہ عہد بود۔
خود شہاب مہمرہ کا مشہور قصیدہ جس کا مطلع ہے ؎
الغم زلوح ہستی ہمہ ہیچ در خشانی
بیقائے غیر قائم ز وجود خویش فانی
اُس کے تبحر فی الفلسفہ و حکمہ پر شاہد عدل ہے۔

لکھتے ہیں ؎

در طبیعی شناختہ تمام — راز مولود و عنصر و اجرام
در ریاضی چنانکہ مہر قلم — بازکردہ بہمت گوش جذر اصم
ذر مجسطی در یکے منقش — صد اشارات در آں منقش

ظاہر ہے یہ اوصاف وہی صاحب کمال بیان کرسکتا ہے جو خود حکمت طبیعیہ کے مسائل سے جو موالید ثلاثہ (جمادات ونباتات وحیوانات)، عناصر اربعہ اور اجرام فلکی سے بحث کرتی ہے باحسن وجوہ واقف ہو، جسے ان مشکلات کا عملی تجربہ ہو جو ریاضیات میں اعداد اصم کا جذر نکالنے میں پیش آتی ہیں اور جس کی ایک جانب فقہ میں "مبسوط" امام محمد پر نظر ہو اور دوسری جانب شیخ بوعلی سینا کی "الاشارات والتنبیہات" اس کے مطالعہ میں رہ چکی ہو اور وہ اس کے غوامض عویصہ کو حل کرچکا ہو۔

انھیں "علوم حکمیہ" میں علم النجوم بھی تھا، مگر یہ اُنکی جامع کمالات زندگی کا وہ پہلو ہے جس تک اُنکے تذکرہ نگاروں اور سوانح نویسوں کی نگاہ بہت کم گئی ہے مگر اُنھیں اس فن کے اندر بھی کمال تھا۔

امیر خسرو کے زمانہ کی دلی میں سلاطین وقت کی فلسفہ وفلاسفہ بیزاری کے باوجود نجوم کا بہت زیادہ رواج تھا، بالخصوص علاءالدین خلجی کے عہد حکومت میں چنانچہ اس عہد کے نجومیوں کے بارے میں برنی نے لکھا ہے :-

"از مبارزی اکابر واشراف ..... علم نجوم رواجے تمام داشت وہر جائے از منجمان نیز بودے ..... وشائدکہ منجمان چہار صد و پانصد تقویم وسی صد مولود نامہ فرزندان ..... بخدمت بزرگان رسانیدندے ..... واشراف شہر رادسمے موروث بودہ است کہ بے اختیار منجم در ہیچ مہمے دست نزدندے ..... وہیچ تعلیے وکارخیرے وخواستگاری بے اختیار منجم در دہلی نکنندے"۔

مگر یہ نجوم جوتش والا نجوم تھا۔ لیکن ہمارے رئیس التذکرہ کو سائنٹفک علم النجوم (ASTRONOMY) میں بھی دستگاہ عالی حاصل تھی، بالخصوص اس علم کے اُس شعبہ میں جو "ثوابت پیمائی" (URANOMETRY) کہلاتا ہے۔ اس کے ثبوت میں اُن کا وہ قطعہ پیش کرنا مستحسن ہوگا جو اُنھوں نے "قران السعدین" میں

صفت سیر بروج و روش منزلہا
کہ بہ کارگزار فلک انداز دوراں

کے عنوان سے لکھا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

سیر منازل ہمہ نزدیک و دور — منزلے داد فلک را ز نور
قرن حمل کردہ قرآن یک دگر — وحد حد شرطین برآوردہ سر
بستہ حمل حمل نبات لبطین — زاد سر سیارہ بہ تثلیث عین
ثور گرفتہ ز ثریا نثار — کوہنہ کوہان زگہر ذیر بار
ساختہ ثور از دبران چشم خویش — کحل جواہر فلک آوردہ پیش
ہقعہ سر سیارہ روش بدور — گشت مشکل چو سر نقطہ ثور

۱؎ بلبن اپنے لڑکوں سے سید نورالدین غزنوی رح کی یہ نصیحت بار بار دوہرایا کرتا تھا جو وہ التمش کے دربار میں اپنے وعظ کے دوران دیا کرتے تھے "فلاسفہ وعلوم فلاسفہ ومعتقدان معقولات فلاسفہ در بلاد ممالک خود بودن نگزارند وعلوم فلسفہ را سبق گفتن بدی وجہ کان روا نداشتند" — امیر خسرو کے ممدوح جلال الدین خلجی کی پالیسی یہ تھی "بد دینیاں ولا مذہبان وفلسفیان و بد اعتقادان را در عہد در ہیچ جائے تنخواہ دست نمی دہد"

تا کہ رہ [illegible] یک جا نمود   داغ دے از گردن جوزا نمود
بسکہ ذراع [illegible] گردون نوشت   پردہ اطلس بہ یہ بیہودہ گشت
نثرہ چو ... شدہ گوہر فزا   چار گہر ریختہ زاں پنج پا
طرفہ نیک طرفہ دو چشمش بدید   دیدہ جیش طرف چشمے ندید
قلب گہر دو طلب جبہہ بود   جبہہ بقلب آمد و ہجت نمود
نہرہ قدر بردست شد چوں اسد   بہر اسد کردہ ز آہن جسد
چہرہ صرفہ بدم شیر گم   مہرہ بسر باشد او را بدم
پنج گہر یافتہ عوا بزیر   پنجہ شیر آمدہ بر ران شیر
ربع سماک از حد تیر آمدہ   رفت رہ میزان ترازو شدہ
عقرب چو سطرے کشرو در کہ حرف   راستی اندر خط میزانش صرف
شکل زبانا بچناں داوری   بر سر عقرب بزبان آوری
عقرب از اکلیل سہ گوہر بہ بیخ   ہر سہ گہر سفتہ بیک زخم نیش
روئے چو بکشادہ مہ مہر جوئے   قطب شدہ عقرب و پوشیدہ روئے
شولہ شدہ بر سر عقرب چو خار   دادہ دو دگاں شعلہ آتش قرار
شکل نعائم چو سر پرے بجائے   کثر شدہ با راستی ہشت پائے
بلدہ جہاں از نظر آنجا تہی   ہست دے ہے یک نہ مردم تہی
سعد شدہ ذابح بزد رنہاں   از پے آرایش خوان جہاں
سعد بلع در شکم بزد درون   رفتہ و آوردہ دو بچہ بروں
سعد سعود از دو طرف درخشاں   با اثر سعد ز تثلیث شاں
اخبیہ با جا حریف درشت   دل کشاں گشتہ زبالائے پشت
کردہ مقدم دو قدم پیش و پس   آب کش دلو شدہ از ہوس
دست مؤخر سوئے ماہی دراز   در دل ماہی شدہ تاخیر ساز
کردہ رشا رشتہ پیچاں بدست   در شکم حوت درا فگندہ شست

یہ محض منازل قمر کے ناموں کی فہرست نہیں ہے جسے کہا جائے کہ شاعر نے ادعائے ہمہ دانی کے لئے نظم کر دیا ہے۔ ان منازل اور بروج دوازدہ گانہ کے مابین تعلق کے سلسلے میں شاعر کی نکتہ آفرینیوں سے قطع نظر، مختلف منازل کے ستاروں کی تعداد اور ان کے اوضاع کے تعین میں ماہرین علم الہیئۃ و علم الانوار کے جو اختلاف ہیں اور اس باب میں جو قول مختار ہے اس قطعہ سے انکے ساتھ شاعر کی واقفیت تامہ کا پتہ چلتا ہے اور ہم اس نتیجہ پر پہونچنے کے لئے مجبور ہیں کہ یہ کاوش صرف اُسی عبقری روزگار کے قلم سے ظہور میں آسکتی تھی جس نے اپنی شاعرانہ سخن سنجیوں، موسیقی کی ورزش اور متصوفانہ سرگرمیوں میں سے کافی وقت نکال کر علم ہیئت اور علم الانوار کی معیاری کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہر مختلف فیہ مسئلہ میں قول محقق اختیار کیا ہو۔

اٹھائیسوں منازل قمر کے باب میں اس قسم کی تحقیقاتی کاوش تو موجب تطویل ہوگی، لہٰذا بمصداق

مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ

دو تین منزلوں کے زیر عنوان مشتے نمونہ از خروارے شاعر کی ہیئتی حذاقت کا تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے۔

لیکن اس تذکرے سے پیشتر یونانی - اسلامی علم الہیت بالخصوص "ثوابت پیمائی (URANOMETRY)" کے دونوں مکاتب فکر بطلیموسی ہیئتی نظام اور علم الانوار کا مختصر تعارف مستحسن ہوگا۔

اسلامی علم الہیت میں دو نظام مروج تھے :-
ایک دیسی یا عرب علم النجوم جو "علم الانوار" کہلاتا تھا۔ اور دوسرا بطلیموسی نظام ہیئت جس کی اساس بطلیموس (PTOLEMY) کی کتاب "کتاب المجسطی" پر تھی۔ اجرام فلکی کی دو بڑی قسمیں ہیں :- ایک سیارات (PLANETS) اور دوسرے ثوابت (FIXED STARS)

بطلیموسی نظام ہیئت میں سیارات کی سیر و گردش کے حساب اور اُن کے ارصاد پر زیادہ زور دیا جاتا تھا ۔ اس کے مقابلے میں عربوں کے علم الانواء کے اندر ثوابت کے ساتھ زیادہ اعتناء کیا جاتا تھا کیونکہ اُن کے ہاں انھیں ثوابت کی عملی افادیت تھی ، اہل عرب انھیں نہ صرف ثوابت کی رہنمائی سے لق و دق بیابان و صحرا میں طے منازل کرتے تھے ، بلکہ انھیں کی مدد سے فصول و مواسم کا تعین بھی کرتے تھے ۔

قدیم علم الہیئت میں سیارات کی تعداد سات تھی ، مگر ثوابت بے شمار تھے ۔ بطلیموس نے مرصودہ ستاروں کی تعداد ایک ہزار بائیس لکھی تھی : اور مسلمان ہیئت دانوں میں عبدالرحمن الصوفی نے ایک ہزار پچیس ۔ ماہرین علم الہیئت نے انھیں اڑتالیس مجموعوں میں تقسیم کیا تھا ، جنھیں صورالکواکب (CONSELLATIONS) کہتے تھے ۔ ہر مجموعہ ثوابت یا "صورۃ فلکی" کی شکل کسی انسان یا حیوان سے مشابہ معلوم ہوتی تھی اور اسی وہمی مشابہت کی بنا پر اُن کے نام رکھ لئے گئے تھے ۔ ان میں سے نصف کرۂ شمالی میں اکیس ، جنوبی میں پندرہ اور منطقۃ البروج (یا مدار شمس = ECLIPTIC) پر بارہ صورتیں ہیں ۔ آخر الذکر بروج دوازدہ گانہ کہلاتے ہیں ۔ ان کے نام یہ ہیں :۔

حمل ۔ ثور ۔ جوزا ۔ سرطان ۔ اسد ، سنبلہ میزان ۔ عقرب ، قوس ، جدی ۔ دلو ۔ حوت

ان بروج دوازدہ گانہ کی "صورتیں" (CONSTELLATIONS) دو سو نواسی ستاروں پر مشتمل تھیں ۔ ان کے علاوہ ستاون ستارے جو اسی زمرے میں محسوب ہوتے ہیں ، حالانکہ وہ ان بروج کی صورتوں سے خارج تھے ۔ بارہ کی تقسیم یہ سہولت کی عملی افادیت کے لئے یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ آفتاب ہر برج میں ایک مہینہ رہتا ہے اور اس طرح بارہ مہینوں میں پورے آسمان کا چکر لگا لیتا ہے ۔

عربوں کے علم الانواء میں ان (۲۸۹ + ۵۷) ، تین سو چھیالیس ستاروں میں سے سب کے ساتھ تو تعرض نہیں کیا جاتا تھا صرف کچھ ہی کی اہمیت تھی اور اس کے لئے انھوں نے آسمان کو بارہ برجوں کے بجائے اٹھائیس منزلوں میں تقسیم کر لیا تھا ۔ اور اُن کا خیال تھا کہ ماہتاب ہر منزل میں ایک شب نزول کرتا ہے ۔ ان اٹھائیس منزلوں کے حسب ذیل ہیں :۔

الشرطان ۔ البطین ۔ الثریا ۔ الدبران ۔ الھقعۃ ۔ الھنعہ ۔ الذراع ۔ النثرہ ۔ الطرف ، الجبھہ ۔ الزبرہ ۔ الصرفہ ۔ العواء ۔ السماک ۔ الغفر ۔ الزبانی ۔ الاکلیل القلب ۔ الشولہ ۔ النعائم ۔ البلدہ ۔ سعد الذابح ۔ سعد بلع ۔ سعد السعود ۔ سعد الاخبیہ ۔ الفرغ المقدم ۔ الفرغ المؤخر ۔ بطن الحوت ۔

یہ منازل قمر بروج دوازدہ گانہ ہی میں واقع ہیں ، مگر جن ستاروں پر مشتمل ہیں اُن کی تعداد بروج اثنا عشر کے ستاروں سے بہت کم ہے ۔ عموماً ایک ایک بروج میں دو دو منزلیں ہیں ۔ مگر یہ کلیہ نہیں ہے ۔ بعض بروج میں تین تین منزلیں ہیں اور کسی میں صرف ایک ۔

اس کی تفصیل دلچسپ ہے مگر خوف تطویل مانع ہے۔ اس لئے دو تین منزلوں ہی کے ذکر پر مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر اکتفا کیا جائے۔

بروج اثنا عشر میں سب سے پہلا برج "برج حمل" (ARIES) کہلاتا ہے کیونکہ جن صورتوں کے مجموعے سے بنا ہے، ان کی صورت وہم غلط کار میں "بزغالہ" سے مشابہ معلوم ہوتی ہے جس کا سر مغرب کی طرف ہے اور پچھلا مشرق کی طرف اور گویا کہ مڑ کر اپنے پچھلے کی طرف دیکھ رہا ہو اور اس کا چہرہ پشت کی طرف ہے[1]۔

ہیئتی نقطہ نظر سے یہ برج انتہائی اہم ہے، کیونکہ جب آفتاب اس برج میں داخل ہوتا ہے تو دن اور رات برابر ہو جاتے ہیں۔ اور بہار کا موسم شروع ہو جاتا ہے اسی لئے اس کے نقطہ آغاز کو "نقطہ اعتدال ربیعی" (VERNAL EQUINOX) کہتے ہیں۔ عربوں کا بھی یہی خیال تھا چنانچہ ابن قتیبہ "کتاب الانوار" میں پہلی منزل "شرطین" کے ستاروں کے بارے میں لکھتا ہے :-

"واذا حلت الشمس بهما فقد حلت براس الحمل وهما اول نجوم فصل الربيع ومن عند ذالك يعتدل الزمان ويستوي الليل والنهار[2]"

جب آفتاب (شرطین کے) ان دونوں ستاروں کے قریب حلول کرتا ہے تو وہ برج حمل کے ابتدائی سرے میں حلول کر چکا ہوتا ہے۔ یہ دونوں فصل ربیع کے پہلے ستارے ہیں۔ اسی وقت سے زمانہ اعتدال پر آ جاتا ہے اور رات دن برابر ہو جاتے ہیں۔

---

[1] عبدالرحمٰن الصوفی : صور الکواکب ۱۳۹

[2] ابن قتیبہ : کتاب الانوار ۱۸

بہرحال برج حمل میں دو منزلیں ہیں :- شرطین اور بطین جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

ماہرین علم الھیئت کے نزدیک برج حمل میں اٹھارہ ستارے ہیں، جن میں سے تیرہ ستاروں سے یہ وہمی صورت بنی تھی اور پانچ ستارے اس صورت سے خارج ہیں۔ مگر عرب علم الانواء کے اندر ان اٹھارہ ستاروں میں سے صرف چھ سات ستاروں ہی کو درخور اعتنا سمجھا جاتا تھا۔ یعنی پہلا، دوسرا، پانچواں، ساتواں، آٹھواں، گیارھواں اور خارج الصورۃ ستاروں میں سے پہلا۔

منازل قمر میں سے پہلی منزل "شرطین" ہے۔ اس کی تشکیل میں دو قول ہیں :-

قول مختار یہ ہے کہ مذکور الصدر (برج حمل کے) ستاروں میں سے پہلا اور دوسرا جو اس وہمی بزغالہ کے سینگوں پر ہیں۔ اور واضح طور پر روشن ہیں، وہی دونوں روشن ستارے "شرطین" ہیں۔

اور اگر ان دونوں روشن ستاروں کے ساتھ پانچویں ستارے کو بھی ملا لیا جائے جو پہلے روشن ستارے سے ذرا جنوب میں ہے اور بزغالہ کی گردن پر ہے، تو یہ تینوں ستارے مل کر "اشراط" کہلاتے ہیں۔ لیکن اس باب میں ایک دوسرا قول بھی ہے وہ یہ کہ (سینگوں پر واقع دو روشن ستاروں میں سے) دوسرا روشن ستارہ اور خارج الصورۃ ستاروں میں سے پہلا ستارہ مل کر "شرطین" کی تشکیل کرتے ہیں۔

اور اگر ان دونوں (یعنی دوسرے روشن ستارہ اور خارج الصورۃ پہلے ستارہ) کے ساتھ اول روشن ستارے کو بھی ملا لیا جائے جو دوسرے روشن ستارے

سے کچھ جنوب میں ہے تو اس مجموعہ کو "اشراط" کہتے تھے۔[1]
("شرط" کے معنی علامت ہیں اور "شرطین"
کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ اولین منزل اور برج حمل کی ابتدا
ہے اور سورج کا اس منزل میں حلول کرنا، نئے سال کی
علامت ہے جیسا کہ ابن قتیبہ کی تصریح اوپر مذکور ہوئی)

بہرحال "شرطین" کے بارے میں قولِ مختار یہی ہے کہ یہ برج حمل کے پہلے دو روشن ستاروں کا نام ہے اور اس (یعنی بزغالہ کے دونوں سینگوں پر واقع ہیں) چنانچہ ابن قتیبہ نے "کتاب الانواء" میں لکھا ہے :۔

"والشرطان کوکبان یقال لهما قرنا الحمل.... وهما الشرطین فی ناحیة الشمال والآخر فی ناحیة الجنوب[1]
شرطین دو ستارے ہیں جن کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ (یعنی) بزغالہ کے سینگوں پر ہیں۔۔۔۔ انہیں سے ایک شمال کی جانب ہے اور دوسرا جنوب کی طرف

اور یہی تفصیل مشہور ماہر علم الهیئت البتانی نے اپنی "الزیج الصابی" میں لکھی ہے۔

"کواکب الحمل وهی ۱۸ کوکبا. وفیه الشرطان وهما علی قرنیه[2]"
(برج حمل کے ستاروں کا بیان۔ وہ اٹھارہ ستارے ہیں اسی برج میں (منزل) شرطان واقع ہے اور (اس کے) دونوں ستارے (بزغالہ) کے دونوں سینگوں پر ہیں)

یہی تفصیل عبدالرحمٰن الصوفی نے البتانی سے "صور الکواکب" میں نقل کی ہے اور اس پر کوئی گرفت نہیں کی ہے۔

"وکذالک البتانی لما احب ان یعمر من نفسه معرفة بمنازل القمر والکواکب علی مذهب العرب ذکر.... ان فی جملة کوکبة الحمل علی الشرطین علی قرنیه[3]"
اسی طرح جب البتانی نے خود منازل قمر نیز اہل عرب کے علم الانواء کی معرفت میں مہارت حاصل کرنا چاہی ۔۔۔۔ تو کہا برج حمل کے ستاروں میں شرطین کے ستارے بھی ہیں جو اس (یعنی بزغالہ) کے سینگوں پر واقع ہیں

(خود عبدالرحمٰن الصوفی کی تحقیق آگے آرہی ہے)۔

یہی وضع ابوریحان البیرونی نے بتائی ہے، چنانچہ وہ "قانونِ مسعودی" میں لکھتا ہے :۔

"الشرطین (تعدد کواکبها) ۲ همها الاول والثانی من صورة الحمل[4]۔ شرطین دو ستارے ہیں وہ برج حمل کے پہلے اور دوسرے ستارے ہیں۔ اسی طرح وہ "کتاب التفہیم فی اوائل صناعة التنجیم" (فارسی) میں لکھتا ہے :۔

"نخستین منزل شرطین است ونشان او دو ستارہ روشن بر پیشانی او از شمال سوئے جنوب۔ میان ایشان دوری چند باز ہی است وبانکہ سوئے جنوب گرائیدہ تر است ستارہ ایست سیم فروترین۔ و این شرطین بر سود گاہ حمل است وزیں جہت او را نطح نام کردند[5]"۔

عبدالرحمٰن الصوفی کی تحقیق حسب ذیل ہے :

"برج حمل کے (داخلی) تیرہ ستاروں میں سے دو ستارے جو درخشانی میں قدر ثالث کے ہیں۔ بزغالہ کی (یعنی) صورت کے سینگوں پر ہیں انہیں سے پہلا ستارہ ذرا

---

[1] ابن قتیبہ، کتاب الانواء ۱۷
[2] البتانی، زیج الصابی - ۱۸۸

[3] صور الکواکب ۱۴ - ۱۵
[4] ابوریحان البیرونی: قانون مسعودی ۱۱۴۲
[5] البیرونی، کتاب التفہیم - ۱۰۸

جنوب میں واقع ہے اور دوسرا شمال میں۔ دونوں کے درمیان خالی آنکھ سے دیکھنے پر ۱/۲ ذراع کا فاصلہ نظر آتا ہے۔[۴۹] پہلے کا طول ۹° – ۲۲ دقیقہ اور عرض شمالاً ۴° – ۲۰ دقیقہ ہے۔ دوسرے کا طول ۱۰° – ۲۲ دقیقہ اور عرض شمالاً ۸° – ۲۰ دقیقہ ہے۔"

اسی محققانہ قول مختار کو ہمارے شاعر (امیر خسروؔ) نے اختیار کیا۔ فرماتے ہیں :۔

"(وہمی) بزغالہ کے سینگوں پر دونوں ستارے ایک دوسرے کے ساتھ قِرآن میں ہیں۔ اسی منزل شرطین سے چاند نے سر نکالا ہے۔" ؎

قرن حمل کردہ قرآن یکدگر
وز حد "شرطین" برآوردہ سر

برج حمل میں واقع دوسری منزل "بُطَین" ہے۔ اس کی شکل اس برج کے ساتویں آٹھویں اور گیارھویں ستاروں سے ہوئی ہے۔ ان کے بارے میں ابن قتیبہ نے "کتاب الانواء" میں لکھا ہے :۔

"ثم البُطَین وھو ثلثة	(پھر شرطین کے بعد) بُطَین کی
کواکب خفیة کا نھا	منزل ہے اور وہ تین ننھے ننھے
اثافی ویقال انھا	ستارے ہیں گویا کہ وہ دیگدان
بطن الحمل[۵۰]"	(کے پایے) ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ (برج حمل کے وہمی) بزغالہ کا شکم ہیں۔

ابن قتیبہ نے ان کا محل وقوع نہیں بتایا صرف اتنا ہی کہا ہے کہ اسے "شرطین" اور "حوت" کے درمیان تلاش کرو۔ مگر البتانی نے اسے (وہمی) بزغالہ کے سرین (الیہ) پر بتایا ہے۔

"وھی علی الیتہ[۵۱]"	وہ اس کے سرین پر واقع ہے۔

اسی پر عبدالرحمٰن الصوفی نے اس تغلیط کی ہے :۔

"وکذالک البتانی	اسی طرح البتانی نے ..... ذکر کیا ہے
ذکر ... والبطین علی الیتہ	کہ .... منزل بطین (کے ستارے)
وغلط فی ذالک لان البُطَین	اس (وہمی بزغالہ) کے سرین پر ہیں لیکن یہاں اس سے غلطی ہوئی ہے
ثلاثة کواکب علی مثلث قد	کیونکہ بطین بشکل مثلث تین ستارے
تقدم ذکرہ[۵۲]"	ہیں اور ان کا ذکر گزر چکا ہے۔

اس "شکل مثلث" کا ذکر عبدالرحمٰن الصوفی نے بدین طور کیا ہے :۔

"وتسمّی السابع الذی علی	انہیں سے ساتواں ستارہ جو مکّی دم
منشا الالیة مع الثامن	اُگنے کے مقام پر ہے، آٹھواں ستارہ
المتقدم من الثلاثة التی	جو ان تینوں ستاروں میں سے جو اس کے سرین پر واقع ہیں سب سے آگے ہے
الالیة مع الحادی عشر	اور گیارھواں ننھا باریک ستارہ جو ران
الخفی الذی فی الفخذ وھی	میں ہے، ان تینوں سے ایک مثلث
مثلث شبیه المتساوی	بنتا ہے جو مثلث مساوی الاضلاع کے مشابہ ہے۔ یہ مثلث (وہمی) بزغالہ
الاضلاع علی بطن الحمل	کے شکم پر ہے، اسے بطین کے نام سے
البُطَین والبطن وھو المنزل	موسوم کیا جاتا ہے اور یہ منازل قمر
الثانی من منازل القمر[۵۳]"	میں سے دوسری منزل ہے۔

اور یہی البیرونی کی تحقیق ہے، چنانچہ "قانون مسعودی" میں لکھتا ہے :۔

"ب۔ البُطَین ۳ ھی السابع والثامن والحادی عشر من صورة الحمل[۵۴]"

---

[۴۹] الصوفی : صور الکواکب ۳۹

[۵۰] ابن قتیبہ : کتاب الانواء ۲۰–۲۱

[۵۱] البتانی : زیج الصابی ۱۸۸

[۵۲] الصوفی : صور الکواکب ۱۴–۱۵

[۵۳] الصوفی : صور الکواکب ۱۴۲

[۵۴] قانون مسعودی : ۳۴۲

(منزل "بطین": تین ستارے ہیں یعنی برج حمل کا ساتواں، آٹھواں اور گیارھواں ستارہ)

اسی طرح وہ "کتاب التفہیم" میں لکھتا ہے:۔

"و نام منزل دوم بُطین و سہ ستارہ است خرد بر نہاد مثلث و جایگاہ شان از صورت حمل دنبال است۔ و معنی بُطین شکمک بود، زیرا کہ جوب اول شکم را بہ قیاس کردند آں بزرگ بود و ایں خرد"[1]

لیکن عرب ماہرین علم الانواء میں ایک مرجوح قول بھی تھا، جس کی رو سے برج حمل کے خارج الصورۃ پانچ ستاروں میں سے دوسرا تیسرا، چوتھا اور پانچواں ستارہ جو پہلے خارج الصور ستارے (الناطح) کے پیچھے ہیں۔ منزل "بُطین" کی تشکیل کرتے ہیں اور اسی وجہ سے اُن کا خیال تھا کہ یہ "ثریا" کے داہنے کندھے (منکب) پر واقع ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک "منکب ثریا" دو ستارے ہیں جو صورۃ "ممسک راس الغول" کی ٹانگ پر ہیں[2]

مگر قول مختار وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا یعنی

(۱) منزل "بطین" تین ستاروں سے بنی ہے نہ کہ چار ستاروں سے (جیسا کہ قول مرجوح میں مذکور ہوا)

(۲) اور یہ کہ (وہی) بزغالہ کے شکم پر واقع ہے نہ کہ ثریا کے داہنے منکب پر۔

اور یہی موافقت امیر خسروؒ نے اختیار کئے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"ناف بطین میں برج حمل (دہی بزغالہ) کو حمل ٹھہر گیا، جس سے تین ستارے پیدا ہوئے"

اسی لئے لکھتے ہیں:۔

بستہ حمل حمل بناف بُطین

زاد سہ سیارہ بتثلیث عین

[بُطین کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ:۔

(۱) بقول مختار وہی بزغالہ کے شکم (بطن) پر واقع ہے اور

(۲) "ممسکہ عظیمہ" کے بطن کے مقابلے میں چھوٹا ہے۔ اسی لئے اسے بطن کی تصغیر کرکے "بُطین" کے نام سے موسوم کیا گیا[3]]

دوسرا برج "ثور" ہے جو ایک ادھورے بیل کی وہی شکل ہے جس کا سُرین اور پچھلے دونوں پاؤں ندارد ہیں۔ اس کا پچھلا حصہ جنوب مغرب کی طرف اور اگلا حصہ ... مشرق کی جانب ہے۔ اُس کا سر پہلو پر مڑا ہوا ہے اور دونوں سینگ مشرق کی طرف ہیں۔ اس برج میں ۳۳ ستارے ہیں جن میں سے ۳۲ اسی صورۃ کے ہیں اور باقی ایک جو اُسکے شمالی سینگ پر ہے، اس برج اور نصف کرہ شمالی کی صورۃ "ممسک الاعنہ" (AURIGA) کے داہنے ٹخنے میں مشترک ہے۔ ان کے علاوہ ۱۱ ستارے خارج الصورۃ ہیں۔

اس برج میں بھی دو منزلیں ہیں: ثریا اور دبران جو ان ۴۴ ستاروں میں سے صرف پانچ ستاروں پر مشتمل ہیں یعنی انتیسواں، تیسواں، اکتیسواں، بتیسواں اور چودھواں

---

[1] کتاب التفہیم ۔ ۱۰۸

[2] عبدالرحمن الصوفی: صورالکواکب ۱۴۳

[3] عبدالرحمن الصوفی: صورالکواکب ۱۴۳

چھ ستارے یعنی نمبر ٢٩، ٣٠، ٣١ اور ٣٢، ٣٣ منزل ثریا کی تشکیل کرتے ہیں۔[١] عبدالرحمٰن الصوفی کا قول ہے کہ وہ یوں کہتا ہے :-

"والکواکب الثریا تزید علی هذه الاربعة التی ذکرنا ها و انما اقتصرنا علی هذه الاربعة لانها ..... اعظمها فی القدر فذکرنا ها و ترکنا ما سواها"[٢]

ثریا کے ستاروں کی تعداد ان چار ستاروں سے زیادہ ہے جنکا ہم نے ذکر کیا لیکن ان چار کے ذکر پر اقتصار اور اکتفا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ... "قدر" (حجم اور درخشان) میں زیادہ بڑے ہیں، اسی وجہ سے انھیں ذکر کیا اور انکے علاوہ باقی ستاروں کو چھوڑ دیا۔

آگے چل کر کہتا ہے :-

"وفی خللها اکر کیان او ثلثة قد صارت مع الاربعة مثل عنقود العنب متقاربة مجتمعة"[٣]

انکے درمیان دو تین ستارے اور ہیں جو ان چار کے ساتھ مل کر خوشہ انگور کے مانند ہو گئے ہیں جو کہ وہ ایک دوسرے کے قریب اور باہم مجتمع نظر آتے ہیں۔

"اس طرح "ثریا" کے ستاروں کی تعداد بقول مشہور چھ (یا سات) ہو گئی۔ اسی لئے ابن قتیبہ نے کہا ہے :-

"وهی ستة انجم ظاهرة فی خللها نجوم کثیرة خفیة"[٤]

ثریا چھ ستارے ہیں ظاہر ہیں انکے درمیان باریک باریک بے شمار ستارے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ اسی کثرت تعداد کی بنا پر اس منزل کا نام "ثریا" پڑا ہو جو "ثروی" کی تصغیر ہے چنانچہ مجد الدین فیروز آبادی لغت کی مشہور کتاب "القاموس" میں فرماتے ہیں :-

"والمرأة ثروی۔ متمولة والثریا تصغیرها والنجم الکثیر الکواکب مع ضیق المحل"[١]

عورت (کے لئے کہا جائیگا) "ثروی" یعنی مالدار اور اس ثروی کی تصغیر "ثریا" ہے اسی لئے "ثریا" منزل نجم کا نام ہے کیونکہ اسکے ستاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے حالانکہ جس مقام میں یہ واقع ہیں وہ بہت تنگ (نظر آتا) ہے۔

لیکن عبدالرحمٰن الصوفی نے ایک اور وجہ تسمیہ بتائی ہے :-

"ویسمون الثریا متبرکون بها و لطلوعها و یزعمون ان المطر الذی عند نوءها یکون منه الثروة وهی تصغیر ثروی"[٢]

اہل عرب اس منزل کا نام ثریا رکھتے تھے کیونکہ وہ اسے اور اسکے طلوع ہونے کو تبرک سمجھتے تھے، ان کا گمان تھا کہ اسکے نچھتر میں جو بارش ہوتی ہے وہ ثروت (از یا مال و دولت) کی وجہ ہے۔ ثریا ثروی کی تصغیر ہے۔

البیرونی نے "ثریا" کے ستاروں کی تعداد چھ بتائی ہے لکھا ہے :-

"ج۔ الثریا و هی القاسع و العشرون و ما بعد ه الی آخر کواکب الثور"[٣]

تیسری منزل ثریا ہے وہ چھ ستارے ہیں یعنی برج ثور کے انیسویں ستارے سے آخری ستارے تک۔

نیز وہ "کتاب التفہیم" (فارسی) میں لکھتا ہے :-

"نام سوم منزل ثریا است پروین و آن شش ستارہ است یک بدیگر خزیدہ مانند خوشہ انگور و برگوہان گاو است۔ و عامہ مردان و خاصہ شاعران ایشان برآنند کہ پروین ہفت ستارہ است و آن گمانی است نہ راست۔ و ہر چند کہ نام نجم بر ہیکے

---

[١] الصوفی: صور الکواکب ١٥٣ [٢] ایضاً ١٥١
[٣] ایضاً ١٥٣ [٤] ابن قتیبہ: کتاب الانواء ٢٣

[١] مجد الدین فیروز آبادی۔ (٢) الصوفی: صور الکواکب ١٥٣
[٣] قانون مسعودی ١١٤٢

از ہم ستارگان افتد و لیکن پروین را خاصہ است "[1]

[اس باب میں امیر خسرو کی حقیقت نگاری اور نکتہ آفرینی آگے آرہی ہے۔ سردست ہم چوتھی منزل قمر کے باب میں مصنفین کتاب علم الانوا اور ماہرین علم ہیئت کے افادات نقل کرتے ہیں]

چوتھی منزل " دَبَران " ہے جو برج ثور کے چودھویں ستارے پر مشتمل ہے، چنانچہ عبدالرحمٰن الصوفی نے لکھا ہے :-

" والرابع عشر ھو النیر الاحمر العظیم الذی علی الطرف الجنوبی من صورۃ الدال وھو علی عینہ الجنوبیۃ	برج ثور کا چودھواں ستارہ وہ بڑا سرخ درخشاں ستارہ ہے جو اس برج کی جنوبی جانب میں ہے۔ اور یہ ستارہ اس (وہی بیل) کی جنوبی آنکھ پر واقع ہے ....
ویسمی الدبران وعین الثور من القدر الاول "[2]	اسے دَبَران اور عین الثور کہتے ہیں۔ یہ قدر اول کا ستارہ ہے۔

یہی بات ابوریحان البیرونی نے " قانون مسعودی " میں لکھی ہے :-

" د۔ الدبران وھو الرابع عشرین صورۃ الثور "[3]	منزل دَبَران اس میں ایک ستارہ ہے یعنی برج ثور کا چودھواں ستارہ

زیادہ تفصیل اس نے " کتاب التفہیم " میں بیان کی ہے :-

" ومنزل چہارم دَبَران۔ واو ستارہ ایست بزرگ و روشن و سرخ گون بر آں چشم گاو کہ سوئے مشرق است نہادہ۔ و دبران را تابع النجم خوانند اے پس روندہ پروین را "[4]

یہ تفصیلات کتنی ہی معلومات افزا کیوں نہ ہوں مگر نہ تو دلچسپ ہیں، نہ کسی خاص اہمیت کی حامل۔ البتہ جو امر موضوع زیر بحث کے نقطہ نظر سے اہمیت رکھتا ہے وہ ان دونوں منزلوں کا مقام ہے اور اسی میں ہمارے شاعر نے اپنی حذاقت فنی کا ثبوت دیا ہے :-

(۱) ثریا کے بارے میں علم الانوا کے مصنفین کا اتفاق تھا کہ وہ برج حمل کی دم پر ہے۔ حالانکہ باقاعدہ ہیئتی ارصاد اور فلکیاتی تحقیقات نے بتایا کہ یہ برج ثور کے کوہان پر ہے چنانچہ عبدالرحمٰن الصوفی نے لکھا ہے :-

" وکلھم ذکروا فی کتبھم انھا علی الیۃ الحمل وھی علی سنام الثور "[5]	علم الانوا کے جملہ مصنفین نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے کہ وہ (ثریا) برج حمل کے سرین پر واقع ہے حالانکہ فی الحقیقت وہ برج ثور کے کوہان پر واقع ہے۔

علم الانوا کے اور مصنفین کی کتابیں تو ہماری رسائی میں نہیں ہیں لیکن ابن قتیبہ نے اس متفقہ غلطی کو دوہرایا۔ وہ " کتاب الانوار " میں لکھتا ہے :-

" ثم الثریا و یقال انھا الیۃ الحمل "[6]	(منزل بطین کے بعد) پھر منزل ثریا آتی ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ برج حمل کی دم ہے۔

مگر ہمارے شاعر نے اس باب میں محقق لغت نویسوں کی خوش فہمیوں کو (جنکا مدار علم الانوار کی کتابوں پر ہے)۔

---

[1] البیرونی: کتاب التفہیم ۱۰۸
[2] الصوفی: صور الکواکب ۱۴۸
[3] البیرونی: قانون مسعودی ۱۱۴۲
[4] البیرونی: کتاب التفہیم ۱۰۸
[5] صور الکواکب ۱۵۳
[6] ابن قتیبہ: کتاب الانوار ۲۳

نہ دہرانے کے بجائے قولِ محقق کو (جیسے عبدالرحمٰن الصوفی جیسے ماہر الفلکیات کی تحقیق اور ابوریحان البیرونی کی تائید حاصل ہے) باحسن وجوہ پیش کیا۔ فرماتے ہیں :-

"ثریا جو (صرف خوشۂ انگور ہی نہیں بلکہ) گوہر پارے شاہوار کا ڈھیر بھی ہے، برجِ ثور کے بیل پر بڑی فیاضی سے موتی نثار کر رہا ہے، اتنی فیاضی کے ساتھ کہ ان موتیوں کی کثرت سے بیل کا کوہان زیرِ بار ہو رہا ہے"۔

کہتے ہیں ؎

ثور گرفتہ ز ثریا نثار کوھہ کوہان ز گہر زیر بار

اس طرح امیر خسرو نے اس متفقہ غلطی کی اصلاح کر دی جو عرب نجوم کے ماہرین کرتے آئے تھے کہ ثریا کے ستارے برجِ حمل کے سرین پر ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ بقول عبدالرحمٰن الصوفی یہ برجِ ثور کے کوہان پر ہیں۔

(۲) اس سے بھی زیادہ اہم اصلاح ہمارے شاعر نے "دَبَران" کے بارے میں فرمائی۔ اسکے اندر تو شہرہ آفاق ہیئت دان البتانی بھی دھوکا کھا گیا تھا چنانچہ عبدالرحمٰن الصوفی نے البتانی کی اس غلطی کی بدیں طور نشاندہی کی ہے :-

"وکذالک البتانی لما احب ان یمھر من نفسہ معرفۃ بمنازل القمر والکواکب علی مذھب العرب واخذ فنا لدیکن من شانہ، ظھر نقصہ و ذلک انہ ذکر فی کتابہ ..... ان فی کوکبہ الثور ..... الدَّبَران علی اھل اذنہ۔ وغلط فی ذالک ایضاً لانّ الدَّبَران علی عینہ الجنوبیہ وھوالنیر الاحمر من الخمسۃ التی علی وجہہٖ"

اسی طرح جب البتانی نے منازل قمر اور عربوں کے مذہب کے مطابق ستارہ شناسی کی معرفت میں مہارت حاصل کرنا چاہی اور جو کچھ اس کا منصب نہ تھا اس میں دخل در معقولات دینا شروع کیا تو اسکی کوتاہی ظاہر ہونے لگی اور یہ اسطرح ہوا کہ اس نے اپنی کتاب (الزیج الصابی) میں ذکر کیا کہ ..... برجِ ثور کے ستاروں میں سے ..... دَبَران بھی ہے جو اسکے کان کی جڑ پر واقع ہے (لیکن) اس باب میں بھی اسنے غلطی کی کیونکہ دَبَران اس (برجِ ثور) کی جنوبی آنکھ پر واقع ہے اور وہ ان پانچ ستاروں میں سے ہے جو اسکے چہرہ پر ہیں۔ یہ درخشاں سرخ ستارہ ہے۔

اور عبدالرحمٰن الصوفی کی اس تحقیق کو "دَبَران" برجِ ثور کے وہی بیل کی "چشمِ روشن" ہے نہ کہ اسکے (کان کی جڑ) ہمارے شاعر کی تحقیق پسند طبیعت نے بھی اپنا لیا۔ فرماتے ہیں:

"برجِ ثور کے (وہی) بیل نے ستارہ دَبَران سے اپنی آنکھ بنالی ہے، گویا کہ آسمان نے اسکی زیادتی بصارت کیلئے کحل الجواہر مہیا کر دیا ہے"۔ آخری بات اشارہ ہے اس ستارے کے برق و لمعان کی طرف کیونکہ یہ قدرِ اول کا درخشاں اور منور ستارہ ہے جس کی تفصیل میں عبدالرحمٰن الصوفی نے لکھا ہے :-

"ویسمّی الرابع عشر الذی علی العین الجنوبیہ الدَّبَران وھوالنیر الاحمر العظیم وھوالمنزل الرابع من منازل القمر یسمّی دبرانا"

(برجِ ثور کا) چودھواں ستارہ جو جنوبی آنکھ پر واقع ہے دَبَران کہلاتا ہے اور وہ بڑا اور سرخ روشن و درخشاں ستارہ ہے اور یہ قمر کی منازل میں سے چوتھی منزل ہے جو دَبَران کے نام سے موسوم کی گئی ہے۔

اس قولِ محقق کو اختیار کرتے ہوئے نکتہ آفرینی فرماتے ہیں :-

ساختہ ثور از دَبَران چشمِ خویش
کحلِ جواہر فلک آوردہ پیش

جی چاہتا ہے کہ اٹھائیسوں منازل کے باب میں اس عبقریِ وقت کی تحقیق اور نکتہ آفرینیوں کا جائزہ پیش کیا جاتا مگر ؎

داماں نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچیں تو از تنگیِ داماں گلہ دارد

---

[۱] عبدالرحمٰن الصوفی: صور الکواکب ص ۱۴۔۱۵ [۲] صور الکواکب ص ۱۵۴

(محمد حسین تسبیحی)　از ڈاکٹر آصفہ زمانی لکچرر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی
(فارسی سے ترجمہ)

امیر خسرو بحیثیت طنز نگار

اگر ہم امیر خسرو کو اچھی طرح سمجھنا چاہیں تو ہمیں ان کی طنز نگاری کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انکی شخصیت زیادہ تر انکے طنز ہی میں پوشیدہ ہے۔ امیر خسرو کی طنز نگاری کو مختلف مدارج میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جو ان کے مذہبی، سماجی، اور سیاسی نظریات سے تخلیق ہوئی ہے۔ کبھی تو ان کا طنز احترام آمیز نظر آتا ہے، کبھی دوستانہ، کبھی ہجو آمیز، کبھی ہزل اور تمسخر پر مبنی، کبھی لطیفوں سے بھرپور اور کبھی قبیح و بدنما بھی۔ ہر شخص کے لئے ممکن ہے کہ ان گوناگوں اقسام کے طنزوں کو مختلف ناموں سے جیسے ہزل مزاح، ہجو، شوخی اور لطیفے وغیرہ سے موسوم کرے۔ لیکن میں نے لفظ "طنز" کو ان الفاظ کی جگہ پر اختیار کیا ہے کیونکہ امیر خسرو نے کچھ اسی طرح کی علامات کو رسائل الاعجاز خسروی میں استعمال کیا ہے۔

اول تو وہ اپنی، ادبی، علمی اور فنی شخصیت کی نشاندہی کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ وہ اپنے سیاسی، سماجی اور مذہبی تصورات کو طنز کے لباس میں مرصع اور مسجع الفاظ میں تنقید کی کسوٹی پر کستے ہیں، جیسا کہ خود انھوں نے اعجاز خسروی کے رسالے پنجم میں بکثرت نمونے پیش کئے ہیں۔ کہتے ہیں:-

"دریں رسالہ کہ از قلتِ تکلیف بر خوان مفلسان مانند خام شوربا تہی کشیدہ شدہ است کہ بیشِ از پختہ شدن دقائق از دود خامہ زنگ یافتہ بود خامہ چوں دمایں ایام، دوات پر تر بجنبین کاتب، کہ آں دیگ سوا داست کہ برنج سوختہ آنرا پختہ کاران، بہ چاشنی تمام، غذائی روح می سازند دیں پختہ ہای قدیم اگرچہ رنج شبانہ است کہ کسی را در تناول آن چند دل گرمی نباشد، معہذا پیش مہمان لذت شناس داشتیم۔ درخواست آن چنانکہ مطبوخات جدید را برای دل خویش دردرو نہ خود جای خواہند داد این مطبوخات دیرینہ را نیز بہ جہت دل من کہ میزبان قدیمم در پذیرند و اگر بیرونی بہ اشاعہ نگیرند کہ غذا نایاب است چنداں گوارا نباشد، باری باید کہ بہ زودی نیز سیر نیایند،" ؎

چاشنی کن خام من گرچہ نشد در خورد کام
تا نیارد خامیم از پختن سودای خام

ترجمہ: اس رسالہ میں جو قلت تکلیف کے باعث فلسوں کے دستر خوان کے مشابہ ہے اور اس پر کچا شوربا رکھا ہوا ہے کہ بار یکیوں کی پختگی سے پہلے قلم کے دھوئیں سے زنگ آلود ہوگیا۔ قلم اس زمانے میں کاتب کی ترنجبین سے بھری ہوئی دوات کہ جو سیاہی کی دیگ ہے کہ اسکے پلے ہوئے چاول کو پختہ کا روگ پوری چاشنی کے ساتھ روح کی غذا بناتے ہیں۔

یہ پُرانی پکی ہوئی چیزیں اگرچہ باسی چاول کے مانند ہیں کہ کسی کو ان کے کھانے میں زیادہ رغبت نہیں ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود میں نے اسے لذت شناس مہمان کے سامنے رکھا ہے۔ درخواست یہ ہے کہ جس طرح نئی پکی ہوئی چیزوں کو اپنے دل کی پسندیدگی کے لئے اپنے اندر جگہ دیں گے ان پُرانی پکی ہوئی چیزوں کو بھی میرے دل کی خواہش کے خیال سے کہ ان کا قدیمی میزبان ہوں، قبول کرلیں اور اگر انھیں ذرا بھی بھوک نہ ہو کہ غذا نایاب ہوا ور اتنی گوارا نہ ہوگی تو بھی چاہیئے کہ جلدی سے سیر نہ ہو جائے۔

میری اس ناپختہ چیز کو چکھئے اگرچہ کام و دہن کے قابل نہیں ہے، کیونکہ میری اپنی خام میرے سودائے خام کو پکانے میں قاصر ہے)۔

ہم دیکھتے ہیں کہ امیر خسرو خود اپنے لئے بھی طنز آمیز الفاظ و کلمات استعمال کرتے ہیں۔ اور جب اسے عبارات کے الفاظ میں جس طرح ادا کرنا چاہتے ہیں پیش کرسکتے تو لفظ "فلاں" استعمال کرتے ہیں۔ درحقیقت اپنی طنز نگاری کے لئے انھوں نے ایک فارمولا بنا رکھا ہے جو شخص لفظ "فلاں" نہیں استعمال کرنا چاہتا ہے وہ جو نام مناسب سمجھتا ہے لفظ فلاں کی جگہ رکھ دیتا ہے اور "اِسے" یا "اُسے"

طنز و مزاح کا نشانہ بناتا ہے۔

امیر خسرو طنز نگاری اور مزاح نگاری میں بڑے ماہر ہیں، ہر شخص کو اپنے طنز کے شہد اور ڈنک سے ہنسانے یا رلانے پر قادر ہیں۔ ہر شخص کو طنز و مزاح کی خوردبین سے دیکھا ہے۔ زمین کے نیچے سے لیکر (یعنی مُردوں پر بھی طنز کیا ہے) آسمان تک پہونچتے ہیں۔ اپنے عہد کے سماجی طبقوں میں اپنے جادو نگار قلم کی نوک سے ڈنک یا شہد کا کام لینا خوب جانتے ہیں۔

اصولاً خسرو طنز مزاح نگاری اور ہجو و ہزل سرائی کے لئے بقول خود "گالیوں سے بھرا ہوا ایک گھر" تیار رکھتے ہیں۔ اور جو شخص ان کا دوست یا ساتھی نہیں ہے اسے ہمیشہ "چوکھی گالیوں کا ہدیہ" پیش کرتے رہے ہیں جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:۔

"من بندہ کہ خسروم درا ین کوہ بے ستون
فرہاد شدم و بہ ہر منصوبہ کہ ہست با و نزد کنیزگان
می باشم خانہ لی میسر نمی شود و چند روزی شد
دروغی راست کردہ است کہ خواجہ درایں خانہ
خواہد آمد انشاء اللہ تعالےٰ زود تر نقل کند
تا ایں خانہ ملک تو گردد و من ایں قطعہ را کہ
اسرار است در گوش او آشکار کردم"

ترجمہ:۔ (میں حقیر جو خسرو کہلاتا ہوں، اس کوہِ بے ستون میں فرہاد ہوگیا ہوں۔ اور جتنے منصوبے ہیں ان کی وجہ سے اسی کے ساتھ کنیزوں کے پاس رہتا ہوں۔ کوئی گھر میسر نہیں ہوتا اور چند دن ہوئے ہیں جھوٹ کو سچ کر رکھا ہے کہ مالک اس گھر میں انشاءاللہ آئے گا اور جلد ہی منتقل کردے گا یہاں تک کہ یہ مکان تمھاری ملکیت ہو جائے گا اور میں نے یہ قطعہ جو اسرار پر مبنی ہے اس

کانوں میں آشکارا کر دیا ہے۔ ؎

تو بیروں کردیم زیں خانہ ای زال
بہ لب چوں مست در قمار خانہ

ترجمہ :۔ اے بڑھیا تو نے مجھے اس گھر سے باہر کر دیا، جوا خانے میں رہنے والے مستوں کی طرح تیرے لب ہیں۔

؎ کہ عاجز ماندم از چوں تو حریفی
چو یکتا مہرہ در ہر دار خانہ

ترجمہ :۔ تجھ جیسے ساتھیوں سے میں عاجز ہوں جیسے کسی مردار خانہ میں کوئی اکیلا مہرہ ہو۔

؎ ز بس کز دست تو دیوانہ گشتم
مرا ایں خانہ شد بیمار خانہ

ترجمہ :۔ تیری وجہ سے مجھ پر اس کثرت سے دیوانگی طاری ہوئی ہے کہ میرے لئے یہ گھر اسپتال بن گیا ہے۔

؎ ترا ہمخانہ ئی چوں من نیا شد
مرا زینساں بود بسیار خانہ

ترجمہ :۔ تیرے گھر میں رہنے والا میرا جیسا نہ ہوگا۔ مگر مجھے ایسے بہت سے گھر مل سکتے ہیں۔

؎ قلم ہست و دوات و قوت طبع
مکن دست بلا در مار خانہ

ترجمہ :۔ قلم ہے دوات ہے اور فطرت کی دی ہوئی قوت ہے سانپ کے بل میں بلائیں سمیٹنے کے لئے ہاتھ نہ ڈالو۔

؎ خمش کن ورنہ مدح خواجہ تو
وہم در دفتر ہر کار خانہ

ترجمہ :۔ خاموش رہو ورنہ تمھارے مالک کی مدح ہر کارخانے میں جا کر کر دوں گا۔

؎ یکی خانہ برا ز دشنام بخشم
ہمہ دشنام ہای چپا رخانہ

ترجمہ :۔ گالیوں سے بھرا ہوا ایک گھر بخش دوں گا اور ساری گالیاں چو کھی ہونگی۔

مندرجہ بالا قطعہ میں امیر خسرو ایک لونڈی کو سرزنش کرتے ہیں کہ تم نے اگر میرا گھر واپس نہ دیا اور ایسا نہ کیا تو میں تمھاری اور تمھارے مالک کی ہجو کروں گا۔

ان برجستہ گفتگوؤں میں فطری طنز نہ بہت بلیغ سخت ہے نہ تیز یہ رسائل، اعجاز خسروی سے ماخوذ ہیں، جسے قارئین کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے اور یہ طنزیات علاوہ اس کے کہ امیر خسرو کو اچھی طرح ہم سے متعارف کراتے ہیں، اس بات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کے زمانے کے ادارے کس سطح کے اور کس حالت میں تھے، لیکن تمام طنزیات کی نقل خاص طور پر وہ جو ہجو اور گالی سے مشابہ ہیں ممکن نہیں۔ جو شخص مزید گفتگو کرنا چاہے اسے چاہیئے کہ اعجاز خسروی کا خاص طور پر رسالہ پنجم کا مطالعہ کرے تاکہ بقول خسرو ؎

تا نقش مرا اہل معانی چو بینند
حیران شدہ چوں صورت دیوار بمانند

ترجمہ :۔ اہل معانی جب میرے نقش کو دیکھتے ہیں تو حیران ہو کر دیوار کے مانند ہو جاتے ہیں۔

معتقد ہو جائیں۔

امیر خسرو نہ صرف رسائل اعجاز خسروی میں طنز گوئی اور ہزل سرائی کرتے نظر آتے ہیں بلکہ انکی دوسری تصنیفات میں خاص طور پر "پنج گنج" (پانچوں مثنویوں) میں بعض ایسے قصّے بھی بیان کئے گئے ہیں کہ جن پر ہزل اور طنز کا لباس نظر آتا ہے، بہت سے محققوں کی تحقیق اور جستجو امیر خسرو کی متضاد شخصیتوں کو ان کی تصنیفات

کے ذخیرے سے علماً از جلد تلاش کرے گی۔ سطور ذیل میں ان کی طنزیات، ہزلیات اور مزاح نگاری کے چند نمونے پیش خدمت کیے جا رہے ہیں:۔

طنز مترسلانہ:

"سودا پختن مترسلان از نی خانہ بیش از این نیست کہ زبان پختۂ پارسی را از تیزیہای عرب چاشنی دھند۔ اگر گوارا آید مترسلانہ خوانند و اگر ناگوارا باشد باصطلاح (معلم بچہ ھا) و جز معنی تحت اللفظ در آن نبود برسان نمکی کہ در دیگ افکنند و حوائج دیگر با آن ضم نکنند و چون بچشنگی چاشنی گیران ترسلات جز آن بہ ذوقی نرسیدہ اند می پندارند کہ مگر از این لذیذ تری نیست"

ترجمہ:۔ قلم کے نزکل سے رسالہ نگاروں کا جنون کو پکانا اس سے زیادہ نہیں ہے کہ فارسی کی پختہ زبان میں عرب کی تیزی سے چاشنی پیدا کریں۔ اگر وہ گوارا معلوم ہو تو اسے مترسلانہ پڑھیں اور اگر ناگوار ہو تو معلم بچوں کا جیسا سمجھیں اور اگر معنیٰ تحت اللفظ کے سوا اس میں کچھ نہ ہو جیسے کہ نمک دیگ میں ڈالا جاتا ہے تو اس میں دوسری ضروریات نہ ملائیں اور چونکہ رسائل کا ذائقہ چکھنے والے بڑے طور پر اس کے سوا کسی اور ذوق سے بہرہ یاب نہیں ہوتے یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس سے زیادہ لذیذتر کوئی اور شے نہیں۔

طنز ادیبانہ:۔

"مجوسانِ حرف شناس را اتفاق آن باشد کہ قلم آسودۂ خود را در این عرصۂ سہل و ناھموار رنجہ کنند و جزوھای کتاب را با نتسابی بزرگ گردانند درخواست آن است کہ در کتابت این جریدہ طریق تصحیح و اتفاق تا حد امکان واجب دارند و کاتبی را بوجہ کتابت سیم دھد کہ روی ستم نبینند و روی سیمین از جواھر صحت ترصیع دھد نہ از شبہ سہو تسوید کند یعنی چون مقابلہ بسعادت تثلیث رسد نحوست خطا را از این تقویم بہ کلی بیرون برد کرام کتاب این نامہ ھا را بہ نشین خطا سیہ روی نکنند از خالق قلم بہ دعا می خواھم کہ کراماً کاتبین را نگذارد کہ نامہ ھای ایشان بہ نبشتن این خطا سیہ روی گردانند"

ترجمہ:۔ حرف شناس ہوس پرستوں کو اس بات کا اتفاق ہوتا ہے کہ اپنے مطمئن قلم کو اس سہل اور ناہموار میدان میں دوڑائیں اور کتاب کے اجزا ضخیم سے ضخیم تر کرتے جائیں، التماس یہ ہے کہ اس رسالہ کی تحریر میں صحت اور احتیاط کا طریقہ ہر ممکن اور ضروری حد تک روا رکھیں کاتب کو کتابت کی معقول اجرت دیں کہ وہ تکلیف نہ اٹھائے اور چاندی سونا پاکر تحریروں کو صحت کے جواہرات سے مرصّع کرے، نہ کہ سہو و نسیان سے مسودہ لکھے یعنی جب تثلیث کی سعادت کا مقابلہ پہونچے تو اس تقویم سے غلطیوں کو پورے طور پر دور کر دے۔ کتاب کے کیڑے ان تحریروں کو سیاہ رو نہ کریں۔ قلم کے خالق سے میری دعا ہے کہ کراماً کاتبین کو اس بات کی اجازت نہ دیں کہ اپنے اعمالنامے لکھنے میں ان غلطیوں کو لکھ کر سیاہ رو نہ کریں۔

طنز نحوی و صرفی:۔

"فتح در صمصام است، معنی ظاہر آنکہ فتح از سر صمصام حاصل شود و معنی نحوی آنکہ صرف نخستین صمصام مفتوح است و اگر جزم یا فتح یار کنند و گویند کہ فتح یا جزم در صمصام ساکن است ھم معنی فتح کہ در اول حرف صمصام است درست آید و ھم معنی جزم کہ قطع است درست

نیز و چنیں باشد کہ فتح و قطع ھر دو با اوست، پس متصرف کسی را توان گفت ؎

کہ کند صرف لفظ بر نحوی
کہ معانی فزوں بروں آید

چوگانی کہ مخدوم فرستادہ بر سر لطف ھای دیگر ضم شد یعنی چوگان شکل ضم دارد، در لطف مضموم است وھمہ وقت در سر ملوک وصدور کشی ضم دارد"

ترجمہ :- فتح تلوار میں پوشیدہ ہے۔ اس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ تلوار کے ذریعے فتح حاصل ہوتی ہے اور معنی یہ ہیں کہ حرف مفتوح کی پہلی تلوار ہوتی ہے اور اگر جزم کو فتحہ کے ساتھ کر دیں اور کہیں کہ فتح با جزم تلوار میں ساکن ہے تو بھی فتح کے معنی جو تلوار کے پہلے حرف میں ہیں صحیح ہونگے اور جزم کے معنی بھی جو قطع کرنا ہے، درست ہو جائیں گے اسی طرح ہوتا ہے کہ فتح و قطع دونوں اس کے ساتھ ہیں اسلئے متصرف اس شخص کو کہا جا سکتا ہے جو ؎

نحو پر لفظ کا تصرف پیدا کرے ؛؛ تاکہ زیادہ معنی پیدا ہوں

جو چھاپی مخدوم نے بھیجی وہ دوسری دلچسپیوں میں ضم ہو گئی یعنی چھاپی ضمہ کی شکل رکھتی ہے۔ اور لطف کا سہرا مضموم ہے اور ہمیشہ بادشاہوں اور صدروں کے سر میں بھی پیوست رہتی ہے۔

طنز رمل در میدان جنگ :-

"ملک نصرت کہ داخل بندگان درگاہ است بالشکری بہ عدد رمل از عتبۂ استقرار خارج شد علم لعلش حمرہ بر آوردہ است و پرچم علم شکل لحیانی نمودہ ذات او کہ بوقت بیرون آمدن نصرت خارجہ است دلیل کند کہ مغلان کوسج شکل را بزخم تیر چوں نقطہ ھای رمل دوگان و چہارگان باھم دوزد و از موج خون بر چہرہ ایشاں ع

شکل کوسج بہ نقش حمرہ گرداند تبدل

ترجمہ :- فتح کا ملک جو درگاہ کے بندوں میں داخل ہے ایک بڑے لشکر کے ساتھ جو ریت کی گنتی کے برابر تھا نکلا۔ اسکے لعل کا جھنڈا سرخ ہو گیا ہے اور علم کا پرچم داڑھی کی شکل کا ہے، اس کی ذات نصرت کے باہر آنے کے وقت خارجی ہے اور اس بات کی دلالت کرتی ہے کہ خشخشی داڑھی والے مغلوں کو تیر کی چوٹ سے ریت کے دانوں کی طرح دو دو چار کر کے باہم سی دیں اور ان کے چہروں پر خون کا لیپ کر دیں ع خشخشی داڑھی والی شکل سرخ رنگ میں تبدیل ہو جائے۔

طنز بر سپاہی :-

"قرابیک میسرہ کہ بہ سر حشم سوی ملتان فاخر بود سوار را مدام در شراب راحت داشت اما قرابیک میشوم میمنہ بجز قرابیتان خود دیگر را آب خوردن ھم نداد"

ترجمہ :- بائیں طرف کا سپاہی لشکر کے ساتھ ملتان کی طرف حملہ آور ہوتا ہے اور سوار کو ہمیشہ عیش و آرام میں مصروف رکھتا ہے لیکن داہنی طرف کا فوجی دستہ ایسا منحوس ہے کہ اپنے عزیز داروں کے سوا دوسرے کو پانی بھی پینے نہیں دیتا۔

طنز بر امیر صدہ :-

(سو سپاہیوں کے سردار پر طنز) "قلب القلب در قلب میسرہ ھر سیم قلب کہ بیرون آمدہ است امیر صدہ میسور روسی نگاہ داشتہ است و ہر کہ میرود بہ سبب مشغولی شراب بارش نمی دھد و قلبہ می زند و ھم از در روی کند و زر مردمان زیر و زبر کردہ است و زر ساختہ"

"واست است آنکہ مرد از زر باژگونہ شود
آں خرس سرخ را کہ قلب است یارب برای آن زرگیرند
تا از ہماں زر را زیر و زبر کند کہ زر حاصل شود۔"

ترجمہ :۔ دل کا وسطی حصہ بائیں طرف کے جھتے کے وسط میں ہر دفعہ پلٹ کر جب واپس آتا ہے سوسواروں کا یہ سردار بائیں جانب نگاہ ڈالتا ہے اور جو بھی گزرتا ہے شراب میں مشغولیت کے سبب اُس کی طرف توجہ نہیں کرتا، پلٹتا ہے اور اسے دروازے سے باہر کر دیتا ہے۔ اسلئے بہت سے لوگوں کو زیر زبر کر دیا ہے اور کامیابی حاصل کی ہے۔ سچ ہے کہ انسان سونے سے پلٹ جاتا ہے وہ خرس سرخ کہ جو قلب ہے اے خدا اسی کے لئے سونا دیتے ہیں تاکہ اسی سونے کو زیر و زبر کریں اور اس سے مزید زر حاصل کریں۔

طنز بر خواجہ وجیہ و خواجہ حسن کیمیای

(خواجہ وجیہ اور خواجہ حسن کیمیای پر طنز) :—

"خواجہ وجیہ روی گر بداند کہ امسال در تاختن ولایت مالوہ روینیہ و مسینہ بسیار افتادہ است و از خزانہ زر قلب بر مس بیرون آمدہ، قدری روین و مس بہ دست سونپال زرگر فرستادہ شد، خواجہ حسن کیمیای را بد عہد تا روی مانگاہدار د و مس را زر کند ع

زیں کار قلبی نزنداں مسینہ را

ترجمہ :۔ خواجہ وجیہ اگر یہ جان لے کہ اس سال مالوہ کی ریاست پر حملہ کرنے میں روینیہ اور مسینہ بہت پڑی ہیں اور خزانے سے تانبے پر زر قلب باہر آیا ہے، تھوڑا روین اور مس سونپال زرگر کے ہاتھ بھیج دیا گیا تاکہ خواجہ حسن کیمیای کو دیدے کہ وہ ہمارے منہ کا لحاظ کرے اور تانبے کو سونا بنا دے ع

وہ اس تانبہ کو کبھی پگھلاتا نہیں

طنز بر شراب خواری۔

(شراب خوری پر طنز)

" در دیہ خاص رسیدیم، شرابی خوردیم مستی در او ہماں مقدار کہ در مستانہ (مستار) است و شیر جستیم ہماں مقدار یافتیم کہ در نام شیراز و کوا شیر است، و آب چنداں خوردیم کہ در شراب و لفظ سراب است۔ خدای تعالیٰ از آن دہ بیران بنام آباداں خرسند دارد۔"

ترجمہ :۔ ہم نے ایک خاص دیہات میں پہونچنے پر شراب پی، اس میں مستی اس حد تک تھی کہ جتنی ہونا چاہیئے، پھر ہم نے دودھ تلاش کیا تو اتنا ہی پایا کہ جتنا شیراز اور کوا شیر کے نام میں مل سکتا ہے اور پانی اتنا پیا کہ جتنا شراب اور لفظ سراب میں ملتا ہے۔ خدا ہمیں اس گاؤں سے لے جائے اور آبادی کے نام پر خوش و خرم رکھے۔

حکیم مقنعی پر طنز :۔

سیما سیمیا، خواجہ حکیم مقنعی کہ مہر دیان نخشب را در کشش می آرد ز بیمار از شبستان ایشان شبا شب بگریزد کہ مصرع

نی شب نخشب است و نی مہ نخشب مہ است

ترجمہ :۔ نقرئی پیشانی، خواجہ مقنعی کہ "نخشب" کے ماہ رویوں کو کشش میں لاتے ہیں راتوں رات ان کے شبستان سے "ز بیمار" بھاگ جاتے ہیں۔ ع

نہ نخشب کی رات رات ہے نہ نخشب کا چاند چاند ہے۔

طنز بر چاکر و عارضِ سپہ سالار :-

(ملازم اور سپہ سالار پر طنز)

" قلبِ سلطان دریایی است کہ اگر لطف عارض شدہ باشد آنجا سوارکاران آب ہم بگذرند، ہر کہ گندم سلطان طلبیدہ او را در انبار بلا باید رفت ملک چنان سایہ گستر و بارندہ باید کہ چاکر محتاج عارض نشود، فتراک بزرگان دستِ آویزِ امید است، دستِ تعلق در فتراک باید زد کہ چرب باشد تا بیم گسستن نبود چاکر چنان دوندہ و پویندہ باید کہ در کارہا بادی شود، شراب لشکریان عرق پیشانی و شرابی از این حلال تر نباشد "

ترجمہ :- بادشاہ کا دل ایک سمندر ہے، اگر سپہ سالار کی مہربانی ہو جائے تو وہاں سوار لوگ پانی سے بھی گذر جائیں جس نے بادشاہ سے گیہوں طلب کیا اسے مصیبتوں میں مبتلا ہونا چاہیئے بادشاہ کو اتنا سایہ فگن اور بارش کرنے والا ہونا چاہیئے کہ ملازم سپہ سالار کا محتاج نہ ہو بزرگوں کا چلا امید کے ہاتھوں میں لٹکا ہوا ہے۔ چلے میں تعلق کا ہاتھ مارنا چاہیئے کہ چکنا رہے تاکہ ٹوٹنے کا ڈر نہ ہو۔ نوکر کو اتنا دوڑنے والا اور چلنے والا ہونا چاہیئے کہ کاموں میں ہوا بن جائے۔ فوجیوں کی شراب پیشانی کا پسینہ ہے اور اس سے زیادہ جائز اور کوئی شراب نہیں۔

نذرِ عقیدت

امیر خسرو

عبدالمتین نیاز

ہزاروں سال کی بے نوریاں تخلیق کرتی ہیں
اک ایسی آنکھ جو پیچیدگیٔ وقت کا ادراک رکھتی ہو
ہر اک احساس ہر اک فکر سے ہو آگہی جس کو
جو مستقبل کی ان دیکھی تہوں میں جھانک سکتی ہو
جو مہر و ماہ کی روشن ہو نورِ علم و دانش سے
جو لفظ و صوت کے ہر رنگ کو خود میں سمو پائے
جو ہستی کی تہوں میں ڈوب کر موتی نئے لائے
جو ارمان و تمنا کے انوکھے گیت بنتی ہو
خوشی کے پھول چنتی ہو
غموں سے جس کی یاری ہو
اک ایسی ہی نرالی آنکھ تھی خسرو کی ہستی بھی
جو مستقبل کا سینہ چیر کر ہم تک چلی آئی
ہماری روح پر کچھ تازگی کے رنگ برسانے
پھر احساس و تفکر کے نئے عنوان سمجھانے
ہمارے خشک تپتے ذہن کی بالیدگی دینے
وہ اک فنکار، اک انسان، اک صوفی
جو اپنے فن کی روشن آنکھ میں ہے جلوہ گر اب بھی
اسی کے جشن کا سب آج ہنگامہ اٹھاتے ہیں
مگر پیغام اس کے فن کا سنتا ہی نہیں کوئی
نمائش اس کے فن کی ہو رہی ہے ساری دنیا میں

ڈاکٹر سید مجاہد حسین حسینی
صدر شعبۂ اردو و فارسی، ایم ڈی کالج، بمبئی

امیر خسرو کا لسانی شعور

طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرو کی شخصیت میں پائی جانے والی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو چکی ہے۔ مجھے تو یہاں تک کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ ۶۵۱ھ مطابق ۱۲۵۳ء میں پیدا ہونے والے اس "ترک ہندوستانی" کی شہرت کا آفتاب خود اس کے عہد میں اتنی بلندی پر نہ تھا جتنا کہ آج ہے۔ کلام خسرو، معاصرین خسرو، تذکار سلطنت، اور تاریخ کے پارینہ صفحات، محدب شیشے کی طرح خسرو کی ذات و صفات اور فضا و ماحول کو ہماری نظروں کے سامنے واضح طور پر لا رہے ہیں۔

اس وقت نہ میں امیر خسرو کے شاعرانہ کمال کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اور نہ فن موسیقی میں ان کی مہارت کا تذکرہ مقصود ہے۔ مجھے ان کے لسانی شعور کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ خسرو کو اس بات کا بھرپور احساس تھا کہ ما فی الضمیر کو ظاہر کرنے اور خیالات و جذبات کی ترسیل و ابلاغ کے لئے زبان و علم زبان کا جاننا بہت ضروری بلکہ لازمی ہے وہ بیک وقت کئی زبانوں سے واقف تھے اور یہ واقفیت محض سرسری نہ تھی بلکہ وہ ان زبانوں میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ پروفیسر محمود شیرانی گواہ ہیں کہ :-

> وہ ایک طرف فارسی کے زبردست ناظم و ناثر ہیں، دوسری طرف عربی و سنسکرت میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ جہاں فارسی پر اُن کے احسان ہیں وہاں ہندی بھی اُن کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جس قدر فارسی میں اُن کا کلام ہے اس سے کہیں زیادہ ہندی میں بتایا جاتا ہے۔[1]

خسرو کو اپنی فارسی دانی کا عرفان حاصل تھا۔ مشہور و معروف ایرانی شاعر نظامی کی "پنج گنج نظامی" کے جواب میں

---

[1] پنجاب میں اردو، نسیم بکڈپو، لکھنؤ، مطبوعہ فروری ۱۹۷۰ء ص ۱۵۳

"خمسۂ خسرو" لکھتے ہوئے بطور تعلّی فرماتے ہیں ؎

غلغلۂ خسرویم شد بلند
زلزلہ در قبر نظامی فگند

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خسرو، فارسی کے معروف ترین شعراء میں سے ایک ہیں۔ وہ فارسی میں اتنا بلند معیار رکھتے تھے کہ ایران میں بسنے والے ان کے شیرازی ہم زبان لسان الغیب حافظ (المتوفی ۷۹۱ھ) بھی اُن کے خوشہ چیں تھے :-

کلام حافظ میں ایسی کئی ترکیبیں، تشبیہیں
اور بندشیں مل جاتی ہیں جن کا پہلا نقش
امیر خسرو کے یہاں موجود ہے۔ مثلاً دیوان
حافظ کی پہلی غزل کا مطلع ؎

اَلَا یَا اَیُّھَا السَّاقِیْ اَدِرْ کَاساً وَّنَاوِلْھَا
کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

خسرو کے یہاں اس کا مصرعہ اولیٰ یوں ہے ؎
ز شرب لعل باشد قوتِ جاں ہا، قوتِ لہا[۱]

فارسی پر گرفت رکھنے کے باوجود امیر خسرو کو زبان ہندوی سے بے پناہ عشق تھا۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

خسرو نے اس "ہندوی" کی تفصیل اپنی مثنوی "نہ سپہر"[۲] میں اس طرح بیان کی ہے ؎

سندی و لاہوری و کشمیر و کبر | دھور سمندری، تلنگی و گجر
معبری و گوری و بنگال و اودھ | دہلی و پیرامنش اندر ہمہ حد
ایں ہمہ ہندویست ز ایام کہن | عامہ بکار است بہر گونہ سخن

اس کے علاوہ اپنی دوسری مثنوی "دول رانی خضر خاں"[۱] میں وہ خوبیٔ زبان ہند، صرف و نحو زبان ہند، بیان و معنیٔ زبان ہند کی سرخیوں کے تحت بھی "ہندوی" کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

غلط کردم گر از دانش زنی دم
نہ لفظ ہندی است از پارسی کم
بجز تازی کہ میر ہر زبان ست
کہ ہر جملہ زبانہا کامراں ست
دگر غالب زبانہا در رسے و روم
کم از ہندیست زاندیشہ معلوم
عرب در گفت دارد کار دیگر
کہ نامیزد در و گفتار دیگر
بہ نقصانست لفظ پارسی در خورد
کہ بے آچار تیزی کم تواں خورد
چو آں صافی وش و ایں دردناک ست
تو گوئی کیں جسد و آں جان پاک ست
جسد را مایۂ گنجد ز ہر ساں
نہ گنجد از لطافت ہیچ در جاں

۱؎ ڈاکٹر ظ۔ انصاری: مضمون بعنوان (امیر خسرو کے غیر ملکی قدرداں) مطبوعہ ماہنامہ آجکل دہلی (امیر خسرو نمبر) نومبر ۱۹۷۴ء ص ۴۰

۲؎ یہ مثنوی امیر خسرو نے ۷۱۸ھ مطابق ۱۳۱۸ء میں لکھی تھی اور "سپہر سوم" میں انھوں نے ہند کی زبانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس مثنوی کو ڈاکٹر وحید مرزا نے ایڈٹ کیا ہے۔

۱؎ اس مثنوی کا سنہ تصنیف ۷۱۵ھ مطابق ۱۳۱۵ء ہے اسے رشید عالم سالم صاحب نے مرتب کر کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ پریس علی گڑھ سے شائع کیا

ز زیبد ... گردن ہمسری را
... از یمن وُز دری را
ببیں دولت زگنج خوش حرمت
متاع عاریت عاری شگرفست
زبان ہند ہم تازی مثال است
کہ آمیزش درآں جا کم محال است

خسرو کا ہندوی زبان میں لکھا ہوا یہ دوہرہ ملا وجہی[1] نے "سب رس" میں نقل کیا ہے ؎

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساقی تیرا چاؤ
مجھ جلتی جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

میر تقی میر اپنے تذکرے[2] میں لکھتے ہیں :-

اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار دارد۔ دریں
خود تر قدمے نیست از آنجملہ یک قطعہ تیمناً نوشتہ
آمد :-

زرگر پسرے چو ماہ پارا
کچھ گھڑ لیے سنوار ریے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست
پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

مولانا محمد حسین آزاد اپنے مخصوص انداز میں فرماتے ہیں :-

امیر خسرو نے کہ جن کی طبیعت اختراع میں اعلیٰ
درجہ صنعت وایجاد کا رکھتی تھی ملک سخن میں
"برج بھاشا" کی ترکیب سے ایک طلسم خانہ
انشا پردازی کا کھولا[1]

علامہ شبلی نعمانی کی تحقیق کے مطابق :-

"حضرت امیر خسرو نے سنسکرت اور بھاکھا میں
جو کمال پیدا کیا وہ محتاج اظہار نہیں[2]"

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خسرو نے جس ہندی، ہندوی، بھاکھا، برج بھاشا یا اردو میں اپنی تخلیقات پیش کیں، علم لسانیات کے اعتبار سے ان کی حقیقت کیا تھی۔ اس سوال کا جواب ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی ایک تحریر سے ملتا ہے، لکھتے ہیں :-

خسرو سے منسوب جو پہیلیاں اور مکرنیاں
ہیں ان کی زبان کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں تین
قسم کی زبان ملتی ہے :-
(۱) ٹھیٹھ کھڑی بولی۔ (۲) کھڑی اور برج بھاشا
ملی ہوئی۔ (۳) خالص برج بھاشا۔
پہیلیاں وغیرہ عام طور سے کھڑی بولی یا پھر کھڑی
اور برج بھاشا ملی ہوئی زبان میں لکھی گئی ہیں لیکن
انکے گیت عام طور سے معیاری برج بھاشا
میں ہیں۔ اس لیے خسرو کو کبیر کی طرح مفر نہ
تھا[3]

---

[1] سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دور میں وجہی گولکنڈا کا پہلا ملک الشعرا تھا۔ سب رس سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۵ء میں قلمبند ہوئی۔ (حوالہ کے لئے دیکھئے دکنی ادب کی تاریخ مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور مطبوعہ دہلی ۱۹۵۹ء صفحہ ۶۲-۶۳)۔

[2] نکات الشعرا تکمیل یافتہ ۱۱۶۵ھ مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی اشاعت اول جنوری ۱۹۷۲ء مطبوعہ دہلی ص ۲۴

[1] آب حیات (تلخیص و مقدمہ : پروفیسر سید احتشام حسین) نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا) نئی دہلی صفحہ ۲۱

[2] مضمون بعنوان ــ بھاشا زبان اور مسلمان (انتخاب مضامین شبلی) مکتبہ جامعہ دہلی مئی ۱۹۶۱ء صفحہ ۲

[3] مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ سرسید بک ڈپو علی گڑھ ۱۹۷۰ء ص ۱۳۷

ہے کہ برج بھاشا کی نرم بولی کے مقابلہ میں لوگوں
نے اسے (لہجہ اور آوازوں کی درشتی کے لحاظ سے)
کھڑی یا کھری بولی کہا ہو یا ایرانیوں نے یہ نام
دیا ہو۔[1]

رفتہ رفتہ اس کھڑی بولی پر فارسی اور عربی کا اثر پڑنے لگا عموماً یہ زبانیں (فارسی و عربی) مسلمان اپنے ساتھ ہندوستان میں لائے تھے چنانچہ جب وہ پنجاب پہونچے تو (مُفرّس و مُعرّب) کھڑی بولی اور پنجابی کے ملاپ سے ایک ایسی بولی نے جنم لیا جسے امیر خسروؔ نے "لاہوری" اور ابوالفضل نے "ملتانی" کہہ کر پکارا ــــ اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ امیر خسروؔ جس زبان میں شاعری کر رہے تھے وہ دلی، مغربی یو، پی، پنجاب اور ملتان تک بولی اور سمجھی جا رہی تھی۔ اگرچہ دہلی میں پنجابی۔ ہریانی، کھڑی بولی اور برج بھاشا سبھی مل رہی تھیں لیکن چونکہ بقول چٹرجی ان زبانوں کی قواعدی ساخت میں بہت معمولی فرق ہے۔ اس لئے فارسی، عربی بولنے والے مسلمانوں کا پہلا گروہ پنجابی، ہریانی یا بانگرو اور کھڑی بولی کی طرف زیادہ متوجہ ہوا۔ فرانسیسی ماہر لسانیات جیولز بلاک نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ابتدا میں پنجابی اور کھڑی بولی میں صرف تدریجی فرق رہا ہوگا بعد میں ایک بولی پنجابی بن گئی دوسری کھڑی بولی۔[2]

کھڑی بولی کا یہ نیا روپ زبان دہلوی، ہندی یا ہندوی کہلایا۔

---

[1] جان بیمز: ہندوستانی لسانیات کا خاکہ۔ دانش محل لکھنؤ تیسرا ایڈیشن جولائی ۱۹۶۳ء مقدمہ پروفیسر احتشام حسین ص ۵۵

[2] بحوالہ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ۔ مقدمہ ص ۵۶

لسانی نقطہ نظر سے ہند آریائی زبانوں کے جو خاندان بنائے گئے ہیں ان میں مغربی ہندی کی بولیاں بہت اہم تھیں، انھیں بولیوں میں ماضی کی برج بھاشا اور آج کی کھڑی بولی سب سے اہم ہیں[1]۔ لہٰذا یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ امیر خسروؔ کی زبان آج بھی اتنی ہی عام فہم اور معیاری ہے جتنی خود انکے زمانے میں تھی اور یہی ان کے کلام کی تازگی، ہمہ گیری اور مقبولیت کا راز ہے۔

---

[1] ڈاکٹر گیان چند جین، لسانی مطالعے، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا دہلی۔ جنوری ۱۹۷۳ ص ۴۸

بقیہ مضمون صفحہ ۲۹۲

نئے راگ ایجاد کئے۔ دھروپد ہمارا روایتی راگ تھا جو عبادت کے وقت گایا جاتا تھا۔ انھوں نے ترانہ ایجاد کیا ان کا راگ "عشاق" سارنگ اور بست نارا کا امتزاج ہے اور "آئین" مرکب ہے ہنڈول اور نیریز کا ایسے ہی ان کے دوسرے راگ ہیں۔

امیر خسرو ایسی رنگا رنگ اور بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے، انھوں نے مشترکہ تہذیب کی بنیاد رکھی۔ اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لائے۔ انھوں نے بادشاہوں کی ملازمت کی لیکن انکے حلقہ بگوش نہیں ہوئے اور خود کو ہمیشہ عوام کے ساتھ رکھا

خسرو انسان دوست تھے عوام سے محبت کرتے تھے
وہ محب وطن تھے، اپنے ملک سے پیار کرتے تھے
شاعر، موسیقار اور صوفی تھے
وہ ان تمام خوبیوں کا نادر مجموعہ تھے۔
ہندوستان ان پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

مذکورۂ بالا تجزیے کی بنیاد پر ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے خسرو کے بیاض سے حسب ذیل مثالیں پیش کی ہیں :-

(الف) ٹھیٹھ کھڑی بولی۔

ایک تھال موتی سے بھرا — سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اور وہ تھالی پھرے — موتی اس سے ایک نہ گرے

(ب) خالص برج بھاشا :-

سیام برن پی تامبر کاندھے مرلی دھر نہیں ہوئے
من مرلی وہ ناد کرت ہے برلا بوجھے کو سے

(ج) کھڑی اور برج ملی زبان :-

ایک گنی نے یہ گن کینا — ہریل پنجرے میں دے دینا
دیکھو جادوگر کا حال — ڈالے ہرا نکالے لال

آگے چل کر پروفیسر موصوف نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ :-

> لسانی تجزیہ کرنے کے بعد بھی ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ خسرو کے ہندی کلام کی زبان عالم گیر کے عہد سے قبل کی اردو نہیں اس لئے امیر کے کلام کو قدامت کی سند بخشتے وقت ذرا احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کم ازکم اس سے ہرگز ہرگز اس عہد کی زبان کے متعلق کلیات نہیں بنائے جا سکتے۔[۱]

مجھے اس بات پر اصرار نہیں کہ امیر خسرو کے کلام کی زبان قدیم ترین یا مستند ہے۔ اس امر سے بھی اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ خسرو کے ہندی کلام کی مدد سے اس عہد کی زبان کے متعلق کلیات نہیں بنائے جا سکتے لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ امیر کا لسانی شعور بہت پختہ تھا اور جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا تھا کہ وہ علم زبان و اصول لسانیات کی اہمیت و افادیت سے یکسر ناواقف نہ تھے۔ جس ہندی یا ہندوی پر خسرو کو ناز تھا اسے مختلف حضرات نے مختلف ناموں سے پکارا اور اس کے الگ الگ علاقے بھی متعین کئے گئے۔ مثلاً ایک گروہ نے اسے "کھڑی بولی" کا نام دیا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، کھڑی بولی کے بارے میں لکھتے ہیں :-

> کھڑی بولی یا ہندوستانی دراصل، میرٹھ اور دلی کی زبان ہے جو کسی زمانے میں ان علاقوں کی محض بول چال کی زبان تھی لیکن جب اسے ادبی اور ملک کی معیاری زبان کا درجہ ملا، اس کا حلقہ اثر برابر وسیع ہوتا چلا گیا اور اب یہ مغربی روہیل کھنڈ، دوآبے کے شمالی حصہ اور پنجاب کے ضلع انبالہ میں بھی بول چال کی حیثیت سے رائج ہے۔ اس زبان کا نام کھڑی، ہندو ادیبوں کا دیا ہوا ہے۔[۱]

مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی کا خیال ہے کہ :-

> چونکہ کھڑی بولی کا تعلق مسلمان بادشاہوں کے دربار سے ہو گیا تھا اسی لئے اسے کھڑی بولی کہا گیا اس علاقہ کی دوسری زبانیں یعنی برج بھاشا وغیرہ پڑی بولیاں کہی جاتی تھیں۔[۲]

لیکن پروفیسر احتشام حسین کو ان نظریے سے اختلاف ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

> یہ محض قیاس آرائی معلوم ہوتی ہے، ہو سکتا

---

۱ مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۱۳۹

۱ اردو زبان کا ارتقا: اردو مرکز دہلی ص ۲۷
۲ ہندی آریائی اور ہندی۔

حضرت امیر خسروؒ کی غزل پر چار زبانوں میں تضمین

قمر سیوہاروی

نہ جانے عالمِ لاہوت تھا، یا ہُو کا تھا عالم — کٹاری مار کے نینا کی کل بے چھپ گئے بالم
فَاِنَّ الْعَقْلَ لَا يُحْصِيْ وَاِنَّ الْفَهْمَ لَا يَفْهَمْ — دگرگوں حالِ من بے بس[1] گہے خنداں گہے گریم
نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم
بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائیکہ من بودم

وہ جس کے روئے زیبا سے منور چاند اور تارے — قمر اس چندر ما مکھڑے پہ تن، من اور دھن وارے
جَمَالٌ فِيْ جَمَالٍ مُسْتَتِرٌ وَ بَيْنَ اَسْتَارٍ — ہزاراں فتنہا در غمزۂ چشمِ فسوں کارے
پری پیکر نگارے سرو قدے لالہ رخسارے
سراپا آفتِ دل بود شب جائیکہ من بودم

کبھی دردِ شبِ فرقت، کبھی سوزِ غمِ پنہاں — پریتم نام سے تمرے موہے چھیڑت رہیں سکھیاں
فَكَيْفَ نَرْفَعُ الْاَصْوَاتَ مَالَمْ يَقْدِرِ الْاِنْسَانُ — بہر لمحہ جگر سوزاں بہر جانب نظر حیراں
رقیباں گوش بر آواز، او در ناز، من ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم

تھا اس عالم کا ہر لمحہ حیاتِ جاوداں خسرو — چتر سنسار تھا وا کا چتر تھے سب یہاں خسرو
فَكَانَتْ هٰذِهِ الْاَحْوَالُ بَيْنَ الْاِمْتِحَانِ خسرو — قمر دیدہ عجب عالم ز چشمِ عاشقاں خسرو
خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائیکہ من بودم

---

[1] بے بس لفظ فارسی ہے جو مرکب ہے بے + بس = بے بس۔ بس کا استعمال مختلف مواقع پر مختلف معانی کے لئے ہوا ہے۔ سعدیؒ نے سہارا، تکیہ کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ اسی معنی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حرفِ سابقہ "بے" کو شروع میں لگا دیا۔ اس لفظ کو خارج از فارسی سمجھنا بے علمی اور بے بضاعتی ہے۔ (قمر)

مطبوعات ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ
(بہ ترتیب حروف تہجی مع جدید قیمت مئی ۱۹۷۶ء)

(۲)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	امیر خسرو نمبر	فروغ اُردو	۱۲/-
۲	ادبی جائزے	سعادت علی صدیقی	۸/-
۳	اپنا کا چمن، فواروں کے پھول۔	قمر لبسوانی	۳/-
۴	احتشام حسین نمبر (فروغ اُردو)	سید انصار حسین ناہلی	۲۵/-
۵	اُردو کا ماضی، حال اور مستقبل۔	احمد ابراہیم علوی	۴/-
۶	آئینۂ نظم اردو	قمر لبسوانی	۳/-
۷	انتخاب کلام چکبست لکھنوی	روپ نرائن شیوپوری شاکر	۱/-
۸	اُردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	ڈاکٹر محمود الحسن رضوی	۱۶/-
۹	اُردو نمبر، فروغ اُردو	اقبال صدیقی	۳/۵۰
۱۰	انوار اللغات اُردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز)	پروفیسر احتشام حسین	۴/-
۱۱	ادبی تاثرات۔	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/-
۱۲	آئینۂ عقل	پروفیسر نکہت شاہجہاں پوری	۳/۵۰
۱۳	اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احسن فاروقی	۶/۵۰
۱۴	امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۵۰
۱۵	انارکلی امتیاز علی تاج (جدید ایڈیشن)		۲/۷۵
۱۶	امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	۵/۵۰
۱۷	اُردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ	پروفیسر کلیم الدین احمد	۱۰/-
۱۸	اُردو میں تنقید	ڈاکٹر احسن فاروقی	۶/-
۱۹	انتخاب قصائد اُردو	مغیث الدین فریدی	۱/۵۰
۲۰	ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	۸/-
۲۱	اُردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم	عبدالشکور	۷/-
۲۲	ادبی نقوش،	شاہ معین الدین ندوی	۸/-
۲۳	اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں	عبدالماجد دریابادی	۸/-
۲۴	انتخاب جدید نثر اُردو	سید احتشام حسین	۴/۵۰
۲۵	اقبال مرثیہ	فروغ اُردو	-/۵۰
۲۶	البرامکہ اور ان کا عروج و زوال	ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے	۳/-
۲۷	انتخاب کلام غالب	بشیر احمد علوی	۱/۵۰
۲۸	ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	۷/۵۰
۲۹	انتخاب قصائد و غزلیات	فروغ اُردو جدید ایڈیشن	۶/-
۳۰	ادب کیا ہے	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۳/۵۰
۳۱	ادبی خطوط غالب	مرزا محمد عسکری	۷/-
۳۲	آئینۂ نثر اُردو	سعادت علی صدیقی	۴/۵۰
۳۳	ایک نادر روزنامچہ	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۲/۵۰
۳۴	ابو الخمر	مجنوں گورکھپوری	-/۵۰
۳۵	اُردو کی کہانی	سید احتشام حسین	۲/۵۰
۳۶	ادب پارے حصہ نظم و نثر	"	۵/۲۵
۳۷	ابو الکلام آزاد (نظم)	جگن ناتھ آزاد	-/۲۵
۳۸	ارمغان نثر و نظم	عبدالاحد خاں خلیل	۴/۷۵
۳۹	افسانہ نمبر	مرتبہ فروغ اُردو	۱/۵۰
۴۰	اچھی نظمیں	اخگر شتاق	-/۷۰
۴۱	اُردو ادب میں طنز و مزاح جدید ایڈیشن	کامل دو جلد غلام احمد فرقت	۲۵/-
۴۲	اُردو شاعری	امیر احمد علوی	۲/-
۴۳	غزلیات حافظ صائب	غالب فارسی	۳/-
۴۴	آخری یادگار نادر شاہ	معہ ترجمہ	۲/-
۴۵	اپنی پہچان یعنی زندگی کا حال معلوم کرنیوالی کتاب	اعجاز احمد فاروقی	۱/۲۵
۴۶	اللہ کے پیارے	امیر حسن نورانی	-/۵۰
۴۷	اسپین کی شہزادی	صادق سردھنوی	۴/۵۰
۴۸	ادبی معرکہ نمبر	مرتبہ فروغ اُردو	۱/۵۰

۴۹- اپنی موج میں — گو دارہ — ۲/۵۰
۵۰- انوار جدید خط و کتابت — خلیق احمد علوی — -/۵۰
۵۱- ایک جہان تین قالب — خان محبوب طرزی — ۴/۵۰
۵۲- اُلفت — " " — ۵/۵۰
۵۳- آغاز سحر — " " — ۴/-
۵۴- امین آباد — " " — ۴/-
۵۵- انشائے خطوط نویسی حصہ اوّل — مشیر احمد علوی — -/۴۰
۵۶- اچھی کہانیاں " — شمس الدین نوری — -/۵۰
۵۷- انشائے خطوط نویسی حصہ دوم — -/۷۵
۵۸- اسپادوں کی باتیں — مصطفےٰ حسن رضوی — ۳/-
۵۹- اچھی کہانیاں حصہ اوّل — شمس الدین نوری — -/۵۰
۶۰- " " حصہ دوم " " — -/۵۵
۶۱- " " حصہ چہارم " " — -/۶۵
۶۲- ادب کا مقصد — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۴/۵۰
۶۳- اسلامی نظمیں — محمد حسین علوی شمس — -/۴۵
۶۴- اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں — عبدالماجد دریابادی — ۳/۵۰
۶۵- اوراقِ گل — اخگر مشتاق — ۱/-

(ب)

۶۶- بابائے اُردو عبدالحق — عبداللطیف اعظمی — ۷/-
۶۷- بستانِ حرم، (جدید نعتیہ کلام) — نائر حرم حمید صدیقی — ۳/-
۶۸- شہید محبت بوٹا سنگھ — خان محبوب طرزی — ۴/-
۶۹- بزم بے تکلف — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۴/۵۰
۷۰- بحث کہانی — ڈاکٹر نورالحسن و ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۵/-
۷۱- بہادر شاہ ظفر — امیر احمد علوی کاکوروی — ۷/۵۰
۷۲- بہشتی ثمر (حصہ اوّل و دوم) خلاصۂ بہشتی زیور — مولانا تھانوی — ۳/۸۰

۷۳- بانیٔ اسلام — علامہ محی الدین ضیاء کی تاریخ کا اُردو ترجمہ — ۵/-
۷۴- بشریت انبیاء — عبدالماجد دریابادی — -/۴

(پ)

۷۵- پطرس کے مضامین — پطرس بخاری — ۳/-
۷۶- پیاری باتیں — محسن کاکوروی — -/۴۰
۷۷- پھولوں کے انبار (ناول) — منظر سلیم — ۴/۷۵
۷۸- پیسہ اور پرچھائیں مجموعۂ ڈرامہ — ڈاکٹر محمد حسن — ۴/-
۷۹- پاگل خانہ (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۳/۲۵
۸۰- پیغام " — طاہر رامپوری — ۳/-
۸۱- پنجاب میں اُردو — حافظ محمود شیرانی — ۸/-
۸۲- پردیسی کے خطوط (حصہ اوّل) — مجنوں گورکھپوری — ۵/-

(ت)

۸۳- مختصر تاریخ ادب اُردو (فروغ اُردو ایڈیشن) — ڈاکٹر سید اعجاز حسین — ۱۲/-
۸۴- تصویر درد مع تشریحات و ترجمہ — فرید احمد علوی — ۱/-
۸۵- تحریریں مجموعہ مضامین — ڈاکٹر گیان چند — ۷/-
۸۶- تاریخی جائزے — ڈاکٹر محمد یاسین — ۳/-
۸۷- تنقیدی تجزیے — کاظم علی خاں — ۵/-
۸۸- تعارف تاریخ اُردو ترمیم شدہ جدید ایڈیشن — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۷/-
۸۹- تاجدار مدینہ — اقبال صدیقی — -/۳۰
۹۰- تنقیدی اصول اور نظریہ — حامد اللہ افسر — ۷/۵۰
۹۱- تنقید و تحلیل — شبیہ الحسن نونہروی — ۶/۵۰
۹۲- تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن) — سید احتشام حسین — ۴/-

۹۳- تنقیدی نظریات جلد اول سید احتشام حسین ۱۰/-
۹۴- " " جلد دوم " ۱۰/-
۹۵- تنقیدی اور عملی تنقید " ۷/-
۹۶- تنقیدی اشارے (جدید اڈیشن) آل احمد سرور ۵/-
۹۷- ترانۂ فلسفۂ خیام ڈاکٹر رغیب حسین ۳/-
۹۸- تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص محمد حسین شمس ۳/-
۹۹- تصویر درد معہ ترجمہ علامہ اقبال ۱/-

(ٹ)

۱۰۰- ٹیگور نادم سیتاپوری ۳/-
۱۰۱- ٹھیکرے کی مانگ صدیقہ بیگم سیوہاری ۲/-

(ث)

۱۰۲- ثنائے حبیب و نعتیہ کلام بہزاد لکھنوی ۲/۲۵

(ج)

۱۰۳- جہان غالب محمد حسین شمس علوی ۳/-
۱۰۴- جائزے انور سیوانی ۳/-
۱۰۵- جواہرات اسمٰعیل ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱/۵۰
۱۰۶- جنگ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء) فروغ اردو ۳/-
۱۰۷- " " نمبر ۲ " ۳/-
۱۰۸- جوئے رواں مجموعہ کلام حامد اللہ افسر ۳/۵۰
۱۰۹- جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول) ڈاکٹر اختر بلگرامی ۳/۵۰
۱۱۰- جگ ہنسائی (مجموعہ افسانہ) قیصر تمکین ۲/۵۰
۱۱۱- جلوے معین الدین دردائی ۲/-
۱۱۲- جمیلہ لوائزی (ناول) خان محبوب طرزی ۴/۵۰
۱۱۳- جگر نمبر اول سید احتشام حسین ۸/-

(چ)

۱۱۴- چوتھی بہن، مجموعہ افسانہ مسیح الحسن رضوی ۳/-

(ح)

۱۱۵- حیات فضل الحق خیر آبادی ۴/۵۰
۱۱۶- حالی بحیثیت شاعر (جدید ایڈیشن معہ اضافہ) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱۲/-
۱۱۷- حسرت موہانی عبد الشکور ۲/
۱۱۸- حجاج بن یوسف جرجی زیدان ۴/۵۰
۱۱۹- حکیم نباتات وزیر خاں لنکراں ۲/-
۱۲۰- حبیبۂ غالب سعادت علی صدیقی ۲/۵۰

(خ)

۱۲۱- خضر راہ مع ترجمہ علامہ اقبال ۱/-
۱۲۲- خطبات ماجدی یا سیرت نبوی عبد الماجد دریابادی ۳/۵۰
۱۲۳- خضر راہ معہ ترجمہ علامہ اقبال ۱/-
۱۲۴- خلاصہ شریف زادہ مرزا رسوا ۱/۲۵
۱۲۵- خلاصہ روح تنقید ۱/-
۱۲۶- خلاصہ جواہر العروض ۱/-
۱۲۷- خبطی مزاحیہ محمد علی واحدی معہ مقدمہ شوکت تھانوی ۱/۵۰
۱۲۸- خوش بختی کی تلاش احسن الظفر بی اے ۳/-
۱۲۹- خلاصہ شعر الہند حصہ دوم ۱/-
۱۳۰- خلاصہ المیزان -/۷۵

(د)

۱۳۱- دیوان آبرو ڈاکٹر محمد حسن ۷/-
۱۳۲- دلچسپ کہانیاں مسعود عالم ۲/۵۰

۱۳۳۔ دیوان نعمانی ۱/۵۰

۱۳۴۔ داستان سہراب و رستم معہ مقدمہ (فارسی) عبدالماجد خاں خلیل ۳/۵۰

۱۳۵۔ دلی کا یادگار مشاعرہ مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/۵۰

۱۳۶۔ دستہ گل شبلی نعمانی -/۴۰

۱۳۷۔ دوشیزہ قاف (ناول) خان محبوب طرزی ۵/-

۱۳۸۔ دلربا " " ۳/-

۱۳۹۔ دلی کا دبستان شاعری (معہ اضافہ جدید ایڈیشن)

۱۴۰۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۱۲/-

۱۴۱۔ دھڑکنیں ذکی کاکوروی ۳/۵۰

(ڈ)

۱۴۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ڈاکٹر نورالحسن -/۴۰

(ذ)

۱۴۳۔ ذوق و جستجو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۱۶/-

۱۴۴۔ ذوق ادب و شعور سید احتشام حسین ۶/۵۰

۱۴۵۔ ذوق و جنون، مجموعہ کلام آل احمد سرور ۸/-

(ر)

۱۴۶۔ روایت اور بغاوت سید احتشام حسین ۷/۵۰

۱۴۷۔ رباعیات غالب فارسی معہ اردو ترجمہ سید اکبر حسن نورانی ۳/-

۱۴۸۔ رہبر مضمون نویسی شفاعت علی صدیقی ۳/-

۱۴۹۔ راکھی ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی -/۵۰

۱۵۰۔ رخسار سحر (ناول) انصر کریم قدوائی ۱/۵۰

۱۵۱۔ رفتار وحشی محمود آبادی ۳/۵۰

۱۵۲۔ رموز حکمت معہ مقدمہ اردو محمد شریف ۳/۵۰

۱۵۳۔ ریاض فارسی منتخب کلام فارسی -/۴۰

۱۵۴۔ ریختہ ولی ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۴/-

(ز)

۱۵۵۔ زکوٰۃ الحلی یعنی (زیورات کی زکوٰۃ) مولانا تھانوی -/۵۰

۱۵۶۔ زینتوں کا بادشاہ، حکیم بانا مزاحیہ ناول سید علی عباس حسینی ۴/-

(س)

۱۵۷۔ سلور کنگ آغا حشر کاشمیری ۲/۵۰

۱۵۸۔ سوانح اور خاکے نجم الدین نقوی ۴/-

۱۵۹۔ سرور جہاں آبادی ڈاکٹر حکیم چند نیر ۸/-

۱۶۰۔ سرود نو (مجموعہ کلام) پروفیسر اختر قادری ۳/۵۰

۱۶۱۔ سنگ گہر سید احتشام حسین -/۴

۱۶۲۔ سرسید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری سید علی عباس حسینی ۱/۵۰

۱۶۳۔ سرمایہ زبان اردو جلال لکھنوی ۷/۵۰

۱۶۴۔ سفر (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/-

۱۶۵۔ سیاحت زمین (ناول) محمود اعظم فہمی ۱/۵۰

۱۶۶۔ ستاروں سے آگے ناظر کاکوروی ۳/۵۰

۱۶۷۔ سنہرا حلقہ -/۷۵

۱۶۸۔ سرسید احمد خاں انوارالحسن صدیقی -/۴۰

۱۶۹۔ سوشل اسٹیڈی احمد محسن کاکوروی ۱/۷۵

۱۷۰۔ سازدل ذکی کاکوروی ۲/۵۰

(ش)

۱۷۱۔ شعور تنقیدی مجموعہ ڈاکٹر محمد حسن ۶/۵۰

۱۷۲۔ شرح دیوان غالب (مزاحیہ) غلام احمد فرقت ۸/۵۰

[illegible]	شرح سنگ گہر	عبدالقوی دریابادی	۵/-
[illegible]	شاہ تمکین حضرت جی	پروفیسر عبدالشکور	۳/-
۱۷۴-	شرح ادب پارے نثر	سعادت علی صدیقی	۴/-
۱۷۵-	شرح ادب پارے نظم	ڈاکٹر محمود الحسن	۴/-
۱۷۶-	شرح منتخبات فارسی	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۱۷۷-	شبلی نعمانی	انوار الحسن نورانی	-/۴۰
۱۷۸-	شرح دیوان غالب (جدید ایڈیشن)	نظم طباطبائی	۷/۵۰
۱۷۹-	شہری اور سماجی زندگی	عبدالعلی قدوائی	-/۸۰
۱۸۰-	"	"	-/۹۵
۱۸۱-	"	"	۱/-
۱۸۲-	"	"	۱/-
۱۸۳-	شاہان مادہ یعنی گجرات کی تاریخ	امیر احمد علوی	۳/۵۰
۱۸۴-	شعر العجم، حصہ اول ـ دوم، سوم، چہارم، پنجم	شبلی نعمانی	۴۴/-
۱۸۵-	شرح نثر امروز ایران	احسن الظفر بی اے	۳/-
۱۸۶-	شرح امروز ایران	"	۳/۵۰
۱۸۷-	شمع و شعر	علامہ اقبال	-/۵۰
۱۸۸-	شرح منیر نباتات وزیر خاں	منیر مسعود	۱/۲۵
۱۸۹-	شرح انتخاب قصائد و غزلیات	مشتاق ندوی ایم اے	۲/-
۱۹۰-	شرح شعر پاستان حصہ اول	ڈاکٹر انوار الحسن	۳/-
۱۹۱-	شرح ترانہائے خیام	حکیم عبدالقوی	۲/-
۱۹۲-	شرح مفتاح العربیہ	عبدالقوی دریابادی	۱/۵۰
۱۹۳-	شرح نصاب فارسی		۶/-
۱۹۴-	شرح شعر پاستان دوم	احسن الظفر	۳/-
۱۹۵-	شرح گلہائے ادب		۳/-
۱۹۶-	شرح آئینہ نظم اردو		۳/-
۱۹۷-	شرح نثر فارسی امروزہ		۳/-

۱۹۸-	شرح آئینہ نثر اردو	خلیل قدوائی	۳/۵۰
۱۹۹-	شرح غنچہ و گل		۵/-
۲۰۰-	شرح شعر فارسی کلاسیک	احسن الظفر	۴/-
۲۰۱-	شرح ہماری زبان اردو درجہ ۶ ، ۷ ، ۸ درجہ تک	خلیل قدوائی	۲/-

(ص)

۲۰۲-	صید هدف (مزاحیہ مضامین)	غلام احمد فرقت	۵/-
۲۰۳-	صحیفہ محبت مہدی افادی کے خطوط	ڈاکٹر محمود الٰہی	۶/-

(ط)

۲۰۴-	طرزی نمبر (خان محبوب طرزی)	مرتبہ فروغ اردو	۳/-
۲۰۵-	طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہئے	غلام الثقلین	-/۲۵
۲۰۶-	طلسم اسرار (ڈرامہ)	مرزا رسوا لکھنوی	۱/۵۰

(ع)

۲۰۷-	عذرا (ناول)	صالحہ عابد حسین	۶/-
۲۰۸-	عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)	سید احتشام حسین	۶/۵۰
۲۰۹-	عبدالماجد دریابادی نمبر		۹/-

(غ)

۲۱۰-	غالب کا تنقیدی شعور	اخلاق حسین عارف	۴/-
۲۱۱-	غالب نام آورم	نادم سیتاپوری	۶/-
۲۱۲-	غلام احمد فرقت کاکوروی نمبر	سید امیر حسن نورانی	۶/-
۲۱۳-	غالب کی تخلیقی تخیل	شہید صفی پوری	۸/-
۲۱۴-	غنچہ و گل	سید محمود الحسن رضوی	۴/۵۰

۲۱۵- غالب کے کلام میں الحاقی عناصر — نادم سیتاپوری — ۶/-
۲۱۶- عشرتی دروازہ (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۴/۵۰
۲۱۷- غزلیات نظیری — ۱/۵۰
۲۱۸- غزل انسائیکلوپیڈیا (جدید ایڈیشن) ذکی کاکوروی — ۲۵/-

(ف)

۲۱۹- فروق (لغت) — طاہر محسن علوی — ۴/۵۰
۲۲۰- فن خطابت یعنی اُستادِ تقریر — کلب مصطفےٰ ایڈوکیٹ — ۱۵/-
۲۲۱- فریدہ — خان محبوب طرزی — ۱/-
۲۲۲- فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی — نادم سیتاپوری — ۷/-
۲۲۳- فلسفۂ اقبال — عبدالقوی دریابادی — ۴/۵۰
۲۲۴- فلسفی ابن رشد — مائل ملیح آبادی — ۳/۵۰
۲۲۵- فروغِ جام مجموعۂ کلام — نشور واحدی — ۴/-
۲۲۶- فغانِ محسن — محسن کاکوروی — -/۴۰
۲۲۷- فارسی آموز — مشیر احمد علوی — ۱/-
۲۲۸- فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن) پروفیسر کلیم الدین احمد — ۷/-

(ق)

۲۲۹- قدیمچے۔ جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں — غلام احمد فرقت — ۶/-
۲۳۰- قصائد ظہیر فاریابی — ۲/-
۲۳۱- قصائد مومن۔ مع شرح — ظہیر احمد صدیقی — ۶/۵۰
۲۳۲- قطرے سے گہر ہونے تک — صالحہ عابد حسین — ۷/-
۲۳۳- قصص و مسائل — عبدالماجد دریابادی — ۳/-
۲۳۴- قصائد قاآنی (فارسی) — ۱/-
۲۳۵- قومی ادب نثر و نظم — حامد اللہ افسر — ۴/-
۲۳۶- قیدِ عنصری (سائنسی ناول) — خان محبوب طرزی — ۳/-

(ک)

۲۳۷- کلیاتِ اقبال — علامہ اقبال — ۸/-
۲۳۸- کیسر اور کاہی — بدرالدین طیب جی — ۳/-
۲۳۹- کف گلفروش (مزاحیہ مضامین) — غلام احمد فرقت — ۴/۵۰

(گ)

۲۴۰- گاندھی نمبر — ۳/-
۲۴۱- گلدستۂ فارسی اول و دوم — محمد غوث بیگ سیفی — ۲/۲۵
۲۴۲- گلزار فارسی یعنی آمد نامہ جدید — -/۷۰
۲۴۳- گلہائے ادب — عبدالاحد خاں خلیل — ۳/-
۲۴۴- گاندھی جی کے ساتھ — حامد اللہ افسر — ۱/۵۰

(ل)

۲۴۵- لوائح جامی مع مقدمہ — عبدالاحد خاں خلیل — ۱/۵۰
۲۴۶- لال قلعہ — مائل ملیح آبادی — ۶/-
۲۴۷- لبِ بام — عادل رشید — ۶/-
۲۴۸- لسانیات اور اُردو — سید محمود الحسن رضوی — ۴/۵۰

(م)

۲۴۹- مرقع اقبال — عصمت فاطمہ علویہ — ۱۲/-
۲۵۰- مزاحیہ شرح دیوان غالب اُردو — غلام احمد فرقت — ۸/۵۰
۲۵۱- محسن کاکوروی نمبر — ۳/۵۰
۲۵۲- مسلمان اور کانگریس — ابوالکلام آزاد — ۳/۵۰
۲۵۳- مرثیہ نگاری اور میر انیس — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۵/۰۰
۲۵۴- مضامین فرحت حصہ اول — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۵/-
۲۵۵- " " حصہ دوم — " " — ۵/-

عنوان	مصنف	قیمت
ماجھی کی کہانیاں	آفتاب اختر تلہری	۳/-
بہت اچھے ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	۴/۵۰
موسم گل (ناول)	عادل رشید	۷/-
مجبور	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
مضامین جدید	محمد ہادی	۱/۷۵
مثنوی سحر ہلال فارسی معہ مقدمہ	قدرت اللہ بیگ	۲/۵۰
مطالعہ	ذکی کاکوروی	۵/-
مولوی نذیر احمد کی کہانیاں	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰
معرکہ روم دیونات	صادق سردھنوی	۴/-
مثنویات حالی مع اضافہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۵۰
مطالعہ ماؤ		۴/-
مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵
میٹھے بول	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۲/۵
مصنوعی چاند	خان محبوب طرزی	۴/-
مقدمہ شعر و شاعری	مطابق نصابی، اے حالی	۲/۵۰
مرثیہ غالب	حالی	-/۲۵
محبوبہ کربلا	جرجی زیدان	۳/۵۰
معمار	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	-/۴۰
انتخاب فسانہ آزاد یعنی مہاراج بلی	سرشار لکھنوی	۲/۵۰
مسٹر ملاکی نوک جھونک	خواجہ عزیز الحسن مجذوب	-/۷۵
مجذوب اور اُن کا کلام	مولانا رضا انصاری	۱/۵۰
مصباح بلاغت معہ مقدمہ	محمد شریف	۴/-
مطالعہ سودا	ڈاکٹر محمد حسن	۴/۵۰

نمبر	عنوان	مصنف	قیمت
۲۸۱	مقدمات و مقالات	عبدالاحد خاں خلیل	۵/۵۰
۲۸۲	منتخب سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	۴/-
۲۸۳	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵

(ن)

نمبر	عنوان	مصنف	قیمت
۲۸۴	نثر امروز ایلان	ڈاکٹر رغیب حسین	۳/-
۲۸۵	نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	۴/-
۲۸۶	نقد و انتقاد	اعجاز احمد معجز	۲/۵۰
۲۸۷	نقش حالی دوم یعنی حالی نمبر	پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	
۲۸۸		شجاعت علی سندیلوی	۳/-
۲۸۹	نغمہ کوہسار	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۹۰	نغمات الہند مع مقدمہ اردو	محمد شریف	۳/-
۲۹۱	نظم سائیکلوپیڈیا	ذکی کاکوروی	۱۰/-
۲۹۲	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر احمد جائسی	۲/۵۰
۲۹۳	نسرین و نسترن	ذکی کاکوروی	۵/-
۲۹۴	نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	۴/-
۲۹۵	نیرنگ خیال حصہ اول	محمد حسین آزاد	۱/۲۵
۲۹۶	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان اسلام کے نام	عبدالماجد دریابادی	
	نوائے سرور جہاں آبادی	ڈاکٹر حکم چند نیر	د/۷
۲۹۷	نیا راستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۲۹۸	نوروز	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۹۹	نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدید	آل احمد سرور	۱۰/-
۳۰۰	نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	۶/۵۰
۳۰۱	نیلم	انتصار حسین	۳/-
۳۰۲	نذیر احمد کی کہانی	فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۳۰۴	نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی	عبدالاحد خاں خلیل	5/-
۳۰۵	منشی نولکشور تبسم		2/50
	(و)		
۳۰۶	وعدہ فردا	انگر مشتاق رحیم آبادی	15/-
	(ہ)		
۳۰۷	ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے	علی عباس حسینی	5/-
۳۰۸	ہندی کے مسلمان شعرا	امیر حسن نورانی	1/25
۳۰۹	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	1/-
۳۱۰	ہندوستان ... [illegible]		
۳۱۱	ہندوستان ... [illegible]		/50
۳۱۲	ہمارا سماج حصہ ۱	ڈاکٹر ... [illegible]	/-
۳۱۳	" حصہ ۲	"	/95
۳۱۴	" حصہ ۳	"	۴/-
۳۱۵	" حصہ ۴	"	۲/-
۳۱۶	یادگار غالب	مولانا حالی	۹/-
۳۱۷	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۳۱۸	یادگار انیس		
		امیر احمد علوی	۳/-

ملنے کا پتہ: ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ (امین آباد پارک لکھنؤ)

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کیساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کردی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کردی جائیں گی، ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

(۴) جوابی امور کے لیے جوابی کارڈ روانہ فرمایئے۔

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔